دعوتِ اصلاح و تبلیغ کا ترجمان

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا ذریعہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، اور عہد ہے

اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بندگی ہوگی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرة

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارہ الفرقان"

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

تصوف کیا ہے؟
اردو میں تصوف سے متعلق کئی اچھی اچھی چیزیں ہمارے اس زمانہ میں شایع ہو چکی ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ تازہ طبع کتاب اپنے اختصار کیساتھ انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے بہت ممتاز سمجھی جائے گی اور انشاء اللہ ان تمام حق پسند حضرات کے لیے اطمینان کا باعث ہوگی جو تصوف کے بارہ میں بھی انصاف سے غور کرنا چاہتے ہیں اور جن کو اس کے نام سے خواہ مخواہ کی ضد اور چڑ نہیں ہے۔
اس میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان، مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے مندرجہ ذیل آٹھ مقالے ہیں۔۔۔
گویا ان تینوں حضرات کی مشترک تالیف ہے۔
(۱) تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ ——— محمد منظور نعمانی
(۲) تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند یقین ——— " "
(۳) تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات ——— " "
(۴) تصوف کے متعلق بعض شبہات کا جواب ——— مولانا محمد اویس ندوی
(۵) یقین اور اس کے ثمرات ——— " "
(۶) تصوف اور شیخین ——— " "
(یعنی تصوف کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ ابن القیمؒ کی تصریحات)
(۷) اہل تصوف اور دینی جد و جہد ——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
(۸) طالبان سلوک کو ابتدائی مشورے ——— محمد منظور نعمانی
ڈیڑھ سو صفحات، کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ اعلیٰ (قیمت عہ)
کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

ہندوستان سے
سالانہ چندہ ۔۔۔ پانچروپیہ
فی کاپی
(آٹھ آنے)

پاکستان سے
سالانہ (للعہ) پاکستانی سکہ
دیگر ممالک سے
(۱۲ شلنگ)

جلد ۲۰	بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۲ء	نمبر ۱

سُرخ پنسل کا نشان! اس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مدت خریداری اس شمارہ پر ختم ہو گئی ہے، لہٰذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ (پانچروپیہ) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ اگر ۱۰ ر نومبر ۱۹۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی، تو اگلا پرچہ (وی۔ پی) بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا ———

پاکستان کے حضرات اپنا چندہ سکریٹری صاحب "ادارۂ اصلاح وتبلیغ" آسٹریلین بلڈنگس (لاہور) کے پتہ پر ارسال فرمائیں، اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دیں۔ اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں، اگر آپ کے چندہ کی اطلاع ۱۰ ر نومبر ۱۹۵۲ء تک موصول نہ ہوئی، تو "ادارۂ اصلاح وتبلیغ، لاہور" سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا ——— دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ (۱۲ شلنگ) بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں۔ والسلام

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاح جلد بستم (۲۰)

بسم اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم یحیی ویمیت وھو علی کل شیء قدیر!

آج "الفرقان" اپنی عمر کے بیسویں (۲۰) سال میں داخل ہو رہا ہے، یہ محض فضل و کرم ہے اُس ذات کریم کا جسنے اُسے اب تک اُنیس (۱۹) منزلیں طے کرائیں، ہر منزل کے آغاز سے اختتام تک اسکی دستگیری فرمائی، ہر مشکل کے وقت غیب سے آسانیاں پیدا فرمائیں، ہر تنگی کو کشادگی سے بدل دیا، اسکے کارکنوں کو صبر و ثبات کی توفیق عطا فرمائی، ہم شکر گذار ہیں اسکی ان مہربانیوں پر، اور ان کے علاوہ اس نعمتِ عظمٰی پر کہ اُس پاک ذات کا نام بلند کرنے، لوگوں کو اُسکے دین کی طرف بلانے اور اُسکے پیغمبرِ برحق سے اُمتِ مرحوم کا تعلق بڑھانے کی کوشش کی توفیق کسی نہ کسی درجہ میں "الفرقان" کو برابر ملتی رہی۔ لاریب اس خدا فراموش دور میں یہ عظیم ترین نعمت ہے، جس پر جتنا بھی ناز اور جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ اللّٰھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد

اے اللہ! شکر کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرما، نفس کے شرور سے حفاظت فرما! ہمارے اپنے عیوب اور اپنی غلطیوں پر متنبہ فرما۔ اے پروردگار! ہمیں ہر موقع پر صحیح اور حق کہنے کی توفیق دے، اور سُننے اور پڑھنے والوں میں اسکے قبول کی صلاحیت پیدا فرما!

ربِّ اشرح لی صدری ویسّر لی امری واحلل عقدۃً من لسانی یفقھوا قولی

نگاہِ اوّلیں

مسلمانوں میں دینی شعور و احساس بیدار کرنے اور ایمانی زندگی اُن میں عام کرنے کی جو کوشش ایک خاص طرز پر "تبلیغ" یا "دعوتِ اصلاح و تبلیغ" کے نام سے ہو رہی ہے، جس کا ذکر الفرقان میں بھی برابر ہوتا رہتا ہے، اُسکی یہ خصوصیت عام طور سے معلوم اور مشہور ہے کہ اُس میں دین کیلئے جدوجہد اور قربانی کے مطالبہ کا پہلو دوسرے سب پہلوؤں پر عملاً غالب ہے ——— یعنی سب سے زیادہ زور اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ لوگوں میں دین کی اہمیت کا احساس اور اس کا فکر پیدا ہو، اور جس طرح دنیا حاصل کرنے اور اس میں ترقی کرنے کیلئے آج محنتیں اور کوششیں کیجاتی ہیں اسی طرح دین کی تحصیل اور ترویج کیلئے محنتیں اور مجاہدے اور قربانیاں کرنے کا رواج ہو ——— یہ پہلو ہماری اس دینی دعوت میں اتنا غالب ہے کہ بعض اوقات لوگوں کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد اور اس جماعت کا کام بس جدوجہد اور دوڑ دھوپ ہی ہے، اور اِسکے سوا کوئی اور متعین مقصد اور اصلاحی یا تربیتی کام ان لوگوں کے سامنے ہے ہی نہیں ——— حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ تو اصل کام کیلئے صرف ذریعہ ہے، ورنہ اصلی مقصد اور اصل کام تو حقیقی ایمانی اور ایمان زندگی کا پیدا کرنا اور عام کرنا ہے، یعنی مومن ہونے کیلئے جن حقیقتوں پر یقین ضروری ہے ان کا یقین مسلمانوں میں عام ہو، جن دینی باتوں کا علم ضروری ہے اُن کا علم عام ہو، اور مومن کی جیسی عملی اور اخلاقی اور دعوتی زندگی ہونی چاہئے وہی مسلمانوں کی عمومی زندگی ہو ——— لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہمارے اس کام کی ساخت اور ترتیب میں چونکہ جدوجہد اور قربانی کا ذکر اور مطالبہ ہی دوسری تمام چیزوں پر غالب رہتا ہے، اور باقی چیزیں اُسکے نیچے دبی رہتی ہیں، اِسلئے بعض کام کرنے والوں کے متعلق بھی کبھی تجربہ ہوا کہ عرصہ تک کام سے متعلق رہنے کے باوجود اور بار بار اس سلسلہ کے مہینوں اور چلّوں کے سفروں میں شرکت کے بعد بھی اُن میں ایسی علمی خامیاں اور فکر و عقیدہ کی غلطیاں اور اصلی دعوت کے بارے میں بھی ایسی غلط فہمیاں باقی رہ گئیں، جو نہ رہنی چاہئے تھیں۔

اس چیز کی فکر تو اس کا احساس کرنے والوں کو ہمیشہ رہی، اور جب کبھی ہم میں سے کسی نے اس کو محسوس کیا اُس نے اُسکے جبر و اصلاح کیلئے جو کوشش مناسب سمجھی وہ کی۔ لیکن اس ماہ محرم کے شروع میں پورے آٹھ دن کا ایک تعلیمی اور تربیتی پروگرام خاص اس مقصد کیلئے لکھنؤ میں تجویز کیا گیا ——— ابتداءً تو صرف لکھنؤ ہی کے رفقاء کار پیش نظر تھے، بلکہ انھوں نے ہی اس ضرورت کو

محسوس کرکے اس کا تقاضا ہم لوگوں سے کیا تھا، لیکن پھر بعض دوسرے مقامات کے مخصوص احباب کو بھی اسکی اطلاع دے دینا مناسب سمجھا گیا، تاکہ اگر وہ چاہیں تو اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

۴ محرم (۵ ۲ ستمبر) سے ۱۱ محرم (۲ اکتوبر) تک پورے آٹھ دن یہ تعلیمی اور تربیتی سلسلہ جاری رہا۔ دوسرے مقامات کے بھی قریباً ۴۰ حضرات اسمیں شریک ہوئے۔ خود ہمارے لئے بھی یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا (اور اسی لئے اسکی عام دعوت نہیں دیگئی تھی) الحمدللہ کہ اس تجربہ نے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ دینی کام کرنے والوں کی، بالخصوص خاص داعیوں اور کارکنوں کی اس طرح کی تعلیم و تربیت کی کوشش نہایت ضروری اور نہایت مفید ہے —— روزانہ کا پروگرام یہ تھا کہ:۔ صبح ۷ ½ سے ۹ بجے تک کسی متعین موضوع پر درسی اور تعلیمی انداز میں ایک تقریر ہوتی تھی —— پھر ۹ ½ سے ۱۱ بجے تک دوسرے موضوع پر —— پھر بعد ظہر ۲ ½ سے ۴ تک تیسرے موضوع پر —— اور پھر مغرب کے بعد عشاء تک چوتھے موضوع پر —— ان درسی تقریروں کے خاص موضوعات اور عنوانات یہ تھے:—— دین و شریعت اور اُسکے مختلف شعبے (عقائد، عبادات اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست و حکومت) ؛ دینی دعوت اور جد وجہد کے محرکات و موجبات ؛ اُسکے اصول ؛ اسکی کامیابی اور ترقی کے شرائط اور اسباب ؛ مختلف دوروں کی اصلاحی و تجدیدی کوششیں ؛ ان کا مابہ الاشتراک اور انکی خصوصیات ؛ خلافِ اسلام عصری تحریکات و نظریات ؛ ہندوستان میں مسلمانوں کا موقف اور ان کی خاص ذمہ داری۔

ان میں سے اکثر عنوانوں پر کئی کئی صحبتوں میں گفتگو جاری رہی، عنوانات آپس میں تقسیم کر لئے گئے تھے، اس عاجز راقم سطور اور رفیقِ محترم مولٰنا سید ابوالحسن علی کے علاوہ مولٰنا محمد اسحاق صاحب سندیلوی اور مولٰنا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی نے بھی بعض عنوانات اپنے ذمہ لئے تھے —— بعض احباب نے ان تعلیمی اور تربیتی تقریروں کو قلمبند کرنے پر بھی بڑی محنت کی۔ اب تعمیم فائدہ کے لئے اسکے کچھ حصے الفرقان میں بھی شائع کرنے کی تجویز ہے —— جن دوستوں نے ترتیب اور تبییض کا کام اپنے ذمہ لیا ہے، اگر انھوں نے زیادہ دیر نہ لگائی تو اُمید ہے کہ انشاءاللہ اگلے ہی شمارہ میں اس کو شائع کیا جا سکے گا۔

اگر اس پورے سلسلہ کے لئے ایک مہینہ کے پرچہ کے صفحات کافی نہ ہوں گے، تو پھر دو مہینے کا رسالہ مشترک کر دیا جائے گا —— اگر ایسا کرنا پڑا تو آئندہ پرچہ ربیع الاول میں شائع ہو سکے گا، اور وہ صفر و ربیع الاول کا مشترک شمارہ ہوگا۔ —— اگر اللہ تعالیٰ نے ان درسی تقریروں کو اچھی طرح مرتب کرا دیا، تو اُمید ہے کہ یہ ایک بڑی کام آمد چیز تیار ہو جائیگی۔

قرآنی دعوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[ہمارا ایمان ہے کہ قرآنی دعوت و تعلیم ساری انسانی دنیا کے لئے آبحیات ہے اور جو اُمت اس کو کتابِ الٰہی مان کر اپنی زندگی اس کی رہنمائی میں گذارنے کا فیصلہ کرلے وہ اس کے لئے دنیا و آخرت کی ہر فلاح و سعادت کی ضامن ہے ——— لیکن صدیوں کی ہماری تقصیر سے صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کا کیا ذکر، قرآن کو کتاب اللہ ماننے والی جو اُمت اسوقت روئے زمین پر پھیلی ہوئی ہے جسکے افراد کی تعداد چالیس پچاس کروڑ سے ستر کروڑ تک بتلائی جاتی ہے، خود اس کا حال قرآن سے دوری کے بارہ میں یہ ہے کہ یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ فی صد نہیں بلکہ فی ہزار زیادہ سے زیادہ بس ایک دو اُن میں قرآنی دعوت سے کچھ تعلق اور واقفیت رکھنے والے ہونگے، اور باقی نوسے ننانوے یا نوسے اٹھانوے فی ہزار وہ ہونگے جن کو قرآنِ پاک کی دعوت و تعلیم سے نہ واقفیت ہے اور نہ کوئی خاص تعلق! ——— لیکن چونکہ قرآن مجید سے یہ بُعد تدریجاً پیدا ہوا ہے اور صدیوں سے اُمت کچھ اسی حال میں ہے اسلئے ہم میں سے جن کو دین کا کسی قدر فکر ہے وہ بھی اس کو کچھ زیادہ محسوس نہیں کرتے حالانکہ اگر سوچا جائے تو یہ اتنا عظیم سانحہ اور اتنا بڑا حادثہ ہے کہ دوسرے بڑے بڑے اکثر وہ مصائب اور حوادث جو مختلف زمانوں میں مسلمانوں پر آئے اور جن کی یاد آج بھی ہم کو رُلا دیتی ہے وہ اسکے سامنے ہلکے اور ہیچ ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے اُن مخلص بندوں کو جزائے خیر دے اور انکی مساعی کو مشکور فرمائے جنھوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اس کو کچھ محسوس کیا، اور مختلف راہوں سے اس کیلئے کوششیں فرمائیں، یا جو آج بھی کسی طریقے پر اس کیلئے کوشاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ سے زیادہ بندے قرآنی دعوت و تعلیم سے آشنا ہوں، اور یہ آبحیات کسی طرح زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچ جائے۔

گذشتہ رمضان کے شروع ہی میں ایک دن تلاوتِ قرآن ہی کے دوران میں بڑی شدت اور قوت سے یہ احساس اِس عاجز کے دل میں پیدا ہوا، اور اسی وقت یہ خیال میں آیا کہ اس سلسلہ میں کرنے کا ایک کام جو کچھ بُرا بھلا خود بھی انشاء اللہ کیا جاسکتا ہی یہ ہے، کہ قرآنی دعوت و تعلیم کو ایک ایسی کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے جو زیادہ بڑی بھی نہ ہو، اور جسکی زبان بھی جہانتک ہوسکے عام فہم اور طرزِ بیان سادہ اور آسان ہو کہ معمولی لکھے پڑھے مسلمان اور ہماری دینی اصطلاحات کا علم نہ رکھنے والے غیر مسلم بھی اس کو سمجھ سکیں، اور پھر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو دوسری زبانوں میں بھی اسکی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

بہر حال متوکلاً علی اللہ اس عاجز نے یہ فیصلہ کرلیا، اور پھر قرآن مجید کی تلاوت اسی نقطۂ نظر سے کرنے لگا، اور جو آیات "قرآنی دعوت" سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں عنوانات قائم کرکے اُنکے ذیل میں انکو جمع کرتا رہا اور الحمدللہ کہ رمضان ہی میں یہ کام ختم بھی کرلیا، اور صرف ترتیب و تالیف کا کام رہ گیا —— اگر اس کام کے لئے بھی یکسوئی سے وقت دیا جاسکتا تو زیادہ سے زیادہ مہینے دو مہینے میں یہ بھی پورا ہوجاتا، لیکن میرے قریبی احباب جانتے ہیں کہ مشاغل کی خاص نوعیت کی وجہ سے اس عاجز کے کام اور اوقات کس قدر غیر منضبط رہتے ہیں —— بہر حال بنام خدا ترتیب کا کام بھی شروع کردیا ہی، لیکن اللہ ہی جانتا ہے کہ اس ابتداء کی انتہاء اگر مقدر ہے تو کب ہوگی ناظرین کرام دُعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ نے جس طرح اس کام کا داعیہ دل میں ڈالا اور اس کو شروع کردینے کی توفیق بخشی، اسی طرح اپنی رضا کے مطابق اس کو پورا کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائیں، اور قبولیت سے نوازیں۔

اس کتاب کے ابتدائی چند صفحات بلکہ کہنا چاہئے کہ اس کا پہلا عنوان آج حضرات ناظرین الفرقان کی نذر کیا جارہا ہے —— یہ بالکل ابتدائی مسودہ کے چند اوراق ہیں جو الفرقان کیلئے کاتب صاحب کو دیئے جارہے ہیں۔ زبان کو آسان اور عام فہم کرنے کے لئے ابھی مجھے مستقل محنت کرنی پڑے گی، اور یہ کام کتاب مرتب ہوجانے کے بعد ہوسکے گا۔ آیات کے ترجمہ میں مضمون کی تفہیم کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے اسلئے لفظی ترجمہ کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔)

خدا کی ہستی!

دین و مذہب کے سلسلہ کی بنیاد اس حقیقت کے ماننے پر قائم ہوتی ہے کہ ہمارا اور ساری کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہی اپنی قدرت اور اپنے حکم سے اس سارے جہان کو چلا رہا ہے، اگر کوئی شخص اس بنیاد ہی کو نہ مانے تو اُس کے نزدیک دین اور دھرم کے سلسلہ کی تمام باتیں بیوقوف انسانوں کے "توہمات" ہیں —— بہرحال خدا کی ہستی کا مسئلہ دین و مذہب کا پہلا بنیادی مسئلہ ہے، اور کوئی دینی دعوت اُن ہی لوگوں کو دیجا سکتی ہے جو پہلے اس بنیاد کو تسلیم کرلیں۔ مگر چونکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا کی ہستی کا علم انسانوں کیلئے خود اپنی ہستی کے علم کی طرح بالکل فطری اور بدیہی ہے جس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں، اور اسی لئے دنیا کی عام انسانی آبادی ہمیشہ سے اس بنیاد کی ماننے والی رہی ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے اس دور میں بھی جس کو لادینیت اور دہریت کا دور کہا جاتا ہے انسانوں کی غالب ترین اکثریت خدا کی ہستی کی ماننے والی ہی ہے، اسلئے قرآن مجید نے اپنی دعوت کے سلسلے میں اس مسئلہ پر براہِ راست زیادہ بحث نہیں کی۔ لیکن پھر بھی جا بجا جو کچھ اشارات اس بارہ میں کئے ہیں وہ ہر اُس شخص کے دل میں خدا کی ہستی کا یقین پیدا کرنے کیلئے بالکل کافی ہیں جس کے ہوش و حواس صحیح و سالم ہوں، اور جس نے اپنی عقل و بصیرت کی آنکھوں کو بالکل پھوڑ نہ لیا ہو۔

ہاں! اس سلسلے میں یہ ایک بات پہلے سمجھ لینے کی ہے کہ قرآن پاک خدا کی ہستی (اور اسی طرح دوسری ایمانی حقیقتوں) کو منوانے کیلئے منطقیوں کے طریقے پر بحث و مناظرہ نہیں کرتا ہے جس کے مقابلہ میں مخاطب اگرچہ لاجواب ہو جائے لیکن اُس کے دل میں اس سے یقین کی ٹھنڈک پیدا نہیں ہو سکتی، بلکہ قرآن پاک کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی صحیح اور سلیم فطرت سے اپیل کرتا ہے کہ کائنات کا نظام جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، بلکہ تم خود اسی کے ایک جزو ہو، اس میں ذرا غور و فکر کرو، تم خود حقیقت کو پالوگے، اور جو تم کو بتلایا جا رہا ہے اُس کی کھلی نشانیاں بچشم خود دیکھ لوگے، اور تمہارا یہ غور و فکر اور مطالعہ ہی یقین و اطمینان کی ٹھنڈک تمہارے دلوں میں پیدا کر دے گا۔

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر ذرا پڑھئے قرآن مجید کی یہ آیتیں:—

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بلاشبہ آسمان و زمین کی ساخت میں، اور رات دن کے
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ	یکے بعد دیگرے آنے میں، اور اُن کشتیوں جہازوں میں جو
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ	انسانوں کے کام کی چیزیں لیکر دریاؤں اور سمندروں میں

بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (البقرہ - ع - ۲۰)

چلتے پھرتے ہیں، اور اُس بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے پھر اُس سے زمین کو ایک زندگی بخشتا ہے بعد اسکے کہ وہ مُردہ ہو چکی ہوتی ہے، اور اسی کے ذریعہ ہر قسم کے جانداروں زمین کی وسعت میں پھیلا دیتا ہے، اور ہواؤں کے چلنے میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر رہتے ہیں (تو ان سب چیزوں میں جن کو سب آنکھوں والے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں) عقل سے کام لینے والے لوگوں کیلئے کھلی نشانیاں ہیں۔

قرآن مجید نے یہاں آسمان و زمین کی ساخت، رات دن کی آمد و رفت کے مقررہ نظام، سمندروں میں جہازوں کی چلت پھرت، بارش اور اسکے آثار و نتائج، ہواؤں کے تغیرات، اور آسمان و زمین کے درمیان ایک خاص نظام کے تحت رہنے والے بادلوں کی طرف اشارہ کر کے انسانوں سے کہا ہے کہ ان چیزوں میں غور کرو، اگر تم عقل سلیم سے کام لوگے تو ان میں کی ہر چیز تمہیں زبانِ حال سے صاف صاف بتائے گی کہ وہ جو کچھ ہے اور جس حال میں ہے آپ سے آپ نہیں بنی ہے، بلکہ کسی حکیم و خبیر اور کامل القدرت ہستی نے اُسے ایسا بنا دیا ہے ——

پھر سورۂ انعام میں ارشاد ہے:—

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (الانعام - ع - ۱۲)

یقیناً اللہ ہے دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا، وہ زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہی ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو۔

قرآن کہتا ہے کہ تم دیکھتے ہو کسی اناج کے ایک دانے یا کسی پھل کی گٹھلی کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے، نہ اُس دانے یا گٹھلی میں کوئی شعور و احساس ہے، نہ زمین میں، اور نہ ان میں سے کسی میں ارادہ کی کوئی طاقت ہے، یہ سب چیزیں بالکل بے جان ہیں، لیکن چند دنوں کے بعد کسی نظر نہ آنے والی طاقت کا مخفی ہاتھ زمین کے

اندر ہی اندر اُس دانے اور گٹھلی کو پھاڑتا ہے، اور اُس میں سے نہایت نرم و نازک ایک ریشہ نکلتا ہے، پھر وہ اپنے اوپر والی مٹی کی تہوں کو چیرتا ہوا اوپر نمودار ہو جاتا ہے، تو ذرا سوچو کہ مٹی میں دفن شدہ اس بے جان دانے یا گٹھلی کو کس نے پھاڑا، کس نے اُس میں سے وہ جاندار کھوا نکالا، پھر سوت کے دھاگے جیسے نرم و نازک اس کھوے نے کس کی طاقت سے زمین کو چیر ڈالا؟ —— کیا تمہاری عقل میں یہ آسکتا ہے کہ اُس بے جان دانے، یا گٹھلی نے یہ سارے کام خود کر لئے، یا بغیر کسی کرنے والے کے آپ سے آپ یہ سب کچھ ہو گیا —— ہرگز نہیں! یہ سب ایک حکمت و قدرت والی ہستی نے کیا، اور وہ ہستی خدا کی ہستی ہے (ان اللہ فالق الحب والنوی)۔

اور اُسکی قدرت صرف بے جان دانے اور گٹھلی ہی کے ساتھ یہ عمل نہیں کرتی ہے، بلکہ اور بھی کتنی بے جان چیزوں سے وہ جاندار چیزیں پیدا کرتا ہے، اور اسی طرح کتنی ہی جاندار چیزوں سے بے جان چیزوں کو برآمد کرتا ہے —— اور تم یہ سب دیکھتے ہو، مثلاً بے جان انڈوں سے جاندار بچوں کا نکلنا بھی دیکھتے ہو اور جانداروں میں سے بے جان مادوں کے برآمد ہونے کا بھی مشاہدہ کرتے ہو —— خدا کی قدرت کی یہ کیسی کھلی کھلی نشانیاں تمہارے سامنے ہیں، پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیوں اور کدھر بہک رہے ہو ——

اور سورۂ رعد میں ارشاد ہے:۔

وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

(سورۂ رعد-ع-۱)

اور دیکھو! زمین میں مختلف قطعے ہیں جو باہم ملے ہوئے اور پاس پاس ہیں، اور انگوروں کے باغات ہیں، اور غلہ کے کھیت ہیں، اور کھجور کے درخت ہیں، انہیں کچھ ایسے ہیں جو جڑ سے دوسرے درخت کیساتھ جڑے ہوتے ہیں، اور کچھ ایسے جو اس طرح جڑے نہیں ہوتے، ان سب چیزوں کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے، اور پھر ان میں سے بعض کو بعض پر ہم مزہ میں فوقیت اور برتری دیتے ہیں —— اس سب میں بڑی نشانیاں ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لئے۔

قرآن کہتا ہے، زمین جس پر تم چلتے ہو اور جس سے تمہاری غذا پیدا ہوتی ہے، ذرا اُسکی اس حالت پر تو غور کرو، کہ اُسکے باہم ملے ہوئے قطعوں میں بسا اوقات کیسا کیسا فرق ہوتا ہے، ایک زیادہ پیداوار والا ہے دوسرا کم پیداوار والا، ایک مثلاً گیہوں کی کاشت کیلئے زیادہ مناسب ہے، اور دوسرا مثلاً کپاس یا ایکھ کی کاشت کیلئے، پھر کسی ٹکڑے میں انگور کی بیلیں ہیں اور اُن سے انگور اُترتے ہیں، اور اسی کے برابر والے دوسرے ٹکڑے میں مثلاً غلہ کا کھیت ہے جس میں سے غلہ پیدا ہوتا ہے، اور ساتھ ہی کے تیسرے ٹکڑے میں کھجور کے درخت ہیں اور وہ بھی سب یکساں نہیں، بلکہ مختلف طرح کے ہیں، الگ الگ اکہرے اکہرے بھی ہیں، اور ایک ہی جڑ سے نکلے ہوئے کئی کئی جڑے ہوئے بھی ہیں، پھر حال یہ ہے کہ سب کو ایک پانی ملتا ہے، ایک ہی ہُوا لگتی ہے، ایک ہی سورج کی شعاعیں سب پر پڑتی ہیں، اسکے باوجود اُنکی ظاہری شکل وصورت کے علاوہ اُنکے ذائقوں میں بھی کتنا فرق ہے —— کیا یہ فرق، یہ چھوٹائی بڑائی، اور یہ اُونچ نیچ آپ سے آپ ہے، کسی ارادہ اور قدرت کے عمل کے بغیر یہ یوں ہی خود بخود ہو رہا ہے؟ ہرگز نہیں! قطعاتِ زمین کے اس کیفیاتی فرق و اختلاف میں، اور اسکی پیداوار کی اس رنگارنگی میں عقل و بصیرت سے کام لینے والوں کیلئے کُھلی نشانیاں موجود ہیں جن سے وہ اصل حقیقت کے بارہ میں یقین حاصل کرسکتے ہیں اور جس کی حکمت وقدرت سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اُس کو جان سکتے ہیں —— اور سُورۂ عبس میں ارشاد ہے:-

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا	انسان ذرا اپنی غذا پر نظر ڈالے، اور اُس میں غور کرے،
الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ	ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں، پھر اُس زمین کی سطح کو
شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا	شق کرتے ہیں، پھر ہم اُس میں غلہ، انگور، ترکاریاں،
وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ	زیتون، کھجور کے درخت اور گنجان باغ اور میوے،
غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝ (سورۂ عبس)	اور جانوروں کیلئے چارہ پیدا کرتے ہیں۔

پس ہماری پیدا کی ہوئی اِن غذاؤں کو استعمال کرنیوالے انسان کو چاہئے کہ وہ سوچے کہ یہ غلہ جس سے تیار کی ہوئی روٹی میں کھاتا ہوں، اور یہ ترکاریاں، اور یہ طرح طرح کے میوے، اور یہ پھل، اور ہمارے جانوروں کے کام آنے والے یہ چارے، یہ سب چیزیں کہاں سے آتی ہیں اور کون ان کو پیدا کرتا ہے، جس پانی سے یہ سب چیزیں پیدا ہوتی ہیں

وہ کون برساتا ہے، اور پھر کس کے حکم اور کس کی قدرت سے زمین کے اندر دبے ہوئے دانوں، یا گٹھلیوں سے ان چیزوں کے پودے اُگتے ہیں، اور بالکل ابتدا میں زمین میں سے اِن پودوں کے نکلنے کے لئے کون سطح زمین کو ان کے واسطے چیر دیتا ہے ــــــ تو انسان اگر حقیقت کا طالب بنکر اپنی غذا ہی پر غور کرے گا تو وہ حقیقت کو پالے گا، اور غذا کے خالق کا، اور اُس کی قدرت و حکمت کا اس کو علم حاصل ہو جائے گا ــــــ اور سُورۂ نحل میں ارشاد ہی:-

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِّمَّا فِي بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ (سُورۂ نحل ع-۹)

اور تمہارے لئے تمہارے مویشیوں میں بھی غور و عبرت کا سامان ہی، ہم تم کو اُنکے پیٹ میں سے خون اور غلیظ فضلہ کے درمیان سے پاک صاف دُودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کیلئے بڑا خوشگوار ہوتا ہی۔

قرآن کہتا ہے کہ جن مویشیوں کا تم دُودھ پیتے ہو ذرا اُن ہی میں تم غور کرو، اُنکے پیٹ میں خون کی نالیاں ہیں، غلیظ فضلہ کے رہنے کی جگہ اور اُسکے راستے ہیں، اور کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا کہ ان مویشیوں کے جسم میں سُرخ ناپاک خون اور بدبو دار غلیظ فضلہ کی کافی مقدار بھری نہ رہتی ہو، لیکن ان مویشیوں کے جسم کے جن حصّوں میں خون اور غلاظت بھری رہتی ہی، اُسی کے قریب سے لطیف اور صاف دُودھ نکلتا ہے، جس میں نہ خون کے رنگ کا کوئی شائبہ ہوتا ہے، اور نہ غلیظ فضلہ کی بدبو کا کوئی اثر، وہ پینے والوں کے لئے کیسا خوشگوار، خوش ذائقہ، اور نفیس مشروب ہے، تم خود اس کو جانتے ہو! ــــــ تو ذرا سوچو، کہ یہ کس کی کاریگری ہی، کیا جس گائے یا بھینس میں سے یہ دُودھ نکلتا ہے، یہ اس کا فعل ہے؟ کیا کسی انسانی عقل نے دُودھ کی یہ عجیب و غریب زندہ مشین بنائی ہی ــ نہیں ہرگز نہیں! یہ صرف اُس حکیم و خبیر ہستی کی قدرت کا کرشمہ ہے، جس نے اس ساری دنیا کو اور تم کو بھی پیدا کیا ہے۔

اور ایک موقع پر سوالیہ انداز میں "خدا کی ہستی" ہی کے متعلق نہایت مختصر لفظوں میں کتنی بلیغ بات کہی گئی ہے، ارشاد ہے:-

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (سُورۂ ابراھیم ع-۲)

کیا تمہیں اُس اللہ کی ہستی میں شک ہے جو تمام آسمان و زمین (اور اُنکے اندر کی ساری کائنات) کا بنانے والا ہے۔

اس مختصر سے سوالیہ جملہ کے ذریعہ قرآن پاک نے انسانوں کے غور و فکر کیلئے اُنکے سامنے زمین و آسمان کی ساری دنیا رکھ دی ہیں ـــــ آنکھوں والا انسان آسمان کو دیکھتا ہے، چاند سورج ستاروں کو دیکھتا ہے، اُنکی روشنی اور اُنکی گرمی یا خنکی کو دیکھتا ہے، زمین کو اپنے نیچے پاتا ہے، اس میں باغات دیکھتا ہے، کھیتیاں دیکھتا ہے، اس سے پیدا ہونیوالا غلہ اور میوے پھل کھاتا ہے، اُسکے خوش رنگ پھول دیکھتا ہے، اور اُن کی خوشبو سونگھتا ہے، اُس سے پیدا ہونے والی بے شمار چیزوں کو استعمال کرتا ہے، اور اُن کے عجیب و غریب خواص اور منافع سے فائدہ اُٹھاتا ہے ـــــ پھر جبتک کہ اس کی عقل بالکل مسخ نہ ہو جائے وہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ سب چیزیں خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے ایسی بن گئی ہیں، وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا کہ کسی فلسفی یا صناع انسان کی فلسفہ دانی یا کاریگری کے یہ سب کرشمے ہیں، اُس کی سلیم عقل و بصیرت اِسکے سوا کسی توجیہ کو قبول ہی نہیں کر سکتی، کہ یہ سب کسی حکیم و خبیر ہستی کی قدرت اور صنعت کا کرشمہ ہے۔

اور سورۂ ذاریات میں ارشاد ہے:۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ	اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں
وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿﴾	موجود ہیں، اور خود تمہارے اندر میں موجود ہیں، پھر کیا
(ذاریت ـ ع ـ ۱)	تم کو دکھلائی نہیں دیتا! ـ

یہاں انسانوں سے کہا گیا ہے، کہ زمین و آسمان میں ہماری قدرت کی جو نشانیاں ہیں انکے علاوہ خود تمہارے اندر ہماری نشانیاں موجود ہیں، تم اگر اپنی فطری بصیرت سے کام لو، تو خود اپنے وجود اور اپنے نظام زندگی میں غور کر کے یقین حاصل کر سکتے ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان اگر صرف اپنے وجود، اپنے اعضاء، اور اپنے نظام زندگی ہی پر غور کرے تو فاطر ہستی کے بارہ میں اُسے ہرگز کوئی شک شبہ نہ رہے، وہ اپنی ابتداء کو سوچے، رحم مادر میں میری یہ صورت کس نے بنائی؟ میرے قالب میں یہ رُوح کہاں سے آئی؟ میری زندگی کے یہ سامان کس نے پیدا کئے؟ میری آنکھ میں روشنی کس نے ڈالی؟ میرے کان کے پردوں میں آوازیں سُننے کی قابلیت کس نے رکھدی؟ میری ناک کے غدودوں کو خوشبو اور بدبو کا یہ احساس کس نے دیا؟ میری زبان اور میرے تالو میں یہ چٹخارہ اور ذائقہ

کس نے رکھدیا جس سے کھانے پینے کے سارے لُطف ہیں؟ ــــ اور مجھے یہ گویائی کی قوت کس نے دی؟ ــــ کیا میرے ساتھ یہ مہربانیاں میری ماں نے کیں، میرے باپ نے کیں؟ کیا میرے ان کاموں کے لئے کسی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی گئیں؟ کیا میں نے خود اپنے آپ کو ایسا بنالیا؟ ــــ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے، اور یہ سوچنا تو اور بھی زیادہ غلط ہوگا کہ میں اپنے، یا کسی اور کے ارادہ کے بغیر ہی آپ سے آپ ایسا بن گیا ــــ بس حقیقت اِسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بڑی حکیم و خبیر اور بڑی کامل القدرت ہستی نے مجھے پیدا کیا ہے، اور یہ سب مہربانیاں میرے ساتھ اُسی نے، اور صرف اُسی نے کی ہیں۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

"قصص القرآن"

قرآن پاک میں انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات، انکی امتوں اور مختلف قوموں اور شخصیتوں کے جو قصص و واقعات مذکور ہیں، اِس کتاب میں اُنھیں بڑی تفصیل اور تحقیق کیساتھ پیش کیا گیا ہے ــ بلا شبہ یہ کتاب ایک مذہبی اور تاریخی شاہکار ہے۔ جلد اوّل :- حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک (۵۳۶ صفحات) قیمت :- ۶ ر جلد دوم :- حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک کے واقعات قیمت :- ۳ ر جلد سوم :- انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی تمام قصص قرآن کا بیان۔ قیمت :- ۸ ر جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات اور متعلقہ واقعات۔ قیمت :- ۶ ر

"لغات القرآن"

اُردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح کی گئی ہے، اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہے ــــ اعلیٰ درجہ کی تحقیق اور جامعیت کے علاوہ اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ عوام و خواص بھی اس سے اپنی اپنی سطح کے مطابق فائدہ حاصل کرسکتے ہیں ــــ ابھی صرف تین جلدیں تیار ہوئی ہیں، ہر جلد میں (سوا تین سو) سے زیادہ صفحات ہیں۔ قیمت :- فی جلد للعہ ر

ملنے کا پتہ :-

کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معارف الاحادیث

دوزخ اور اس کا عذاب:-

جس طرح جنت کے متعلق قرآن پاک کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اعلیٰ درجہ کی ایسی لذتیں اور راحتیں ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی لذتوں اور راحتوں کو ان سے کوئی نسبت نہیں، اور پھر وہ سب ابدی اور غیر فانی ہیں اسی طرح دوزخ کے متعلق قرآن و حدیث میں جو کچھ بتلایا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایسی تکلیفیں اور ایسے دُکھ ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے دُکھوں اور بڑی سے بڑی تکلیفوں کو اُن سے کوئی نسبت نہیں۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے الفاظ سے جنت کے عیش و راحت اور دوزخ کے دُکھ اور عذاب کا جو تصور اور جو نقشہ ہمارے ذہنوں میں قائم ہوتا ہے وہ بھی اصل حقیقت سے بہت ناقص اور کمتر ہے، اور یہ اس لیے کہ ہماری زبان کے سارے الفاظ ہماری اسی دنیا کی چیزوں کے لیے وضع کیے گئے ہیں، مثلاً سیب یا انگور کے لفظوں سے ہمارا ذہن بس ان ہی چیزوں کی طرف جا سکتا ہے جن کو ہم دیکھتے اور چکھتے ہیں جنت کے ان سیبوں اور انگوروں کی اصل حقیقت اور کیفیت کو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں جو اپنی خوبیوں میں یہاں کے سیبوں اور انگوروں سے ہزاروں درجہ زیادہ ترقی یافتہ ہوں گے اور جن کا کوئی نمونہ ہم نے یہاں نہیں دیکھا، اسی طرح مثلاً سانپ اور بچھو سے ہمارا ذہن اسی قسم کے سانپوں اور بچھوؤں کی طرف

جا سکتا ہے جو ہم نے اس دنیا میں دیکھے ہیں، دوزخ کے اُن سانپوں بچھوؤں کا پورا نقشہ ہمارے ذہنوں میں کیسے آ سکتا ہو جو اپنی جسامت اور خوفناکی اور زہریلے پن میں یہاں کے ان سانپوں اور بچھوؤں سے ہزاروں درجہ بڑھے ہوئے ہوں گے، اور کبھی ہم نے ان کی تصویر تک نہیں دیکھی ہو۔

بہر حال قرآن و حدیث کے الفاظ سے بھی جنت و دوزخ کی چیزوں کی اصل کیفیت اور اصل حقیقت کو ہم یہاں پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے بس وہاں پہونچ کر ہی معلوم ہوگا کہ جنت کے عیش و راحت کے بارے میں جو کچھ ہم نے جانا اور سمجھا تھا ہمارا وہ علم بہت ہی ناقص تھا۔ اور جنت میں تو اس سے ہزاروں درجہ زیادہ عیش و راحت ہے، اور دوزخ کے دکھ اور عذاب کے بارے میں جو کچھ ہم نے سمجھا تھا اصل حقیقت کے مقابلہ میں وہ بھی بہت ہی ناقص تھا اور یہاں تو ہمارے سمجھے ہوئے سے ہزاروں گنا زیادہ دُکھ اور عذاب ہے۔

اور جیسا کہ اس سے پہلے جنت کے بیان میں بتلایا جا چکا ہے دوزخ اور جنت کے متعلق جو کچھ قرآن و حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے اُس کا یہ مقصد ہے ہی نہیں کہ جو کچھ وہاں پیش آنے والا ہے اس کو ہم یہاں پوری طرح سمجھ لیں اور جان لیں اور وہاں کے حالات کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے آجائے بلکہ اس بیان کا اصل مقصد تبشیر و انذار ہو یعنی جنت کا شوق اور دوزخ کا خوف دلا کر اللہ کی رضا والی اور دوزخ سے بچا کر جنت میں پہونچانے والی زندگی پر اللہ کے بندوں کو آمادہ کرنا اور اس مقصد کے لیے جنت و دوزخ سے متعلق قرآن و حدیث کا یہ بیان بالکل کافی ہے، پس اس سلسلہ کی آیات و احادیث پر غور کرتے وقت ہمیں اسی خاص مقصد کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے —— اب چند حدیثیں دوزخ اور اس کے عذاب کے متعلق سُنیے!

(۱۰۹) عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال نارکم جزءٌ من سبعين جزءً من نار جهنم قيل يا رسول الله ان كانت لكافية قال فضلت عليهن بتسعة وستين جزءً

کلھن مثل حرّھا		(متفق علیہ۔ واللفظ للبخاری)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری اس دنیا کی آگ دوزخ کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہو۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ یہی (دنیا کی آگ) کافی تھی؟ آپ نے فرمایا کہ دوزخ کی آگ دنیا کی آگ کے مقابلہ میں انہتر درجہ بڑھادی گئی ہو اور ہر درجہ کی حرارت آتش دنیا کی حرارت کے برابر ہے۔" (صحیح بخاری و مسلم)

(تشریح) اس دنیا کی آگ کی قسموں میں بھی درجۂ حرارت میں بعض بعض سے بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ مثلاً لکڑی کی آگ میں گھاس پھونس کی آگ سے زیادہ گرمی ہوتی ہے اور مثلاً پتھر کے کوئلہ کی آگ میں لکڑی کی آگ کے مقابلہ میں بہت زیادہ حرارت ہوتی ہے اور بعض بموں سے جو آگ پیدا ہوتی ہے وہ درجۂ حرارت میں ان سب سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوتی ہو اور اب تو آلات سے یہ معلوم کرنا بھی آسان ہوگیا ہو۔ کہ ایک آگ دوسری آگ کے مقابلہ میں کتنے درجہ کم یا زیادہ گرم ہے پس اب حدیث کے اس مضمون کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا کہ "دوزخ کی آگ دنیا کی آگ کے مقابلہ میں ستر درجہ زیادہ حرارت اپنے اندر رکھتی ہو۔"

اور جیسا کہ پہلے بھی کئی بار شرح حدیث کے اسی سلسلہ میں تبلایا گیا ہو کہ عربی زبان میں ایسے موقعوں پر ستر کا عدد کسی چیز کی صرف زیادتی اور کثرت ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہو پس ہوسکتا ہو کہ اس حدیث میں بھی یہ عدد اسی محاورہ کے مطابق استعمال کیا گیا ہو، اس صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ دوزخ کی آگ اپنی گرمی میں اور جلانے کی صفت میں دنیا کی آگ سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہو۔ واللہ اعلم۔

آگے حدیث میں ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دوزخ کی آگ کا یہ حال بیان فرمایا تو کسی صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ دنیا کی آگ کی حرارت ہی کافی تھی اس پر آپ نے اور زیادہ واضح لفظوں میں پھر پہلے ہی مضمون کو دہرا دیا اس کے علاوہ کوئی اور جواب نہیں دیا۔ غالباً اس طریق جواب سے آپ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ ہمیں اللہ کے جلال اور قہر سے ڈرنا اور آتش دوزخ سے بچنے کی فکر کرنا چاہیے اور اللہ کے افعال اور اس کے فیصلوں کے بارہ

میں ایسے سوالات نہیں کرنے چاہئیں جو کچھ اُس نے کیا ہو اور جو کچھ وہ کرے گا وہی ٹھیک ہو۔

(۱۱۰) عن النعمان بن بشیر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انّ اھون اھل النار عذاباً من لہ نعلان وشراکان من نار فیغلی منہما دماغہ کما یغلی المرجل ما یریٰ ان احداً اشد منہ عذاباً وانہ لاھونھم عذاباً (متفق علیہ)

(ترجمہ) نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا وہ شخص ہوگا جس کی چپلیں اور ان چپلوں کے تسمے آگ کے ہوں گے ان کی گرمی سے اس کا دماغ اس طرح کھولے گا اور جوش مارے گا جس طرح چولھے پر دیگچی کھولتی ہو۔ اور اس میں جوش آتا ہو۔ وہ نہیں خیال کرے گا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ سخت عذاب میں بھی ہو (یعنی وہ اپنے ہی کو سب سے زیادہ سخت عذاب میں سمجھے گا) حالانکہ وہ دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

(۱۱۱) عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یؤتیٰ بانعم اھل الدنیا من اھل النار یوم القیٰمۃ فیصبغ فی النار صبغۃ ثم یقال یا ابن اٰدم ھل رایت خیراً قط ھل مرّ بک نعیم قط؟ فیقول لا واللّٰہ یا ربّ! ویؤتیٰ باشدّ الناس بؤساً فی الدّنیا من اھل الجنّۃ فیصبغ صبغۃً فی الجنّۃ فیقال لہ یا ابن اٰدم ھل رایت بؤساً قط وھل مرّ بک شدۃ قط؟ فیقول لا واللّٰہ یا ربّ ما مرّ بی بؤس قط ولا رایت شدۃً قط (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت انس سے مروی ہو کہ قیامت کے دن اہل دوزخ میں سے (یعنی ان لوگوں میں سے جو اپنے کفر و شرک کی وجہ سے یا فسق و فجور کی وجہ سے دوزخ میں جانے والے ہوں گے) ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جس نے اپنی دنیا کی زندگی نہایت عیش و آرام کے

ساتھ گزاری ہوگی اور پھر اس کو دوزخ کی آگ میں ایک غوطہ دلایا جائے گا (یعنی جس طرح کپڑے کو رنگتے وقت رنگ میں ڈال کر اور بس ایک ڈوب دے کر نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح اس شخص کو دوزخ کی آگ میں ڈال کر فوراً نکال لیا جائے گا، پھر اس سے کہا جائے گا کہ اے آدم کے فرزند کیا تو نے کبھی خیریت اور اچھی حالت بھی دیکھی ہو اور کیا کبھی عیش و آرام کا کوئی دور تجھ پر گزرا ہو؟ وہ کہے گا کبھی نہیں قسم خدا کی اے پروردگار! — اور ایک شخص اہلِ جنت میں سے (یعنی ان خوش نصیب بندوں میں سے جو اپنی ایمان والی زندگی کی وجہ سے جنت کے مستحق ہوں گے) ایسا لایا جائے گا جسکی زندگی دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف میں اور دکھ میں گزری ہوگی اور اس کو ایک غوطہ جنت میں دیا جائے گا (یعنی جنت کی فضاؤں اور ہواؤں میں پہونچا کر فوراً نکال لیا جائے گا) اور اس سے کہا جائے گا کہ اے آدم کے فرزند کیا کبھی تو نے کوئی دُکھ دیکھا ہو اور کیا تجھ پر کوئی دور شدت اور تکلیف کا گزرا ہو۔ پس وہ کہے گا نہیں، خدا کی قسم اے میرے پروردگار مجھ پر کبھی کوئی تکلیف نہیں گزری اور میں نے کبھی کسی تکلیف کا منھ نہیں دیکھا! (مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ دوزخ کا عذاب اتنا سخت ہو کہ اُس کا ایک لمحہ عمر بھر کے عیش و راحت کو بھلا دے گا اور جنت میں وہ راحت اور وہ عیش ہو کہ اس میں قدم رکھتے ہی آدمی عمر بھر کے سارے دکھ اور ساری کلفتیں بھول جائے گا۔

(۱۱۳) عن سمرۃ بن جندب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال منھم من تاخذہ النار الی کعبیہ ومنھم من تاخذہ النار الی رکبتیہ ومنھم من تاخذہ النار الی حجزتہ ومنھم من تاخذہ النار الی ترقوتہ۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) سمرۃ بن جندب سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخیوں میں سے بعض وہ ہوں گے کہ جن کو پکڑے گی آگ ان کے ٹخنوں تک اور بعض وہ ہوں گے کہ جن کو پکڑے گی آگ ان کے زانوؤں تک اور بعض وہ ہوں گے جن کو پکڑے گی

آگ ان کی کمر تک، اور بعض وہ ہوں گے جن کو پکڑے گی آگ ان کی ہنسلی تک۔
(مسلم)

(تشریح) حدیث کا مقصد یہ ہے کہ دوزخ میں سب ایک درجہ میں اور ایک ہی حال میں نہیں ہوں گے بلکہ جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے ان کے عذاب میں کمی بیشی ہوگی، مثلاً کچھ لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ آگ ان کے صرف ٹخنوں تک پہونچے گی اور کچھ لوگوں پر عذاب اس سے زیادہ ہوگا اور آگ ان کے زانوؤں تک پہونچے گی اور کچھ لوگوں پر اس سے بھی زیادہ ہوگا اور آگ ان کی کمر تک پہونچا کرے گی اور کچھ لوگ ان سے بھی سخت تر اور بدتر حالت میں ہوں گے اور آگ ان کی گردن تک پہونچے گی۔ اللّٰھم احفظنا!

(۱۱۶) عن عبد اللہ بن الحارث بن جزء قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی النار حیات کامثال البخت تلسع احداھن اللسعۃ فیجد حموتھا اربعین خریفاً وان فی النار عقارب کامثال البغال الموکفۃ تلسع احداھن اللسعۃ فیجد حموتھا اربعین خریفاً (رواہ احمد)

(ترجمہ) عبد اللہ بن الحارث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جہنم میں سانپ ہیں جو اپنی جسامت میں بُختی اونٹوں کے برابر ہیں (جو جثہ میں عام اونٹوں سے بہت بڑے ہوتے ہیں) اور وہ اس قدر زہریلے ہیں کہ ان میں کا کوئی سانپ جب دوزخی کو ایک دفعہ ڈسے گا تو چالیس سال کی مدت تک وہ اس کے زہر کا اثر پائے گا (اور تڑپے گا) اور اسی طرح دوزخ میں بچھو ہیں جو (اپنی جسامت میں) پالان بندھے خچروں کی مانند ہیں (وہ بھی ایسے ہی زہریلے ہیں کہ) ان میں سے کوئی کسی دوزخی کو ایک دفعہ ڈنک مارے گا تو چالیس سال تک وہ اس کے زہر کی تکلیف پاوے گا۔ (احمد)

(۱۱۷) عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو ان دلواً من غساق یھراق فی الدنیا لانتن اھل الدنیا (رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ غساق (یعنی وہ سڑی ہوئی پیپ جو جہنمیوں کے زخموں سے نکلے گی اور جسکے متعلق قرآن مجید میں تبلایا گیا ہو کہ وہی انتہائی بھوک میں ان کی غذا ہوگی وہ اسقدر بدبودار ہوگی کہ) اگر اس کا ایک ڈول اس دنیا میں بہا دیا جائے تو ساری دنیا (اسکی سڑاہند سے) بدبودار ہو جائے۔ (ترمذی)

(۱۱۵) عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرء ھٰذہ الآیۃ "اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ہ قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم لو اَنَّ قطرۃً من الزقوم قُطِرَتْ فی دار الدنیا لَاَفْسَدَتْ علی اھل الارض معایشھم فکیف بِمَنْ یکونُ طعامہ (رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مسلمون — اللہ سے ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہو اور فیصلہ کرلو کہ ہرگز نہ مروگے مگر اس حال میں کہ تم مسلم (اللہ کے فرمانبردار بندے) ہوگے۔

(اور اللہ سے اور اسکے عذاب سے ڈرنے کے سلسلہ میں) آپ نے بیان فرمایا کہ زقوم (جسکے متعلق قرآن مجید میں ہو کہ وہ جہنم میں پیدا ہونے والا ایک درخت ہو اور وہ دوزخیوں کی خوراک بنے گا) اگر اس کا ایک قطرہ اس دنیا میں ٹپک جائے تو زمین پر بسنے والوں کے سارے سامان زندگی کو خراب کردے، پس کیا گزرے گی اس شخص پر جس کا کھانا وہی زقوم ہوگا۔ (ترمذی)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ زقوم اس قدر گندی اور زہریلی چیز ہے کہ اگر اس کا ایک قطرہ ہماری اس دنیا میں ٹپک جائے تو یہاں کی تمام چیزیں اس کی بدبو اور گندگی اور زہریلے پن سے متاثر ہو جائیں اور ہمارے کھانے پینے کی ساری چیزیں خراب ہو جائیں۔ پس سوچنے کی بات ہو کہ یہ زقوم جسکو کھانا پڑے گا اس پر کیا گزرے گی۔

(۱۱۶) عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یا ایھا الناس ابکوا فان لم تستطیعوا فتباکوا فان اھل النار یبکون فی النار حتی تسیل دموعھم فی وجوھھم کانھا جداول حتی تنقطع الدموع فتسیل الدماء فتقرح العیون فلو ان سفناً ازجیت فیھا لجرت (رواہ البغوی فی شرح السنہ)

(ترجمہ) حضرت انس سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے ایک خطاب میں) فرمایا کہ اے لوگو (اللہ اور اس کے عذاب کے خوف سے) خوب رؤو۔ اور اگر تم یہ نہ کر سکو یعنی اگر حقیقی گریہ کی کیفیت تم پر طاری نہ ہو (کیونکہ وہ ایسی اختیاری چیز نہیں ہو کہ آدمی جب چاہے اسکو اپنے اندر پیدا کر لے) تو پھر (اللہ کے قہر اور اسکے عذاب کا خیال کر کے) تکلف سے رؤو اور رونے کی شکل بناؤ کیونکہ دوزخی دوزخ میں اتنا روئیں گے اتنا روئیں گے کہ ان کے چہروں پر ان کے آنسو ایسے بہیں گے کہ گویا وہ بہتی ہوئی نالیاں ہیں یہانتک کہ آنسو ختم ہو جائیں گے اور پھر (آنسوؤں کی جگہ) خون بہیں گے اور پھر (اس خون بہنے سے) آنکھوں میں زخم پڑ جائیں گے (اور پھر ان زخموں سے اور زیادہ خون جاری ہوگا اور ان دوزخیوں کے ان آنسوؤں اور خونوں کی مجموعی مقدار اتنی ہوگی کہ) اگر کشتیاں اس میں چلائی جائیں تو خوب چلیں۔ (شرح السنہ)

(تشریح) حدیث کا مقصد یہ ہو کہ دوزخ میں اتنا دکھ اور ایسا عذاب ہوگا کہ آنکھیں آنسوؤں کا ذخیرہ ختم کر کے خون روئیں گی اور اس مسلسل رونے سے ان میں زخم پڑ جائیں گے۔ پس وہاں کے اس دکھ اور عذاب سے اور آنسوؤں کا اور خون کا دریا بہانے والے اس رونے سے بچنے کے لیے آدمیوں کو چاہیے کہ وہ یہاں اپنے اندر خدا کا خوف پیدا کریں اور روئیں۔ دوسری ایک حدیث میں ہو کہ لَا یَلِجُ النَّارَ مَنْ بَکٰی مِنْ خَشْیَۃِ اللہِ حَتّٰی یَعُوْدَ اللَّبَنُ فِی الضَّرْعِ[۱] (یعنی جو یہاں اللہ کے خوف سے روئے گا وہ ہرگز دوزخ میں نہیں جائے گا) ــــــ بہرحال اللہ کے خوف سے رونا اور اگر رونا نہ آئے تو رونی صورت ہی بنانا اللہ کے رحم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا خاص ذریعہ ہو اور دوزخ کے عذاب سے بچانے والے خاص اعمال میں سے ہے۔

[۱] رواہ الترمذی والنسائی عن ابی ہریرہ۔ مشکوٰۃ کتاب الجہاد۔

ایک سو چالیس برس پہلے

ایک مردِ حق آگاہ کی مجلس میں

(نسیم احمد فریدی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

شعبان کا چاند طلوع ہوا تو فرمایا:۔

"جب شعبان المعظم کا چاند ہوتا ہے تو گویا رمضان المبارک کے برکات کا ہلال طلوع ہوتا ہے اور جب شعبان کی چودھویں کا چاند ہوتا ہے تو گویا وہ "ہلال برکاتِ رمضان" بدرِ کامل بن جاتا ہے، اور پھر بدر کامل بن کر سورج کی طرح چمکنے لگتا ہے۔"

فرمایا ——— کہ:۔

"فقر سے مُراد وہ چند اعمال ہیں جن کی مداومت سالک کو ضروری ہے، فقر علمِ سلوک اور علمِ مراقبات کا نام نہیں ہے جس میں سیکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں، فقر تو ایک خزانہ ہے جس کو سینے میں رکھنا چاہیے، نہ کہ سفینے میں۔"

ایک شخص نے شدتِ گرما کی شکایت کی، حضرتؒ نے فرمایا:۔

"فعلِ محبوب کی شکایت نہیں ہونی چاہیے، مصیبت میں زیادہ تر لذت حاصل کرنا چاہیے میں دردے آہِ سرد نہیں کھینچتا، رنج و ملال سے شربتِ زلال پیتا ہوں۔" ۶

"کہ ہرچہ ساقیِ ما ریخت عین الطافست"

ایک شخص کچھ رقم خدمتِ اقدس میں لایا اور عرض کیا، کہ اس کو فقراء خانقاہ پر تقسیم فرما دیجئے۔ حضرتؒ نے فرمایا:۔

"ایک ایک ٹنکہ ہر ایک کو تقسیم ہوگا، اُس وقت خانقاہ میں ایک سو دس صوفی وہ تھے جو اپنے وطن چھوڑ کر طلبِ حق میں یہاں مقیم تھے ایک ایک ٹنکہ سب کو تقسیم کر کے فرمایا:۔ میں بھی انھیں فقراء کے زمرے میں ہوں، ایک ٹنکہ میں بھی اپنا حصہ لئے لیتا ہوں"

بعدازیں یہ آیت پڑھی:۔ "واللہ الغنی وانتم الفقراء"

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کا وہ مکتوب پڑھا گیا جس میں انھوں نے مذہبِ ہنود کی اصل بیان فرمائی ہے اور اُن کی چار کتابوں کی تحقیق پیش کی ہے، اُس مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ اُن چار کتابوں میں سے ایک میں معارف ہیں، اُس پر حضرت والاؒ نے فرمایا، کہ:۔

"کوئی بات پیر و مرشد کی بات پر کہنا کمالِ بے ادبی ہے، لیکن میرے نزدیک ان کتابوں میں معارف ثابت نہیں ہیں"

فرمایا:۔

"حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ دو سال کی مدت میں "لطیفۂ قلبی" طے کراتے تھے، اور اُس کے بعد ایک سال میں "لطیفۂ نفس"۔۔۔۔۔ بعدہٗ دو سال میں تا "بکمالات" پہونچاتے تھے، اور پھر پانچ سال میں جو نصف سلوک رہ جاتا تھا طے کراتے تھے"

فرمایا:۔

"تمام مسافت ہر مقام" دس سال میں طے ہوتی ہے، اگرچہ "رنگ ہر مقام" ایامِ قلیلہ میں حاصل ہو جائے"۔۔۔۔۔ اسی ضمن میں فرمایا، کہ:۔ "حضرت شیخ محمد عابدؒ نے چند اشخاص کو جلدی سلوک طے کرا دیا تھا، (اُس کا یہ نتیجہ ہوا) کہ جب اُسی زمانے میں

نادر شاہ ابدالی کا قضیہ نمودار ہوا، اُس فتنے میں اُن لوگوں کا باطن مکدر ہو گیا، گویا نسبت سے خالی ہو گئے (فتنے کے اثرات بوجہ خامی کے ہٹا نہ سکے، اُس سے متاثر ہو گئے) اسی وجہ سے حضرت پیر و مرشد تا وقتیکہ سالک کو ایک "مقام" میں "طول و عرض" پیدا نہ ہو جائے دوسرے مقام کی توجہ نہیں فرماتے تھے، اور "قطع سلوک" کی مدت دس سال مقرر فرمائی تھی" تلک عشرۃ کاملۃ۔

درسِ مکتوبات ہو رہا تھا، وہ مکتوب پڑھا گیا جو صاحبزادگانِ کبار یعنی خواجہ خسرو، و خواجہ کلاں کو بیانِ عقائد میں لکھا گیا ہے، اس مکتوب کے متعلق فرمایا، کہ:۔

"یہ علم عقائد میں فائدہ کثیر رکھتا ہے، اس کو علیٰحدہ لکھ لکھ کر لوگوں کو دینا چاہئے"

فرمایا:۔

"حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر نے اپنی زبان میں بھی ایک ذکر مقرر کیا تھا"

پھر فرمایا ـــــ کہ:۔

"ہر ایک شخص اپنی اپنی زبان میں اپنے محبوب کی یاد کرتا ہے۔ ہندی اپنی اصطلاح میں، سندھی اپنی اصطلاح میں" پھر یہ شعر پڑھا:۔

مرغانِ چمن بہر صباحے ۔۔۔ خوانند ترا با صطلاحے

فرمایا ـــــ کہ:۔

"وہ معارف جو حضرت مجدد الف ثانی پر مکشوف ہوئے، تین قسم کے ہیں:ـــــ ایک قسم وہ ہے کہ کسی سے نہیں فرمائے اور سلک تحریر و تقریر میں نہیں لائے ـــــ ایک قسم وہ ہے کہ اولاد امجاد سے بیان فرمائے ـــــ اور ـــــ ایک قسم وہ ہے کہ علی العموم اپنے متوسلین سے بیان فرمائے، اور تحریر و تسطیر میں لائے ہیں ـــــ چنانچہ

تین جلدیں مکتوبات کی، اور سات رسائل اسی قسم پر مشتمل ہیں۔"

فرمایا:۔

"اسرار "توحید وجودی" ہوں، یا "معارف" "توحید شہودی" یا "مقاماتِ دیگر"، جو کچھ اللہ تعالیٰ عنایت فرمادیں نعمتِ عظمیٰ ہے۔" پھر یہ شعر پڑھا:۔

جانِ من و جانانِ من، دینِ من و ایمانِ من　　سلطانِ من سلطانِ من چیزے بدہ درویش را

ایک دن شدت کی گرمی تھی، فرمایا ——— کہ:۔

"پنکھا جھلو" ——— بعدہٗ فرمایا:۔ "جو شخص مخدوم بننا چاہے اپنے پیر و مرشد کی خدمت کرے۔" ع "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد"

فرمایا:۔

"خدمت مرتبۂ ادنیٰ سے مرتبۂ اعلیٰ تک پہونچاتی ہے، اور ادب سطحِ خاک سے اُٹھا کر فلک الافلاک پر لیجاتا ہے۔"

فرمایا:۔

"ذکر کرنا چاہئے، اور اس میں کوشش کرنی چاہئے، راستہ بغیر چلے طے نہیں ہوسکتا۔"

فرمایا:۔

"جمیع کمالات ظاہری و باطنی بطریقِ اجمال جناب سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حاصل تھے لیکن جمیع کمالات کی تفصیل کا ظہور زمانۂ خاص اور اشخاص خاص پر موقوف تھا، چنانچہ دیکھو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے:۔ "اعطیت مفاتیح کنوز الارض" (مجھے تمام خزانوں کی کنجیاں دی گئیں) ——— (اس کا ظہور بعد زمانۂ رسالت مآب ہوا)

آنحضرت کے زمانے میں ممالک فتح نہیں ہوئے، عہد خلفاء میں اکثر مقامات فتح ہوئے اور بعد از صحابہؓ سلاطین نامدار نے اکثر مقامات فتح کئے۔" (اسکے بعد مفصل طریقے پر اس مضمون کو مع امثلہ کے بیان فرمایا)۔

اس بات کا ذکر آیا کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ سے استفادہ کیا ہے فرمایا:۔" یہ بات میرے نزدیک ثابت نہیں ہے۔" (پھر حضرت مجددؒ کی تحریر سے اپنے دعوی کا ثبوت پیش کیا)۔

رمضان میں تراویح کا ذکر آیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بیسؓ رکعت ثابت ہیں یا نہیں۔ فرمایا:۔" عبداللہ بن براء المالکی نے بیسؓ رکعت کی روایت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ثابت کی ہے۔" بعد ازاں مشکوٰۃ شریف طلب کی، اسکے حاشیہ پر یہ بحث لکھی ہوئی تھی اسکی عبارت پڑھی۔

فرمایا:۔" اللہ کے وعدے میرا خزانہ ہیں۔"

فرمایا:۔" حیا کی چند اقسام ہیں۔"

۱۔ ایک شخص گناہ سے اسلئے پرہیز کرتا ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ سے جو کہ امور ستر و علانیہ کو دیکھ رہا ہے، حیا کرتا ہے۔

۲۔ ایک شخص معاصی سے پرہیز کرتا ہے اسلئے کہ ملائکہ کے دیکھنے سے اُس کو حیا آتی ہے۔

۳۔ ایک شخص گناہ سے بچتا ہے، اسلئے کہ فرشتے جناب سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے اعمال پیش کرتے ہیں۔

فرمایا:۔" حیا جس قسم کی بھی ہو، بہر حال شعبہ ہے ایمان کا۔"

محبت و عشق کا ذکر چھڑا، تو یہ شعر پڑھے :-

دارم دلے اما چہ دل صد گونہ حرماں در بغل
چشمے و خوں در آستیں صد اشک و طوفاں در بغل

روزِ قیامت ہر کسے در دست گیرد نامۂ — من نیز حاضر میشوم تصویرِ جاناں در بغل

مداراۃ اور مداہنۃ کا ذکر چھڑا، تو فرمایا :-

"مداراۃ دُنیا کو دین کے لئے صرف کرنا ہے، اور مداہنۃ دین کو دُنیا کے لئے برباد کر دینے کا نام ہے۔"

خواب میں حضور سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھنے کا ذکر ہوا۔ فرمایا :-

"جب کوئی شخص آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بصورتِ اصلی خواب میں دیکھے، شیطان کو اُس میں کوئی دخل نہیں ہوتا، یقیناً اُسنے حضورؐ ہی کو دیکھا ہے، لیکن جو کچھ آنحضرتؐ نے خواب میں ارشاد فرمایا ہو اُس کو "فرمودۂ حیات" پر پیش کرنا چاہئے اگر اُسکے مخالف ہے تو اُس سے پرہیز کرنا چاہئے، اسلئے کہ دخلِ شیطان خواب کے کلام میں ہو سکتا ہے، نہ کہ صورتِ مُبارک دیکھنے میں۔"

بعد ازاں ایک حکایت بیان فرمائی —— کہ :-

"ایک شخص نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں —— اِس مقام میں دیگ خزانہ مخفی ہے اُس کو نکال لے، اور اس خزانہ کا خمس میں نے تجھ کو معاف کیا —— جب وہ شخص بیدار ہوا، اُسی جگہ جہاں فرمایا تھا دیگ خزانہ کو پایا۔ اسنے قاضی سے معافیِ خمس کا مسئلہ پُوچھا —— قاضی نے کہا :- دیکھنا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حق ہے، لیکن خمس معاف نہیں ہے —— اسلئے کہ جو حکم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جمیع صحابہؓ کو بیداری میں اپنے جسم ظاہری کیساتھ دیا ہے

وہی جاری ہے۔ پس بعد وصال خواب میں جو حکم فرمائیں گے وہ بیداری والے حکم کا ناسخ نہیں ہوگا۔"

فیض طلب خاں نے خانقاہ کے خرچ کے لئے غلّہ بھیجا تھا، حضرت ناخوش ہوئے اور فرمایا:۔
"ہم اللہ کے وعدوں پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں، ہمیں امراء سے کیا سروکار۔"

۱۹ ؍ رمضان کو فرمایا ــــــ "رمضان المبارک میں فیض کثیر وارد ہوتا ہے، اس ماہ میں عبادت وطاعت میں بہت جدوجہد کرنا چاہئے۔ دو عشرے اس ماہ مبارک کے گذر چکے ہیں عشرۂ اخیرہ باقی ہے، مردمانِ خانقاہ کو چاہئے کہ اعتکاف کریں، کیونکہ حضور سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس عمل پر مداومت فرمائی ہے کبھی ترک نہیں فرمایا، ایک بار ترک ہوگیا تھا تو اُس کی قضا فرمائی ــــ جس کسی کو اعتکاف میسر نہ ہو وہ خلوت اختیار کرے۔"

۲۰ ؍ رمضان کو فرمایا ــــــ "آج کے دن صبح سے اکیسویں (۲۱) شب کے برکات ظاہر ہیں، احتمالِ شب قدر ہے" ــــ بعدازاں فرمایا، کہ: "اس آخری عشرۂ متبرکہ میں طاق راتوں کے اندر شبِ قدر ضرور ہوتی ہے ــــ کبھی کسی تاریخ میں، کبھی کسی میں ــــ اور اس عشرے کی تمام طاق راتیں اکیسویں (۲۱)، تئیسویں (۲۳)، پچیسویں (۲۵)، ستائیسویں (۲۷)، اُنتیسویں (۲۹) فیوض وبرکات سے بھرپور ہوتی ہیں ــــ اور جفت راتیں بھی طاق راتوں سے فیض حاصل کرلیتی ہیں، اور اپنی دونوں جانبوں سے برکات مانگ لیتی ہیں، اس طرح تمام عشرہ کی راتیں متبرک ہوتی ہیں، سب کا احیاء کرنا چاہئے۔"

۲۴ ؍ رمضان کو فرمایا ــــــ "شیخ الشیخ حضرت شیخ محمد عابدؒ کا معمول تھا کہ رمضان المبارک میں لائق حضرات کو تعلیم طریقہ کی اجازت مرحمت فرمایا کرتے تھے، میں نے بھی اپنا یہی معمول بنایا ہے، انشاء اللہ ۲۷ ؍ تاریخ کو چند اشخاص کو اجازت دوں گا" ــــ

بعدازاں فرمایا ـــــ "چند کلاہیں تیار کرلینی چاہئیں" ـــــ یہ بھی فرمایا، کہ:۔
"کوئی شخص قابلِ اجازت اُس وقت ہوتا ہے جبکہ اُسنے اپنے قلب کو آرزوؤں سے
صاف کرلیا ہو، اور اخلاقِ ذمیمہ سے نفس کا تزکیہ کرچکا ہو" لیکن چند قیود اور بھی ہیں:۔

۱۔ بازاری قسم کا آدمی نہ ہو۔

۲۔ تیجے چالیسویں میں نہ جائے۔

۳۔ اُمراء و مخالفانِ طریقہ سے ملاقات نہ کرے۔

۴۔ "مقاماتِ عشرۂ صوفیا" صبر و توکل وغیرہ ہیں ـــــ رکھتا ہو ـــــ خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا ہے، کہ ـــــ "قابلِ اجازت وہ شخص ہے کہ وہ اپنی "نسبت" میں اتنی تاثیر رکھتا ہو کہ پاس کے بیٹھنے والوں پر اُس کا اثر پڑے"

حضرت مولانا شاہ درگاہیؒ کا ذکر آیا ـــــ حضرتؒ نے فرمایا، کہ ـــــ اِن کے (اشارہ شاہ رؤف احمد رافت رامپوریؒ کی طرف) مُرشد تھے، میں رامپور گیا تھا لیکن اُن سے مُلاقات نہ ہوئی اُن کے مُرشد سے جو اولیاء حق میں سے تھے مُلاقات ہوئی، گرمی کا زمانہ تھا، میں اُنکی خدمت میں گیا مجھے تربوز عنایت فرمایا، میں نے عرض کیا کہ:۔ آپ کی خدمت میں گرمیِ محبت حاصل کرنے آیا ہوں مجھے حرارتِ محبت کی طلب ہے"

فرمایا ـــــ "کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا نام حق تعالیٰ سے مدد طلب کرنا ہے، کہ کھانا قوتِ شہوانی و نفسانی پیدا نہ کرے، بلکہ ایسی طاقت دے جو طاعت و عبادت میں صرف ہو"

فرمایا ـــــ "فقراء ہر لقمہ کے اوّل میں بسم اللہ کہتے ہیں، اور اُسکے آخر میں الحمد للہ"

فرمایا ـــــ "مجتمع ہو کر کھانا بہت برکت رکھتا ہے، لیکن یہ چاہیے کہ ہر ایک شخص ایک دوسرے کے ساتھ ایثار کرے، اور جو چیز اچھی ہو اُسکے متعلق یہ چاہیے کہ اس کو میرا ساتھی کھالے، یہ نہ کہ

خود بہتر چیز تناول کرے، یا زیادہ کھانے کی فکر کرے (اور ساتھی کا خیال نہ رکھے)۔"

اس کے بعد ایک (عبرت انگیز) حکایت سنائی، کہ ——— "ایک شخص نے ایک آدمی کو بغداد کے بازار میں دیکھا کہ دلالوں کے ساتھ دلالی کا پیشہ کر رہا ہے، اُس شخص نے کہا کہ تجھ کو تو میں نے فلاں شہر میں دیکھا ہے، تو تو عابد و زاہد شخص تھا کیا سبب ہوا کہ تو یہاں آیا اور پیشۂ دلالی میں مبتلا ہو گیا، اُس نے جواب دیا:- میں نے ایک دن مچھلی پکائی تھی اور یہ چاہا کہ اُس کا اچھا ٹکڑا خود کھالوں، اور باقی دوسروں کو دوں، بس اُس خیال کا یہ وبال ہے کہ میرا یہ حال ہے۔"

فرمایا ——— "کھانے پینے کے بعد یہ دُعا حدیث میں آئی ہے ——— "الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین۔" (تعریف ہے اللہ کی، جسنے ہمیں کھانا کھلایا، پانی پلایا، اور مسلمان بنایا) جیسا کہ مسند احمد، سنن ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے۔ اشارہ جعلنا من المسلمین سے اس طرف ہے کہ اسلام اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے، پس نعمتِ عظمیٰ پر حمد بطریق اولیٰ کرنی چاہیئے۔"

ایک روز یہ شعر پڑھ رہے تھے:- ؎

کار کن کار بگذر از گفتار   که بجز کار ہیچ ناید کار

فرمایا ——— "ایک دن مطالعۂ مکتوبات کرکے متوجہ ہوا "فوق الفوق" سے ایک فیض آیا، بعد ازاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے کلام (تصنیف) کا مطالعہ کیا "اسرارِ ملکوت" دل پر وارد ہوئے، بعد ازاں مطالعۂ احیاء العلوم کیا "فیضِ ملکوت" قلب میں آیا۔" فرمایا ——— "ایک روز بوعلی سینا کی کتاب کا مطالعہ ایک صفحے کے قریب کیا تھا، کہ ایک ظلمت قلب پر طاری ہوئی، فوراً میں نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اُس ظلمت کا ازالہ کیا۔"

بوقتِ خلافت عمامہ وخرقہ کا تذکرہ ہوا، تو فرمایا ——— "عمامہ کا دینا حدیث سے ثابت ہے، طبرانی کی روایت ہے:- "کان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لا یُولّی والیاً حتّٰی یعممہ ویرخی سد لہا من جانبہ الایمن نحو الاذن" ——— اسکے علاوہ روایاتِ ابن ابی شیبہ وابو یعلی الموصلی و بزار کو پیش فرمایا۔

مرتب ملفوظات فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے عرض کیا:- رامپور سے خط آیا ہے اُس سے معلوم ہوا کہ احقر کے مکان کی دیوار شدتِ بارش کی وجہ سے منہدم ہو گئی ——— فرمایا ——— "الحمد للہ" تمہارا ظاہر اور باطن دونوں فانی ہو گئے، یہاں (خانقاہ دہلی میں) تمہارے وجود کو "فنا" حاصل ہو گئی، وہاں تمہارے مکان کو۔"

ایک روز رویتِ حق تعالیٰ کا تذکرہ ہوا، فرمایا ——— "علماء نے لکھا ہے کہ جنت میں مومنوں کو ہر ہفتے ایک بار رویتِ اللہ تعالیٰ ہو گی، اور جو لوگ کہ صبح وشام مراقبہ کرتے ہیں اور ہر دو وقت "حضور مع اللہ" کی دولت پاتے ہیں اُن کو ہر روز دو بار شام وسحر دیدارِ خداوندی ہو گا" ——— پھر فرمایا:- "اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس کسی کو دائمی "حضور وآگاہی" اس جہان میں حاصل ہو گئی ہے، اُمید کہ اس کو بہشت میں رویتِ دائمی عطا فرمائی جائے گی۔"

ایک روز صوفیانِ خانقاہ سے کثرتِ ذکر ونوافل اور تہجد وغیرہ کی تاکید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:- "جان کھپانی چاہئے، تب مدعا حاصل ہو گا۔"

ایک روز فرمایا ——— "پچھلے اکابر طالبین کے لئے کوئی نہ کوئی خدمت مقرر فرما دیا کرتے تھے ——— خدمت میں ترقیاتِ باطن کا راز مضمر ہے" ——— بعد ازاں ایک حکایت سنائی، کہ:- ——— "ایک شخص اپنے مرشد کے حضور میں حاضر ہوا، اور عرض کیا، کہ میرے لئے کوئی خدمت مقرر فرمائیے۔

شیخ نے فرمایا:۔"سب خدمتیں طالبین کیلئے معین و مقرر کر دی گئیں، اب کوئی خدمت باقی نہیں ہے، ہاں ایک کام ہے، وہ یہ کہ جنگل سے ترکاری وغیرہ لایا کرو، اور اس کام کو بلا ناغہ کرنا۔ چنانچہ وہ شخص روزانہ جنگل سے ترکاریوں کا انبار سر پر رکھ کر لایا کرتا تھا، ایک دن خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے اک آگ کا دریا ہے اور لوگ اُس پر سے گذر رہے ہیں، میں نے وہی انبار جو سر پر لاد کر لایا کرتا تھا، اُس "آتشیں دریا" پر ڈال دیا ہے، اور اُس پر بیٹھ کر پار ہو گیا ہوں۔"

فرمایا ـــــ "حضرت خواجہ باقی باللہؒ شب بیداری کیا کرتے تھے، اور (جب رات گذر جاتی) فرمایا کرتے تھے، الٰہی رات کو کیا ہو گیا کہ اس سرعت کے ساتھ گذر گئی، کچھ اور توقف نہ کیا۔"

فرمایا ـــــ "حضرت مرزا مظہر جانِ جاں شہیدؒ فرمایا کرتے تھے:۔ واللہ ثم واللہ اپنے آپ کو خالی ٹھیکرا پاتا ہوں، لوگ میرے پاس آتے ہیں، توجہ حاصل کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میری توجہ سے فوائد کثیرہ برآمد ہوتے ہیں، میں یہ سُنکر سوچتا ہوں ـــ کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولا کرتے شاید میرے اندر کچھ نسبت ہو۔"

فرمایا ـــــ "حضرت پیر و مرشدؒ یہ بھی فرمایا کرتے تھے، کہ صوفی کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ لوگوں کی ایذا رسانی پر جو ناراضگی کا اثر دل پر ہوتا ہے وہ کس قدر دل میں رہتا ہے اگر ساعت دو ساعت رہا، تو خیر ـــ اگر تمام رات رہا ـــ تو اُس کو چاہئے از سرِ نو "توبہ" کرے، کیونکہ ایسی حالت سے پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کے باطن میں "نورِ نسبت" نے کوئی اثر نہیں کیا۔"

یہ شعر پڑھا کرتے تھے:۔ ؎

زناتوانیِ خود اینقدر خبر دارم   کہ از رخش نتوانم کہ دیدہ بردارم

مرتب ملفوظات فرماتے ہیں، آخر محرم ۱۳۳۱ھ میں حضرتؒ کی طبیعت تپ و لرزہ سے ناساز ہو گئی ہر باری پر تپ و لرزہ زور شور کا آتا تھا، راقم سطور ہر بار حاضر ہوتا، دیکھتا تھا کہ عین شدّت میں شوق و ذوقِ الٰہی میں مصروف ہوتے تھے ـــ جتنا تپ و لرزہ سے تڑپتے تھے اُتنے ہی زیادہ

لذت یاب ہوتے تھے —— کبھی فرطِ اشتیاق میں دونوں ہاتھ کھولتے تھے، گویا محبوبِ حقیقی کو اپنی آغوش میں لے رہے ہیں، اور اپنے آپ کو حاضرِ دربار پاکر لبیک وسعدیک پکارتے تھے، کبھی یہ شعر پڑھتے تھے۔ ؎

لولاک لما قتلت واللہ واللہ لما قتلت لولاک

ایک روز اُسی مرض میں مضمونِ حدیث بیان کیا، کہ:- حق تعالیٰ قیامت کے دن ارشاد فرمائے گا —— (اے بندے) میں بیمار ہوا، تو نے میری عیادت نہیں کی —— سامع حیران ہو کر عرض کرے گا، اے اللہ تو تو مرض سے پاک ہے —— حق تعالیٰ فرمائے گا فلاں شخص بیمار تھا، اگر اُس کی عیادت کرتا، مجھ کو پاتا، میں اُسکے قریب تھا۔ یہ فرماکر ارشاد فرمایا، کہ:- "مرض بھی عجیب نعمت ہے، کہ حق سبحانہٗ مریض کے پاس ہوتا ہے"

ابتدائے مرض تپ ولرزہ میں مولوی بشارت اللہ صاحب جو آپکے اعظم خلفاء میں سے تھے حاضرِ خدمت ہوئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اُنکے آنے سے بیحد خوش ہوئے اپنی قیام گاہ سے اُٹھ کر حضرت مرزا مظہر جانِ جاں شہیدؒ کے مزارِ پُر انوار تک جاکر اُن کا استقبال کیا، اور اُن کو اپنے مکان میں لے گئے، بڑی بڑی نوازشیں فرمائیں —— اور فرمایا، کہ:- الحمد للہ —— تم جو نسبت یہاں سے لیکر گئے تھے اُس سے زیادہ لیکر آئے ہو، میں تم سے راضی ہوں، میں تم کو "کلاہِ رضا" دوں گا۔ اس سے پہلے آپنے کسی کو کلاہِ رضا نہیں دی تھی۔

ایک روز درسِ بخاری دے رہے تھے، درس کے بعد فرمایا، کہ:- "میں تسبیح وتحمید وغیرہ پڑھ کر اُس کا ثواب رُوحِ سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہونچایا کرتا تھا، ایک روز سہواً یہ عمل ترک ہوگیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خواب میں دیکھا کہ تشریف لائے اور ارشاد فرمایا، کہ:- "مجھ کو ہدیہ کیوں نہیں بھیجا؟" آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں نے اُسی شکل وشمائل میں دیکھا جس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔"

فرمایا —— "ایک روز میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خواب میں دیکھا کہ تشریف لائے ہیں۔ میں نے عرض کیا، کہ:- حدیث من رانی فقد رای الحق (جسنے مجھ کو خواب میں دیکھا اُسنے مجھ ہی کو دیکھا) صحیح ہے؟ ابھی میرا کلام ختم نہیں ہوا تھا، کہ ارشاد فرمایا:- "(ہاں) اسی طرح ہے۔"

مولوی بشارت اللہ بہرائچی نے آپ سے اس حدیث کی اجازت چاہی، آپ نے اُنکو اجازت مرحمت فرمادی۔

فرمایا :-

"میں ایک روز قبل از نمازِ عشاء سو گیا تھا، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے اور قبل عشاء سونے سے منع فرمایا، بلکہ ایسا کرنے والے پر وعید فرمائی"۔

آخر ماہ صفر ۱۲۳۲ھ کو بعد از جمعہ (مرتب ملفوظات) مولانا رؤف احمد مجددیؒ کو بارِ دگر اجازت تعلیم ہر چہار طرق کی مرحمت فرما کر رامپور رخصت کیا ــــــ پھر شوال ۱۲۳۲ھ میں دہلی طلب فرمایا، یہاں پہنچے تو بہت مسرور ہوئے ــــــ اسی عرصے میں آپ نے مولوی بشارت اللہ صاحبؒ کو بہرائچ رخصت فرمایا ــــــ مرزا عبد الغفور صاحبؒ کو خورجہ روانہ کیا ــــــ اور مولانا رؤف احمد رافت رامپوری کو جمادی الثانی ۱۲۳۳ھ تک اپنے پاس رکھ کر اُن کی تکمیل کر کے تلقین طریقہ کے لئے کوٹہ اور سرونج کی جانب بھیجا۔

لہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جہاں آپ کا کوئی خلیفہ نہو، صرف ایک شہر انبالہ میں پچاس خلفاء آپ کے تھے ۔۱۲

(الخطبۃ الشوقیہ از حضرت مولانا محمد عبد الشکور صاحب فاروقی مجددی لکھنوی مدظلہ)

مندرجہ الفرقان (مجدد الف ثانیؒ نمبر)

ایک پُرانے قصبے کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشے میں :-

ایک دور بیں زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مُسلمانوں کے سارے احوال اور اُنکی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل، نیک و بد، اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا، اُسکے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ مُسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ اُنکے درست کرنے میں مشغول تھا، اُس نے پوری زندگی اسی میں صرف کی، کہ مُسلم کی تصویرِ حیات کو اُس شبیہ کے مطابق بنادے جو دینِ حق میں نظر آتی ہے۔ (مقدمہ جامع المجددین، از سید سُلیمان ندوی) ــــــ یہ کسی گذشتہ صدی کے تجدیدی کارنامہ کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ہماری اسی صدی کا ذکر ہے، اِس اجمال کی تفصیل، ذیل کی تین ضخیم کتابوں میں دیکھئے :-

۱- جامع المجددین (قیمت مجلد صعہ) -۲- تجدید تصوف و سلوک (قیمت مجلد صعہ) -۳- تعلیم و تبلیغ (قیمت مجلد ؏)

جدید معاشیات

یعنی

بے مقصد زندگی

(از:- جناب مولنا عبدالباری صاحب ندوی)

لاپلاس نامی اٹھارھویں[1] صدی کے ریاضیات و فلکیات کے ایک نامور محقق نے اپنی ایک بڑی تصنیف نپولین کو پیش کی، جس میں خدا کا نام تک نہ تھا۔ نپولین نے وجہ پوچھی تو نہایت بے باکی سے جواب دیا کہ مجھ کو اس میں خدا کے ماننے کی ضرورت کہیں نہیں پڑی[1]۔ اسی ذہنی رجحان کے وارث بہت سے سپوتوں نے یورپ میں مادرزاد ننگوں کی مستقل آبادیاں اور کلب بنا رکھے ہیں، اُن کا تجربہ بھی بالکل یہی ہے، کہ لباس کی کہیں ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہزاروں لاکھوں سال سے زمین کے اِسی کرہ پر ہزاروں لاکھوں قسم کے جانور رہتے بستے چلے آتے ہیں کسی کو کبھی لباس کے ایک چیتھڑے کی بھی قطعاً ضرورت نہیں پڑی، وہ تو غریب انسان ہی کو اسکی انسانیت کی بدولت پڑی تھی، اب اگر نام نہاد انسانوں کی کوئی جماعت یا آبادی اپنے کو سرے سے "انسانیت" ہی سے ننگا کرنے پر تل گئی ہو، تو ظاہر ہے کہ لباس ہی کی طرح خدا کی ضرورت بھی کیوں محسوس ہونے لگی، آخر جانوروں نے بھی تو کبھی خدا کی ضرورت قطعاً محسوس نہیں کی، نہ خود خدا نے ان میں کوئی رسول بھیجکر اسکی تکلیف دی، پھر جب انسان خود ہی اپنی خدا طلب انسانی یا خلافتی فطرت و خلقت کو بھلا کر صرف نام کا انسان رہجائے، تو

---

[1] ماحصل، بالکل یہی حوالہ ٹھیک سامنے نہیں ۱۲۔

قدرتی معاملہ اس کے ساتھ یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے انسان ہونے کا تخیل ہی اُسکے دل و دماغ سے نکال باہر کر دیا جائے، حتیٰ کہ اکڑ اکڑ کر خود ہی اپنے کو بڑھیا جانور (HIGHER ANIMAL) کہنے لگے، نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ کی تفسیر کا اس سے بڑھ کر آنکھوں سے کیا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے[1]۔

غرض خدا و آخرت کے بُرے بھلے سبھی تصورات و عقائد کو خیر باد کہکر یورپ جس طرح خود اپنی رہی سہی انسانیت سے دست بردار ہو رہا تھا۔ لاپلاس کا یہ تاریخی فقرہ در اصل انسانیت بیزاری کی اس انتہائی منزل ہی کی نشاندہی کر رہا تھا، جو آگے چل کر صدی ڈیڑھ صدی کے اندر ہی علمی و عملی پوری فرنگی زندگی پر چھاگئی۔

ذہن کے اس سانچہ میں ڈھلی ہوئی معاشیات پر بھی جو کتابیں پڑھی پڑھائی اور لکھی لکھائی جاتی ہیں، یا جو موقت رسائل اور ماہنامے وغیرہ مستقل معاشی مسائل پر نکلتے رہتے ہیں، وہ یا تو تمامتر خدا اور آخرت کے انکار و نفی پر مبنی ہوتے ہیں، یا کم از کم خدا کی ان میں کہیں کوئی ضرورت قطعاً نہیں محسوس کیجاتی، ان کا تعلق انسان کے آغاز و انجام دونوں سے بے پروا ہو کر صرف بیچ کی اس دنیوی زندگی کی معاشی فلاح و فساد سے ہوتا ہے، یعنی عام انسانوں یا کسی مُلک و خطہ کے خاص باشندوں پر کسی عام یا خاص معاشی روش و رویہ کا نیک و بد، بُرا بھلا کیا اثر پڑتا ہے۔

لیکن کھانے پینے رہنے سہنے وغیرہ کی ضروریات چونکہ زندگی کے محض معاشی ذرائع و وسائل ہی ہیں، اِسلئے جب تک خود زندگی کی کوئی غرض و غایت انجام و آخرت یا اخلاقی قدر و قیمت نہ لگائی جائے، اسکے کسی ذریعہ و وسیلہ یا کسی عام و خاص معاشی روش و رویہ کے بُرے بھلے ہونے کا فیصلہ کیسے ممکن ہے کسی شے یا کسی فعل کو بُرا بھلا تو کسی معلوم مقصد و مُدعا کے مدِ نظر ہی ٹھہرایا جاتا ہے، جو چیز اس مقصد کی تحصیل و تکمیل میں ممد و معاون ہے وہ اچھی، جو مزاحم و مانع ہے وہ بُری۔ جب معاشیات کے سارے مسائل و مباحث کا تعلق ہر پھر کر انسانی زندگی کی کسی نہ کسی معاشی ضرورت و حاجت ہی سے ہے، تو جب تک خود زندگی کی ضرورت و غایت متعین نہ ہو، اس کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل و تشفی کے کسی معاشی نظریہ و نظام کے حسن و قبح،

---

[1] انشاء اللہ "تجدید کلامیات" میں اس پر پوری بحث ہوگی کہ انسان کھانے پینے سے بھی زیادہ خدا کا بھوکا پیاسا ہے۔ ۱۲

عیب وہنر، یا فلاح وفساد کا تعین کیسے کیا جاسکتا ہے۔ کسی چیز کے صحت وسقم، خطا وصواب کا معیار ومیزان تو وہ غرض وغایت ہی ہوتی ہے، جس کے ماتحت یا جس کے حق میں مفید ومضر ہونے کی بنا پر اس کو صحیح وغلط، یا جائز وناجائز کہا جاتا ہے۔ معاشیات یا معاشی اشیاء وافعال ہی پر کیا موقوف، زندگی کی کسی نقل وحرکت کو برا بھلا نیک وبد کہنے کے کوئی معنی ہی نہیں بتائے جاسکتے، جب تک کسی خاص مقصد ومدعا کے اعتبار سے پہلے اسکی کوئی اخلاقی قدر وقیمت نہ ٹھہرالیجائے۔

معاشیات ہی کے ایک مشہور عالم[1] کا قول ہے، کہ :۔

"کسی دیوار میں کبھی کوئی کیل بھی تو بلا اخلاقیات کے نہیں ٹھونکی گئی، اور آپ کہتے ہیں کہ تم معاشیات سے اخلاقی احکام کو یکسر نکال دو"

اس طرح کی آوازیں بجائے خود منطقی قوت کتنی ہی رکھتی ہوں، لیکن جدید فرنگی معاشیات کے مولد میں بھی یہ سنی سنائی اسی وقت تک کچھ جاسکتی تھیں، جب تک مسیحی مذہب کے بچے کھچے اثرات کی کچھ گرفت ذہنوں پر باقی تھی، ورنہ معاشیات کے موجودہ مغربی اساتذہ ومصنفین اس قسم کی بحثوں سے اب عموماً کتراہی جاتے ہیں، تو پھر ہم مشرقی شاگردرشیدوں کا کہنا ہی کیا! ۔

انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

بات لے دیگر وہی ہے کہ آدمی نے جب اپنی زندگی کا رشتہ اپنے آغاز یا پیدا کرنے والے سے توڑ لیا، تو پھر دوسرا کون ہے جو علم ویقین کے ساتھ اس کی پیدائش کے انجام وآخرت کی روشنی اس کو عطا کرسکے۔

من لم یجعل اللہ لہٗ نوراً فما لہٗ من نور

معاشیات ہی نہیں، سیاسیات واخلاقیات، قانون اور معاشرات وغیرہ سارے عمرانی علوم حاضرہ کے علماء انسانی زندگی کے مآل ومدعا کو کھو کر لال بجھکڑوں کے ظن وخرص کی تاریکیوں میں بھٹکتے ملیں گے۔ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ۔ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ۔ اور ہر نیا لال بجھکڑ علم کے نئے نئے دعووں کیساتھ جہل ہی کی

---

[1] دیکھو "معاشیات، مقصد ومنہاج" از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ص ۳۰ - ۱۲

نئی نئی تاریکیاں پھیلاتا رہتا ہے۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا، کہ انھوں نے معاشیات کی عام چالو اور چلتو راہ سے ہٹ کر بعض اصولی و اساسی بحثوں کا ایک اچھا دلچسپ خلاصہ خود اُردو میں ہمارے لئے فراہم کر دیا ہے، حاصل سب کا یہ ہے کہ وحی و نبوت کی روشنی سے محرومی اختیار کر لینے کے بعد انسان کے پاس اسکے ناقص و محدود، روز بروز بدلنے والے تجربات کے سوا چونکہ علم و عمل کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی، اور ان تجربات سے "کیا ہے" کے آگے "کیا ہونا چاہئے" یعنی زندگی کے کسی مقصدی معیار و میزان کا پتہ چل نہیں سکتا، اسلئے بس جو کچھ "ہے" اسی کو قبول کر لینا ہے، یا زیادہ سے زیادہ "چاہئے" کی جگہ "ہونے" ہی کا کوئی شاعرانہ فلسفہ گڑھ کر خود انسان کو خدا اور اسکی آغاز و انجام سے ناآشنا موجودہ زندگی ہی کو بذاتِ خود مقصود و مطلوب بنا لیا جائے"۔ اٹھارھویں[۱۸] صدی میں جب متکلمین (یعنی دین وحی و نبوت) کے فلسفہ کی سرد بازاری ہوئی" تو

"ایک اور فلسفیانہ عقیدہ معیاری معاشیات کی بنیاد بنا، جس کو کائنات کی ہم آہنگی کا مسلک کہتے ہیں، اسنے اپنے تصورِ کائنات میں مرکزی جگہ خدا کے بجائے انسان کو دی"۔

یعنی جو جانشین (خلیفہ) و امین تھا وہ باغی و غاصب بن بیٹھا، پھر نتیجہ جو ہونا تھا ہوا، کہ:۔

"کائنات کا مقصد اب یہ نہ رہا کہ اسکے مظاہر سے خالقِ عالم کی شان و قدرت کا اعلان ہو، بلکہ یہ کہ انسان اس میں سکھ چین، امن و آرام سے رہے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اپنی جبلت پر چلنے کے لئے آزاد ہو، کوئی روک ٹوک نہ رہے"۔

ٹیپ کا بند یہ ہے، کہ:۔

"پابندیاں نہ ہوں تو انسان کی زندگی میں خود بخود صلح و آشتی، امن و شانتی پیدا ہو جائیگی، اور ہم آہنگی کا دَور دَورہ ہو گا، جیسے افلاک میں ستاروں اور سیاروں کی ہم آہنگی و ترتیب ہے"

آگے خود ڈاکٹر صاحب ذرا عقیدت مندی کے ساتھ فرماتے ہیں، کہ:۔

"یہ فلسفیانہ مسلک مغربی روشن خیالی کی بہار کا پھول ہے، جس کی آبیاری میں ڈیکارٹ، نیوٹن، اور روسو کا بہت حصہ ہے"۔ (صـ ۲۴)

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اُنیسویں صدی ابھی اپنے دو کے رہی دہے میں تھی کہ پہلی جنگ ۱۹۱۴ء نے اس "روشنیِ طبع" کے "برمن بلا شدی" کی ابتدا کر دی، اور اس ابتدا پر چوتھائی صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی، کہ خزاں کے ایک اور زیادہ تند جھونکے (دوسری جنگ ۱۹۳۹ء) نے اٹھارھویں صدی کی نوپیدا "مغربی روشن خیالی" کی کہنا چاہئے، کہ ساری بہار ہی کو لوٹ لیا، پھولوں کی جگہ سارا چمن کانٹوں سے بھر گیا، اور شاعرانہ فلسفہ نے "بے روک ٹوک آزادی" کی راہ سے "صلح و آشتی، امن و شانتی" کا جو خواب دیکھا تھا اُس کی تعبیر اُلٹ کر یہ نکل رہی ہے، کہ دوسری "جہانگیر جنگ" کا خمیازہ دُنیا ابھی بھگت ہی رہی ہے کہ تیسری "جہاں سوز" جنگ، اور آلاتِ جنگ کی دیوانہ وار ہر طرف سے جھنکار سنائی دینے لگی ہے، پہلے اگر ایٹم بم ہیروشیما کے صرف ایک شہر کو برباد کر سکتا تھا، تو اب نوایجاد ہائڈروجن بم کہا جاتا ہے کہ ایک آدھ شہر نہیں، پورے مُلک کے مُلک کو ریگستان بنا دے گا، اور جراثیمی جنگ کی تصویر یہ کھینچی جاتی ہے کہ ہیضہ طاعون وغیرہ مختلف وبائی بیماریوں کے جراثیم کو دشمن مُلک میں گرا کر اس طرح پھیلا دیا جائے گا، کہ:-

> "بوڑھے بچے، عورت مرد سب ان امراض میں گرفتار اور سسک رہے ہیں، ڈاکٹر نرس اسپتال کا سب عملہ بھی شکار ہے، ہزاروں لاکھوں انسان دم توڑ رہے ہیں، اور حلق میں کوئی پانی کی بوند تک ٹپکانے والا نہیں، پھر جب اس حالت میں جنگ ختم ہوگی، تو اس کے ساتھ وبائیں ختم نہ ہوں گی۔ ... ... یا پورے مُلک کو قرنطینہ کر دیا جائے گا، کہ جو مرتے ہیں مرتے رہیں، ان جراثیمی اسلحہ کے استعمال کے بعد بہت طویل عرصہ کے لئے مفتوح مُلک کے سب کارخانے بند ہو جائیں گے، اسکولوں میں تالے پڑ جائیں گے اور مُلک کا نظم و نسق ختم ہو جائے گا، افراتفری لوٹ مار اور بداخلاقیاں عام ہو جائیں گی"۔
>
> (الفرقان رجب ۱۳۷۱ھ ص۴۵)

یہ ہے "سکھ چین" امن و آرام" کا وہ نقشہ، اور "بے روک ٹوک آزادی" کے اس "فلسفیانہ عقیدہ" کا تحفہ جس میں دعویٰ کیا گیا تھا، کہ:- "انسان کی زندگی میں خود بخود صلح و آشتی، امن و شانتی پیدا ہو جائے گی"۔ اور اس "ہم آہنگی کا دَور دَورہ ہوگا، جو سیاروں اور ستاروں میں پائی جاتی ہے"!!

کچھ دُکھ، کچھ ہنسی، کہ شاعری کے زور میں اتنی بھی عقل نہ رہی، کہ "ستاروں اور سیاروں میں ہم آہنگی" نتیجہ ہے اُن کی غیر ارادی وغیر اختیاری حرکات کا، اُن کی خلقت نے تو اوّل دن ہی ارادہ و اختیار کی امانت کو اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا، اُن کی مجبورانہ ہم آہنگی پر اس مختارانہ فطرت کا قیاس کس منطق سے صحیح اُتر سکتا ہے، جس کی امتیازی خصوصیت جبر نہیں اختیار، اضطرار نہیں ارادہ ہے۔ اور "ارادہ و اختیار کی بے روک ٹوک آزادی" کے معنی "باہم آہنگی" نہیں، صرف "باہم آویزی" یا نزاع ہیں۔

ریت کی اس طرح کی بنیادوں پر کھڑا کیا ہوا "معیاری معاشیات" کا کوئی فلسفہ کھڑا ہی کتنی دیر رہ سکتا ہے۔ آخر معاشیات کی ان بحثوں ہی کے سلسلہ میں اسی کتاب میں یہ اقرار ملتا ہے، کہ یورپ زندگی کی جس مذہب گریز راہ پر پڑ گیا تھا، اس میں کھاپی کر، یا بیش بریں کچھ ظاہری آسائش و آرائش کیساتھ کھاپی کر مرجانے کے سوا زندگی کے کسی اور مقصد و معیار کی گنجائش ہی کیسے نکل سکتی تھی۔

"بس آدمی کے لئے خود ہی زندگی، خود اپنا آرام و آسائش مقصود بالذات بن گیا، دوسری دُنیا کے اُدھار پر آدمی اس دُنیا کے نقد کو ترجیح دینے لگا، اور وہ رشتے جو قدیم مذہبی تہذیب میں سب افراد کو ایک مرکز کائنات، یعنی ذاتِ الٰہی سے وابستہ کئے ہوئے تھے، سب کے سب ٹوٹ گئے، اور زندگی کے سارے اجزا تتر بتر ہو گئے۔ سیاسی زندگی میں، اجتماعی زندگی میں، ذہنی زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا، تمدّن کے اجزا الگ الگ ہو گئے۔ ریاست الگ ہو گئی، علوم و فنون الگ ہو گئے، دین الگ، دُنیا الگ، مذہب الگ، معیشت الگ۔" (ص ۴۳)

آگے اور صاف صاف سُنئے، کہ:۔

"ان میں سے ہر چیز خود اور بجائے خود مقصود بالذات ہو گئی، آرٹ کی خاطر، آرٹ شروع ہوا، یہ سوال نہ رہا کہ جاننے والا کیا جانتا ہے، بلکہ یہ کہ کتنا جانتا ہے۔ اس پر نظر نہ رہی کہ تصویر کا موضوع کیا ہے، بلکہ اہلِ نظر بس یہ دیکھنے لگے، کہ کیسی بنائی ہے، مقاصد کا زمانہ ختم ہوا، ذرائع کا عہد شروع ہوا، اور ہوتے ہوتے ذرائع و وسائل

خود ہی مقصد بن گئے"۔
(صـ۴۴ـ)

معاشی زندگی جو قدرت کی عطا کی ہوئی فہم سلیم (COMMON SENSE) کے سہارے تھوڑی بہت انفرادی و اجتماعی فکروں اور تدبیروں کے ساتھ بے غل وغش چل رہی تھی، ذرائع پرستی کے اس جنون نے اس کو بھی علمی و فنی معاشیات کے ناپیدا کنار دفتروں میں گم کر دیا، اور طرح طرح کی روز روز جنم لینے والی معاشی دعوتوں اور نظریوں کی بدولت معیشت کی سیدھی سادھی قدرتی زندگی آج زندگی کا سب سے پریشان اور بھیانک خواب بن کر رہ گئی، ان بے سروپا دفتروں، یا:۔

"علم (معاشیات) کے الگ مدون ہونے کی وجہ ایک تو وہی ذہنی انتشار ہے جس کا تذکرہ ابھی ہو چکا، دوسرے دنیاداری کا غلبہ اس عہد کی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے معاشی زندگی بہت پیش پیش رہی، معاشی چیزوں کی وقعت تمدنی زندگی میں بڑھ گئی"۔

(صـ۴۷ـ)

مقاصد و اخلاق سے "پاک" اس ذرائع پرست ناپاک "دنیاداری کے غلبہ" کا ذکر ایک اور موقع پر آگے چل کر علمائے معاشیات ہی کے ایک مسلک کی ترجمانی میں اس طرح ملتا ہے، کہ اس مسلک والے:۔

"سب کے سب فلسفہ (یعنی زندگی کی کسی غرض و غایت کی جستجو) کے مقابلے میں علم کے حامی ہیں، یعنی جو کچھ ہے اس سے بحث کرنا چاہیے "ہونا چاہیے" سے سرے سے سروکار نہیں تمام مافوق التجربہ اور مابعد الطبیعاتی عناصر سے اپنے علم (معاشیات) کو پاک رکھنا چاہیے معاشیات میں اخلاقی احکام کے یہ سختی سے مخالف ہیں"۔

ذرا اور آگے کچھ اور سن لیں:۔

"ان کے نزدیک معاشیات کی اساس نفسِ انسانی کے عام قوانین ہیں، اور تمام قوانین کا ماخذ فطرتِ انسانی کی عام نفسیاتی صفات ہیں"۔

ان نفسیاتی صفات میں بھی ان دیدہ دروں کے نزدیک:۔

"سب سے سادہ عنصر نفسی جس پر اکثر ترتیبی معاشیوں نے اپنی علمی عمارت کی بنیاد رکھی ہے

وہ خود غرضی ہے جو معاشی میدان میں خواہش دولت کی شکل اختیار کرلیتی ہے، اس عنصر کو تنہا مالتھس نے خواہش تناسل کو بھی توام کردیا ہے، اور عرصہ تک یہ دونوں عناصر معاشی زندگی کے سارے کارخانہ کی توجیہ کے لئے کافی سمجھے جاتے رہے، گذشتہ صدی کے نصف آخر میں ان کے ساتھ ایک اور عنصر بھی شامل کیا گیا، یعنی ادراک حظ و کرب، محاسبہ افادہ، جس سے افادۂ مختتم والے تمام معاشی مظاہر کی تشریح کے مدعی ہیں "

(ص ۵۹)

آگے مزید ترقی ملاحظہ ہو، ابھی تک معاشیات میں انسان کی انسانیت کو کم از کم اتنا دخل تھا کہ خود اس کا نفس بھی کسی شمار قطار میں تھا، خواہ وہ نفس حیوانی، بلکہ شیطانی، یا "امارہ" ہی کیوں نہو:-

"لیکن دوسرے لوگوں نے ان سادہ عناصر کی تلاش نفس انسانی میں (بھی) نہ کی، بلکہ انھیں خارجی معاشی زندگی سے حاصل کرنا چاہا، اور ان ہی کے وجود اور انکی حرکات پر معاشی زندگی کو منحصر کیا، سب سے پہلے تو یہ کام مقدار نے دیا، پھر اس محنت کو، جو اشیائے معاش میں متشکل ہوگئی ہو، آخری عنصر مانا گیا، اور ریکارڈو، راڈبرٹس اور مارکس وغیرہم کے نظامہائے معیشت میں یہی مقدار محنت معاشی دنیا کی آخری بنیاد توجیہ بنی۔"

(ص ۵۹)

ایک ہی کتاب کے ان مختلف و منتشر چند اقتباسوں اور عبارتوں سے سرسری اندازہ ان مشترک رجحانات کا بخوبی ہوگیا ہوگا، جو یورپ کی لائی اور پھیلائی ہوئی ——— بے مقصد زندگی کی جدید، بلکہ جدید ترین علمی و عملی، معاشی و سیاسی ذہنیت کے پیدا کرنے میں کارفرما رہے ہیں۔

خلاصہ سب کا وہی ہے کہ جب تک بُری بھلی مذہبیت (مسیحیت) کا مغربی ذہنوں پر کچھ اثر باقی رہا، بعض علماء معاشیات کو بھی اس پر اصرار رہا کہ انسان کیڑوں مکوڑوں، چرندوں پرندوں کی طرح کا نرا حیوان یا صرف بڑھیا جانور (HIGHER ANIMAL) نہیں ہے، بلکہ اس کی انسانی فطرت میں حیوانیت سے اونچی بھی کوئی چیز شریک ہے، اس کی زندگی کا مآل و مستقبل خالی زمین پر چرنے چگنے اور مرجانے کے آگے بھی

کچھ ہے، لہٰذا اس کی زندگی کے معاشی مسائل اور ان کی صلاح و فساد کا معیار بھی فقط حیوانیت نہیں، انسانیت، اور فقط حال نہیں، مآل ہونا چاہئے۔ لیکن دوسری طرف مذہب سے بڑھتی ہوئی بغاوت اسپر مصر تھی کہ ہم اپنے تجربہ و مشاہدہ کی آنکھوں سے چونکہ صرف اپنی حیوانیت اور حال ہی کو دیکھتے یا جانتے ہیں، اسلئے اسکے ماورا کسی دوسرے ذریعۂ علم سے انسانیت کا کوئی دوسرا مفہوم و مدعا پہچاننا ہی نہیں چاہتے، نہ کسی اور معیار سے "چاہئے" اور "نہ چاہئے" کی بحث میں پڑنا پسند کرتے ہیں، بس جو کچھ سامنے ہے اُسی کو سمجھ لینا چاہتے ہیں، اُسی کا نام "افہامی معاشیات" رکھا، اور بنایا گیا ہے، اِس طرح زندگی کے کسی مقصد و مستقبل سے فرار کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ زندگی کے جو ذرائع تھے وہی مقاصد بن گئے۔

پھر جس طرح جانوروں کا کھانا پینا، جنا جنانا کسی دانستہ و ارادی اعلیٰ مقصد پر مبنی اخلاقی احکام سے خالی ہوتا ہے، اسی طرح انسان کی بے مقصد و بے معیار زندگی کی "معاشیات" میں بھی (اسکے علماء) اخلاقی احکام کے (دخل در معقولات کے) سختی سے مخالف ہونے کے سوا کیا ہوسکتے تھے، لازماً جانوروں ہی کی طرح انسان کے معاشی محرکات کا سرچشمہ بھی "خود غرضی" ـ "خواہشِ تناسل" ـ اور "ادراکِ حظ و کرب" بالفاظِ دیگر صرف اسی دنیا کی زندگی، یا "دنیا داری کا غلبہ، اس عہد کی خصوصیت" اور معیشت کا آئینہ دار ہے، اس سے بھی بڑھ کر انسانی معیشت کے سراسر حیوانی تصور کی جس تازہ ترین ترقی پر لوگ رقص و وجد میں آپے سے باہر ہوتے جارہے ہیں، وہ یہ ہے، کہ جب آدمی جانور ہی ٹھہرا، تو اسکے چارہ کی مقدار کا فیصلہ بھی اس کی محنت و مشقت کی کمی بیشی کی مقدار ہی سے ہونا چاہئے"، مارکس وغیرہ کے نظامہائے معیشت میں "یہی بڑی دُور کی کوڑی لائی گئی ہے، کہ "مقدارِ محنت ہی معاشی دنیا کی آخری بنیادِ توجیہ بنی"۔

اسکے بالکل برعکس انسان کا اِسلامی تصور ــــ جیسا کہ پہلے اچھی طرح معلوم ہوچکا ــــ یہ ہے کہ وہ حیوان صرف ظاہر میں ہے، باطن میں اُسکے نگاہ کرو تو معلوم ہوگا، کہ خدا جس کا تصور "صفاتِ کمال کی جامع ذات" کے سوا کچھ نہیں، انسان دراصل اُس کا خلیفہ و جانشین یا اُسکے صفاتِ کمال کا حامل وامین

——— مظہر اتم ——— ہے، اسکے اندر خدا نے خود اپنی رُوح پھونکی ہے، اسی رُوح و روحانیت کی ترقی و تربیت کی خاطر زمین کی خلافت بخشی ہے، اسی خلافتی و امانتی زندگی کے حقوق و فرائض کی ادائی کا نام عبادت، اور اسی عبادتی یا عبدیت و بندگی والی زندگی میں پاس اور فیل ہونے کا رزلٹ (آخرت) جنت و جہنم کی ابدی صورت میں ظاہر ہوگا، اس بندگی سے زندگی میں جو "ہم آہنگی" رونما ہوتی ہے وہ ستاروں اور سیاروں کی طرح طبعی قوانین کے جبر و اضطرار پر مبنی نہیں ہوتی، انسان کو اپنا خلیفہ بناکر پیدا کرنے والے نے اپنی جو صفت بطور خاص اس کو امانتاً سپرد فرمائی ہے وہ ارادہ و اختیار ہے، آسمان و زمین اپنی جسمانی عظمت و وسعت کے باوجود جس امانت کے اُٹھانے سے پیچھے ہٹ گئے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ دانستہ و شعوری اختیار ہی کی صفت تھی۔ اختیار و ارادہ کی اس امانتی زندگی میں "ہم آہنگی" کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ امانت کو امانت رکھانے والے کی مرضی و منشا کے مطابق نہ کسی قانونی، یا جبلی جبر و اضطرار کے ماتحت، خود اپنی خوشی اور سوچے سمجھے اختیار و ارادہ سے استعمال کیا جائے ارادہ و اختیار کے استعمال میں اس خلافتی و امانتی "ہم آہنگی" ہی سے دنیا کو اس نزاع و انتشار سے نجات نصیب ہو سکتی ہے، جو دوسری تمام تدبیروں سے روز بروز "ہم آویزی" ہی میں ترقی کرتا جارہا ہے۔

(باقی آئندہ)

قادیانیوں کا معاملہ

(محمد منظور نعمانی)

کچھ عرصہ سے پاکستان میں یہ سوال اٹھا ہوا ہے کہ قادیانیوں کو دوسرے غیر مسلم فرقوں کی طرح مسلمانوں سے الگ ایک مستقل اقلیت قرار دیا جائے، اور وہاں کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مطالبہ پر مسلمانانِ پاکستان کے قریباً تمام اُن طبقات کا اتفاق ہے جو دین سے واقفیت اور دینی حس بھی رکھتے ہیں، اور قادیانیوں کو الگ اقلیت قرار دیئے جانے کے جو اچھے یا بُرے اثرات اُن کے ملک اور اُن کی ملت پر پڑ سکتے ہیں وہ انکو بھی سمجھ سکتے ہیں ـــــ بہرحال یہ مسئلہ آجکل پاکستان میں معلوم ہوتا ہے کہ بڑی قوت سے اٹھا ہوا ہے، پھر اسی سلسلہ میں قادیانیوں کے مسلمان یا نامسلمان ہونے کا مسئلہ بھی پھر سے بحث میں آ رہا ہے۔

جہاں تک سیاسی اور دستوری اصطلاح کے مطابق قادیانیوں کے اقلیت قرار دیئے جانے کا سوال ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پاکستان ہی کے مسلمانوں کے طے کرنے کی چیز ہے، اور اس مسئلہ کی نوعیت صرف وہ نہیں ہے جو کسی گمراہی یا کسی گمراہ فرقہ کے متعلق شرعی حکم ظاہر کرنے کی ہوتی ہے، بلکہ اسکے ساتھ بہت سی دوسری چیزیں وابستہ ہیں جن کا تعلق ملکی اور دستوری مسائل سے ہے، بہرحال ہم غیر پاکستانی اس فیصلہ کا حق نہیں رکھتے، اور نہ اس بارہ میں ہماری رائے کی کوئی وقعت ہونی چاہئے۔

ہاں اس سلسلہ میں قادیانیوں کے کفر و ایمان کی جو بحث چل پڑی ہے اسکے بارے میں بعض ایسے مضامین دیکھ کر جن سے کفر و ایمان کی حقیقت ہی مشتبہ ہو جاتی ہے، چند اصولی اور تنقیحی باتیں عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ۔

سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جو دینی حقیقتیں اور دینی باتیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہم تک پہنچی ہیں اُن میں سے زیادہ تر تو وہ ہیں جن کے بارے میں اگرچہ ہمیں اطمینان ہے کہ ان کا ثبوت اس درجہ کا ہے کہ ہمارے لئے ان کا ماننا اور اگر وہ عمل سے متعلق ہیں تو اُن پر عمل کرنا ضروری ہے، لیکن پھر بھی ان کا ثبوت ہر قسم کے احتمال و تشکیک اور اشتباہ و التباس سے بالاتر، ایسا یقینی اور قطعی اور بدیہی نہیں ہے کہ ہم ان کے نہ ماننے کو قطعیت کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات کا نہ ماننا کہہ سکیں، اور اس کو کفر و انکار قرار دے سکیں ——— دین اور شریعت کے زیادہ تر اجزاء و عناصر کا یہی حال ہے۔

لیکن کچھ دینی حقیقتیں اور دینی باتیں ایسی بھی یقیناً ہیں جن کی حیثیت یہ ہے کہ مثلاً جس درجہ کے یقینی اور غیر مشکوک ذرائع سے اور جس قسم کے تواتر سے ہم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اللہ کے پیغمبر کی حیثیت سے ایک دین کی طرف اپنے زمانہ کے لوگوں کو بلایا تھا اُسی درجہ کی نقل و روایت اور اُسی قسم کے تواتر سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اپنی دینی ہدایت اور دعوت کے سلسلہ میں یہ یہ چیزیں خاص طور سے فرمائی تھیں ——— مثلاً یہ بات کہ آپ نے "لا الٰہ الا اللہ" یعنی توحید کی دعوت دی تھی، اور بت پرستی کو شرک قرار دیا تھا ——— اور مثلاً یہ بات کہ آپ نے قرآنِ پاک کو کتاب اللہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا ——— اور مثلاً یہ بات کہ آپ قیامت کا آنا بیان فرماتے تھے؛ اور مثلاً یہ بات کہ آپ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا حکم دیتے تھے ——— تو یہ، اور ان جیسی بہت سی دینی حقیقتیں ہیں جن کا ثبوت ہر قسم کے وہم و شک اور احتمال و تشکیک سے بالاتر اُسی درجہ کے تواتر سے ہم تک پہنچا ہے، جس درجہ کے تواتر سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت کی دعوت پہنچی ہے، اور ہر دور میں امت کے تمام طبقات میں ان کی ایسی ہی شہرت رہی ہے۔

الغرض رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان دینی حقیقتوں کا ثبوت ایسا یقینی، قطعی اور بدیہی ہے کہ ان کا نہ ماننا بلاشبہ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیان فرمودہ حقیقت کا نہ ماننا ہے۔

خالص علمی اور دینی اصطلاح میں دین کی ایسی حقیقتوں کو "ضروریاتِ دین" کہتے ہیں۔

اِسکے بعد ہمیں عرض کرنا ہے کہ جو شخص اسلام وکفر کے معنی وہی جانتا ہو جو کتاب وسنت سے، اور اُمت کے متواتر تعامل سے علماء سلف وخلف نے ابتک سمجھے ہیں، اس کو غالبًا اس بات سے اختلاف اور انکار نہ ہوگا کہ مومن ومسلم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان "ضروریاتِ دین" میں سے کسی حقیقت کا منکر نہ ہو۔ اگر یہ بھی ضروری نہ ہو تو پھر اسکے معنی یہ ہوں گے کہ مومن ومسلم ہونے کے لئے سِرے سے کسی حقیقت کا ماننا ضروری ہی نہیں، اور شاید اس سے زیادہ مہمل اور بے معنی بات دین کے بارہ میں اور نہیں کہی جاسکتی۔

اب یہیں ایک بات پر اور بھی غور کر لیا جائے، ان ہی دینی حقیقتوں میں سے (جن کو ضروریاتِ دین کہا جاتا ہے) کسی حقیقت کے بارہ میں ایک گمراہ شخص کہتا ہے کہ میں اس کو مانتا ہوں، لیکن وہ اسکے معنی بالکل نئے گڑھتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ میں "لا الٰہ الا اللہ" کو مانتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہی ہے، اسکے سوا کوئی معبود نہیں، لیکن لوگوں نے جانا نہیں، وہ میں خود ہوں، میں نے اب اِس شکل وصورت میں ظہور کیا ہے، جس میں تم مجھے دیکھ رہے ہو، اور قرآن میری نازل کردہ کتاب ہے، اور محمد میرے بھیجے ہوئے رسول تھے (معاذ اللہ) —— یا فرض کیجئے کہ وہ اپنے بارہ میں یہ نہیں کہتا، بلکہ کسی مقبول ہستی کے بارے میں یہ بات کہتا ہے، یعنی "لا الٰہ الا اللہ" کو مانتے ہوئے وہ اس کا مصداق اُس مقبول ہستی کو بتلاتا ہے —— (جیسا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کے بارے میں غلو کرنے والے کچھ غالی باطنیوں کے متعلق نقل بھی کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کو مسلمانوں میں شمار کرتے تھے، "لا الٰہ الا اللہ" پڑھتے تھے، اور "اللہ" کا ظہور، یا مصداق حضرت علیؓ کو ٹھہراتے تھے) —— یا مثلاً فرض کیجئے کہ ایک شخص کہتا ہے، کہ میں کلمۂ "لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ" کو مانتا ہوں، لیکن اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو عام مسلمان ابتک سمجھتے رہے، بلکہ اس کا مطلب (معاذ اللہ) یہ ہے کہ کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا، اور وہ اللہ خود محمدؐ ہیں، جو "رسول اللہ" کے روپ میں آگئے ہیں —— یا مثلاً ایک شخص قیامت کے بارے میں کہتا ہے کہ میں قیامت کو مانتا ہوں، لیکن اس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو عام مسلمان سمجھے ہوئے ہیں، اور

خواہ مخواہ اُسکے انتظار کی تکلیف اُٹھا رہے ہیں، بلکہ اس کا مطلب صرف ایک دَور کا خاتمہ اور دوسرے دَور کا آغاز ہے، جو ہو بھی چکا، اور مسلمان جس توڑ پھوڑ والی قیامت کے منتظر ہیں، وہ کبھی آنیوالی نہیں ——

یا مثلاً ایک گمراہ شخص کہتا ہے کہ میں قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہوں، لیکن اس بارہ میں میرا خیال اور تصوّر وہ نہیں، جو عام مسلمانوں کا ہے، بلکہ میرے نزدیک اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دراصل تو یہ رسُول اللہ ؐ کی تالیف ہے، اور خود ان کا کلام ہے، لیکن اس میں جو باتیں ہیں، اور جن خیالات کو اس میں ظاہر کیا گیا ہے چونکہ وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ اللہ نے ہی ان کو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں پیدا کیا تھا، اسلئے قرآن کو کتاب اللہ کہدیا جاتا ہے۔[1]

تو غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا ایسے گمراہوں کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ یہ بیچارے مکذّب اور منکر نہیں، بلکہ مؤوّل ہیں، اور اسلئے مسلمان ہی ہیں۔ یا یہ کہا جائے گا کہ یہ زندیق تاویل اور تحریف کے ساتھ دینی حقیقتوں کی تکذیب کرتے ہیں، اور انھوں نے یہ رویہ اختیار کر کے دینِ محمدی سے اپنا رشتہ کاٹ لیا ہے؟ ۔

کھُلی ہوئی بات ہے کہ تاویل کے ساتھ "ضروریاتِ دین" کا انکار کرنے والوں کو مومن و مسلم کہنے کی گنجائش جب ہی نکل سکتی ہے کہ پہلے اس بات کو مان لیا جائے کہ ان ضروریاتِ دین کی بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہے جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو، اور اسکے معنی یہ ہوں گے کہ سرے سے خود اسلام ہی کی حقیقت متعین نہیں، کیونکہ "ضروریاتِ دین" تو اُسکے اوّل درجہ کے بنیات ہیں۔

اسی لئے متقدمین اور متاخرین میں سے جنھوں نے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے وہ سب اس پر متفق ہیں، کہ ضروریاتِ دین میں تاویل، مآل اور حکم کے لحاظ سے تکذیب ہی ہے۔

اور واضح رہے کہ یہ کوئی فرعی اجتہادی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ کفر و اسلام کی حقیقت اور اسکی حدود کا اصولی اور بنیادی مسئلہ ہے، متقدمین و متاخرین اہلِ حق میں سے ایک کا بھی نام نہیں بتایا جا سکتا

---

[1] واضح رہے یہ سب محض فرضی مثالیں نہیں ہیں، بلکہ انہیں بعض باتیں وہ ہیں جنکے کہنے والے پہلے کسی زمانہ میں گذرے ہیں، بعض وہ ہیں جنکے کہنے والے اب بھی موجود ہیں، اور قرآن پاک کے متعلق یہ بات تو ابھی چند سال ہوئے نیاز فتحپوری صاحب نے کہی تھی۔ ۱۲

جس نے اس اصول سے اختلاف کیا ہو، اور تاویل کے ساتھ ضروریاتِ دین کے انکار کو کفر نہ قرار دیا ہو، ہاں کسی شخص یا گروہ پر اس اصول کے انطباق اور اطلاق میں واقفیت وعدم واقفیت کی بنا پر یا دوسری وجوہ سے دو رائیں ہو سکتی ہیں، اور کسی کی تکفیر کے بارے میں جہاں خود محققین و محتاطین اہلِ حق میں اختلاف ہوا ہے وہ عموماً اطلاق اور انطباق ہی میں ہوا ہے۔ بہرحال تمام سلف وخلف اہلِ حق میں سے کسی ایک کو بھی اس اصول سے اختلاف نہیں ہے کہ ضروریاتِ دین کا انکار اگرچہ تاویل کے ساتھ ہو بہرحال وہ اسلام سے رشتہ کاٹ دیتا ہے۔

اسکے بعد عرض کرنا ہے، کہ جو شخص دین کا کچھ بھی علم رکھتا ہے وہ یہ ضرور جانتا ہو کہ "ختم نبوت کا عقیدہ" یعنی "ختم نبوت" اور "خاتم النبیین" کے صرف الفاظ نہیں، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری نبی ہیں اور اب کوئی نیا نبی قیامت تک مبعوث نہیں ہوگا — "ضروریاتِ دین" میں سے ہی، یعنی ناقابلِ شک یقین پیدا کرنے والے تواتر کے جن ذرائع سے ہمیں مثلاً یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا تھا اور قرآن پاک کو کتاب اللہ بتلایا تھا، اور آپ توحید اور نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کا حکم دیتے تھے، ان ہی ذرائع سے اور بالکل ویسے ہی تواتر سے یہ بھی معلوم ہوا ہو کہ آپ نے اپنے بارہ میں یہ بھی بتلایا تھا کہ سلسلۂ نبوت مجھ پر ختم کر دیا گیا، میں خاتم النبیین ہوں، اور اب میرے بعد کوئی نیا نبی اللہ کی طرف سے نہیں آئے گا ——— الغرض یہ عقیدہ اور یہ دینی حقیقت بھی دین کی خاص اصطلاح میں "ضروریاتِ دین" میں سے ہے، اور کسی شخص کے مسلمان ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کا انکار نہ کرے، اور نہ اس کی ایسی کوئی تاویل اور توجیہ کرے جس سے ختم نبوت کی مذکورہ بالا حقیقت کا انکار اور ابطال ہوتا ہو۔

اب آخری کڑی اس بحث کی یہ ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی کتابیں جس شخص نے پڑھی ہیں اُسے اس بات میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں کہ جن الفاظ وعبارات میں نبوت کا دعویٰ

کیا جا سکتا ہے، اور اگلے پیغمبروں نے کیا ہے، مرزا صاحب نے اُن ہی الفاظ وعبارات میں اپنے لئے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ اگر ہٹ دھرم نہیں ہیں تو وہ سوچیں کہ نبوت کا دعویٰ کن لفظوں اور کن عبارتوں میں ہوتا ہے، اور پھر وہ مرزا صاحب کی اس سلسلہ کی عبارات کا مطالعہ کریں —— اور خیر جانے دیجئے مرزا صاحب کے معاملہ کو۔ کہ لاہوری پارٹی کے غیر منطقی وجود نے اُنکے معاملہ کو (واقعۃً قابلِ اشتباہ نہ ہونے کے باوجود) بعض شکی لوگوں کے لئے ہم مان سکتے ہیں کہ کسی درجہ میں اب مشتبہ کر دیا ہے، لیکن موجودہ قادیانی پارٹی کا معاملہ تو بالکل صاف ہے (اور اسی کے بارے میں آج کل یہ بحث چل رہی ہے) وہ تو کھلے بندوں مرزا صاحب کے لئے حقیقی نبوت اور اسکے لوازم ثابت کرتے ہیں اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہتے ہیں کہ وہ اُسی معنی کر، اور اُسی قسم کے حقیقی نبی تھے جس معنی کر اور جیسے نبی پہلے آتے رہے، اور اگلے نبیوں کے نہ ماننے والے جس طرح کافر ہیں، اور نجات کے مستحق نہیں، اُسی طرح مرزا صاحب کے نہ ماننے والے سارے مسلمان بھی کافر، اور نجات سے محروم رہنے والے ہیں ——

جن لوگوں نے اُن تحریروں کو پڑھا ہے، جو (نبوت) اور (تکفیر) کے مسئلہ پر لاہوری پارٹی کے جواب میں قادیانی پارٹی کے ذمہ داروں کی طرف سے کتابی صورت میں، اور اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس بارے میں ان لوگوں نے کسی بڑے سے بڑے شکی اور تاویلی آدمی کے لئے بھی کسی شک وشبہ کی، اور کسی تاویل کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

الغرض قادیانیوں کا مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے، اُن کی یہ بات قابلِ تعریف ہی کہ انھوں نے اپنے مسلک کے اخفا میں نفاق سے کام نہیں لیا، اور اپنے کو اتنا کھول کر پیش کر دیا کہ کسی کے لئے بھی اُن کے بارے میں اشتباہ کی گنجائش نہیں رہی۔

اب اِسکے بعد اُن کو شرعی معنی میں مسلمان کہنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ اسلام میں تاویل کے ساتھ ضروریاتِ دین کے انکار کی گنجائش سمجھی جائے، یہ وہ نہیں کہہ سکتا جس نے اس مسئلہ کے مالہ وماعلیہ پر غور کیا ہو، اور جو ایسے اصولی اور بنیادی مسئلہ میں سلف وخلف امت کے خلاف رائے قائم کرنے کا اپنے کو حقدار نہ سمجھتا ہو۔ اور دوسری صورت قادیانیوں کو مسلمان کہنے کی یہ ہے کہ اُن کے ان کھلے

دعوؤں کے باوجود، کہ "مرزا صاحب کو ہم حقیقی معنی میں نبی مبعوث مانتے ہیں" کوئی شخص کہے جائے کہ میں تو یقین نہیں کرتا کہ آپ ان کو نبی مانتے ہیں، بلکہ میرا "حسنِ ظن" یہ ہے کہ آپ صوفیانہ انداز میں کوئی خاص مجاز استعمال فرما رہے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ یہ آپ کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ آپ شاعری فرما رہے ہیں۔

بہرحال اس عاجز کا خیال یہی ہے کہ جو حضرات موجودہ قادیانی پارٹی کو بھی مسلمان کہنے کی گنجائش سمجھتے ہیں اُنھوں نے یا تو ضروریاتِ دین میں تاویل کے مسئلہ پر غور نہیں فرمایا ہے، یا اُنھوں نے قادیانیوں کی اس سلسلہ کی چیزیں بالکل نہیں پڑھی ہیں۔

اس مقالہ میں بس اتنی ہی اصولی گفتگو کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا، عرصہ سے اس ناچیز کا خیال ہے کہ قادیانیت اور قادیانیوں کی مذہبی حیثیت کے متعلق لکھنے لکھانے کی ضرورت اب بالکل باقی نہیں رہی ہے، پروفیسر الیاس برنی نے (اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت میں اپنے خاص کرم سے توازے) "قادیانی مذہب" لکھ کر قادیانی تحریک اور اسکے علمبرداروں کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کو آخری حد تک پہنچا دیا ہے، اور پھر جس قدر اضافہ وہ اس میں مفید اور ضروری سمجھتے ہیں برابر کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ آخری اڈیشن معلوم ہوا ہے کہ بڑے سائز کے سولہ سو صفحات تک پہنچ گیا ہے، گویا کتاب نہیں، بلکہ اپنے موضوع پر ایک پورا کتب خانہ ہے۔

اور اب سے قریباً ۲۰ سال پہلے بھاولپور کے تاریخی مقدمہ میں اُستاذنا حضرت مولانا محمد انورشاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ اور چند اور علماء نے جو بیانات دیئے تھے، اور پھر فاضل جج نے قریباً ڈیڑھ سو صفحہ پر اُس مقدمہ کا جو فیصلہ لکھا تھا، اُن دونوں چیزوں نے قادیانیوں کے ایمان و کفر کے مسئلہ کو علمی طور پر بالکل ختم کر دیا ہے[1] ـــــ ہاں اگر کسی شخص کا کفر و ایمان کا تصور ہی جداگانہ ہو تو پھر بات دوسری ہے۔

---

[1] اس مقدمہ کے یہ بیانات اور فاضل جج کا فیصلہ دونوں چیزیں اُسی زمانہ میں الگ الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۲

انتخاب

عورت اور مجالسِ قانون ساز

(از مولانا سید ابو الاعلےٰ مودودی)

ماہ اگست کے "ترجمان القرآن" (لاہور) میں مولانا مودودی نے پاکستان کیلئے چند دستوری تجاویز پیش کی تھیں ان تجاویز پر بعض حلقوں کی طرف سے اعتراضات کئے گئے، جنکے جوابات موصوف نے ستمبر کے "ترجمان" میں دیئے ہیں، انہیں ایک اعتراض انکی اس تجویز پر تھا، کہ ــــ "عورتوں کو مجالس قانون ساز کا رکن نہ ہونا چاہیئے" ــــ اسکے جواب میں موصوف نے جو کچھ لکھا ہے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کو "الفرقان" کے صفحات میں بھی محفوظ کر دیا جائے، کیونکہ اس کا تعلق ہمارے اس دور کے ایک اہم سوال سے ہے۔

ایک اعتراض ہماری اس تجویز پر کیا گیا ہے، کہ "عورتوں کو مجالس قانون ساز کا رکن نہ ہونا چاہیئے"۔ اس بارے میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ کون سے اسلامی اصول ہیں جو انکی رکنیت میں مانع ہیں، اور قرآن و حدیث کے وہ کون سے ارشادات ہیں جو ان مجالس کی رکنیت کو مردوں کیلئے مخصوص قرار دیتے ہیں؟ ــــ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اُن مجالس کی صحیح نوعیت اچھی طرح واضح کر دیں جنکی رکنیت کیلئے عورتوں کے استحقاق پر گفتگو کیجارہی ہے۔

اِن مجالس کا نام مجالس قانون ساز رکھنے سے یہ غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ ان کا کام صرف قانون بنانا ہے، اور پھر یہ غلط تخیل ذہن میں رکھ کر جب آدمی دیکھتا ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں خواتین بھی قانونی مسائل پر بحث، گفتگو، اظہار رائے، سب کچھ کرتی تھیں، اور بسا اوقات خود خلفاء اُنکی رائے لیتے، اور اُس رائے کا لحاظ کرتے تھے، تو اُسے حیرت ہوتی ہے کہ آج اسلامی اصولوں کا نام لیکر اس قسم کی مجالس میں عورتوں کی شرکت کو غلط کیسے کہا جا سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مجالس اس نام سے موسوم کیجاتی ہیں ان کا کام محض قانون سازی کرنا نہیں ہے، بلکہ عملاً وہی پوری ملکی سیاست کو کنٹرول کرتی ہیں، وہی وزارتیں بناتی اور توڑتی ہیں، وہی نظم و نسق کی پالیسی طے کرتی ہیں، وہی مالیات اور معاشیات کے مسائل طے کرتی ہیں، اور انہی کے ہاتھ میں صلح و جنگ کی زمام کار ہوتی ہے، اس حیثیت سے ان مجالس کا مقام محض ایک فقیہ اور مفتی کا مقام نہیں ہے، بلکہ پوری مملکت کے "قوّام" کا مقام ہے۔

اب ذرا دیکھئے، قرآن اجتماعی زندگی میں یہ مقام کس کو دیتا ہے اور کسے نہیں دیتا۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ	مرد عورتوں پر قوّام ہیں بوجہ اُس فضیلت کے جو اللہ نے انمیں سے
بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ	ایک کو دوسرے پر دی ہے، اور بوجہ اسکے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔
فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ	پس صالح عورتیں اطاعت شعار اور غیب کی حفاظت کرنیوالیاں
بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ۔ (رکوع-۶)	ہوتی ہیں، اللہ کی حفاظت کے تحت۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں قوّامیت کا مقام مردوں کو دے رہا ہے، اور صالح عورتوں کی دو خصوصیات بیان کرتا ہے، ایک یہ کہ وہ اطاعت شعار رہیں، دوسرے یہ کہ وہ مردوں کی غیر موجودگی میں اُن چیزوں کی حفاظت کریں جن کی حفاظت اللہ کرانا چاہتا ہے ——— آپ کہیں گے کہ یہ حکم تو خانگی معاشرت کیلئے ہے، نہ کہ ملکی سیاست کیلئے مگر یہاں اوّل تو مطلقاً اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ کہا گیا ہے، فی البیوت کے الفاظ ارشاد نہیں ہوئے ہیں، جن کو بڑھائے بغیر اس حکم کو خانگی معاشرت تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر آپکی یہ بات مان بھی لی جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ جسے اللہ نے گھر میں قوّام نہ بنایا، بلکہ قنوت (اطاعت شعاری) کے مقام پر رکھا، آپ اُسے تمام گھروں کے مجموعے یعنی پوری مملکت میں قنوت کے مقام سے اُٹھا کر قوّامیت کے مقام پر لانا چاہتے ہیں؟ گھر کی قوّامیت سے مملکت کی قوّامیت تو زیادہ بڑی اور اونچے درجے کی ذمہ داری ہے، اب کیا اللہ کے متعلق آپکا یہ گمان ہے کہ وہ ایک گھر میں تو عورت کو قوّام نہ بنائے گا، مگر کئی لاکھ گھروں کے مجموعے پر اسے قوّام بنا دے گا؟۔

اور دیکھئے، قرآن صاف الفاظ میں عورت کا دائرۂ عمل یہ کہہ کر معیّن کر دیتا ہے، کہ:۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ	اپنے گھروں میں وقار کیساتھ ٹھہری رہو اور پچھلی جاہلیت کے سے
تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی (الاحزاب-۴)	تبرّج کا ارتکاب نہ کرو۔

آپ پھر فرمائینگے کہ یہ حکم تو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر کی خواتین کو دیا گیا تھا، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آپکے خیالِ مبارک میں کیا نبی (صلعم) کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جسکی وجہ سے وہ بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کیلئے نااہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے اُن پر کوئی فوقیت حاصل ہے؟ پھر اگر اس سلسلہ کی ساری آیات صرف اہل بیت نبوت کیلئے مخصوص ہیں، تو کیا دوسری مسلمان عورتوں کو تبرّج جاہلیت کی اجازت ہے؟ اور کیا انھیں غیر مردوں سے اس طرح باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے کہ اُنکے دل میں طمع پیدا ہو؟ اور کیا اللہ اپنے نبی کے

گھر کے سوا ہر مسلمان گھر کو "رجس" میں آلودہ دیکھنا چاہتا ہے؟۔

اسکے بعد حدیث کی طرف آئیے، یہاں ہم کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ واضح ارشادات ملتے ہیں :۔

إِذَا كَانَ أُمَرَاؤُكُمْ شِرَارَكُمْ وَأَغْنِيَاؤُكُمْ بُخَلَاءَكُمْ وَأُمُورُكُمْ إِلَى نِسَاءِكُمْ فَبَطْنُ الْأَرْضِ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا۔ (ترمذی)

جب تمھارے امراء تمھارے بدترین لوگ ہوں، اور جب تمھارے دولتمند بخیل ہوں، اور جب تمھارے معاملات تمھاری عورتوں کے ہاتھ میں ہوں، تو زمین کا پیٹ تمھارے لئے اسکی پیٹھ سے بہتر ہے۔

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ لَمَّا بَلَغَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ أَهْلَ فَارِسَ مَلَّكُوا عَلَيْهِمْ بِنْتَ كِسْرَى قَالَ لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً۔ (بخاری، احمد، نسائی، ترمذی)

ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر پہنچی کہ ایران والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنالیا ہے تو آپ نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کئے ہوں۔

یہ دونوں حدیثیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی ٹھیک ٹھیک تفسیر بیان کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیاست و ملک داری عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے، رہا یہ سوال کہ عورت کا دائرۂ عمل ہے کیا؟ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ ارشادات اُس کو وضاحت کیساتھ بیان کرتے ہیں :۔

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ۔ (ابوداؤد)

اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اسکی اولاد کی راعیہ ہے، اور وہ اُنکے بارے میں جوابدہ ہے۔

یہ ہے آیت وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کی صحیح تفسیر، اور اسکی مزید تفسیر وہ احادیث ہیں جن میں عورت کو سیاست و ملک داری سے کمتر درجہ کے خارج از بیت فرائض و واجبات سے بھی مستثنیٰ کیا گیا ہے :۔

اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةً: عَبْدٌ مَمْلُوكٌ، أَوِ امْرَأَةٌ، أَوْ صَبِيٌّ، أَوْ مَرِيضٌ۔ (ابوداؤد)

جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا حق اور واجب ہے، بجز چار کے۔ غلام، عورت، بچہ، اور مریض۔

عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ نُهِيْنَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ۔ (بخاری)

ام عطیہ سے روایت ہے کہ اُنھوں نے کہا ہم کو جنازوں کیساتھ جانے سے روک دیا گیا تھا۔

اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں، اور کوئی چیلنج کرے تو ہم اُنھیں پیش کر سکتے ہیں، مگر اول تو انکے بارے میں سوال نہیں کیا گیا ہے، دوسرے ہم کسی مسلمان کا یہ حق ماننے کیلئے تیار بھی نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسولؐ کے واضح احکام سُننے کے بعد انکی تعمیل کرنے سے پہلے، اور تعمیل کیلئے شرط کے طور پر عقلی دلائل کا مطالبہ کرے۔ مُسلمان کو، اگر وہ واقعی مُسلمان ہے، پہلے حکم کی تعمیل کرنی چاہئے، پھر وہ اپنے دماغی اطمینان کیلئے عقلی دلائل مانگ سکتا ہے، لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے پہلے عقلی حیثیت سے مطمئن کرو، ورنہ میں خدا اور رسولؐ کا حکم نہ مانوں گا، تو ہم اُسے سرے سے مُسلمان ہی نہیں مانتے، کجا کہ اس کو ایک اسلامی ریاست کیلئے دستور بنانے کا مجاز تسلیم کریں۔ تعمیلِ حکم کیلئے عقلی دلائل مانگنے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے، نہ کہ اُسکے اندر۔

سیاست و مُلک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھہرانے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کا دعویٰ لیکر اُٹھیں، اور حضرت علیؓ کے خلاف جنگِ جمل میں نبرد آزما ہوئیں، مگر اوّل تو یہ دلیل اصولاً ہی غلط ہے، اسلئے کہ جس مسئلے میں اللہ اور اسکے رسولؐ کی واضح ہدایت موجود ہو اُس میں کسی صحابی کا کوئی ایسا انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہؓ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہیں، مگر اس غرض کیلئے کہ انکی روشنی میں ہم اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، نہ اس غرض کیلئے کہ ہم اللہ اور رسولؐ کی ہدایت چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں، پھر جس فعل کو اُسی زمانے میں جلیل القدر صحابہؓ نے غلط قرار دیا تھا، اور جس پر بعد میں خود اُمّ المومنین بھی نادم ہوئیں، اسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کیلئے دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟۔

حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی اطلاع پاتے ہی اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ نے اُن کو جو خط لکھا تھا وہ پورا کا پورا ابن قتیبہؒ نے "الامامۃ والسیاسۃ" اور ابن عبد ربہ نے "عقد الفرید" میں نقل کیا ہے، اُسے ملاحظہ فرمائیے، کتنے پُرزور الفاظ میں وہ فرماتی ہیں کہ:-

"آپکے دامن کو قرآن نے سمیٹ دیا ہے، آپ اسے پھیلائیے نہیں"۔ اور "کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آپ کو دین میں افراط برتنے سے روکا ہے؟" اور یہ کہ "آپ رسُول اللہؐ کو کیا جواب دینگی اگر وہ آپ کو اس طرح کسی صحرا میں ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ کی طرف اونٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ لیتے؟" ——— پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول کو یاد کیجئے، کہ:- "عائشہ کیلئے ان کا گھر انکے ہودے سے بہتر ہے"۔ ——— اور حضرت ابوبکرہؓ کا یہ قول بخاری میں ملاحظہ فرمالیجئے، کہ:-

"میں جنگِ جمل کے فتنے میں مبتلا ہونے سے صرف اِسلئے بچ گیا کہ مجھے رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد یاد آگیا، کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی، جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیئے ہوں"۔

حضرت علیؓ سے بڑھ کر اُس زمانے میں کون شریعت کا جاننے والا تھا؟ انھوں نے صاف الفاظ میں حضرت عائشہؓ کو لکھا، کہ "آپکا یہ اقدام حدودِ شریعت سے متجاوز ہے؟"۔ اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و فقاہت کے باوجود اسکے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کر سکیں۔ حضرت علیؓ کے الفاظ یہ تھے، کہ:- "بلاشبہ آپ اللہ اور اُسکے رسُول ہی کی خاطر غضبناک ہو کر نکلی ہیں، مگر آپ ایک ایسے کام کے پیچھے پڑی ہیں جسکی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی، عورتوں کو آخر جنگ اور اصلاح بین الناس سے کیا تعلق؟ آپ عثمانؓ کے خون کا دعویٰ لیکر اُٹھی ہیں، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے آپ کو اس بلا میں ڈالا اور اس معصیت پر

آمادہ کیا، وہ آپکے حق میں عثمانؓ کے قاتلوں سے زیادہ گناہگار ہے۔" ——— دیکھئے، اِس خط میں سیدنا علیؓ حضرت عائشہؓ کے فعل کو صریحًا خلافِ شرع قرار دے رہے ہیں، مگر حضرت عائشہؓ اس کا کوئی جواب اسکے سوا نہ دے سکیں کہ "جل الامر عن العتاب" "معاملہ اب اِس حد سے گذر چکا ہے کہ عتاب و ملامت سے کام چل سکے۔" ——— پھر جنگِ جمل کے خاتمے پر جب حضرت علیؓ اُمّ المومنین سے ملنے تشریف لیگئے تو انھوں نے کہا: "یَا صَاحِبَةَ الْهَوْدَجِ قَدْ اَمَرَكِ اللّٰهُ اَنْ تَقْعُدِیْ فِیْ بَیْتِكِ ثُمَّ خَرَجْتِ تُقَاتِلِیْنَ؟ اے ہودے والی! اللہ نے آپ کو گھر بیٹھنے کا حکم دیا تھا، اور آپ لڑنے کیلئے نکل پڑیں۔" مگر اُس وقت بھی حضرت عائشہؓ یہ نہ کہہ سکیں، کہ: "اللہ نے ہم عورتوں کو گھر بیٹھنے کا حکم نہیں دیا ہے، اور ہمیں سیاست اور جنگ میں حصّہ لینے کا حق ہے۔"

اِن سب سے بڑھ کر یہ کہ خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عائشہؓ کو اس فتنے پر متنبہ کر دیا تھا، ابن قتیبہ کی روایت ہے کہ:-

"بصرے کے راستے میں جب حضرت عائشہؓ (حَوْأَب) کے مقام پر پہنچیں تو کتے بھونکتے ہوئے انکے ہودے کی طرف لپکے، حضرت عائشہؓ نے چونک کر پوچھا "یہ کون سا مقام ہے؟" محمد بن طلحہؓ نے عرض کیا "حَوْأَب" حضرت عائشہؓ نے فرمایا "اب میں آگے نہیں جا سکتی، مجھے یہیں سے پلٹنا ہے۔" پوچھا "کیوں؟" فرمایا "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی بیویوں سے یہ کہتے سنا ہے، کہ تم میں سے کسی پر (حَوْأَب) کے کتے بھونک رہے ہیں" اور پھر آپنے مجھ سے خطاب کر کے فرمایا کہ "خبردار! اے حمیراء کہیں وہ تم ہی نہ ہو" آخر کار حضرت عائشہ کو قسم کھا کر یقین دلایا گیا کہ "یہ مقام (حَوْأَب) نہیں ہے، تب وہ آگے چلنے پر راضی ہوئیں" ابنِ قتیبہ کہتا ہے، کہ "یہ پہلی جھوٹی شہادت تھی جو اسلام میں دیگئی" ——— پھر یہ بھی ثابت ہے کہ آخر کار حضرت عائشہؓ خود اپنے اس فعل پر پچھتاتی رہیں، چنانچہ علامہ ابن عبدالبر (استیعاب) میں یہ روایت لائے ہیں، کہ ام المومنینؓ نے عبداللہ ابن عمرؓ سے شکایتہً فرمایا: "اے ابو عبدالرحمٰن! تم نے کیوں نہ مجھے اس کام پر جانے سے منع کیا؟" انھوں نے جواب دیا: "میں نے دیکھا، کہ ایک شخص (یعنی عبداللہ بن زبیر) آپ کی رائے پر حاوی ہو گیا ہے، اور مجھے اُمید نہ تھی کہ آپ اُسکے خلاف چل سکیں گی۔" اس پر ام المومنینؓ نے فرمایا: "کاش! تم مجھے منع کر دیتے، تو میں نہ نکلتی۔"

اِسکے بعد جناب صدیقہؓ کے عمل میں آخر کیا دلیل باقی رہ جاتی ہے جس کے بل بوتے پر کوئی صاحبِ علم یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ اسلام میں عورتیں بھی سیاست اور نظمِ مملکت کی ذمہ داری میں شریک قرار دیگئی ہیں؟ رہے وہ لوگ جن کیلئے اصل معیارِ حق صرف دنیا کی غالب قوموں کا طرزِ عمل ہے، اور جنھیں بہرحال چلنا اُسی طرف ہے جس طرف انبوہ جا رہا ہو، تو انھیں کس نے کہا ہے کہ اسلام کو بھی اپنے ساتھ ضرور لے چلیں؟ اُن کا جدھر جی چاہے شوق سے جائیں، مگر کم از کم اتنی راستبازی تو اُن میں ہونی چاہئے کہ جس مقتدا کے دراصل وہ پیرو ہیں اُسی کا نام لیں، بلا دلیل اسلام کی طرف وہ باتیں منسوب نہ کریں جن سے خدا کی کتاب، اور اُسکے رسولؐ کی سنت، اور قرونِ مشہود لہا بالخیر کی تاریخ صاف صاف انکار کر رہی ہے۔

مولانا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

عصر حاضر کی مشہور دینی شخصیت، عارف و مصلح حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور انکی کامیاب دینی جد وجہد کی تاریخ، ایسے شخص کے قلم سے جس کو ذاتی مطالعہ و مشاہدہ اور استفادہ کا موقع ملا ہو۔ مولانا کے ذاتی حالات و کمالات اخلاق و عادات، اور انکی دعوت کے ارتقائی مدارج کی مستند تاریخ اور دین کے بہت سے اہم مباحث اسلامی اصلاح و انقلاب کے بہت سے اصول جو دوسری جگہ نہ ملیں گے۔ اس زمانہ میں دین کا کام کرنے والوں کیلیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری اور موجب بصیرت ہو۔

لکھائی چھپائی بہترین، کاغذ گلیز، قیمت (عہ)

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

(مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی)

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور ان کی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعہ ملفوظات کا مطالعہ کرلے جو دین کے حقائق و معارف کا عجیب غریب گنجینہ ہے۔ اس سے مولانا مرحوم کی دینی دعوت کی روح، حقیقت اس کے اصول و مقاصد اور آداب و لوازم۔ اور اس کی گہرائیاں بھی معلوم ہوں گی اور یہ بھی اندازہ ہوجائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولاناؒ کا مقام کتنا بلند تھا، اور اللہ تعالی نے دین کے کیسے حقائق و معارف ان کے قلب پر منکشف فرمادیے تھے اور امت مسلمہ کے امراض کی مولانا نے کتنی صحیح تشخیص کی تھی۔ حقیقت شناسوں کی نظر میں اس مجموعہ کا ایک ایک ملفوظ ایسا ہو جس پر ضخیم کتابیں قربان کی جاسکتی ہیں۔

کاغذ، کتابت، طباعت اعلی، قیمت مجلد (عہ)

"تذکرۂ امام ربانی"

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا کتابی اڈیشن

حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی سوانح و خصائص اور آپکے اہم تجدیدی کارناموں کا تفصیلی [illegible] اور اس کے منافق و ملحد حواریوں کے گڑھے ہوئے "دین الٰہی" کی تفصیلات، اس زمانہ کے علماء سوء اور ملحد صوفیوں کی تحریفات و تلبیسات اور ان سب گمراہیوں کے اثرات سے اسلام کو اور ہندستانی مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کے لیے حضرت امام ربانی کی مجددانہ جد وجہد اور بارگاہ خداوندی میں چیخ پکار اور اصلاح و تجدید کے اس مشن میں آپ کی محیر العقول کامیابی اور مغلیہ سلطنت کے رویہ اور مسلک پر آپ کی مساعی تجدید کا اثر۔ ان تمام چیزوں کی پوری تفصیل آپ کو "تذکرۂ امام ربانی" کے مطالعہ ہی سے معلوم ہوسکتی ہو۔

(قیمت، دو روپے آٹھ آنے)

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں

خدا کا ایک وفادار بندہ

(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

شاہ ولی اللہ کا دور اسلامی ہند کا سخت طوفانی دور تھا، مغلیہ سلطنت کا زوال و انحطاط، ہندستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز، سکھ اور مرہٹہ تحریکوں کا زور اور ان کے غارتگرانہ ہنگامے نادرشاہ کا خونی سیلاب، احمد شاہ ابدالی کی تاریخی جنگ، یہ سارے واقعات شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ میں ہوئے اور خود شاہ صاحب ان سے غیر متعلق بھی نہ تھے اس لیے اس مقالہ میں ان تمام واقعات اور انکے اسباب و اثرات کا ذکر بھی اچھی خاصی تفصیل سے آگیا ہو۔ پھر بتلایا [illegible] کہ شاہ صاحب نے فتنوں کے اس طوفانی دور میں اسلام کی خدمت کیا اور کس طرح کی اور ان کے طرز عمل سے موجودہ حالات میں ہمیں کیا روشنی ملتی۔ یہ مقالہ اچھی خاصی کتاب ہے، باریک قلم سے الفرقان سائز کے ۱۳۰ صفحات پر ختم ہے۔

کتابت و طباعت اعلی، کاغذ سفید چکنا

(قیمت، ایک روپیہ آٹھ آنے)

نماز کی حقیقت
از مولانا محمد منظور نعمانی
ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ

دعوت اصلاح و تبلیغ کا ترجمان

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

[illegible]

ادارۂ الفرقان

مدیر و مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

تصوف کیا ہے؟
اردو میں تصوف سے متعلق کئی اچھی اچھی چیزیں ہمارے اس زمانہ میں شایع ہو چکی ہیں،
لیکن ہمارا خیال ہو کہ یہ تازہ طبع کتاب اپنے اختصار کیساتھ انصاف و تحقیق اور مباحث
کے سلجھاؤ کے لحاظ سے بہت ممتاز سمجھی جائے گی اور انشاء اللہ ان تمام حق پسند حضرات کے
لیے اطمینان کا باعث ہو گی جو تصوف کے بارہ میں بھی انصاف سے غور کرنا چاہتے
ہیں اور جن کو اس کے نام سے خواہ مخواہ کی ضد اور چڑ نہیں ہے۔
اس میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان، مولانا محمد اویس صاحب ندوی
نگرامی، مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی کے مندرجہ ذیل آٹھ مقالے ہیں۔۔۔
گویا ان تینوں حضرات کی مشترک تالیف ہے۔
(۱) تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ ــــــ محمد منظور نعمانی
(۲) تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند یقین ــــــ " "
(۳) تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات ــــــ " "
(۴) تصوف کے متعلق بعض شبہات کا جواب ــــــ مولانا محمد اویس ندوی
(۵) یقین اور اس کے ثمرات ــــــ " "
(۶) تصوف اور شیخین ــــــ " "
(یعنی تصوف کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ ابن القیمؒ کی تصریحات)
(۷) اہل تصوف اور دینی جد و جہد ــــــ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
(۸) طالبان سلوک کو ابتدائی مشورے ــــــ محمد منظور نعمانی
ڈیڑھ سو صفحات، کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ اعلیٰ (قیمت عہ)
کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

چندہ
پاکستان سے
سالانہ — للعہ سکہ پاکستانی
ششماہی — عہ ر ر
فی پرچہ — ۸ر ر

چندہ
ہندوستان سے
سالانہ ... صہ ر
ششماہی ... سے ر
فی پرچہ ... ۸ر

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد ۲۰ | ماہ صفر ۱۳۷۲ھ (م) نومبر ۱۹۵۲ء | نمبر ۲

شمار	مضامین	لکھنے والے	صفحات

سرخ پنسل کا نشان اس بات کی علامت ہو کہ جناب کی مدت خریداری اس شمارہ پر ختم ہو گئی ہو، لہذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ اگر ۱۰ دسمبر ۱۹۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی تو اگلا پرچہ وی، پی بھیجا جائیگا جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا ——— پاکستان کے حضرات اب اپنا چندہ منیجر صاحب "مکتبۂ اصلاح" ۲۶ مال روڈ لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دے دیں اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں۔ اگر آپ کے چندہ کی اطلاع آخر دسمبر ۱۹۵۲ء تک موصول نہیں ہوئی تو "مکتبۂ اصلاح لاہور" سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی، پی ارسال کیا جائے گا ——— دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں۔ والسلام۔

——— ناظم الفرقان، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

پاکستان میں ہمارا نیا انتظام

احباب پاکستان کو چند اہم اطلاعات

(۱) آئندہ سے پاکستانی احباب دفتر الفرقان کے حساب کی جملہ رقوم صرف ذیل کے پتہ پر روانہ فرمایا کریں۔

منیجر مکتبۂ اصلاح ۲۶ مال روڈ لاہور

(۲) پاکستان کے خریداروں کو اب الفرقان کے وی۔ پی بھی اسی پتہ سے ہوا کریں گے۔

(۳) کتب خانۂ الفرقان کی تمام وہ کتابیں جن کا اشتہار الفرقان میں دیا جاتا ہو، پاکستانی احباب اب "مکتبۂ اصلاح ۲۶ مال روڈ لاہور" ہی کے پتہ سے طلب فرمایا کریں۔ کتب خانہ الفرقان کی سب کتابیں آپ کو اس پتہ سے مل سکیں گی، کتابوں کا کافی اسٹاک انشاء اللہ وہاں رہے گا۔ جن کتابوں پر جو کمیشن اور جو مراعات یہاں سے کسی کو دی جاتی ہو وہی "مکتبۂ اصلاح" سے دی جائے گی۔

(۴) یہ انتظام اسی مہینے سے کیا گیا ہے اور اب انشاء اللہ ہمارے پاکستانی احباب کو وہ زحمتیں نہ ہوں گی جو کئی برس سے یہاں سے کتابیں منگوانے میں ہوتی تھیں۔

اسی طرح رسالہ الفرقان کے متعلق پاکستان کے مخلصین کو جو شکایتیں ہوتی تھیں ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ اس نئے انتظام کے بعد وہ بہت کم ہو جائیں گی۔

ہمارے ایک بہت ہی مخلص دینی دوست مولوی محمد اقبال صاحب ہوشیار پوری، اور ان کے بھائی ڈاکٹر محمد اسلم صاحب (دندان ساز) نے یہ ذمہ داری خود میرے کہنے پر قبول کی ہے۔ اور پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کو انجام دینے کی اُن سے توقع ہے

محمد منظور نعمانی

(۲۰ صفر ۷۲ھ) ۔ (۱۰ نومبر ۵۲ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

فرض کیجیے اگر کوئی شخص سائل بن کر آپکے پاس اس حال میں آئے کہ مسلسل فاقوں سے اس کا پیٹ کمر سے لگ رہا ہو، جسم سوکھا جا رہا ہو، بھوک اور خشکی سے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوں اور کپڑے بھی پھٹے پرانے میلے کچیلے ہوں اور پاؤں بھی جوتوں سے ننگے ہوں — اور آپ کو اس کا علم ہو کہ اس کا باپ فلاں شخص تھا جو ایک بڑے اچھے نفع بخش کارخانے کا مالک تھا، اسکی آمدنی سے خود بھی عیش و راحت کی اور با عزت زندگی گزارتا تھا اور بہت سے غریبوں محتاجوں کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہوں کہ اپنا کارخانہ صحیح سالم چھوڑ کے وہ اس دنیا سے گیا ہے۔ اور اس کا یہ بیٹا ہی اس کا تنہا وارث اور مالک ہے — اور وہ خود بھی آپ سے اس کا اقرار کرے اور بتلائے کہ ہاں میں اسی باپ کا بیٹا ہوں اور بیشک میرے باپ کا وہ کارخانہ اب بھی موجود ہے، لیکن مجھے اس سے چونکہ دلچسپی نہیں ہے اور اسکے چلانے میں جو محنت اور زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ میرے بس کی نہیں، اس لیے والد کے مرنے کے بعد سے وہ بند پڑا ہے اور آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ والد صاحب جو کچھ چھوڑ کے گئے تھے کچھ دنوں تک وہ کھایا اسکے بعد گھر کا اثاثہ بیچ بیچ کے کھایا، یہانتک کہ تن کے کپڑے بھی بیچ ڈالے، اب جب بیچنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہ گیا ہے تو میں کئی وقت کے فاقوں کے بعد سائل بن کر آپکے پاس آیا ہوں، آپ اللہ کے واسطے میری کچھ مدد کریں!

تو ذرا سوچیے کہ اُس شخص کی یہ حالت دیکھ کر اور اس کی یہ بات سُن کر آپکے دل کا تاثر اور آپ کا جواب کیا ہوگا؟ — ظاہر ہے کہ اگر وہ دماغ کا بیمار اور پاگل نہیں ہے تو آپ اُسے انتہائی درجہ کا غلط کار قرار دیں گے اور اس کی سب سے بڑی خدمت اور مدد یہی سمجھیں گے کہ اگر وہ سمجھ سکے تو کسی طرح سمجھا بجھا کے اس کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے باپ کے اس کارخانہ کو جس کا وہ خود وارث اور مالک ہے چلائے اور اسکے ذریعہ اپنے باپ کی طرح آرام اور عزت کی زندگی گزارے۔

بلاشبہ یہ ایک فرضی ـــ بالکل فرضی مثال ہو، لیکن غور کیجیے کیا مسلمان کہلانے والی اُمت یا قوم کا مسئلہ اس وقت ہو بہو بالکل یہی نہیں ہو؟ ـــ ہمارے اسلاف اولین نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت پر ایمان لاکر ایمانی زندگی کو اپنایا تھا جسکے متعلق دنیا و آخرت و مافیہا کے خالق و مالک کا فیصلہ اور وعدہ تھا کہ جو قوم اس کو اپنائے گی وہ دونوں زندگیوں میں سربلند و سرفراز کی جائے گی ہم اس کے والی اور حامی ہوں گے اور تعداد و طاقت کے لحاظ سے بظاہر کم ہونے کی حالت میں بھی اپنے بدخواہوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ کامیاب اور غالب رہے گی ـــ چنانچہ اس آسمانی فیصلہ اور وعدہ کے متعلق ہمارے ان اسلاف کو یہ سب چیزیں حاصل ہوئیں اور اس درجہ میں حاصل ہوئیں کہ صدیوں تک ان کی اُن ناخلف نسلوں اور اُن نام لیواؤں نے بھی ان کی بچی کھچی برکات سے فائدہ اُٹھایا جنھوں نے ایمان اور ایمانی زندگی کو ان کی طرح نہیں اپنایا تھا ـــ لیکن بالآخر ایک وقت آیا کہ اگلے بزرگوں کی وہ کمائی اور اُن کا وہ اندوختہ ختم ہوا اور اس کے بعد ان کے نام لیوا جو ان کے طریقہ پر نہ ہونے کے باوجود صرف زبانی جمع خرچ یا نسلی تعلق کی بنا پر اپنے کو ان کا خلف اور وارث سمجھتے ہیں۔ ذلت اور پستی کے اس گڑھے میں جا پہونچے جہاں آج وہ پڑے نظر آرہے ہیں، اب ان کا حال زار یہ ہو کہ اپنی روزی اور معاش اور عزت و آبرو بلکہ اپنی زندگی اور بقا کو بھی اب وہ دوسرے اپنے ہمجنسوں کی نگاہ کرم سے وابستہ سمجھتے ہیں اور اس لیے اب وہ ان میں سے ہر چیز کے لیے سائلانہ نظروں سے دوسروں ہی کی طرف دیکھتے ہیں ـــ آہ "ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝" کا یہ کیا دردناک منظر ہو۔

حالانکہ کم از کم ماننے اور اقرار کرنے کے درجہ میں آج کے ان خستہ و شکستہ نام کے مسلمانوں کے پاس بھی ایمان اور ایمانی زندگی کا وہ نسخہ بجمیع اجزائہ موجود ہو جس کو صحیح طریقہ پر اور پورے طور سے استعمال کرکے ان کے اسلاف نے اللہ کی خاص مدد اور سرپرستی اور اس کے نتیجہ میں "تسخیر کائنات" کی طاقت حاصل کرلی تھی۔

پس جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں اور ایمانی زندگی میں اللہ کی رکھی ہوئی اس تسخیری طاقت پر اب بھی ایمان رکھتے ہیں اُنکی نظروں میں مسلمانوں کی موجودہ ذلت و پستی اوپر کی فرضی مثال والے پریشان حال سائل کی طرح خود اُن ہی کی مجرمانہ غلط کاری کا نتیجہ ہو اور اسی طرح ان کی بھی سب سے بڑی خدمت اور مدد یہی ہو کہ کسی طرح انھیں

یہ سمجھا دیا جائے اور اس پر آمادہ کر دیا جائے کہ ایمان اور ایمانی زندگی کو پھر سے اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے اسلاف کی جس پاک اور بلند زندگی پر وہ فخر کرتے ہیں اسکو پھر سے اپنائیں۔ یعنی خواہشات کی پیروی کے بجائے اللہ کی عبدیت اور بندگی والی زندگی اختیار کریں، اس فانی دُنیا کے بجائے کبھی نہ فنا ہونے والی آخرتی زندگی کی کامیابی کو اصل مقصدِ حیات بنائیں اور ان کے اسلاف نے جس طرح اللہ کے لیے مٹ جانے کو زندگی کی غایت و نہایت سمجھا تھا اسی طرح وہ بھی سمجھیں۔ مسلمانوں کے لیے بس یہی ہو تسخیر کائنات کی کنجی اور اسی کا نام ہو ایمانی و اسلامی زندگی جسکے متعلق اللہ کا فیصلہ اور وعدہ ہو۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ——— وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ہ

یہی ہمارا فلسفہ ہو اور یہی ہماری تاریخ ہے۔

گزشتہ اشاعت کے ان ہی صفحات میں اپنے تبلیغی کام کے سلسلے کے ایک تربیتی ہفتہ کے تجربہ کا ذکر کیا گیا تھا اور بہت جلد ایک مستقل شمارہ میں اسکی وہی تقریروں کی اشاعت کا وعدہ بھی کیا گیا تھا، لیکن بعض دوستوں نے جو تقریریں قلمبند کی تھیں ان کی نظرثانی کا کام اب تک پورا نہیں ہو سکا اسلیے اُس سے پہلے صفر کا یہ پرچہ شائع کر دینا مناسب سمجھا گیا، اب اگلے شمارہ میں انشاء اللہ اس تربیتی ہفتہ کی تعلیمی تقریریں ہی شائع ہوں گی۔ لیکن اب اندازہ یہ ہو کہ سب تقریروں کے لیے دو مہینے کے پورے ۱۲۰ صفحات بھی غالباً کافی نہ ہوں گے۔ تاہم یہ ارادہ ہو کہ اگر ضرورت ہوئی تو صفحات میں اضافہ کر دیا جائے گا اور حتی الوسع یہی کوشش کی جائے گی کہ ساری تقریریں ایک ہی اشاعت میں آجائیں۔

یہ گویا بہت عرصہ کے بعد الفرقان کی ایک غیر معمولی "مخصوص اشاعت" ہوگی۔ ہمارے ناظرین کو اس کے لیے اب آخر ربیع الثانی تک انتظار کرنا پڑے گا، امید ہو کہ انشاء اللہ اس سے زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔ بہرحال آئندہ ماہ (ربیع الاول) میں اب الفرقان کا انتظار نہ فرمایا جائے۔

قرآنی دعوت

(۲)

خدا کی صفات:-

خدا کی ہستی، کا علم تو جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا انسانوں کے لیے ایک وجدانی، فطری اور بدیہی علم ہے ــــ یعنی صرف اتنی سادی سی حقیقت کہ ہمارا اور اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا اور چلانے والا ہے، ہر آدمی کے لیے یہ اتنی ہی روشن اور اتنی ہی یقینی ہے جتنی کہ اس کی نظر میں خود اپنی ہستی اور اپنا وجود ــــ لیکن آگے یہ بات کہ وہ ہستی کیسی ہے اور اس کی صفات کیا ہیں، اگرچہ اس کا جاننا ہمارے لیے ضروری ہے (کیوں کہ اس کے بغیر نہ خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہم اس کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو جان سکتے ہیں) لیکن انسان بطور خود اس کی دریافت سے عاجز ہے ــــ الغرض انسان کے لیے جن چیزوں کا جاننا ضروری ہے اور جن کا صحیح علم حاصل کرنے میں وہ اللہ کے پیغمبروں اور اللہ کی کتابوں کی رہنمائی کا محتاج ہے ان میں سے ایک صفات الٰہی کا مسئلہ بھی ہے۔

نزول قرآن کے وقت خدا کی ہستی کا عقیدہ تو قریب قریب سب قوموں میں اور سب مذاہب میں موجود تھا لیکن اس کی صفات کا صحیح تصور کہیں بھی نہیں تھا اور اس بارہ میں دنیا بڑی سخت غلطیوں اور گمراہیوں میں مبتلا تھی ــــ اس وقت کے بڑے بڑے مذاہب اور ان کی ماننے والی قومیں اور ان کی بنیادی کتابیں آج بھی موجود ہیں یا کم سے کم ان کے بارے میں گواہی دینے والی تاریخ موجود ہے۔ تھوڑا سا وقت اور تھوڑی سی محنت صرف کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ خدا کے متعلق ان کے تصورات کتنے غلط اور کتنے پست تھے۔ اور ان مذہبوں یا فلسفوں کے ماننے والے جو اب تک دنیا میں موجود ہیں وہ صفات الٰہی کے بارہ میں کیسی کیسی گمراہیوں میں آج تک بھی مبتلا ہیں ــــ بہر حال قرآن مجید نے اپنی دعوت و

تعلیم کے ذریعہ اقوام و مذاہب کی جن سنگین غلطیوں کی اصلاح اور تصحیح کی ہو ان میں سے ایک صفات الٰہی کا مسئلہ بھی ہے۔

قرآن مجید نے اس بارہ میں جو کچھ دنیا کو بتایا ہو اس کی صحیح قدر و قیمت جاننے کے لیے، بلکہ اسکو سمجھنے کے لیے بھی کم از کم اجمالاً ہی یہ معلوم ہونا ضروری ہو کہ دنیا کے اقوام و مذاہب نزول قرآن کے وقت خدا کی صفات کے بارے میں کیسی غلط فہمیوں اور گمراہیوں میں مبتلا تھے اور خدا کو کیسا سمجھتے تھے! ـــــ تفصیل تو ان مذاہب کی تاریخ سے متعلق کتابوں ہی میں دیکھی جا سکتی ہو۔ یہاں تو ہم اس باب کی بس چند اصولی گمراہیوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں نزول قرآن کے وقت خدا کو ماننے والی دنیا عام طور سے مبتلا تھی۔

بہت سی قومیں اس دُنیا کو 'ایک خدا کی پیدا کی ہوئی دُنیا' ماننے کے باوجود اس وہم میں مبتلا تھیں کہ جس طرح دنیا میں ایک بادشاہ یا راجہ ہوتا ہو لیکن ملک اور حکومت کے کام زیادہ تر وہ خود نہیں کرتا بلکہ اس کے وزراء اور دیگر ماتحت لوگ کرتے ہیں۔ اور جس طرح چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح خدا کا بھی معاملہ ہو کہ اس دُنیا میں جو کچھ ہوتا ہو وہ سب براہ راست خدا خود نہیں کرتا بلکہ اس کی مقرب کچھ اور روحانی ہستیاں (دیوی دیوتا) ہیں جن کو اس نے بہت سے کام اور بہت سے اختیارات سپرد کر رکھے ہیں۔ اور اُن کاموں کو وہی انجام دیتے ہیں، وہ جس سے راضی ہوں اسے نہال اور خوشحال کر دیتے ہیں اور جس سے ناراض ہوں اُسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور اسی لیے لوگوں کی بھلائی یا بُرائی کا تعلق عملی طور پر اُن ہی دیویوں دیوتاؤں کی خوشی یا ناخوشی سے ہو۔

نیز اسی قسم کی گمراہیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جس طرح دنیا کے بادشاہوں، راجوں، مہاراجوں کا یہ حال ہوتا ہو کہ بعض لوگوں سے رشتۂ قرابت کا یا پیار و محبت کا ایسا تعلق ہوتا ہو کہ وہ ان کی کسی خواہش اور کسی سفارش اور کسی بات کو رد نہیں کر سکتے بلکہ جو وہ چاہیں وہی کرنا پڑتا ہو۔ اسی طرح معاذ اللہ خدا کا بھی بعض خاص ہستیوں سے ایسا تعلق ہو کہ جو وہ خدا سے کرانا چاہیں وہی کرا لیتے ہیں۔

بعض قوموں کی گمراہی یہ تھی کہ وہ خدا کا تصور مادی شکل و صورت اور مادی صفات کے ساتھ کرتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ

مثلاً غم و مسرت اور رنج و راحت جیسے طبعی حالات جو انسانوں پر آتے ہیں یا یہ سب خدا پر بھی آتے ہیں یا یہ سب خدا پر بھی آتے ہیں اور انسانوں پر ان حالات کے جو اثرات پڑتے ہیں وہی خدا پر بھی پڑتے ہیں اور انسان ان حالات سے متاثر ہو کر جیسے کام کرتا ہو ویسے ہی افعال اللہ تعالیٰ سے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

عام مشرک اور بت پرست قوموں کے خیالات خدا کے بارے میں کچھ ایسے ہی تھے اور اُن کے شرک کی بنیاد ان ہی غلط اور گمراہانہ خیالات پر تھی۔

ان کے علاوہ بعض قومیں خدا کو قہر و غضب اور جلال و جبروت سے بھرپور ایک ایسے مطلق العنان بادشاہ کی طرح سمجھتی تھیں جس کا کوئی اُصول اور آئین نہ ہو اور جو غصہ اور ناراضی کے وقت اپنے غیظ و غضب کی تسکین کے لیے لوگوں پر بے حساب تباہیاں اور بربادیاں نازل کرتا ہو، اور رحم اور درگزر سے اس کی فطرت خالی ہو۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سب گمراہیوں کی بلکہ ان کے علاوہ اور بھی جو گمراہیاں خدا کی صفات کے بارے میں اقوام و مذاہب میں تھیں (اور اسی طرح جو آج بھی ہیں) ان سب کی یا کم از کم ان میں سے اکثر کی اساس و بنیاد صرف یہ ہو کہ دنیا کی نظر میں سب سے بڑی چیز بادشاہی تھی اور سب سے بڑی ہستیاں بادشاہوں کی تھیں اس لیے جو باتیں اور جو صفتیں بادشاہوں میں ہوتی تھیں اُن ہی کو زیادہ بڑے اور اونچے پیمانے پر خدا میں مان لیا گیا تھا۔ اور الوہیت کو شاہیت سمجھنے کے اس مغالطے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ خدا کا تصور عام طور سے بس قہر اور غضب اور جلال و جبروت ہی کے ساتھ کیا جاتا تھا اور اسکو دہشت اور خوف ہی کی چیز سمجھا جاتا تھا اور اس سے بس ڈرا ہی جاتا تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے نزول قرآن سے کئی صدی پہلے اسی غلطی کی اصلاح کیلئے اللہ کی صفت رحمت پر بہت زیادہ زور دیا اور اسکو سمجھانے کے لیے (جیسا کہ انجیل سے معلوم ہوتا ہو) باپ کی محبت و شفقت کی تمثیل و تعبیر سے کام لیا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد اُن کی ماننے والی اُمت کی کجروی نے اسی سے ابنیت اور کفارہ کے عقیدے پیدا کر لیے ــــ بہر حال مسیحی اُمت میں ابنیت اور کفارہ کے عقیدے صفات الٰہی کے غلط تصور ہی سے پیدا ہوئے۔

الغرض خدا کی صفات کے بارہ میں اس قسم کی غلطیوں اور گمراہیوں میں نزول قرآن کے وقت دنیا کی عام قومیں اور امتیں مبتلا تھیں ـــ اب ذرا دیکھیے کہ قرآن نے آکر اس بارہ میں دنیا کو کیا بتلایا۔

سورۂ فاتحہ جس سے قرآن مجید شروع ہوتا ہے اس میں سب سے پہلے خدا کی صفات کی رونمائی اس طرح کرائی گئی ہے۔

الحمد للہ رب العالمین ۝	ساری حمد و ستائش اس اللہ ہی کے لیے ہے جو سب کائنات کا پروردگار ہے۔
الرحمٰن الرحیم ۝	بیحد رحمت کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔
مالک یوم الدین ۝	جزا اور انصاف کے دن کا مالک ہے۔

پہلی صفت (رب العالمین) نے یہ بتلایا کہ کائنات کے ساتھ خدا کا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے بلکہ پیدائش کے بعد جس کو جو کچھ بھی مل رہا ہے اور جس طرح بھی اس کی پرورش ہو رہی ہے وہ سب براہ راست اسی کی طرف سے ہے، وہی سب کی تربیت اور پرورش کر رہا ہے، حتیٰ کہ درختوں کو بظاہر ہوا پانی اور زمین سے جو غذا ملتی ہے جس سے ان کی حیات اور ان کا نشو و نما ہے، اور بچہ کو ماں کے پستانوں سے جو دودھ ملتا ہے تو یہ سب بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی ربوبیت ہے اور اصل دینے والا وہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے کہ خود پیدا کر کے اور وجود دے کے پرورش (یعنی ضروریات مہیا کرنے کا کام) کسی اور کے سپرد کر دیا ہو۔ بلکہ جس طرح پیدائش اسی کے پیدا کرنے سے ہوئی اسی طرح سب کی پرورش بھی اسی کی طرف سے ہو رہی ہے۔ اور اس کی ربوبیت اور پروردگاری کا کائنات کے ہر ذرہ سے براہ راست تعلق ہے۔

دوسری اور تیسری صفت (الرحمٰن الرحیم) نے بتلایا کہ جس خدا کو لوگوں نے صرف قہار اور جبار سمجھ رکھا ہے وہ تو بیحد رحمت والا اور نہایت ہی مہربان ہے۔ اور مخلوق کو وجود بخشنا اور پھر اس کی پرورش کرنا اور اس کی ضروریات مہیا کرتے رہنا اس کی رحمت ہی کا کرشمہ ہے۔ اور رحمت کی صفت اس میں اتنی ہے کہ اس کے بیان کرنے کے لیے "الرحمٰن" کہنے کے بعد "الرحیم" کہنے کی بھی ضرورت ہے۔

تیسری صفت (مالک یوم الدین) نے بتلایا کہ سب کا پروردگار اور رحمٰن و رحیم ہونے کے ساتھ وہ عادل اور انصاف کرنے والا بھی ہے اور اس کی اس صفت کا پورا پورا ظہور اس دن ہوگا جو خاص انصاف اور جزا و سزا ہی کا دن ہوگا ــــ گویا اس تیسری صفت کو بیان کر کے سب کو خبردار کر دیا گیا کہ اس کی پروردگاری اور انتہائی رحمت اور مہربانی کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ وہ مجرموں کو بھی سزا نہ دیگا، اور اس ماں کی طرح جو نالائق بیٹے پر بھی پیار کرنے پر اپنی مامتا سے مجبور ہوتی ہے، مجرموں اور نافرمانوں پر بھی وہ رحمت ہی کرے گا ــــ ایسا نہیں ہے بلکہ رب اور الرحمٰن اور الرحیم ہونے کے ساتھ وہ جزا سزا دینے والا بھی ہے اور ایک آنے والے دور میں اس کی اس صفت کا ایسا ظہور ہونے والا ہے کہ وہ پورا دور ہی صرف جزا و سزا کا دور ہوگا، یعنی وہ دُنیا نہ کھانے کمانے کی دنیا ہوگی نہ عبادت کرنے کی دنیا ہوگی بلکہ صرف جزا و سزا اور انصاف و عدالت کی دنیا ہوگی ــــ الغرض اسی لیے اسے "یوم الدّین" کہا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اپنے بالکل ابتدائی ان چھوٹے چھوٹے تین بولوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق جو کچھ بیان کر دیا ہے اگر غور کیا جائے اور اس کی گہرائیوں میں اترا جائے تو صرف اتنا بھی ناکافی نہیں ہے لیکن قرآن پاک چوں کہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہدایت ہے اور اس کے بعد کوئی آسمانی ہدایت نامہ آنے والا نہیں ہے اس لیے اس قسم کے کسی بھی اہم مسئلہ میں اس نے اختصار اور کفایت سے کام نہیں لیا ہے اور بلا مبالغہ ہزاروں جگہ ــــ واقعۃً ہزاروں جگہ ــــ اس میں خدا کی صفات پر روشنی ڈالی گئی ہے چند آیتیں ہم یہاں بھی درج کرتے ہیں ــــ ناظرین کی سہولت کے لیے ہم صفات کے عنوانات قائم کر کے ان کے متعلق آیات درج کریں گے۔

اللہ تعالیٰ علیم کل ہے ساری کائنات کو اس کا علم محیط ہے:۔

قرآن کریم بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چھوٹی بڑی اور کھلی چھپی چیز کا علم ہے، وہ سب دیکھتا اور سُنتا ہے وہ ہر ایک کے قریب اور ہر ایک کے ساتھ ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ (آل عمران ع ۱)

اللہ تعالیٰ (علیم کل ہو) زمین اور آسمان کی کوئی چیز اُس سے پوشیدہ نہیں ہو۔

یہی بات کچھ اور اضافہ کے ساتھ سورۂ انعام میں یوں بیان فرمائی گئی ہو۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ (الانعام ع ۱)

اور وہی ہو اللہ آسمانوں میں اور زمین میں (یعنی زمین و آسمان کی ساری کائنات کا وہی خدا ہو وہی مالک اور رب ہو) وہ تمھاری چھپی اور کھلی سب باتوں کو جانتا ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو اس کا بھی پورا علم ہو۔

نیز اسی سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہو۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ (الانعام ع ۹)

وہ غیب اور شہادت سب کا جاننے والا ہو اور (اس علم کلی کے ساتھ) حکمت بھی رکھتا ہو اور ہر چیز اور ہر بات سے ہر وقت باخبر رہنے والا ہو۔

اور سورۂ قصص میں یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا گیا ہو۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَهُوَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُوْلٰى وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (القصص ع ۷)

اور تمھارا رب جانتا ہو اُن رازوں کو بھی جو وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور ان باتوں اور ان کاموں کو بھی جو وہ اعلانیہ کرتے ہیں اور وہی اللہ ہے۔ اسکے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں اسی کے لیے ساری حمد اور ستائش ہو دنیا اور آخرت میں، اور اسی کے ہاتھ حکم ہو، اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کے جانا ہو۔

اور سورۂ یونس میں ارشاد فرمایا۔

وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ

(یونس ع ۷)

اور تم کوئی کام نہیں کرتے ہو مگر یہ کہ ہم تمہارے پاس اس وقت موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں لگے ہوتے ہو (یعنی تم جو کچھ بھی کرتے ہو ہماری آنکھوں کے سامنے کرتے ہو۔ اور تم اگرچہ ہمیں نہیں دیکھتے مگر ہم وہیں موجود ہوتے ہیں اور سب کچھ دیکھتے ہیں) اور زمین و آسمان میں کوئی ذرہ برابر چیز بھی تمہارے رب سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اور بندوں سے اپنا قرب بیان فرمانے کے لیے سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ

(البقرہ ع ۲۳)

اور اے پیغمبر جب میرے بندے تم سے میری بابت دریافت کریں تو (انھیں بتاؤ کہ) میں ان سے قریب ہی ہوں۔

اور سورہ ق میں فرمایا گیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝

(ق ع ۲)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو وساوس اور خیالات آتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں اور ہم اس کی شہ رگ سے زیادہ اُس سے قریب ہیں۔

اور سورہ مجادلہ میں بندوں کے ساتھ اپنے اسی قرب و معیت کا بیان اس طرح فرمایا۔

مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ

(مجادلہ ع ۲)

کہیں نہیں ہوتا تین کا خفیہ مشورہ، مگر اللہ ان کا چوتھا وہاں ہوتا ہے، اور نہ پانچ کا مگر اللہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کا نہ زیادہ کا مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ جہاں بھی وہ ہوں۔

اور سورۂ نساء میں ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جو آدمیوں سے شرم کرتے ہیں لیکن اللہ سے شرم نہیں کرتے فرمایا گیا۔

يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ (النساء ع ۱۶)

وہ شرماتے ہیں لوگوں سے اور نہیں شرماتے ہیں اللہ سے حالانکہ وہ ہر حال میں اور ہر وقت اُن کے ساتھ ہو۔

ان آیات کے علاوہ قرآن پاک نے اتنے مقامات پر کہ ان کا شمار کرنا بھی آسان نہیں اللہ تعالیٰ کی اسی علم کلی کی صفت کو علیم، خبیر، سمیع، بصیر، شہید، محیط کے الفاظ سے بیان کیا ہو۔ ان تمام آیات کا حاصل بھی یہی ہو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہو، ذرہ ذرہ کو اس کا علم محیط ہو، کوئی چیز اور کسی کا کوئی عمل اور کوئی حال اس سے پوشیدہ نہیں ہو۔

اللہ ہر چیز پر قادر ہو کوئی چیز اسکی قدرت سے باہر نہیں:-

اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور علم کلی کی طرح اس کے کمال قدرت کو بھی قرآن پاک نے طرح طرح سے اور اتنے مقامات پر بیان کیا ہو کہ اس سلسلہ کی آیات کا بھی شمار کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

" اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ " اور " وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ " قرآن مجید کی وہ آیتیں ہیں جن کو موقع بہ موقع بیسیوں جگہ دہرایا گیا ہو اور بہت سے مقامات پر اس کی قدرت کے کمال کو دوسرے عنوانات سے بیان فرمایا گیا ہو۔ ذرا ذیل کی آیات پڑھیے!

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۔ (ابراہیم ع ۳)

کیا تم نہیں دیکھتے، نہیں جانتے کہ اللہ نے بنائے آسمان و زمین ٹھیک جیسا کہ بننے چاہیے تھے (اور اس میں یہ قدرت ہو کہ) اگر چاہے تو فنا کر دے تم کو اور لے آئے (تمہاری جگہ) نئی خلق

اور اللہ کے لیے یہ ذرا بھی مشکل نہیں۔

اسی کو سورۂ نساء میں یوں فرمایا گیا

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَکَفٰی بِاللّٰهِ وَکِیْلًا اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْکُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَیَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ ط وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰالِكَ قَدِیْرًا ہ (نساء ع ۱۹)

اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ کافی ہے کارساز — اے لوگو اگر وہ چاہے تو تمکو فنا کردے اور تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے اور اللہ کو اس پر پوری قدرت ہے۔

اور سورۂ انعام میں فرمایا گیا ہے۔

قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْکُمْ بِهٖ ط (انعام ع ۵)

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ بتاؤ اگر اللہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں لے لے اور تمھارے دلوں پر مہر کردے تو کون رب ہے اسکے سوا جو تمھیں یہ چیزیں لا دیوے۔

اور سورۂ یٰس میں اس کی قدرت کی کچھ نشانیاں ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ہ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ہ (یٰس ع ۵)

اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو کرنا چاہتا ہے تو اس کو بس کہتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے، پس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

اور سورۂ فاطر میں فرمایا۔

وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ اِنَّهٗ کَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا ہ (فاطر ع ۵)

اور اللہ نہیں ہے ایسا کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اسکے بس سے باہر جا سکے، وہ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

بہرحال قرآن مجید خالق ہستی کے متعلق جو کچھ لوگوں کو بتانا چاہتا ہو اور اس کی جن صفات سے انسانوں کو خاص طور سے روشناس کرانا چاہتا ہو اُن میں سے ایک یہ بھی ہو کہ اس کی قدرت وسیع اور بے انتہا ہو اور وہ جو چاہے کر سکتا ہو۔ اور اپنے کسی ارادے کو پورا کرنے میں وہ نہ کسی کی مدد کا محتاج ہو۔ اور نہ اسے آلات واسباب کی ضرورت ہو وہ صرف اپنی مشیئت کے اشارہ سے اور صرف اپنے ارادہ اور فیصلہ سے سب کچھ کر سکتا ہو۔ نیست کو ہست اور ہست کو نیست کر سکتا ہو۔

(باقی)

بقیہ مضمون صفحہ ۵ "اس عبارت سے مفصلہ ذیل باتیں نکلتی ہیں اول تو یہ کہ حضرت صاحب کو اس بات کا الہام ہوا ہے کہ جس کو آپ کی دعوت پہنچی اور اس نے آپ کو قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں دوسرے یہ کہ اس کے نیچے وہی لوگ نہیں ہیں کہ جنھوں نے تکفیر میں جد وجہد کی بلکہ ہر ایک شخص جس نے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں" (تشحیذ الاذہان بابت ماہ اپریل ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۳۵)

نیز اسی تشحیذ الاذہان میں اسی سلسلہ میں صاف صاف لفظوں میں لکھا ہے

جب تبت اور سوئٹزرلینڈ کے باشندے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ماننے پر کافر ہیں تو ہندوستان کے باشندے مسیح موعود کے نہ ماننے سے کیونکر مومن ٹھیر سکتے ہیں جب حضرت کی مخالفت کے باوجود انسان مسلمان کا مسلمان رہتا ہے تو پھر آپ کی بعثت کا فائدہ ہی کیا ہوا" (صفحہ ۱۲۲)

اور اسی بنیاد پر مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھنا اور اُن کی نماز جنازہ میں شریک ہونا اور اپنی لڑکیوں کا اُن سے نکاح کرنا وہ بالکل اسی طرح ناجائز سمجھتے ہیں جس طرح کہ دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ یہ معاملات کرنا ناجائز ہے ـــــ یہ اُن کے یہاں کے عام مشہور مسائل ہیں اور اسی پر قادیانی امت کا عمل ہے۔

ان سب چیزوں کے سامنے آنے کے بعد قادیانی امت کو مسلمان قرار دینے کی صرف یہی صورت ہے کہ اسلام میں نئے نبیوں کے آنے اور اُن پر ایمان لانے کی گنجائش سمجھی جائے اور ظاہر ہے کوئی ایمان والا ہرگز اس کافرانہ گمراہی کو اپنے لئے پسند نہیں کر سکتا۔

حال میں بعض ایسے حضرات نے جن کی غلطی بہت سے مسلمانوں کی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے جو یہ مشورہ مسلمانوں کو دیا ہے کہ وہ قادیانیوں کو مسلمان سمجھیں۔ اُن کے متعلق یہی گمان ہے کہ وہ قادیانیت اور قادیانیوں کے اصل موقف اور مقام سے واقف نہیں ہیں اور اسی ناواقفی نے اُن سے یہ اتنی بڑی خطرناک غلطی کرائی ہے اور انھیں اس کا بالکل اندازہ نہیں ہے کہ قادیانیوں کے ساتھ اُن کی اس بزرگانہ نوازش میں مسلمانوں کے دین وایمان کا کتنا ضرر اور زیان پنہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو توفیق دے کہ وہ خود ہی اس کی تلافی کریں، واقعہ یہ ہے کہ پوری تلافی وہی کر سکتے ہیں۔

اس عاجز نے الفرقان کی گزشتہ اشاعت میں جو مختصر سا مضمون اس سلسلہ میں لکھا تھا جیسا کہ اُس میں بھی عرض کیا تھا ایک عرصہ سے (خاص کر "قادیانی مذہب" کی اشاعت کے بعد سے) یہ عاجز قادیانیوں کے بارہ میں کچھ لکھنے کی بالکل ضرورت نہیں سمجھتا تھا لیکن صرف اس ایمانی احساس نے اس وقت کچھ لکھنے پر مجبور کیا کہ اس تازہ غلط مشورہ سے گمراہی میں مبتلا ہونے والے کسی بندہ کو شاید میری یہ محنت بچا سکے

واللہ الھادی الی سبیل الرشاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معارف الاحادیث

دوزخ اور اس کا عذاب:۔

اس عنوان کے تحت جو حدیثیں درج کرنے کا ارادہ تھا وہ سب گذشتہ اشاعت میں درج ہو چکی ہیں، صرف ایک حدیث باقی رہ گئی تھی وہ آج ملاحظہ ہو۔

---

(۱۱۷) عن النعمان بن بشیر قال سمعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یقول انذرتکم النار انذرتکم النار فما زال یقولها حتی لو قام فی مقامی ھٰذا اسمعہ اھل السوق وحتی سقطت خمیصتہ کانت علیہ عند رجلیہ۔

(رواہ الدارمی)

(ترجمہ) حضرت نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سنا، آپ (اپنے ایک خطاب میں) فرماتے تھے، میں نے تمہیں آتش دوزخ سے خبردار کر دیا ہے، میں نے تمہیں دوزخ کے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے — آپ یہی کلمہ بار بار فرماتے تھے — (آگے حدیث کے راوی نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ آپ یہ بات اتنی بلند آواز سے فرما رہے تھے، کہ) اگر آپ اس جگہ ہوتے جہاں اس وقت میں ہوں (اور یہاں سے فرماتے) تو بازار والے بھی آپ کے اس ارشاد کو سن لیتے، اور (اس وقت آپ پر خود فراموشی کی ایک خاص کیفیت طاری تھی) یہاں تک کہ آپ کی کملی جو اس وقت آپ اوڑھے ہوئے تھے آپ کے قدموں کے پاس آگری۔ (داری)

(تشریح) بعض خطابات کے وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی خاص کیفیت ہوتی تھی، صحابہ کرام اس کی کوشش فرماتے تھے کہ ان خطابات کی روایت کے وقت اس خاص کیفیت کو بھی کسی طرح نقل کر دیں، چنانچہ

حضرت نعمان بن بشیر نے اس حدیث کے بیان میں جو اتنی تفصیل کی تو اس سے ان کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کو یہ بھی بتلادیں کہ اس خطاب کے وقت آپ کی یہ خاص حالت تھی اور دوسروں کو دوزخ سے ڈراتے ہوئے آپ خود اتنے متاثر تھے۔

جنت اور دوزخ کے بارے میں ایک اہم انتباہ!

(۱۱۸) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) حفت النار بالشہوات وحفت الجنۃ بالمکارہ۔ (متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، کہ:۔ دوزخ شہوات ولذات سے گھیر دی گئی ہے، اور جنت سختیوں اور مشقتوں سے گھری ہوئی ہے۔ (بخاری ومسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ معاصی، یعنی جو اعمال انسان کو دوزخ میں پہنچانے والے ہیں اُن میں عموماً نفس کی شہوت ولذت کا بڑا سامان ہے، اور طاعات یعنی جو اعمال انسان کو جنت کا مستحق بنانے والے ہیں وہ عموماً نفسِ انسانی کے لئے شاق اور گراں ہیں، پس جو شخص نفس کی خواہشوں سے مغلوب ہو کر معاصی کا ارتکاب کرے گا اُس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا، اور اللہ کا جو بندہ اللہ کی فرمانبرداری کی مشقتوں کو برداشت کرے گا اور خواہشات والی "خوشگوار اور لذیذ" زندگی کے بجائے احکام الٰہی کی اطاعت والی مجاہدے کی زندگی گذارے گا وہ جنت میں اپنا مقام حاصل کرے گا ——— اس سے اگلی حدیث میں اسی حقیقت کو ایک اور عنوان سے اور کسی قدر تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے۔

(۱۱۹) عن ابی ھریرۃ عن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) قال لما خلق اللہ الجنۃ قال لجبرئیل اذھب فانظر الیھا فذھب فنظر الیھا والی ما اعد اللہ لاھلھا فیھا ثم جاء فقال، اے رب وعزتک لا یسمع بھا احدٌ الا دخلھا ثم حفھا بالمکارہ ثم قال لجبرئیل اذھب فانظر الیھا قال فذھب نظر الیھا ثُمَّ جاء فقال اے رب وعزتک لقد خشیت ان لا یدخلھا احدٌ قال فلما

خلق الله النار قال یا جبرئیل اذھب فانظر الیھا قال فذھب فنظر الیھا ثم
جاء فقال ای رب وعزتك لا یسمع بھا احد فیدخلھا فحفھا بالشھوات
ثم قال یا جبرئیل اذھب فانظر الیھا قال فذھب فنظر الیھا فقال ای رب و
عزتك لقد خشیت ان لا یبقی احد الا دخلھا۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد ونسائی)۔

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان فرمایا، کہ جب اللہ نے جنت کو بنایا تو اپنے مقرب فرشتے جبرئیل سے فرمایا کہ تم جاؤ اور اس کو دیکھو (کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا ہے اور اس میں کیسی کیسی نعمتیں پیدا کی ہیں) چنانچہ وہ گئے اور انھوں نے جاکر جنت کو اور راحت و لذت کے ان سامانوں کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اس میں تیار کئے ہیں اور پھر حق تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خداوندا! آپ کی عزت و عظمت کی قسم (آپ نے تو جنت کو ایسا حسین بنایا ہے اور اس میں راحت و لذت کے ایسے ایسے سامان پیدا کئے ہیں کہ میرا خیال ہے، کہ) جو کوئی بھی اس کا حال سن پائے گا وہ اس میں ضرور پہنچے گا۔ (یعنی اس کا حال سنکر وہ دل وجان سے اس کا طالب بن جائے گا اور پھر اس میں پہنچنے کے لئے جو اچھے اعمال کرنے چاہییں وہ پوری مستعدی کے ساتھ وہ ہی اعمال کرے گا، اور جن برے کاموں سے بچنا چاہئے ان سے وہ پوری طرح بچے گا اور اس طرح اس میں پہنچ ہی جائے گا)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جنت کو سختیوں اور مشقتوں سے گھیر دیا (یعنی جنت کے گرد شرعی احکام کی پابندی کا باڑہ لگا دیا، جو طبیعت اور نفس کے لئے بہت شاق اور گراں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں پہنچنے کے لئے احکام کی اطاعت کی گھاٹی کو عبور کرنے کی شرط لگا دی جس میں طبیعتوں کو اور نفسوں کو بڑی سختی اور دشواری محسوس ہوتی ہے) اور پھر جناب جبرئیل سے فرمایا کہ اب پھر جاؤ اور پھر اس جنت کو (اور اسکے گرد اگر دلگائی ہوئی نئی باڑہ کو) دیکھو ـــــ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں، کہ ـــــ وہ پھر گئے، اور جاکر پھر جنت کو دیکھا، اور اس مرتبہ آکر فرمایا، کہ :- خداوندا! قسم آپکی عزت و عظمت کی، اب تو مجھے یہ ڈر ہے کہ اس میں کوئی بھی نہ جا سکے گا (مطلب یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لئے شرعی احکام کی پابندی کی گھاٹی کو عبور کرنے کی جو شرط آپ کی طرف سے لگائی گئی ہے وہ نفس و نفسانی

خواہشات رکھنے والے انسان کے لئے اتنی شاق اور اس قدر دشوار ہے کہ اس کو کوئی بھی پورا نہ کر سکے گا، اسلئے مجھے ڈر ہے کہ اب اس جنت کو شاید کوئی بھی حاصل نہ کر سکے گا) ——— رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ نے جب دوزخ کو بنایا تو پھر جبرئیلؑ سے فرمایا، کہ:۔ جاؤ اور ہماری بنائی ہوئی دوزخ کو (اور اس میں انواع و اقسام کے عذاب کے جو سامان پیدا کئے گئے ہیں اُن کو) دیکھو، چنانچہ وہ گئے اور جا کر اس کو دیکھا، اور آ کر عرض کیا:۔ خداوندا! آپ کی عزت کی قسم (آپ نے دوزخ کو تو ایسا بنایا ہے کہ میرا خیال ہے، کہ) جو کوئی بھی اس کا حال سُن لے گا وہ کبھی بھی اس میں نہ جائے گا ——— (یعنی ایسے کاموں کے پاس نہیں جائے گا جو آدمی کو دوزخ میں پہنچانے والے ہیں) ۔ اِسکے بعد اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو شہوات اور نفسانی لذات سے گھیر دیا (مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات والے وہ اعمال جن میں انسان کی طبیعت اور نفس کے لئے بڑی کشش ہے، جہنم کے گرد اُن کی باڑہ لگا دی، اور اس طرح جہنم کی طرف جانے کے لئے ایک بڑی کشش پیدا ہو گئی) اور پھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ سے فرمایا:۔ اب پھر جا کر اُس دوزخ کو دیکھو ——— رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں، کہ:۔ جبرئیلؑ پھر گئے اور جا کر اس کو (اور اسکے گرد شہوات و لذات کی جو باڑہ لگائی گئی تھی اس کو) دیکھا، اور آ کر عرض کیا:۔ خداوندا! آپ کی عزت و جلال کی قسم! اب تو مجھے یہ ڈر ہے کہ سب انسان اُسی میں نہ پہنچ جائیں (مطلب یہ ہے کہ جن شہوات و لذات سے آپ نے جہنم کو گھیر دیا ہے اُن میں نفس رکھنے والے انسانوں کے لئے اتنی زبردست کشش ہے کہ اُن سے رکنا بہت مشکل ہے اور اسلئے خطرہ ہے کہ بے چاری ساری اولادِ آدم نفسانی لذات و شہوات کی کشش سے مغلوب ہو کر دوزخ ہی میں نہ پہنچ جائے)۔

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

(تشریح) حدیث کا اصل مقصد اور اس میں ہمارے لئے خاص سبق یہ ہے کہ نفسانی خواہشات جو بظاہر بڑی لذیذ اور بڑی مرغوب ہیں ہم جان لیں کہ ان کا انجام دوزخ کا دردناک عذاب ہے جس کا ایک لمحہ زندگی بھر کے عیشوں کو بھلا دے گا، اور احکام الٰہی کی پابندی والی زندگی جس میں ہمارے نفسوں کو گرانی اور سختی محسوس ہوتی ہے اس کا انجام اور منتہیٰ جنت ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عیش و راحت کے وہ سامان ہیں جن کی دنیا کے کسی انسان کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

(۱۲۰) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ما رایت مثل النار نام ھاربھا ولا مثل الجنۃ نام طالبھا۔ (رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:۔ میں نے نہیں دیکھی دوزخ کی طرح کی کوئی خوفناک بلا، کہ سوتا ہو اُس سے بھاگنے والا، اور نہیں دیکھی میں نے جنّت کی طرح کی کوئی مرغوب ومحبوب چیز، کہ سوتا ہو اس کا چاہنے والا۔ (ترمذی)

(تشریح) انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی بلا سے، مثلاً اپنی طرف آنے والے کسی خوفناک درندے سے، یا اپنا تعاقب کرنے والے کسی سخت ظالم اور طاقتور دشمن سے جان بچانے کیلئے بھاگتا ہے تو بس بھاگا ہی چلا جاتا ہے اور جبتک کہ اطمینان نہ ہو جائے نہ سوتا ہے اور نہ آرام کرتا ہے، اسی طرح جب کسی انتہائی محبوب ومرغوب چیز کے حاصل کرنے کے لئے تگ ودو کرتا ہے تو اثناء راہ میں نہ تو سوتا ہے نہ چین سے بیٹھتا ہے۔

لیکن دوزخ اور جنّت کے بارے میں انسانوں کا عجب حال ہے، دوزخ سے بڑھ کر کوئی خوفناک بلا نہیں، مگر جن کو اُس سے بچنے کے لئے بھاگنا دوڑنا چاہئے وہ غفلت کی نیند سوتے ہیں، اور جنّت جس کے حاصل کرنے کے لئے دل وجان سے جدوجہد کرنا چاہئے اسکے چاہنے والے بھی محوِ خواب ہیں۔ ؎

پڑے غفلت کے پڑگئے ہیں، بلا کی نیندیں اُمنڈ رہی ہیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے، کہ حشر تک جاگنا قسم ہے

ہادم اللذّات

(از۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

(۲)

اس سلسلہ کی پہلی قسط الفرقان کی گذشتہ سے پیوستہ اشاعت میں یعنی ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی، اس ناچیز نے یہ خیال کرکے کہ الفرقان کے بعض ناظرین "ہادم اللذات" کا مطلب شاید نہ سمجھ سکیں گے، بجائے اسکے عنوان "یادگار موتیں" قائم کردیا تھا، لیکن بعد میں مولانا نے مجھے مطلع فرمایا، کہ:۔ اس عنوان کے تحت جو کچھ وہ اس سلسلہ میں تحریر فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں اُس سب کیلئے حاوی اور جامع "ہادم اللذات" ہی کا عنوان ہوسکتا ہے، یا اسکے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ۔ اسلئے اب یہ سلسلہ انشاء اللہ اسی عنوان سے شائع ہوتا رہے گا۔ "ہادم اللذّات" کے معنی ہیں "زندگی کی لذتوں کو ختم کردینے والی"، یعنی موت کی یہ ایک خاص تعبیر ہے۔ (مدیر)

مرنے کے بعد زندگی کے آثار کا تجربہ اس میں شک نہیں، کہ

یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا — کاشکہ میں ہوتا خاک دھول

کی آرزو رکھنے والوں کے لئے حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ شاید مستحق توجہ بھی نہ ہو، لیکن جو زندہ نہ تھا، وہی زندہ ہوا، اپنی آرزو کے بغیر زندہ ہوا، اُسنے نہیں چاہا تھا، مگر سُننے لگا، نہیں چاہا تھا، اور دیکھنے لگا، نہیں چاہا تھا، اور سمجھنے لگا، پھر وہی زندہ ہونے کے بعد زندگی اور زندگی کے آثار سے محرومی کی تمنا بھی رکھتا ہو، چاہتا ہو کہ مرنے کے بعد مٹی میں مل جاؤں، خاک دھول بن کر اڑ جاؤں، تمنا تو اسکی وہ کرسکتا ہے،

لیکن اس کی یہ تمنا پوری ہوگی؟ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی ہو کر رہے گا؟ آخر کس بھروسے پر اس یقین و اطمینان کی وہ بنیاد قائم کرے۔

قرآن میں اطلاع دی گئی ہے، کہ تراب یعنی خاک دھول بن جانے کی یہ آرزو مرنے والوں کی پوری نہ ہوگی، بلکہ بجائے اسکے

یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدَاهُ۔ ( )	دیکھے گا آدمی اُس دن (ان چیزوں کو) جنھیں اسکے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا۔

الغرض بُرے بھلے سارے اعمال اور کرتوت مرنے والوں کے سامنے آجائیں گے۔ نہ دیکھنے کی تمناؤں کا پالنے والا ان کو دیکھے گا، وہی اس کو دکھائے جائیں گے، دیکھنے پر وہ مجبور کیا جائے گا، قرآن نے اسی کا نام "عذاب قریب[1]" رکھا ہے، فرمایا گیا ہے:۔

إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا۔ (سورۃ النبا)	ہم نے ڈرایا تم کو نزدیک والے دکھ (عذاب قریب) سے اُس دن دیکھے گا آدمی (ان چیزوں کو) جنھیں اسکے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا۔

بہرحال ترابیوں (یعنی مرنے کے بعد خاک دھول بن جانے کی تمنا رکھنے والوں) کا خیال خواہ کچھ ہی ہو، ان کو باور کرایا جاتا ہے، زندگی عطا کرنے والا خود یقین دلا رہا ہے کہ ملنے کے بعد نہ زندگی ہی چھنے گی، نہ زندگی کے آثار چھنیں گے، دیکھنے والے آج جو کچھ دیکھ رہے ہیں کل بھی دیکھیں گے، بلکہ زیادہ بہتر طریقہ پر دیکھیں گے۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ۔ (ق)	اٹھالیا ہم نے تجھ سے تیرے پردے کو، پس آج دید کی قوت تیری زیادہ تیز ہے۔

---

[1] یہ اور اسی قسم کی متعدد قرآنی آیتوں میں جہنمی عذاب کے سوا اس عذاب کا ذکر کیا گیا ہے جو مرنے کے ساتھ ہی مرنیوالوں کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں پیش آجاتا ہے، خود قریب کا لفظ بتا رہا ہے کہ مستقبل بعید کے مقابلے میں یہ ایک معاملہ ہے جو خاکی زندگی کی منزل سے نزدیک ہے۔ ۱۲

کا مطلب آخر اسکے سوا اور کیا ہے، کہ بجائے گھٹنے کے، دیکھنے کی قوت مرنے کے بعد زیادہ بڑھ جائے گی، یعنی خاکی زندگی والی بینائی کی رسائی جن چیزوں تک نہ تھی، مرنے والوں کو وہ بھی دکھائی دینے لگیں گی، ان سے بھی پردہ ہٹ جائے گا۔

اور جب واقعہ یہی ہے، واقعات جس کے قانون اور جس کی مرضی کے تابع ہیں، وہی جب خبر دے رہا ہے۔ تو ہم ان کی پروا کیوں کریں، جن کی مرضی کی تابع نہ ان کی زندگی ہے، اور نہ ان کی موت، نہ اپنی خوشی سے وہ زندہ ہوگئے، اور نہ اپنی خوشی سے مریں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ جس کی مرضی سے سب کچھ ہو رہا ہے، قرآن میں یہ فرماتے ہوئے، کہ:۔

كتب على نفسه الرحمة — اُسنے مہربانی اور رحم کو اپنا شیوہ بنالیا ہے

اپنی اسی مہربانی اور رحمت کا اقتضاء بتاتے ہوئے وہی ارشاد فرمارہا ہے، کہ:۔

ليجمعنكم يوم القيمة لا ريب فيه — تم سب کو اکٹھا کریں گے ہم قیامت کے دن جس میں شک نہیں ہے۔ (الانعام)

حاصل جس کا یہی ہے کہ اپنی مہربانی سے مرنے والوں کو پھر ان لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع دیا جائے گا جن سے اپنی خاکی زندگی میں ہم ملے تھے، اور اُن سے بھی جن سے ملنے کا موقع مرنے والوں کو اس زندگی میں نہیں ملا تھا، مگر ترابیوں کا طبقہ پھیلاتا پھرتا ہے، کہ مرنے والوں سے ملنے کی کوئی امکانی صورت باقی نہیں رہی۔ ملانے والا کہتا ہے، کہ جیسے پہلے تم میں ایک کو دوسرے میں نے ملایا تھا، میری رحمت کا اقتضاء ہے کہ ان ہی ملنے والوں سے تم کو پھر ملاؤں۔ لیکن ترابی چلاتے پھرتے ہیں کہ بچھڑنے کے بعد مرنے والوں سے ہم کبھی مل نہیں سکتے، کیسی عجیب بات ہے۔

مشہور حنبلی امام ابوالوفاء ابن عقیل[1] کے صاحبزادے کا عین ریحانِ شباب میں انتقال ہوا، کُل

---

[1] چھٹی صدی کے مشہور عالم و محدث ہیں علاوہ دوسری کتابوں کے چار سو جلدوں میں ایک علمی انسائیکلو پیڈیا (الفنون) کے نام سے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

چودہ[۱۴] بہاریں اس بچے پر گزری تھیں، اسی کو دفن کرتے ہوئے ابن عقیل نے کہا تھا:۔

لولا ان القلوب توقن باجتماع	دلوں کو اگر اس کا یقین نہ ہوتا کہ دوسری دفعہ بھی
ثان لا نفطرت المرائر لفراق	لوگ ملائے جائیں گے تو دوستوں کے فراق سے
المحبوبین۔ (شذرات الذہب ص۳۶ جلد۴)	لوگوں کے پتے پھٹ پڑتے۔

مگر کیا کیجئے جن کو باقی رہنے کی ضمانت دی گئی ہے وہی فانی ہونے اور مٹنے پر اصرار کر رہے ہیں، اللہ اللہ حرماں نصیبی کی وہ موت جس کے بعد سوچا جاتا ہو کہ آگے کچھ نہیں ہے۔

کوئی عقلی نتیجہ ہوتا، تو جیسے ہر عقلی نتیجے میں شک وشبہ کی گنجائش ہوتی ہے، ہم شک بھی کر سکتے تھے، لیکن جو ماضی کا بھی خدا ہے اور حال کا بھی، مستقبل کا بھی، ازل کا بھی، ابد کا بھی، ظاہر کا جاننے والا بھی، باطن کا جاننے والا بھی، سب کچھ جس کے حکم سے ہو رہا ہے، جب وہی "کچھ نہیں" کے اس وہم بے بنیاد وہم کے مقابلے میں ان لوگوں کو خطاب کرکے فرما رہا ہو، جو قبروں پر بھی گذرتے ہیں، لیکن یہ سوچ کر کہ مٹی کے ڈھیر کے سوا اب کچھ باقی نہیں رہا، اسی لئے اُن میں قبروں سے چونک نہیں پیدا ہوتی، اُن ہی کو چونکایا گیا ہے، کہ:۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ۔	ہرگز نہیں (وہ سارے اوہام بے بنیاد ہیں، جو تم باور کئے بیٹھے ہو) بلکہ تم عنقریب جانو گے (مرنے کے ساتھ ہی) اور پھر ہرگز نہیں عنقریب تم جانو گے۔
(سورۂ التکاثر)	

یہ سورۂ التکاثر کے مشہور الفاظ ہیں، یہاں بھی المقابر کا ذکر کرکے ان لوگوں کو جو قبروں ہی تک زندگی

(ص۲۴ کا بقیہ حاشیہ)
تنہا لکھی تھی۔ بعضوں کا بیان ہو کہ آٹھ سو جلدوں میں یہ کتاب تھی۔ ۸۳ سال کی عمر میں وفات ہوئی، نزع کے وقت گھر کی عورتوں نے واویلا شروع کیا، ابن عقیل نے جھڑکتے ہوئے کہا:۔

"پچاس سال سے جس وقت کا منتظر تھا، جب وہ سامنے آیا تو تم شور مچاتی ہو، چھوڑ دو مجھے تاکہ اس مبارک گھڑی کو خوش آمدید کہوں" (ص۳۹۔ جلد۴۔ شذرات)

اور زندگی کے آثار کو محدود سمجھتے ہیں۔ اطلاع دی گئی ہے کہ علم و احساس قبری منزل کے بعد بھی آدمی سے الگ نہیں ہوتا، بلکہ نئے نئے معلومات سے آدمی کے علمی احساسات کا مرنے کے بعد تعلق قائم ہو جاتا ہے، پھر کچھ مدت بعد جو حشر کے لفظ کا اقتضاء ہے، یعنی قیام قیامت کے بعد علم کے نئے دور میں ہم اور ہمارے علمی احساسات داخل ہوں گے، (اور دنیا میں) جن چیزوں کو نہ آنکھوں نے دیکھا تھا، نہ کانوں نے سنا تھا، نہ دلوں میں جن کا خطرہ گذرا تھا، وہی سامنے آئیں گی، اور ہمارے علمی احاطہ میں وہی شریک ہو جائیں گی۔

کچھ بھی ہو، موت کا یہ مطلب کہ زندگی اور زندگی کے احساسات سے مرنے والے محروم ہو جاتے ہیں، اس کی آرزو تو آرزو کرنے والے کر سکتے ہیں، لیکن موت اور حیات کا جو خالق ہے، اُس نے اس کا انکار کیا ہے، اسی لئے زید بن خارجہ صحابی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا قصہ ہو، یا ربیع بن خراش رض کا واقعہ، یعنی ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد بھی تھوڑی دیر کے لئے لوگوں کو ان سے بات چیت کرنے اور ان کی گفتگو سننے کا موقع جو ملا، تو کفر کی ترابی عقلیت سے ممکن ہے ہمارے محدثین اور ارباب سیر کی یہ اطلاعیں اچٹ جائیں، لیکن قرآنی عقلیت میں ان کی گنجایش پیدا کرنے کے لئے کیا کسی تقریر اور توجیہ کی ضرورت ہے؛ ناشکری اور نمک حرامی کی زندگی بسر کرنے والوں میں اگر یہ آرزو پیدا ہو، کہ موت ہی پر ان کا قصہ ختم ہو جائے، تو اسکے سوا ان کا مجرم دماغ بچ نکلنے کی تجویز اور سوچ کیا؟۔

سانپ کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ بندر اپنی آنکھیں میچ لیتا ہے، لیکن بندر کو کون سمجھائے کہ سانپ اور اُس کا وجود تیری نگاہوں کا تابع نہیں ہے، ماننے والوں کو چاہئے کہ اس قسم کی بوزنیائی ذہنیت کی پرواکئے بغیر ایمان کی روشنی میں آگے بڑھتے چلے جائیں، اس روشنی کے بڑھانے میں جن چیزوں سے مدد ملے، ان کو خود بھی پڑھیں، پڑھ کر دوسروں کو بھی سنائیں۔

آخر ہماری ان ہی کتابوں میں بیداری نہیں، بلکہ نیند تک کی حالت کے ایسے مشاہدوں کا جو ذکر کیا گیا ہے، مثلاً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دو صحابیوں یعنی حضرت عوف بن مالک اور صعب بن جثامہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا واقعہ جو حافظ ابن قیمؒ نے بھی کتاب "الروح" میں حماد بن سلمہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کا ذکر اس سلسلہ کی پہلی قسط میں کیا جا چکا ہے، آخر اس قسم کے واقعات میں استبعاد کی کیا بات ہے۔

اور وہ تو خیر ایک انفرادی واقعہ ہے، عہدِ صحابہؓ ہی میں اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ پیش آیا، جس میں معاملہ حکومت تک پہونچا، جس کا حاصل یہ ہے کہ مسیلمہ کذاب سے حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے عہدِ خلافت میں جو جنگ یمامہ میں مسلمانوں کو لڑنی پڑی، اُس جنگ میں دوسرے صحابیوں کے ساتھ حضرت ثابت بن قیس بن شماس انصاری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بھی شریک تھے، اور اسی جنگ میں وہ شہید ہوئے ان کی شہادت کا واقعہ عجیب ہے۔

دشمن کے ایک آدمی نے ان پر حملہ کیا، تلوار چلائی، جس سے حضرت ثابتؓ کی ٹانگ کٹ کر جسم سے الگ ہو گئی، کہتے ہیں کہ اپنی اسی کٹی ہوئی ٹانگ کو حضرت ثابتؓ نے اٹھالیا، کامل

ضربه بها، فقتله، یہی کٹی ہوئی ٹانگ انھوں نے دشمن پر دے ماری

(ص۱۴۱ جلد ۳) جس سے وہ ختم ہو گیا۔

بعد کو حضرت ثابتؓ بھی شہید ہو گئے، ان کی شہادت کے بعد خواب میں فوج کے ایک سپاہی نے دیکھا کہ حضرت ثابت اُس کے سامنے کھڑے ہوئے فرما رہے ہیں:—

"میری ایک وصیت ہے، ایسا نہ ہو، کہ تم اس کو خواب و خیال ٹھہرا کر ٹال دو، اور وہ یہ ہے کہ میں جب قتل کر دیا گیا، تو خود ہماری فوج کے ایک آدمی نے میرے بدن سے وہ زرہ اُتار لی، جسے میں پہنے ہوئے تھا، زرہ اُتارنے والے سپاہی کا خیمہ فوجی پڑاؤ کے آخری حصے میں ہے، ایک گھوڑا بھی اُسکے خیمے کے سامنے لمبی ڈوری میں بندھا ہوا ہے، اُس شخص نے زرہ پر ایک ہانڈی اوندھا دی ہے، اور ہانڈی پر کجاوے کو ڈال دیا ہے"۔

اِس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد حضرت ثابتؓ نے خواب دیکھنے والے سے کہا:—

"تم فوج کے سپہ سالار خالد بن ولید کے پاس جاؤ، اور واقعہ کا ذکر کر کے اُن سے کہنا کہ جو پتہ دے رہا ہوں اسی پتہ سے میری زرہ برآمد کر کے اپنے قبضہ میں اس کو لے لیں، مدینہ پہونچکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلیفہ ابو بکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو اس واقعہ سے مطلع کر کے میری طرف سے یہ پیغام پہونچا دیں کہ مجھ پر فلاں فلاں آدمی کا قرض ہے،

(اس قرض کو زرہ فروخت کرکے ادا کر دیا جائے)"

خواب دیکھنے والا سپاہی بیدار ہوا، اور سیدھے حضرت خالد بن ولید کے پاس پہونچا، واقعہ کی اطلاع دی، اُسی وقت آدمی روانہ کیا گیا، اور جہاں زرہ کا پتہ دیا گیا تھا، وہیں زرہ ہانڈی کے نیچے ملی، جس پر کجاوہ پڑا ہوا تھا، حضرت خالدؓ نے وصیت کے مطابق ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں مدینہ پہونچ کر زرہ کو پیش کر دیا۔ زرہ فروخت کی گئی، اور بقول حافظ ابن قیمؒ:۔

اتفق خالد وابوبکر الصدیق والصحابۃ	خالد بن ولید اور ابوبکر صدیق اور صحابہ نے
معہ علی العمل بھذہ الرؤیا وتنفیذ	متفق ہو کر اس خواب کے مطابق فیصلہ کیا، اور
الوصیۃ بھا وانتزاع الدرع ممن	وصیت نافذ کی گئی، جس کے قبضہ میں زرہ تھی اس سے
ھی فی یدہ بھا۔ (ص۲۱۔ کتاب الروح)	چھینی گئی۔

بہرحال خواب میں مرنے والے زندہ رہ جانے والوں سے جب ربط پیدا کر سکتے ہیں، اپنے معلومات سے آگاہ کر سکتے ہیں، تو اسی ربط کا تجربہ بحالتِ بیداری بھی بعض لوگوں کو اگر کرایا گیا ہو، تو اس پر کیوں تعجب کیا جائے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ بجائے اضطراری نیند کے اگر اپنے اوپر اختیاری نیند طاری کر لینے کی تھوڑی بہت مشق بھی بہم پہونچا لی جائے، یعنی سونے میں حواس جیسے معطل ہو کر اپنے وظائف چھوڑ بیٹھتے ہیں، تعطل کی یہی کیفیت حواس پر بیداری کی حالت میں بھی طاری ہو جائے، اور باہر سے معلومات کی آمد و رفت کا سلسلہ آدمی میں بند ہو جائے، اسی طرح جو معلومات پہلے سے دل و دماغ میں موجود ہوں، انکے خطرات کو بھی روک لیا جائے، تو اختیاری نیند کی اس حالت کو طاری کر لینے کے بعد بھی مرنے والوں سے ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے صوفیہ نے مراقبۂ کشف قبور کی جو صورت لکھی ہے اُس کا حاصل یہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی کتاب "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں کشفِ قبور کے اُس طریقے کا جو سادات نقش بند میں مروج تھا، اسی کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے، کہ:۔

یجلس محاذی القبر ویقرء ایۃ الکرسی	قبر کے سامنے آدمی بیٹھ جائے، اور ایک دفعہ آیۃ الکرسی

مرة وسورة الاخلاص اثنا عشر مرة وتخلى نفسه من كل خاطر فكل ما لاح له بعد ذلك فهو منه ۔

(ص۵۷)

بارہ دفعہ سورۂ اخلاص (قل ھو اللہ احد) پڑھے اور اپنے آپ کو ہر قسم کے خطرہ سے خالی کرلے، اس عمل کے بعد جو کچھ محسوس ہو، سمجھنا چاہیے کہ وہ مرنے والے کی طرف سے ہے۔

آیۃ الکرسی اور سورۂ اخلاص پڑھنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کا ثواب مرنے والے تک جب پہونچتا ہے، یا خود ان آیتوں کی روشنی جب مرنے والے تک پہونچتی ہے، تو پڑھنے والے کی طرف اس کی رُوح متوجہ ہو جاتی ہے، اُس وقت نیند کی اختیاری حالت مراقبہ کرنے والا اپنے اوپر طاری کرلے، یعنی بیرونی اور اندرونی خطرات کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلے، تو شاہ صاحبؒ کا بیان ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ ربط قائم ہونے کی صلاحیت مراقبہ کرنے والے میں پیدا ہو جاتی ہے، اور اس حال کے بعد جو کچھ مراقبہ میں محسوس ہو، اُس کو مرنے والے کی طرف سے سمجھنا چاہیے[1]

اس مراقبہ کے آثار و نتائج کا تجربہ آئے دن لوگوں کو ہوتا رہتا ہے، مجھ سے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (مرحوم) براہِ راست بیان کرتے تھے کہ مولانا اعلم علی صاحب نگینوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ اسحاقؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے، ان کی کم عمری کے زمانہ میں بھیکم پور نواب صاحب کے وطن تشریف لایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یہ صورت پیش آئی، کہ چند آدمیوں کے ساتھ مولانا قبرستان کی طرف تشریف لے گئے، نواب صاحب بھی ساتھ تھے، اچانک ایک قبر پر مولانا اعلم علی صاحبؒ کو دیکھا کہ کھڑے ہو گئے، اور تھوڑے وقفہ کے بعد فرمانے لگے، کہ:-

---

[1] صوفیہ کے یہاں اس قسم کی بہت سی چیزیں ہیں جو تجربہ اور مشاہدہ سے معلوم ہوئی ہیں اور شریعت میں انکی نفی نہیں فرمائی گئی ہے اسلئے جنھوں نے تجربہ نہیں بھی کیا ہے اُن کے لئے انکار کی کوئی وجہ نہیں، ہاں یہ چیزیں کمالات مقصودہ میں سے ہرگز نہیں ہیں، بلکہ ان کا حال کچھ علوم و فنون کا سا ہے، اور ان میں عوام کے لئے فتنہ کا پہلو بہت قابل توجہ ہے، اور انکے دین کے تحفظ کی رعایت خواص کے فرائض میں سے ہے۔ ۱۲ (نعمانی غفرلہ)

"یہ ایک خاتون کی قبر ہے، مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ جوتیوں کی ایک جوڑی کسی بیوی صاحبہ نے امانتہً ان کو رکھنے کے لئے دی تھی، یہ امانت واپس نہ ہو سکی، اور میرا انتقال ہو گیا میں چاہتی ہوں کہ جس کی امانت ہے اُس تک یہ امانت پہونچا دی جائے، پتہ یہ بتاتی ہیں کہ اُن کے مکان کے فلاں کمرے کے گوشہ میں صندوق ہے، صندوق کپڑوں سے بھرا ہوا ہے، ان ہی کپڑوں کے نیچے آخری تہ میں جوتیوں کی یہ جوڑی ہے"

نواب صاحب کا بیان ہے، کہ قبرستان سے واپس ہو کر ٹھیک ان کے بتائے پتہ کے مطابق وہ جوڑی جوتیوں کی ملی، جس کی امانت تھی، اُن سے پوچھا گیا، انھوں نے بھی تصدیق کی کہ امانتہً رکھنے کیلئے میں نے انکو دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ مولانا اعلم علی صاحبؒ جو باہر کے رہنے والے تھے اُن کے لئے اس کی صورت ہی کیا تھی کہ گھر کے اندرونی کمرے کے صندوق، اور صندوق کے کپڑوں کے نیچے جوڑی جوتیوں کی رکھی ہوئی ہے، اور کس کی ہے، ان باتوں کو کیسے جان سکتے تھے۔

اور ایک مولانا اعلم علی صاحب ہی نہیں، حال حال تک ہم میں ایسے پاک نفوس کی کافی تعداد تھی جن پر اہل قبور کے حالات کا انکشاف ہو جاتا تھا، مرنے والوں سے وہ ربط پیدا کر لیتے تھے، بلکہ یوں بھی بغیر کسی مراقبہ کی حالت کے زندوں پر وفات یافتہ بزرگوں کو اثر انداز ہوتے ہوئے پایا گیا ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا محمود حسن شیخ الہند (رحمۃ اللہ علیہ) اس قصہ کو بیان کرتے تھے، کہ ایک دفعہ دار العلوم میں حدیث سُننے کے لئے ایک طالب علم آیا، وہ براہِ راست میرے پاس پہونچا، اور خواہش ظاہر کی کہ حدیث کے اسباق سُننے کی اجازت اسے دیجائے، لیکن اسی کے ساتھ اس نے کہا کہ میری علمی قابلیت اتنی نہیں ہے، کہ دار العلوم کے امتحان میں شریک ہو سکوں، چاہتا تھا کہ امتحان سے بھی اس کو مستثنیٰ قرار دیا جائے اور مدرسہ کے مطبخ سے کھانا بھی جاری کرا دیا جائے۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس کی عجیب وغریب خواہش سُنکر میں نے کہا، کہ:

"امتحان کے بغیر مدرسہ کی امداد کے قانوناً تم مستحق نہیں ہو سکتے"

بیچارا مایوس ہو کر میرے سامنے سے اُٹھ کر چلا گیا، ادھر وہ روانہ ہوا، کہ ٹھیک اسی وقت ڈاکیہ آیا، اور

ایک منی آرڈر پانچ روپیہ کا، جو بھوپال سے کسی نے بھیجا تھا، لایا۔ منی آرڈر کے کوپن میں لکھا ہوا تھا:۔

"کسی وجہ سے ایک سال کیلئے پانچ روپیہ ماہوار وظیفہ ایسے طالب علم کے نام میں جاری کرنا چاہتا ہوں، جو قانوناً مدرسہ کی امداد کا مستحق نہ ہو۔"

یہ اسی طالب علم کی غیبی امداد ہے، مولانا نے یہ خیال کرتے ہوئے طالب علم کو بلاکر روپیے اسی کے حوالہ کر دیئے، اور حدیث سننے کی اجازت دی گئی، سال بھر تک وہ حدیث کے اسباق میں شریک رہا، امتحان کا زمانہ جب آیا، مدرسہ چھوڑ کر چلا گیا، ایک مدت گذر گئی، کئی سال بعد پھر وہ ایک دفعہ میرے پاس آیا۔ کہاں تھے، کیا کرتے تھے، ان باتوں کے دریافت کرنے پر اسنے یہ ماجرا بیان کیا، کہ:۔

"دیوبند سے رخصت ہونے کے بعد پنجاب کے کسی قصبہ کی مسجد میں وہ امام ہو گیا، وہاں کے باشندے غیر معمولی طور پر اس سے مانوس ہو گئے، مزے سے گذرنے لگی، اسی عرصہ میں ایک مولوی صاحب اس قصبہ میں پہونچے، واعظ تھے، لوگ ان سے متاثر ہوئے، اُن کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس قصبہ کی مسجد کا امام دیوبندی ہے، تو قصبہ کے مسلمانوں پر اصرار کیا، کہ اس وہابی کو مسجد سے نکال دو، لوگوں نے کہا کہ دونوں مناظرہ کر کے ہم لوگوں پر ثابت کر دیجئے، کہ آپ دونوں میں حق پر کون ہے مولوی صاحب تیار ہو گئے، لوگوں نے مجھے بھی مناظرے پر آمادہ کیا، لیکن میں یہ سوچ کر کہ میری علمی قابلیت معمولی ہے، مناظرے سے گھبرایا۔ لیکن چارہ کار اسکے سوا اور کچھ نظر نہ آیا، کہ میں بھی آمادہ ہو جاؤں۔ بستی کے لوگ مسجد میں جمع ہوئے، ایک طرف میں بیٹھا، اور سامنے وہی واعظ مولوی صاحب تھے، میری آس تو اللہ کے ساتھ لگی تھی، ابھی گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ایک صاحب میرے بازو میں آکر بیٹھ گئے، اور مجھ سے کہتے ہیں، کہ بے دھڑک جو کچھ پوچھا جائے اُس کا جواب دو، واعظ مولوی صاحب نے کچھ دریافت کیا، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری زبان سے جواب میں کیا ادا ہو رہا تھا، مگر زبان بول رہی تھی، چند ہی فقروں کے بعد دیکھا کہ واعظ صاحب مبہوت ہو کر مجھ سے معافی چاہ رہے ہیں، مجھ سے غلطی ہوئی، آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہی صحیح ہے، یہ یا اسی

قسم کے الفاظ کہہ رہے ہیں، یہ حال تو اُن پر طاری تھا، اور جو صاحب میرے بازو میں آکر بیٹھ گئے تھے، دیکھا کہ وہ غائب ہو گئے۔"

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے، کہ:-

"میں نے پوچھا کہ اُن کی شکل و صورت کیا تھی، جو کچھ بیان کیا، وہ حضرت الاستاذ مولٰنا محمد قاسم (رحمۃ اللہ علیہ) کا خط و خال تھا"

یہی سمجھا گیا، کہ اس مظلوم کی امداد کے لئے حضرت نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی رُوح حاضر ہو گئی تھی[1]

---

[1] میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کے نصوص قطعیہ میں جب ہم یہ پاتے ہیں، کہ ملکوتی ارواح یعنی فرشتوں سے امداد مسلمانوں کو پہونچائی گئی، تو بجائے ملکوتی ارواح کے انسانی روحوں سے اسی قسم کی اعانت بندوں کی حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اگر کی گئی ہو، تو اس میں شرک یا شائبہ شرک کا دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے۔ ۱۲
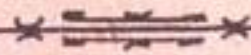
جدید حیوانی معاشیات

اور

اسلام کی انسانی معاشیات

(از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی)

گذشتہ سے پیوستہ

اسلام کی نظر میں جب انسان نرا معاشی حیوان نہیں تو اسلام کی انسانی معاشیات کو بھی آج کل کی نری حیوانی معاشیات سے دور کا بھی کیا لگاؤ ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا کہا جائے کہ خود مسلمانوں کا قلم اسلامی معاشیات کو کیسی کند چھری سے ذبح کرتا ہو کہ اس موضوع پر بالعموم حیوانی معاشیات ہی کی بولیاں ہم بھی بولتے رہتے ہیں۔ یعنی اسلام کی معاشی تعلیمات وہدایات کا منشا ومرجع بلکہ سب کہنا چاہیے کہ اسی حیوانی یا دنیوی زندگی کے معاشی مسائل ومشکلات کا حل قرار دیتے ہیں۔ اور اپنی آواز "حیوانی معاشیات" کی آوازوں میں اس طرح ملا دیتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی اصطلاحات کے نام کے سوا اسلامی روح بالکل نکل جاتی ہو۔

یہ صورت حال کچھ معاشیات کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اس عہد کی جو امتیازی خصوصیت خود اسکے نمائندوں کی زبانی "دنیا پرستی یا" دنیاداری کا غلبہ" ابھی سن چکے، وبائی جراثیم کی طرح اس کا متعدی زہر اندر ہی اندر اتنا سرایت کر گیا ہو کہ دین کے اچھے اچھے صاحب علم وصاحب صلاح حلقوں سے تعلق رکھنے والے قلموں کو بھی کیسی کیسی لغزش ہو جاتی ہو، ابھی پرسوں (۱۹ رمئی ۵۲ء) کو انگریزی کا ایک پندرہ روزہ موصول ہوا۔ ماشاء اللہ خالص اسلامی تعلیمات کا وکیل ہو۔ سارے مضامین قرآن وحدیث کے نصوص واسناد سے مزین ہیں۔ پھر بھی ابتدا کے نوٹوں ہی میں خالص دینی عقائد واعمال، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ تک کے جو

اسرار و فوائد بیان کیے گئے ہیں سب کے سب کا تعلق کہنا چاہیے کہ خالص دنیا ہی سے بتلایا گیا ہو۔

"اسلام کے سارے اساسی عقائد اور اصولی اعمال کی غرض و غایت عالمگیر اخوت پیدا کرنا ہو...... نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب مسلمانوں میں اسی باہمی اخوت کی تعلیم و تاکید کے تخیّل پر مبنی ہیں"

"اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" (نماز قائم کرو میری۔ خدا کی۔ یاد کے لیے) والی

"نماز باجماعت کی ضبط و نظم کی تدبیری حیثیت کی بڑی قیمت یہ ہو کہ اس سے مسلمانوں میں سماجی مساوات کا احساس اور زندگی (اس دنیوی زندگی) کی کشمکش میں بقا کے لیے جمعیتُ اتحاد کا شعور ترقی کرتا ہو۔ نماز کے میدان کو بالکل بجا طور پر اسلام کا پہلا ڈرل (فوجی قواعد) کا میدان کہا گیا ہو"

"قرآن مجید تمام مسلمانوں کو سچا مسلمان بننے کی تاکید کرتا ہو" کیوں؟ اس لیے کہ

"صرف چند کا عمل سب کو خواری و رسوائی (ظاہر ہو کہ اس دنیا کی خواری و رسوائی) سے نہیں بچا سکتا۔ جب کسی ریاست کے شہریوں کی بہت بڑی اکثریت اپنے قومی اغراض کو بچانے پر کمر باندھ لیتی ہے، تب ہی کامیابی نصیب ہوتی ہو۔ ہوائی بمباریوں اور قتل عام کی جو منظم شکل یورپ نے اس دور میں پیدا کر دی ہو، اس کے لیے ہم میں سے ہر فرد کو سچے مسلمان کی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت ہو۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہماری روزانہ زندگی کی بدعنوانیاں ختم ہو جائیں گی۔ قومی طاقت مستحکم ہو گی۔ سماجی زندگی میں شرافت کا جوہر پیدا ہو گا اور بین الاقوامی وقار بڑھے گا۔"

دیکھا آپ نے "اسلامی زندگی کی برکات" اور "سچا مسلمان بننے کے زیر خط مقاصد ہمارے تحتانی نہیں فوقانی شعور میں زیادہ تر کیا ہیں؟ وہی دنیا کی" خواری و رسوائی" کا غم۔ دنیا ہی کے "قومی اغراض" "قومی طاقت" "بین الاقوامی وقار" "سماجی تنظیم"۔ "سماجی زندگی"! آگے اداریہ کے اسی مقالہ کا جو حاصل بیان ہوا ہو وہ بھی کان لگا کر سن لیں:-

> "اگر مختلف صوبوں میں رہنے والے شہری اپنی قوت مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اسلامی زندگی کی راہ اختیار کریں۔ اسی سے ان کے آپس کے اختلافات دور ہوسکتے ہیں اور فکر وعمل میں اتحاد پیدا ہوسکتا ہے، جو ملک کے استحکام کے لیے ناگزیر ہے۔۔۔۔ اسلام کے پیرو اگر اسلامی زندگی کی پیروی نہیں کرتے، تو یہ استحکام جو قومی وجود کے لیے لازم ہے عملاً کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔ لہٰذا اول وآخر تمام شہریوں سے ہماری اپیل یہی ہے کہ ان کو اسلام ہی سے زندگی کی روح حاصل کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ اسی سے وہ قوت وحدت پیدا کرسکیں گے جس کے بغیر کوئی قوم دیر تک باقی نہیں رہ سکتی۔"

ظاہر ہے کہ یہ "قومی وجود"، "قومی بقا"، "قومی ریاست"، "قومی طاقت"، جس کا "اسلام کی پیروی" "اسلام کی زندگی" سے حاصل کرنا مطلوب قرار دیا گیا ہے، سب لے دے کر صرف اسی دنیا کی تو ہے۔ بس وہی مغالطہ کہ یہ چیزیں اگر کسی درجہ میں مطلوب بھی ہیں تو آخرت کی فلاح ونجات کے وسائل کے طور پر ضمناً وذیلاً۔ لیکن اب ہم نے ان کو مقاصد کے درجہ میں اپنے فکر وعمل پر اتنا مسلط کرلیا ہے کہ اخروی زندگی کا نام زبان وقلم پر آتا بھی ہے تو اس میں جوش طلب کی اس گرمی وسرگرمی کا پتہ تک نہیں ہوتا جو دنیا کے کسی معمولی مقصد کی لگن میں بھی ہم اپنے اندر پاتے ہیں کہیں کم کہیں زیادہ لیکن ذہنیت بن ہماری یہی گئی ہے کہ آخرت کا غم یا تو سرے سے نہ دار دیا دنیا کے مقابل نہیں کے برابر ہے تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔

اسی پندرہ روزہ پرچہ میں خود معاشیات پر بھی ایک مضمون ہے، جس میں قرآنی تعلیمات کی ترجمانی زیادہ صحیح کی گئی ہے، مگر روح اس کی بھی وہی ہے کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کا اصلی مدعا ومقصد گویا اس دنیوی زندگی ہی کی معاشی مشکلات سے انسان کو نجات دلانا ہے۔ اخروی نجات میں ان کو کوئی خاص دخل نہیں ہے، مضمون کا عنوان بھی یہی ہے کہ "انسانیت کی معاشی بیماریاں، اور ان کا اسلامی علاج" ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ

> "معاشی مشاغل کے دائرہ میں اسلام کا مقصود پورے سماج کی عام خوشحالی ہے"

سلہ یہاں مولانا کا یہ لفظ "اگر" کھٹکتا ہے۔ مدیر

نہ صرف چند مستثنیٰ خواص کی جاگیرداری، جو بھی مختلف معاشی تعلیمات اسلام نے دی ہیں سب کی انتہائی غرض و غایت معاشرہ کے مختلف طبقات و افراد میں کسی نمایاں فرق و امتیاز کو مٹانا ہو؟

یہ وہی اشتراکیت کی بند بند بولی کے سوا کیا ہو۔ آخر میں صاحبِ مضمون کے نزدیک سب سے پہلی بات یاد رکھنے کی یہی ہو کہ "اسلام بس یہی چاہتا ہو کہ سب کی زندگی کا عام معیار بلند کردے"۔ یہی نعرہ ہو جو خدا و آخرت کا منکر یا اس سے غافل ہر چھوٹا بڑا لیڈر آجکل ہر جگہ لگاتا پھر رہا ہو۔ "بلند معیاری" کا یہ خبط یہاں تک پہونچا ہو کہ ابھی اسی اگست کی ۵ تاریخ کے اخبار میں دیکھا کہ برما کے وزیر اعظم نے ایک کانفرنس میں دن دوپہر کی بیداری کے اپنے اس خواب کا اعلان فرمایا کہ "انکی بہبودی ریاست (WELFARE - STATE) میں ہر شخص کے پاس ایک مکان ہوگا، ایک موٹر کار ہوگی اور اس کی آمدنی آٹھ سو روپیہ ماہوار ہوگی"!

حالانکہ قرآن کی کثیر آیتیں خود معاشیات کے اسی مضمون میں ایسی نقل کی گئی ہو، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ معاش کے معاملہ میں بھی اسلام کا اصلی رُخ معادہی کے ابتلائی و پرورشی مصالح کی طرف ہو، ارشاد ہو کہ تمھارا مال اور اولاد (سب درحقیقت تمھاری) آزمائش اور امتحان کے لیے ہیں۔ اور (اس امتحان میں کامیابی پر آخرت میں تم کو) اللہ کے پاس بڑا اجر و انعام ملے گا۔ (اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ وَّاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ) احادیث وغیرہ سے قطع نظر زا لحود قرآن ہی کی اسپرٹ مدنظر رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی غرض زندگی کا عام معیار بلند کرنا" یا معاشی اونچ نیچ کو مٹانا بالکل نہیں کہ خود اللہ ہی نے تو گوناگوں حکمتوں کی بنا پر یہ اونچ نیچ پیدا فرمائی ہو[1] (وَاللّٰہُ الَّذِیْ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ) بلکہ اس کو باقی رکھ کر ہر ایک کو اس کے معاشی مقام و عمل کے لحاظ سے آخرت کی امتحانی تیاری میں لگانا ہو۔

اسی طرح "اَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ" کو نظر انداز کر کے "خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا" سے اسی مضمون میں عجیب نتیجہ یہ نکالا گیا ہو کہ اس آیت میں "قرآن دراصل اعلان کر رہا ہو کہ معاشی دولت کے سارے وسائل اسلیے خدا نے پیدا کیے ہیں کہ ان سے سماج کا ہر فرد متمتع ہو" درانحالیکہ خود قرآن میں دوسری جگہ زمین ہی نہیں آسمان و زمین سب کی پیدائش کی خاص غرض موت کے بعد آنے والی زندگی کے لیے حسنِ عمل کی آزمائش یا امتحان کو بتلایا گیا ہو۔ البتہ جو مستقبل کی اس ابدی زندگی یا مرنے کے بعد اٹھنے ہی کے سرے سے منکر ہیں ظاہر ہو کہ وہ

---

[1] یہ واقعہ ہو کہ گوناگوں حکمتوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے جس طرح بعض بندوں کو گورا اور بعض کو کالا اور ذہنی و فکری صلاحیتوں اور عملی قوتوں میں بعض کو جس طرح بعض پر فوقیت دی اسی طرح اسے رزق و معاش میں بھی اپنے بندوں کو مختلف الحال بنایا ہو اور اس لیے معاش میں برابری کا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایسی باتوں کو افسانہ و افسوں ہی قرار دیں گے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ...... لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ۔ (ہود - ع ۱)

ایک ہی مضمون و مضمون نگار نہیں، اچھے اچھے صاحب علم و صلاح حضرات آج کل کی خالص دنیوی اور غیر معادی "معاشیات" کی نقالی میں سینکڑوں صفحات "اسلامی معاشیات" کے نام و عنوان سے اس طرح لکھتے چلے جاتے ہیں کہ گویا قرآن و حدیث کی ساری معاشی تعلیمات کا مدعا بھی لے دے کر بس اسی دنیوی زندگی کے معاشی مسائل و مشکلات کا حل ہو۔ وہ قرآن جس کا ایک صفحہ بھی آخرت کی زندگی کے بناؤ بگاڑ، فلاح و خسران کی مرکزی مقصدیت سے خالی نہ ملے گا، اسی کی معاشیات پر اسی کے ماننے والوں کے قلموں سے آپ سیکڑوں صفحات اس طرح پڑھتے چلے جائیں گے کہ گویا اس زندگی کے معاشی مسائل و احکام کو قرآن و اسلام کی نگاہ میں کسی اور دوسری زندگی سے قطعاً کوئی ربط و واسطہ نہیں[1]۔

حاشا و کلا یہ مطلب بالکل نہیں کہ اس طرح کی باتیں لکھنے والے حضرات خدانکردہ آخرت پر ایمان و اعتقاد نہیں رکھتے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس "غلبۂ دنیا داری" نے یا دنیا پرستی کے زور نے غیر شعوری طور پر اچھے اچھے مسلمانوں تک کے دل و دماغ پر اتنا قبضہ پالیا ہے کہ دین کے احکام میں بھی ان کی سب سے پہلے اور زیادہ تر نظر خالی دنیا ہی کے مصالح و منافع پر پڑنے لگی ہے۔ بخلاف اس کے خود قرآن و حدیث کو ذرا خالی الذہن ہو کر پڑھو تو ان کی دعوت کا اصل رُخ تمام تر آخرت کی فلاح یا بناؤ سنوار کی طرف پاؤ گے دنیا کے ہر رنج و راحت، تونگری و ناداری، تندرستی و بیماری، خوش حالی و بدحالی سب کا مرجع و رخ ان کی تعلیمات میں کسی نہ کسی عنوان آخرت ہی کی طرف پھرتا ہے۔

آخرت پر ایمان کی حقیقت اس کے سوا آخر اور کیا ہے کہ اس دنیا کی انفرادی زندگی ہی نہیں۔ خواہ وہ عمر نوح کیوں نہ ہو زمین و آسمان کی پوری کائنات کو ایک دن فنا ہو کر رہنا ہے۔ اس کے بعد جس نئی زندگی اور نئی دنیا میں ہمکو داخل ہونا ہے وہ کروڑوں، اربوں سال ہی باقی رہنے والی نہیں، بلکہ قطعاً غیر فانی و ناختنا ہی ہے جب ہی تو اس اُخروی زندگی کے مقابلہ میں موجودہ دنیوی زندگی کی حدیث میں اتنی تحقیر و تذلیل ملتی ہے کہ خدا کی نظر میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) وہ تصور غیر صحیح اور غیر فطری ہو چکے آجکل نفب لگتے جا رہے ہیں لیکن اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ "سرمایہ دارانہ نظام" کی پیدا کی ہوئی معاشی اونچ نیچ اللہ کی رضا کی سند حاصل ہو گئی، ہمیں شک کیا ہے کہ انسانیت کیلئے وہ ایک لعنت اور عذاب ہے اور اس باب میں صحیح اور فطری تعلیم وہی ہے جو قرآن پاک دیتا ہے۔ محمد نعمانی۔ [1] اس کی بعض بڑی ہی دردناک تحریفی وہ جگہ کی مثالیں اگلے مباحث میں آئیں گی۔

اس دنیا کی وقعت اگر مچھر کے پر برابر بھی ہوتی تو خدا آخرت کے منکروں کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیا جاتا "یا اور ایسی دوسری روایات کیا خود قرآن کی اس طرح کی آیات کی تفسیر کے سوا کچھ اور ہیں، جن میں دنیا اور دنیا کی زندگی کی حقارت کو بار بار اور باصرار دہرایا گیا ہو قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۔ وَمَا مَتَاعُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ إِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ وغیر ذلك من الآیات۔

پھر بھلا زندگی کا وہ دنی و خسیس تصور جس کی تعمیر ہی از اول تا آخر کسی "خَيْرٌ وَّأَبْقٰى" "آخرت" یا معاد و معادیات کے انکار و نفی پر ہوتی ہو، اسلامی معاشیات ہی کیا، اسلام کی "معاد جو" زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے شعبہ و جزیہ کو بھی اس سراپا معاد گریز "ماڈرن" زندگی کی میزان پر کیسے تولا اور کہاں تک اس پر پورا اتارا جا سکتا ہو! خدا اور آخرت پر ایمان کی شان تو یہ ہو کہ مردِ مومن اس دنیا کے فقر و فاقہ اور دولت و سلطنت دونوں کو خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح حاصل کرنے کا یکساں سرمایہ یقین کرتا ہو اور دونوں ہی کو مردانہ وار اسی راہ میں لگاتا ہو۔

یہ الگ بات ہو کہ حکیم و رحیم اور قدیر خالق کی حکمت و رحمت اور قدرت کے اجتماع نے انسان اور کائنات دونوں کی خلقت و فطرت کو آخرت کے ساتھ کچھ ایسا ہم آہنگ بنا دیا ہو کہ اگر دنیا کی زندگی کو دین یا "یوم دین" (آخرت) کے ساتھ ایماناً و عملاً پوری طرح جوڑ دیا جائے تو یہ بھی اسی طرح نمونۂ جنت بن جا سکتی ہو۔ جس طرح آخرت سے توڑ کر آج زندگی کے معاشی و سیاسی، انفرادی و اجتماعی ہر شعبہ کو دجال کی جنت نما جہنم بنا لیا گیا ہو۔ جس میں ہر کہ و مہ دیوانہ وار کودا پڑ رہا ہو۔ حالانکہ اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی اس جہنم سے خود بنانے والوں کو بھی نکلنے کی اب کوئی راہ نہیں مل رہی ہو اور آخرت سے پہلے ان ظلموں کے لیے دنیا ہی عذاب بن کر رہ گئی ہو۔ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذٰلِكَ .... دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ"۔

موقع پا کر بھرے ہوئے دل کی اس تھوڑی سی بھڑاس نکال لینے کا مدعا فقط اتنا ہو کہ خدا و آخرت پر بُرا بھلا ایمان رکھنے والے ہم مسلمان اپنی انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی زندگی کو مقصود بالذات

سمجھنے سمجھانے کے بجائے خدارا ذرا اس کو آخرت کے تابع و ماتحت کرکے تجربہ کر دیکھیں کہ یہ مقصود بھی مقصود بنائے بغیر کس خوبی و خوش اسلوبی سے آخرت ہی کے طفیل میں نصیب ہو جاتا ہو۔ اجتماعی سیاست و معیشت کا انقلاب تو کسی فرد واحد کے قبضہ و اختیار کی بات نہیں۔ لیکن انفرادی طور پر جس کا جی چاہے ذرا ہمت کرکے خود اپنی ہی معاش کو اختیار بھر معاد کے تابع بنا کر دیکھ لے کہ زندگی کے جس سکھ چین کی تلاش میں ہم در در کی ٹھوکریں کھائے پھرتے ہیں۔ وہ معادی معاش کے صدقے میں گھر بیٹھے ہماری لونڈی بن جاتی ہو یا نہیں۔ شرط یہی ہو کہ لونڈی کو لونڈی ہی بنائے رکھیں، ورنہ جہاں ڈھیل دی سر چڑھ جائے گی۔ ایک نہیں کئی کئی زندگیوں میں خود اس سگ دنیا راقم کو اللہ تعالیٰ نے گھر باہر کھلی آنکھوں مشاہدہ کرا دیا کہ بیوی کے بجائے لونڈی بنا کر رکھنے والوں کی یہ دنیا کیسی خدمت گزار اور وفاشعار لونڈی بن جاتی ہو۔ چھوٹے بڑے، نئے پرانے اپنے لیڈروں سے خصوصاً اپنی انفرادی زندگی میں اس تجربہ کی درخواست ہو۔ اگر ان کے دل میں یہ حقیقت اُتر جائے تو ہماری معاشی و سیاسی ساری اجتماعی دعوتوں کا بھی قبلہ سیدھا ہو جا سکتا ہو۔

رونے کا جی چاہتا ہو کہ مسلمان ملکوں تک کے اکثر ائمہ و خواص یا مسلمان لیڈر خود ہی ترکستان کی راہ پر پڑ گئے ہیں تو عوام کا رخ کعبہ کی طرف کون پھیر سکتا ہو۔ مسلمان جس کو ایمان لاتے ہی ہر شرک اور شائبہ شرک کی کاٹ ڈالنے والی "لا الٰہ" کی تلوار اسی لیے دی گئی تھی کہ اس کی کاٹ کے سامنے کوئی "غیر اللہ" نہ ٹھہر سکے، وہ اب خود ہی وطنیت اور قومیت، سیاست و معیشت، تمدن و ثقافت (کلچر) کے ماڈرن دیوتاؤں پر اسلامیت کا ٹھپہ لگا کر مستقلاً ان کا داعی و رسول بن گیا ہو اور زبان و قلم کا سارا زور لگانے لگا ہو۔ گویا قرآن کے خدا کو معاذ اللہ وطنیت و قومیت، سیاست و معیشت، انسانیت و ثقافت وغیرہ کی کوئی مستقل صاف صاف دعوت (آئیڈیالوجی) پیش کرنا نہ آتی تھی کہ زندگی کے ہر نادیہ سے ہر پھر کر اول و آخر آخرت ہی کو دیکھتا و دکھلاتا رہا۔

کیا کس سے اور کس طرح کہا جائے کہ کیسے کیسے علم و فہم والے بھی بالعموم اسلام کی اس توحیدی دعوت سے بے پروا ہو کر جو پوری زندگی اور زندگی کے ہر کل و جز کو صرف اور صرف ایک ہی مرکز کے گرد گھمانے پر

مصر ہو، ہر نئی شرک پرور دعوت کے لفظی — سراسر لفظی — و اصطلاحی مغالطات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور "تازہ بتازہ" خداؤں کے پکارنے میں اپنی آوازیں بھی آیات و احادیث کو ملا ملا کر ملانے لگتے ہیں۔

اس سراپا بے علم و عمل کی طبیعت تو ان روز روز کے "تازہ خداؤں" سے اس درجہ بھنا اور جھڑ گئی ہو کہ بجز ان کے بالکل ظاہریہ کا ہم مشرب بن جانے کا جی چاہتا ہو۔ اور کتاب و سنت کی عطا کی ہوئی اصطلاحات و تعبیروں سے بھی تجاوز کرتے ڈر ہی لگنے لگا ہو۔ کہ ہر "ماڈرن" اصطلاح کسی نہ کسی "ماڈرن" خدا کو بغل میں دبائے، کسی نہ کسی "ماڈرن" پیغمبر کے "دماغی ابخروں" کی وحی پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتی ہو، اور ہم نادان مسلمان اس ماڈرنزم (تجدد) کو قرآن و حدیث سے کسی نہ کسی طرح جوڑ دینا ہی اسلام کی سب سے بڑی دوستی جاننے لگے ہیں۔ اس سے بڑے فتنہ نے شاید ہی کبھی ایمان و اسلام کو گھیرا ہو۔

اس طلسم کا توڑ کلمۂ اسلام کی خالص و کامل ایمانی و عملی تجدید اور دعوت تجدید و احیار کے سوا کچھ نہیں۔ ابواب بالا میں جس طرح رزقی یا معاشی مسائل کے اساسی و نظری مباحث کو خدا و آخرت کی ایمانی تجدید و تذکیر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو، آئندہ اوراق میں انشاء اللہ اسی نقطۂ نظر سے رزق و معاش کی عملی تعلیمات آتی ہیں۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

ختمِ نبوت اور قادیانی فتنہ

(محمد منظور نعمانی)

اللہ تعالیٰ نے جب سے انسان کو پیدا کیا اسی وقت سے اس کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے نبوت کا سلسلہ جاری فرمایا اور مختلف دوروں اور مختلف قوموں میں ان کی ضرورت کے مطابق انبیاء و رسل آتے رہے (صلوات اللہ تعالیٰ علیہم وسلامہ)

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ہماری اس انسانی دنیا پر ہزاروں سال ایسے گزرے ہیں جبکہ اس کی آبادی کے مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے بہت بے تعلق بلکہ بے خبر تھے اور ان کے احوال و مزاج اور ان کی عقلی و روحانی سطح اور استعداد میں بہت زیادہ فرق تھا۔ کیونکہ انسانوں کی آمد و رفت اور اسی طرح علوم و افکار کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے جو ذرائع بعد میں پیدا ہوئے جنھوں نے انسانیت کے مختلف حلقوں میں تعلق و اتصال اور کسی درجہ میں یکسانی پیدا کی وہ اس وقت تک وجود میں نہیں آئے تھے، اس لئے انسانی دنیا اس وقت ایک دنیا نہیں تھی بلکہ ہر قوم اور ملک کی گویا ایک مستقل دنیا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں قوموں اور ملکوں کے لئے الگ الگ پیغمبر مبعوث ہوتے رہے۔ اور چونکہ انسانوں کی ذہنی استعداد کمال کو نہیں پہنچی تھی۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و ہدایت میں اس پورے دور میں ارتقاء بھی جاری رہا اور شرائع و احکام میں حسب ضرورت تغیر و تبدل ہوتا رہا۔

یہاں تک کہ اب سے قریباً ڈیڑھ دو ہزار سال پہلے ایسے حالات پیدا ہوئے کہ انسانی دنیا کے مختلف حصوں میں باہم تعلق اور تبادلہ علوم و افکار کچھ ہونے لگا اور پوری انسانی دنیا ایک ہی دنیا بننے لگی اور ٹھیک اس دور میں انسانیت کچھ اپنے فطری ارتقاء کے نتیجہ میں اور کچھ انبیاء علیہم السلام کی ہزاروں سال کی مسلسل

تربیت کے طفیل میں اپنی دینی و روحانی استعداد کے لحاظ سے گویا سن بلوغ کو پہنچی اور وہ وقت آگیا کہ سب انسانوں کے لئے اللہ کا دین اور اس کی شریعت آخری اور مکمل شکل میں بھیجدی جائے اور پوری دنیا کی تعلیم و ہدایت کے لئے ایک ہی پیغمبر مبعوث فرما دیا جائے۔ حکمت خداوندی نے ٹھیک اس وقت پر سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا کیلئے واحد نبی و رسول بناکر مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ اپنا دین اور اپنی شریعت آخری اور مکمل شکل میں بھیجدی اور اعلان فرما دیا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۝ (قرآن کریم سورہ مائدہ)

اسی کے ساتھ حکمت خداوندی نے یہ بھی فیصلہ فرمایا کہ اس دین اور اس شریعت کو —— جو اپنے مکمل اور کافی وافی ہونے کی وجہ سے اب کبھی کسی ترمیم اور کسی اضافہ کی محتاج نہ ہوگی —— محفوظ کردیا جائے اور ایسا انتظام فرما دیا جائے کہ ختم دنیا تک تمام انسانوں کے لئے یہ ایک زندہ اور محفوظ اور مستند خدائی دستور اور آسمانی منشور رہے۔ اور اس فیصلہ کا اعلان بھی کتاب پاک میں فرما دیا گیا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

تکمیل دین اور اتمام شریعت کے بعد اس کی حفاظت کا یہ فیصلہ در اصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی حفاظت اور قیامت تک اس کی بقا کی ضمانت کا فیصلہ تھا۔ گویا اسی فیصلہ میں یہ مضمر تھا کہ پہلے انبیاء و رسل جس طرح خود دنیا سے چلے گئے ان کی نبوتیں بھی چلی گئیں ان کے متعلق فیصلہ الٰہی یہی تھا کہ وہ چلی جائیں (جب ایک چیز سے کام لینا ہی نہیں تو اس کے باقی رہنے کی یہاں ضرورت ہی کیا ہے) لیکن محمد رسول اللہ کی نبوت و رسالت دنیا سے خود ان کے چلے جانے کے بعد باقی رکھی جائے گی کیونکہ قیامت تک ہدایت و رہنمائی کا کام اب اسی سے لینا ہے —— الغرض دین و شریعت کی تکمیل و حفاظت کا فیصلہ اور اعلانیہ براہ راست اس حقیقت کا اعلانیہ تھا کہ نبوت محمدی قیامت تک باقی رکھی جائے گی اور آسمان نبوت کا یہ آفتاب اس دنیا کی آخری شام تک غروب نہ ہوگا۔

پس خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس بشری دنیا کے عام طبعی قانون کے مطابق (جس سے حکمت الٰہی نے کسی بشر کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا ہے[1]) وقت مقررہ پر اس دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن آپ کی نبوت نہیں

---

[1] "مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ الْخُلْدَ اَفَاِنْ مِّتَّ فَھُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝" (قرآن کریم)

گئی اور اللہ کے فیصلہ کے مطابق وہ قیامت تک کے لئے اس دنیا میں باقی ہے اور طالبانِ نور کے لئے آفتاب ہدایت (نبوت) جوں کا توں روشن ہے اور روشن رہے گا اور یہ دنیا کبھی نبوت کے نور سے خالی نہ ہوگی۔

اسی لئے حکمت خداوندی نے یہ فیصلہ فرمایا کہ کوئی نئی نبوت نہیں بھیجی جائے گی، اور کوئی نیا نبی مبعوث نہ ہوگا بس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا——— پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اس کا اعلان بھی فرما دیا۔ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (احزاب)۔

حق تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا اعلان فرمانے کے بعد جو یہ فرمایا کہ اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے، تو اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ختم نبوت کے اعلان سے تمہیں یہ وسوسہ اور خطرہ نہ ہو کہ آئندہ جب نبی نہیں آئیں گے تو انسانوں کی ہدایت کی ضرورت کس طرح پوری ہوگی مطلب یہ ہے کہ یہ فیصلہ ہم نے کیا ہے اور ہم علیم کل ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ ہمارے اس آخری نبی کے بعد اب انسانی دنیا کو کسی نئے نبی اور نئی ہدایت کی بالکل ضرورت نہ ہوگی کیونکہ اس نبی کی نبوت اور تعلیم و ہدایت قیامت تک زندہ اور محفوظ رہکر اپنا کام کرتی رہے گی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اپنے اس فیصلہ کا بار بار اعلان کرایا۔ حدیث کا جو ذخیرہ متداول کتابوں میں محفوظ ہے معمولی تلاش سے اس میں دس بیس نہیں سیکڑوں، بلا مبالغہ سیکڑوں حدیثیں ملجاتی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف الفاظ و عبارات میں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کا اعلان فرمایا ہے کہ نبوت مجھ پر ختم کر دی گئی اب میرے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔[1] مگر آپ نے اللہ کی اطلاع سے یہ پیشین گوئی بھی فرمائی کہ :-

لاتقوم الساعة حتی یبعث دجّالون کذابون	نہیں آئے گی قیامت یہاں تک کہ اٹھیں گے
کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النّبیّین	بہت دجال وکذاب اور وہ سب نبوت کے
لا نبی بعدی[2]	مدعی ہوں گے اور حقیقت یہ ہے کہ میں خاتم النبیین

[1] ختم نبوت پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کا اُردو میں جو رسالہ ہے دو سَو حدیثیں تو موصوف نے اسی میں جمع کر دی ہیں اور ان پر اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ [2] رواہ ابوداؤد والترمذی عن ثوبان وفی الصحیحین عن ابی ھریرۃ "لاتقوم الساعۃ حتی یبعث دجّالون کذابون قریبًا من ثلثین کلھم یزعم انہ رسول اللہ" قال

الحافظ فی الفتح لیس المراد بالحدیث من ادعی النبوۃ مطلقاً فانھم لا یحصون کثرۃ ..... ولکن المراد من قامت لہ الشوکۃ فتح ص ۴۵۵ ج ۶۔

ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں

چنانچہ اس پیشین گوئی کے مطابق پہلی صدی سے بلکہ عہد نبوی ہی سے ان دجالوں کذابوں کا ظہور شروع ہوگیا۔ مسیلمہ کذاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دورِ حیات ہی میں نبوت کا دعویٰ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام نے باتفاق رائے سب سے پہلا جہاد اسی مسیلمہ اور اس کی امت کے خلاف کیا جس میں بارہ سو صحابہ شہید ہوئے لیکن جھوٹی نبوت کے اس فتنہ کو دفن کر کے دم لیا۔

پھر اس کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق مختلف زمانوں میں مدعیان نبوت اُٹھے لیکن امت محمدی نے اُن کے ساتھ یہی معاملہ کیا، اگر وہ پاگل نہیں تھے تو ان کو دجال و کذاب اور مرتد قرار دیا گیا اور اُن کے ناپاک وجود سے اللہ کی زمین کو پاک کیا گیا اور یہ اسی بنیاد پر ہوا کہ ختم نبوت کے عقیدہ کو دین کے ان ضروریات دینیات میں سے سمجھا گیا جن میں سے کسی ایک کے انکار سے بھی آدمی کا رشتہ اسلام سے کٹ جاتا ہے۔

بہرحال ہر دور میں پوری امت محمدیہ کا یہ متفقہ فیصلہ رہا ہے اور اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری نبی ہونا اور آپ کے بعد کسی نبی کا نہ آنا اسی طرح "ضروریات دین" میں سے ہے جس طرح مثلاً حضورؐ کا نبی و رسول ہونا، قرآن کا کتاب اللہ ہونا، قیامت کا قائم ہونا وغیرہ وغیرہ اور اسی لئے نئی نبوت کے مدعیوں کو اور اُن پر ایمان لانے والوں کو ہمیشہ اسلام سے خارج سمجھا گیا۔ اور اُن کے ساتھ ہمیشہ وہی معاملہ کیا گیا جس کے مرتدین اور زنادقہ مستحق ہوتے ہیں بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ ان کے ساتھ دوسرے زندیقوں اور مرتدوں سے زیادہ سخت معاملہ کیا گیا۔

اور یوں بھی غور کیجئے سمجھ میں آسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ اور اس کی گنجائش سمجھنا ایسا ہی بڑا فتنہ ہے کہ اُمت کو پوری شدت کے ساتھ اس کی بیخ کنی کرنی چاہئے اور ان کے ساتھ ذرہ برابر نرمی نہ برتنا چاہئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو اپنی طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے نہایت نرم تھے اور بڑے بڑے گرفتار شدہ مکہ کے محارب کافروں کے متعلق بھی جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نرم فیصلہ کی رائے دی تھی مسیلمہ کے خلاف جہاد کے بارہ میں ان کا غیر معمولی جوش و تشدد جو روایات سے

معلوم ہوتا ہے وہ اُن کے مقام صدیقیت کی خاص شہادت ہے۔

ذرا غور تو فرمایئے اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دے کر فیصلہ فرما دیا کہ اب قیامت تک کے سارے انسانوں کی نجات صرف اِن کی تصدیق ان کی ہدایت و تعلیم کے اتباع پر منحصر ہے۔ ان کے بعد اب کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے جس کی تصدیق کرنا اور جس کی ہدایت کا ماننا انسانوں کی نجات کے لئے ضروری ہو۔

شاید بہت سے لوگوں نے غور نہیں کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ایک غیر معمولی عظمت اور اہمیت رکھتا ہے اور اُمت محمدیہ کے لئے اس میں بہت ہی بڑی رحمت ہے۔ نبوت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ نئے نبیوں کا آنا امتوں کے لئے کتنا بڑا اور کتنا سخت امتحان ہوتا ہے اور پہلے پیغمبروں کے ماننے والے کتنے لوگ ہوتے ہیں جو نئے نبی پر ایمان لاتے ہیں ـــــ صرف سب سے آخری دو رسولوں ہی کو دیکھ لیجئے۔ عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائے (اور احیا موتیٰ جیسے معجزے لے کر تشریف لائے) تو یہودیوں میں سے کتنے اُن پر ایمان لائے اور کتنے انکار کر کے لعنتی اور جہنمی بنے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے (اور کیسی آیات بینات کے ساتھ تشریف لائے) تو یہود و نصاریٰ میں سے یعنی اگلے پیغمبروں اور اگلی کتابوں کے ماننے والوں میں سے کتنے آپ پر ایمان لائے اور کتنے انکار اور کفر کر کے دنیا میں اللہ کی لعنت کے اور آخرت میں ابدی عذاب نار کے مستحق ہوئے ـــــ پس اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم فرما کر یہ رحمت فرمائی کہ اس امت کو اس سخت امتحان سے محفوظ فرما دیا۔ اگر بالفرض نبوت جاری رہتی اور آپ کے بعد کوئی نبی آتا تو یقیناً وہی صورت ہوتی جو پہلے ہمیشہ ہوئی ہے یعنی حضورؐ کی امت کے بہت تھوڑے لوگ اس کو مانتے اور زیادہ تر انکار کر کے (معاذ اللہ) کافر اور لعنتی ہو جاتے پس اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ ختم فرما کر اس امت کو ہمیشہ کے لئے کفر اور لعنت کے اس خطرہ سے محفوظ فرما دیا اور امت کو مطمئن فرما دیا کہ تمہاری اور ساری دنیا کی نجات کے لئے بس یہ کافی ہے کہ ہمارے اس رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان ہو اور ان کی ہدایت کا اتباع ہو ـــــ الغرض "ختم نبوت" صرف ایک دینی مسئلہ اور عقیدہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کا عنوان ہے کہ اب سارے انسانوں کے لئے نجات کی آخری شرط بس ہمارے اس رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

پر ایمان لانا اور ان کی ہدایت کا اتباع کرنا ہے اس لئے اب قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کو مطمئن اور یکسو ہو کر بس ان کا اتباع کرنا چاہیے۔ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے سلسلہ میں یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔

بس اب جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی نئی نبوت کی گنجائش نکالتا ہے وہ اللہ کے اس فیصلہ اور اس کے قائم کئے ہوئے اس سارے دینی نظام کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ ذرا اس کے دور رس نتائج پر غور کیجیے یہ دوسری قسم کی اعتقادی گمراہیوں سے بہت مختلف قسم کی بات ہے۔ اس کا اثر پورے نظام دین پر پڑتا ہے، نئے نبی کی آمد پر اس پر ایمان لانا مدار نجات ہو جاتا ہے، وہی نبی وقت ہوتا ہے اور اس کے زمانہ کا کوئی شخص اس سے پہلے پیغمبروں کی تصدیق کرے لیکن اس کو نہ مانے تو وہ کافر اور اللہ کی لعنت کا مستحق ہو جاتا ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نئی نبوت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نجات کی آخری شرط محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا نہیں ہوگا بلکہ بعد میں آنے والے اس نبی پر ایمان لانا نجات کی آخری شرط ٹھیرے گا ــــــــ (جیسا کہ قادیانی امت مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق صاف صاف کہتی ہے کہ ان کا انکار کرنے والے اسی طرح کافر اور لعنتی ہیں جس طرح پہلے نبیوں کے منکر لعنتی اور کافر ہوئے)

بس جو لوگ دین میں اتنا بڑا فساد برپا کرنا چاہیں اور قیامت تک کے لئے قائم کئے ہوئے اللہ کے اس نظام کو یوں درہم برہم کرنا چاہیں لازماً ایمان والوں کو ان کے ساتھ دوسرے تمام زنادقہ و مرتدین سے زیادہ سخت معاملہ کرنا چاہیئے[1] ــــــ اور اسلامی تاریخ کے جاننے والے جیسا کہ جانتے ہیں امت محمدیہ نے ہر دور میں

---

[1] اس موقع پر قادیانیت کے خلاف اسی دور کے دو ممتاز بزرگوں کے شدت غیظ کا ذکر انشاء اللہ بہت سے ناظرین کے لئے اطمینان و بصیرت کا موجب ہوگا۔ استاذنا مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ جن کے متعلق بس جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ علم و تفقہ اور ورع و تقویٰ میں ان کا مقام ہمارے اس دور کے خواص میں بھی کتنا بلند تھا ــــ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب نے اپنی شرح مسلم میں ایک جگہ ان کے بارے میں جو یہ تحریر فرمایا کہ لم تر العیون ولم تر ہو نفسہ مثلہ یعنی اس زمانہ کے لوگوں کی آنکھوں نے ان کی کوئی اور نظیر اور مثال نہیں دیکھی اور انھوں نے خود بھی کوئی اپنا جیسا نہیں دیکھا) ــــــ علی ہذا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے ان کے متعلق جو یہ فرمایا کہ "اس امت میں ان کا وجود اسلام کی صداقت کی دلیل اور ایک مستقل معجزہ ہے[2] تو جو لوگ حضرت شاہ صاحب سے اچھی طرح واقف نہیں ممکن ہے کہ وہ ان بزرگوں کے ان ارشادات میں کوئی مبالغہ سمجھیں لیکن جو واقف ہیں ان کے نزدیک تو یہ بالکل حقیقت ہے جو نپے تلے لفظوں میں ادا کی گئی ہے ــــــ بہر حال مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ اس امام عصر کا حال قادیانیت کے خلاف (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

---

[2] حضرت حکیم الامت کا یہ ملفوظ جس کتاب میں چھپا ہوا ہے وہ اس وقت سامنے نہیں ہے اور بعینہٖ الفاظ بھی یاد نہیں ہیں حاصل انشاء اللہ یہی ہے ۱۲

ایسا ہی کیا ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ کبھی کوئی نرمی نہیں کی گئی۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو جس طرح زنا اور شراب جیسے فواحش و منکرات کو قانونی جواز حاصل ہو گیا اور مسلمانوں کے بس میں یہ بھی نہ رہا کہ وہ بازار میں شراب کی اور عورتوں کی عصمت کی خرید و فروخت کو بزور روک سکیں۔ اسی طرح نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کے لئے بھی میدان صاف ہو گیا تو اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مرزا غلام احمد قادیانی جس کو بہت پہلے سے مذہبی سرداری کا مقام حاصل کرنے کا مالیخولیا تھا انگریزی حکومت کے سایہ میں نبوت کے دعوے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔[۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شدت غیظ کے بارے میں یہ تھا کہ عاجز راقم سطور خود اپنے متعلق عرض کرتا ہے کہ کبھی کبھی دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ دنیا میں طرح طرح کے کافر اور بے دین موجود ہیں پھر حضرت کو سب سے زیادہ غیظ قادیانیوں ہی کے خلاف کیوں ہے اور کفر و الحاد کے دوسرے تمام فتنوں سے زیادہ قابل توجہ آپ قادیانیت کو کیوں سمجھتے ہیں؟ بہت دنوں کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نئی نبوت کا دعویٰ اور اس کی گنجائش سمجھنا دین کے اس پورے نظام کو درہم برہم کر دینا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبوت محمدی کے ذریعہ قیامت تک کے لئے قائم کیا ہے — اس لئے اللہ کے جن بندوں پر اس دجالی فتنہ کی حقیقت اور اس کے ضرر کا پوری طرح انکشاف ہوا ان کے قلوب میں اتنا شدید غیظ پیدا ہو جانا بالکل قدرتی بات ہے اور یہ صدیقی نسبت ہے۔

اسی دور کے اکابر علماء و اہل اللہ میں دوسری شخصیت حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی تھی۔ اس عاجز نے خود تو زیارت نہیں کی لیکن ان کے خواص سے سنا ہے کہ قادیان کے اس دجالی فتنہ سے وہ اس قدر بے کل تھے کہ بعض اوقات تڑپتے اور روتے تھے، رات رات بھر بیٹھ کر قادیانیت کی رد میں کتابیں لکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس پر جہاد کا ثواب دے گا۔ فرماتے تھے میرے لئے یہ کام نوافل سے افضل ہے۔ جن دنوں اس سلسلہ کی کسی کتاب کی تالیف میں مشغول ہوتے تھے تہجد تک مختصر پڑھتے تھے، پھر کتاب کی چھپائی کے لئے جو کچھ پاس ہوتا بعض اوقات سب نکال دیتے اور اس کا بھی خیال نہ فرماتے کہ گھر کے بچے شام کو کھانا کہاں سے کھائیں گے۔

[۵] انجام آتھم مرزا غلام احمد کی مشہور کتاب ہے اس کے آخر میں دو صفحے عربی زبان میں ہیں۔ ان کا عنوان ہے قابل توجہ گورنمنٹ ہندستان دو صفحوں میں مرزا غلام احمد نے انگریزی حکومت کے متعلق اپنے جذبات کا صاف صاف اظہار کیا ہے اور اقرار کیا ہے کہ مجھے یہ آزادی اسی کے سایہ میں ملی ہوئی ہے۔ چند فقروں کا حاصل یہ ہے۔

ہم نے بار بار لکھا ہے کہ ہم سرکار انگریزی کے خدمت گزاروں میں سے ہیں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

اس مختصر سے مضمون میں مرزا غلام احمد کی اور اُس کے دعوؤں کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے اس کیلئے مستقل کتابیں موجود ہیں بلکہ صرف دعوائے نبوت کے متعلق کچھ کہنا ہے اور وہ بھی صرف اس ضرورت سے کہ حال میں بعض حضرات نے (جنھوں نے غالباً مرزا صاحب اور ان کی امت کی کتابوں کے دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ہے) مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانیوں کو مسلمان ہی سمجھیں اور اُن کے ساتھ اخوت اسلامی والا تعلق رکھیں اور مرزا غلام احمد کے دعوائے نبوت اور قادیانی امت کے اس پر ایمان لانے کی اسی طرح تاویل کرلیں جس طرح کہ بہت صوفیوں کے شطحیات کی یا شاعروں کے کلمات کی کرلی جاتی ہے۔

یہ مشورہ خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے دیا گیا ہو لیکن سخت گمراہ کن اور سنگین غلطی ہے اور اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان مشورہ دینے والے حضرات نے اس کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی ہے کہ قادیانیت کے مردہ جسم میں نئے سرے سے جان ڈال دی ہے ـــــ اس عاجز نے الفرقان کی گزشتہ اشاعت کے ایک مضمون میں جیسا کہ عرض کیا تھا قادیانیت علمی طور پر ختم ہو چکی تھی اور کسی غور کرنے والے طالب حق کے لئے اس کے بارہ میں اس قسم کے کسی فریب اور مغالطہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی تھی لیکن اس غلطی نے ایک اچھے خاصے حلقے کے لئے معاملہ کو پھر سے مشتبہ بنا دیا اور ایک طے شدہ مسئلہ پھر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور پوری وفاداری اور خلوص کے ساتھ اس کی خدمت کرتے ہیں اور ہمارے دل اس کے شکر اور اخلاص سے لبریز ہیں۔"

"ہم اسی کے سایہ میں امن و عافیت سے زندہ ہیں۔"

"سرکار انگریزی کی تعریف ہم آج ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کام میں ہماری عمریں ختم ہوئی ہیں اور ہماری ہڈیاں پگھلی ہیں اور ہمارے باپ دادے اس سرکار کی تعریف کرتے ہوئے مرے ہیں۔ اور ہم نے پورے خلوص کے ساتھ دل و جان سے اس سرکار کی حمایت کی ہے اور اس کی اغراض کی حمایت میں بہت سی کتابیں لکھ لکھ کر شام و روم وغیرہ دور دراز ممالک میں کثرت سے شائع کرائی ہیں اور یہ کام سرکار کے وفاداروں میں سے ہمارے سوا کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔"

"سرکار انگریزی کے احسانات اور عنایات کو ہم مرتے دم تک بھولنے والے نہیں۔"

"اسی کے دم سے ہماری جانیں اور ہماری عزت اور ہماری دولت محفوظ ہے۔" (از انجام آتھم ص۲۸۳ و ۲۸۴)

یہ صرف ایک مضمون کے چند فقرے ہیں اس کے علاوہ خدا جانے کتنی جگہ اس شخص نے اپنے ان خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے اور صاف صاف لفظوں میں اپنے کو "انگریزی حکومت کا خود کاشتہ پودا" تک لکھا ہے۔ اللہ کی شان ہے ایسی ذلیل اور پست ذہنیت رکھنے والے آدمی کو بھی نبی اور مسیح اور مہدی ماننے والے مل گئے ہیں۔ جن کی بفضل اللہ خلاف دلی لہ ۱۲

غیر طے شدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اسی احساس نے اس عاجز کو مجبور کیا ہے کہ جس موضوع پر قریباً ۲۰ سال سے کبھی کچھ سوچنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی اب پھر اس پر لکھنا ضروری معلوم ہو رہا ہے —— بہر حال اس وقت قادیانیت سے متعلق دوسرے مباحث سے صرفِ نظر کر کے صرف مرزا غلام احمد کے دعوائے نبوت اور ان کو نبی ماننے والی قادیانی امت کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

دعوائے نبوت

قادیانی امت کے موجودہ خلیفہ اور امام مرزا محمود نے اب سے ۳۷ برس پہلے ۱۹۱۵ء میں "حقیقۃ النبوۃ" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا موضوع ہی لاہوری پارٹی کے مقابلہ میں مرزا صاحب کو نبی (یعنی شرعی معنی کے لحاظ سے حقیقی نبی) ثابت کرنا ہے۔

اس کی لوح پر لکھا ہوا ہے کہ "اس میں مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت براہین قاطعہ کے ساتھ ثابت کی گئی ہے۔"

اس کے بعد ص۱۷۳ سے ص۲۲۳ تک (گویا پورے پچاس صفحے پر) لاہوریوں پر حجت قائم کرنے کے لئے مرزا غلام احمد کی نبوت کے دلائل دئے گئے ہیں۔ یہ کل ۲۰ دلائل ہیں، ان میں ساتویں دلیل یہ ہے کہ مرزا صاحب نے خود اپنے کو نبی و رسول کہا ہے اور اپنے لئے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا ہے —— اور پھر گن کر ۴۹ عبارتیں مرزا صاحب کی کتابوں سے مرزا محمود نے نقل کی ہیں جن میں مرزا صاحب نے اپنے کو نبی و رسول کہا ہے اور نبوت و رسالت کا صاف و صریح دعویٰ کیا ہے —— ان ہی میں سے چند عبارتیں ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ یہ عبارتیں اگرچہ ہم نے خود مرزا صاحب کی کتابوں میں بھی پڑھی ہیں لیکن اس وقت ہم ان کو "حقیقۃ النبوۃ" سے نقل کر رہے ہیں۔

(۱) "میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے۔" (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۶۸)

(۲) "میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں۔" (مرزا صاحب کا آخری خط مندرجہ اخبار عام ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء)

(۳) "ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم رسول و نبی ہیں۔" (بدر ۵ مارچ ۱۹۰۸ء)

(۴) "پس اس میں کیا شک ہے کہ میری پیشین گوئیوں کے بعد دنیا میں زلزلوں اور دوسری آفات کا سلسلہ شروع ہو جانا میری سچائی کے لئے ایک نشان ہے۔ یاد رہے کہ خدا کے رسول کی خواہ کسی حصہ زمین میں تکذیب

مگر اس کی تکذیب کے وقت دوسرے مجرم بھی پکڑے جاتے ہیں۔" (حقیقۃ الوحی ص۱۶۱)

(۵) کانگڑہ اور بھاگسو کے پہاڑ کے صدہا آدمی زلزلے سے ہلاک ہو گئے ان کا کیا تصور تھا انھوں نے کون سی تکذیب کی تھی۔ سو یاد رہے کہ جب خدا کے کسی مرسل کی تکذیب کی جاتی ہے خواہ وہ تکذیب کوئی خاص قوم کرے، یا کسی خاص حصہ زمین میں ہو مگر خدا تعالیٰ کی غیرت عام عذاب نازل کرتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص۱۹۲)

(۶) "پس خدا نے اپنی سنت کے موافق ایک نبی کے مبعوث ہونے تک وہ عذاب ملتوی رکھا اور جب وہ نبی مبعوث ہو گیا...... تب وہ وقت آیا کہ ان کو ان کے جرائم کی سزا دی جائے۔" (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۵۲)

(۷) "سخت عذاب بغیر نبی قائم ہونے کے آتا ہی نہیں جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ایک طرف تو طاعون ملک کو کھا رہی ہے اور دوسری طرف ہیبت ناک زلزلے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اے غافلو تلاش کرو شاید تم میں خدا کی طرف سے کوئی نبی قائم ہو گیا ہے جس کی تم تکذیب کر رہے ہو۔" (تجلیات الٰہیہ ص۵و۹)

(۸) خدا نے نہ چاہا کہ اپنے رسول کو بغیر گواہی چھوڑے۔" (دافع البلاء ص۸)

(۹) خدا تعالیٰ...... قادیان کو اس (طاعون) کی خوفناک تباہی سے محفوظ رکھے گا کیونکہ یہ اُسکے رسول کا تخت گاہ ہے۔" (دافع البلاء ص۱۰)

(۱۰) "سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔" (دافع البلاء ص۱۱) (حقیقۃ النبوۃ از مرزا محمود ص۲۱۲ و ۲۱۳)

یہ مرزا صاحب کی اپنی عبارتیں ہیں، انصاف سے غور کیا جائے کہ ان میں کسی تاویل کی کیا گنجائش ہے — ان کے علاوہ مرزا صاحب کے جو خدائی الہامات گھڑے ہیں۔ اُن میں بھی وہ سیکڑوں جگہ خدا کی طرف سے اپنے کو نبی و رسول کہتے ہیں — مرزا محمود نے "حقیقۃ النبوۃ" میں ان الہامات کو بھی اپنے باپ کی نبوت کی مستقل دلیل قرار دیا ہے اور ۳۹ ہی ایسے الہام بھی ذکر کئے ہیں ہم ان میں سے بھی صرف ۱۰ ہی یہاں نقل کرتے ہیں:۔

(۱) "ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق وتھذیب الاخلاق"

(۲) "انی مع الرسول اقوم والوم من یلوم"

(۳) "انی مع الرسول اقوم وافطر واصوم"

(۴) "سیقولُ العدو لست مرسلا سناخذہ من مارن او خرطوم"

(۵) "انی مع الرسول اقوم ومن یلومہ الوم"

(۶) "انی مع الرسول اقوم ولن ابرح الارض الی الوقت المعلوم"

(۷) "انی مع الرسول اقوم واروم ما یروم"

(۸) "انی مع الرسول فقط

(۹) انا ارسلنا احمد الی قوم فاعرضوا وقالوا کذاب اشر"

عربی زبان کا صحیح ذوق رکھنے والے ہی کچھ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی مہمل تک بندیوں کو حق تعالیٰ شانہٗ کی وحی بتانا افترا علی اللہ ہونے کے علاوہ کتنی بڑی جہالت اور بے حیائی ہے لیکن اس وقت ان چیزوں سے بالکل بحث نہیں، یہاں تو ان مہملات کے نقل کرنے سے غرض صرف یہ ہے کہ اس شخص کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ اللہ کی وحی اور اس کے الہامات ہیں جن میں مجھے نبی و رسول یا مرسل کہا گیا ہے ـــــ آخر میں اس سلسلہ کا ایک اُردو الہام بھی سن لیجئے:۔

(۱۰) دنیا میں ایک نبی آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا۔ لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کرے گا۔

مرزا محمود نے "حقیقۃ النبوۃ" میں اس قسم کے ۳۹ الہام نقل کرکے (جن میں سے دس ناظرین نے یہاں ملاحظہ فرمائے) لکھا ہے کہ:۔

"اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس قدر الہامات کی موجودگی میں ہم حضرت مسیح موعود کو غیر نبی قرار دیں اللہ تعالیٰ تو ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں بیسیوں اور سینکڑوں دفعہ آپ کو نبی کے نام سے یاد فرماتا ہے اور ہم سب جگہ یہ تاویل کرلیں کہ ان سب الہامات سے مراد اسی قدر ہے کہ آپ نبی نہیں مگر نبیوں کی کوئی صفت آپ میں پائی جاتی ہے۔ کیا اس کی نظیر دنیا میں کسی اور انسان میں بھی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بار بار نبی کہہ کر پکارتا ہے لیکن درحقیقت وہ نبی نہیں ہوتا۔"

”کیا سب نبیوں کو ہم اس لئے نبی نہیں مانتے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو نبی کہا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ وہی خدا جس نے موسیٰ سے کہا تو نبی ہے تو وہ نبی ہو گیا اور عیسیٰ سے کہا کہ تو نبی ہے تو وہ نبی ہو گیا لیکن اگر مسیح موعود سے کہتا ہے کہ تو نبی ہے تو وہ نبی نہیں ہوتا۔ اگر نبی بنانے کے لئے کوئی اور لفظ ہوتے ہیں تو انھیں ہمارے سامنے پیش کرو جن سے ہمیں معلوم ہو سکے کہ پہلے نبیوں کو تو اس طرح نبی کہا جاتا تھا تب وہ نبی ہوتے تھے اور مسیح موعود کو اس کے خلاف کسی اور طرح نبی کہا گیا ہے پس وہ نبی نہیں ہوئے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی یقینی وحی کی موجودگی میں کوئی شخص مسیح موعود کی نبوت کا انکار کر سکتا ہے، اور جو شخص انکار کرتا ہے اسے ضرور پہلے نبیوں کا بھی انکار کرنا پڑے گا کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کی نبوت جن دلائل اور جن الفاظ سے ثابت ہوتی ہے اُن سے بڑھ کر دلائل اور صاف الفاظ حضرت مسیح موعود کی نبوت کے متعلق موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے اگر مسیح موعود نبی نہیں تو دنیا میں آج تک کبھی کوئی نبی ہوا ہی نہیں۔“ (حقیقۃ النبوت صفحہ ۲۰۱)

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں واقعہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مرزا غلام احمد کی عبارتوں میں بھی کسی تاویل و توجیہہ کی گنجائش نہیں ہے اور محمد علی لاہوری ایم اے وغیرہ نے ان عبارات میں اب تک جو تاویلیں کی ہیں ہمارے نزدیک تو وہ صرف اس بات کے دلائل ہیں کہ ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بھی جب کسی غلط اور صریحاً غلط بات کو ماننے ہی کی ٹھان لے اور اللہ کی توفیق نصیب نہ ہو تو پھر علم اور عقل کی کوئی روشنی اُسے اُس غلطی سے نہیں بچا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے خواجہ کمال الدین اور محمد علی ایم اے جیسوں کی شکل میں ہمیں یہ نمونے دکھائے تاکہ سمجھنے والے سمجھیں کہ سعادت اور ہدایت کسی کو بلا اللہ کی توفیق کے نہیں ملتی“

بہرحال ہم تو پوری دیانت اور بصیرت سے یہ سمجھتے ہیں کہ مرزا غلام احمد کے دعوائے نبوت میں کسی تاویل و توجیہہ کی کوئی گنجائش نہیں لیکن اگر کسی ایسے صاحب کو جنھوں نے قادیانی لٹریچر کا زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے، لاہوری پارٹی کی تاویلوں کی وجہ سے یا خود مرزا غلام احمد کی بعض دوسری دجل آفریں تلبیسی عبارات کی وجہ سے اشتباہ اور تردد ہو تو ہمارے نزدیک اس کا امکان اور اس کی گنجائش ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مرزا محمود اور اُن کی پارٹی جن کو نبوت کے مسئلہ پر اصرار ہے اور جو صاف کہتے ہیں

کہ ہم مرزا صاحب کو انھیں معنوں میں نبی مانتے ہیں جن معنوں میں پہلے نبیوں کو قرآن و حدیث میں نبی کہا گیا ہے اور جو اپنے اس عقیدے پر دلیلیں پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں سے اس موضوع پر مناظرے کرتے ہیں۔ آخر اُن کے بارہ میں اشتباہ یا تردد کی کیا گنجائش ہے۔

اگرچہ اہلِ انصاف اور طالبانِ حق کے لئے مرزا محمود کی مندرجہ بالا عبارت ہی کافی ہے لیکن اسی کتاب "حقیقۃ النبوۃ" کی چند عبارتیں اور بھی پڑھ لیجئے۔

(۱) "آپ (یعنی مرزا صاحب) نبی ہیں اور خدا نے اور اُس کے رسول نے اُن ہی الفاظ میں آپ کو نبی کہا ہے جن میں قرآن کریم اور احادیث میں پچھلے نبیوں کو نبی کہا گیا ہے۔" (صفحہ)

(۲) "پس اس میں کیا شک ہے کہ حضرت مسیح موعود قرآن کریم کے معنوں کی رو سے بھی نبی ہیں اور لغت کے معنوں کی رو سے بھی نبی ہیں۔" (ص۱۱۶)

(۳) "پس شریعتِ اسلام نبی کے جو معنی کرتی ہے اُس کے معنی سے حضرت صاحب ہرگز مجازی نبی نہیں ہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔" (ص۱۷۴)

(۴) "بلحاظ نبوت ہم بھی مرزا صاحب کو پہلے نبیوں کے مطابق مانتے ہیں۔" (ص۲۹۲)

لاہوری پارٹی مرزا غلام احمد کی ایسی جن عبارتوں کو پیش کرتی ہے جن میں انھوں نے دعوائے نبوت سے کبھی انکار کیا ہے یا اپنی نبوت کو جزئی اور ناقص اور نبوتِ محدثیت بتلایا ہے ان کے متعلق مرزا محمود نے طویل بحث کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ۱۹۰۱ء تک مرزا صاحب کا یہ خیال تھا کہ میری نبوت جزئی اور ناقص نبوت ہے اور اس کا مطلب گویا محدثیت ہے لیکن ۱۹۰۱ء میں خدا کی وحی نے ان کو اس طرف متوجہ کیا کہ ان کی نبوت جزئی نہیں ہے بلکہ ان کی نبوت وہی نبوت ہے جو اگلے نبیوں کی تھی چنانچہ اس کے بعد سے عقیدہ بدل گیا پھر آپ نے اپنی نبوت کو جزئی یا ناقص نہیں کہا ــــــ یہ پوری بحث بہت طول طویل ہے اور غیر ضروری تکرار سے بھری ہوئی ہے سب کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں، چند فقرے جن میں اصل بات آگئی ہے یہ ہیں:-

(۵) "جن کتب میں آپ نے اپنے نبی ہونے سے صریح الفاظ میں انکار کیا ہے اور اپنی نبوت کو جزئی اور ناقص اور محدثوں کی نبوت قرار دیا ہے وہ سب کی سب بلا استثناء ۱۹۰۱ء سے پہلے کی کتب ہیں

اور ۱۹۰۱ء کے بعد کی کتب میں سے ایک کتاب میں بھی اپنی نبوت کو جزئی قرار نہیں دیا اور نہ ناقص اور نہ نبوت محدثیت۔" (ص ۱۲۱)

(۶) "۱۹۰۱ء سے پہلے کے حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے اب منسوخ ہیں اور اُن سے حجت پکڑنی غلطی ہے۔" (ص ۱۲۱)

(۷) "پہلے بھی یعنی ۱۹۰۱ء سے پہلے بھی) نبی کے نام سے آپ کو پکارا تو جاتا تھا لیکن آپ اُس کی تاویل کرتے رہتے تھے لیکن جب بار بار الہامات میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبی و رسول کے نام سے پکارا تو آپ کو معلوم ہوا کہ آپ واقعہ میں نبی ہی ہیں غیر نبی نہیں۔ جیسا کہ پہلے سمجھتے تھے اور نبی کا لفظ جو آپ کے الہامات میں آتا ہے صریح ہے قابل تاویل نہیں۔" (ص ۱۲۴)

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ مرزا محمود نے "حقیقۃ النبوۃ" میں لاہوریوں پر حجت قائم کرنے کے لئے قریباً پچاس صفحہ پر اپنے باپ کی نبوت کی دلیلیں دی ہیں۔ یہ کل ۲۰ دلیلیں دی ہیں ناظرین ذرا اس سلسلہ کی بھی سیر کرلیں۔

(۸) "اول دلیل حضرت مسیح موعود کے نبی ہونے پر یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور نوح اور حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کو نبی کہہ کر پکارا ہے حضرت مسیح موعود کو بھی قرآن کریم میں رسول کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک تو آیت مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ[۱] سے ثابت ہے کہ آنے والے مسیح کا نام اللہ تعالیٰ رسول رکھتا ہے ..... پس جس کا نام قرآن کریم رسول رکھتا ہے اُس کے نبی اور رسول ہونے میں کیا شک کیا جا سکتا ہے جبکہ ہم پہلے سب نبیوں کو اسی بنا پر نبی مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کا نام نبی رکھا ہے تو مسیح موعود کے رسول نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں، جو دلیل پہلوں کے نبی ہونے کی ہے وہی حضرت مسیح موعود کے نبی ہونے کی ہے۔ اگر حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام نبی اور رسول تھے تو مسیح موعود بھی نبی تھے اور اگر حضرت مسیح موعود نبی نہ تھے تو پہلے بزرگ بھی نبی نہ تھے۔ دونوں کی نبوت پر ایک ہی کتاب شاہد ہے۔" (ص ۱۸۸)

(۹) "دوسری دلیل حضرت مسیح موعود کے نبی ہونے پر یہ ہے کہ آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی کے نام سے یاد فرمایا ہے اور نواس بن سمعان کی حدیث میں نبی اللہ کر کے آپ کو پکارا گیا ہے[۲] پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] قادیانیوں کے نزدیک اس آیت میں مرزا غلام احمد کی نبوت اور بعثت کی بشارت دی گئی ہے خود مرزا غلام احمد نے بھی یہی کہا ہے ۱۲

[۲] اس حدیث میں حضرت مسیح بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبی کہا گیا ہے اور آخر زمانہ میں اُن کے نزول کی خبر دی گئی ہے۔ مرزا غلام احمد اپنے کو اس کا مصداق کہتا ہے اور اس کی امت اس روایت کے لفظ نبی اللہ سے اس کی نبوت ثابت کرتی ہے ۱۲

شائع ہیں اس امر کے کہ حضرت مسیح موعود نبی ہیں۔ ..... جب خدا تعالیٰ قرآن کریم میں رسول کہتا ہے اور ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ میں اس کی نسبت پیشین گوئی کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نبی ہونے کی شہادت دیتے ہیں اس کی نبوت کا انکار کرنا کسی مومن کے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔" (صفحہ ۱۸۹ و ۱۹۰)

(۱۰) **تیسری شہادت** مسیح موعود کے نبی ہونے پر انبیار گزشتہ کی شہادت ہے۔ سب سے پرانی شہادت تو زرتشت نبی کی ہے، جو ایران کا ایک نبی ہے ..... دوسری شہادت کرشن نبی کی ہے ... تیسری شہادت دانیال نبی کی ہے ..... پھر کتاب طالمود میں بھی مسیح موعود کا نام نبی رکھا گیا ہے۔"

اب میں تمام صداقت پسندوں سے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بات عقل سلیم تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک شخص جو غیر نبی ہے اس کی نسبت ہزاروں سال پہلے سے انبیار خبر دیتے رہے تھے ..... کیا ان سب نبیوں کی شہادتوں کے باوجود جو انھوں نے ہزاروں سال پہلے دی تھیں ہم مسیح موعود کو غیر نبی تسلیم کر سکتے ہیں اور ان تمام پیشین گوئیوں میں جہاں جہاں اُسے نبی کر کے یاد کیا گیا ہے ان سب مقامات کی تاویل کر سکتے ہیں کہ نبی سے مراد نبی نہیں بلکہ کسی مشابہت کی وجہ سے نبی کہہ دیا گیا ہے آخر تاویل کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ..... میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ جو کوئی شخص مخلی بالطبع ہو کر اس بات پر غور کرے گا تو اُسے اس خیال کی لغویت خود ہی معلوم ہو جائے گی اور روز روشن کی طرح اس پر ظاہر ہو جائے گا کہ مسیح موعود ضرور نبی ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک شخص کا نام قرآن کریم نبی رکھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی رکھیں، کرشن نبی رکھے، زرتشت نبی رکھے، دانیال نبی رکھے اور ہزاروں سال سے اُس کے آنے کی خبریں دی جا رہی ہوں لیکن باوجود ان سب شہادتوں کے وہ پھر بھی غیر نبی کا غیر نبی ہی رہے اور سب پچھلے نبیوں کی بات، قرآن کریم کی شہادت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تاویل کر لی جائے۔ اگر تاویل ہی کرنی ہے تو کیوں اپنے خیالات اور گمانوں کی تاویل نہ کی جائے اور کیوں بلا سبب اس قدر شہادتوں کو ان کی حقیقت سے پھیر دیا جائے اور اس قدر زبردست ثبوتوں سے منہ پھیر لیا جائے

حقیقۃ النبوۃ صفحہ ۱۹۷-۹۸-۹۹)

حال میں جن بعض محترم حضرات نے "ادنیٰ قوم باشد لے مرید" جیسی چیزیں سنا سنا کر مسلمانوں کو یہ تلقین فرمائی تھی

کہ وہ قادیانیوں کو مسلمان ہی سمجھیں اور مرزا قادیانی کے دعوائے نبوت اور ان کی امت کے عقیدۂ نبوت کی تاویل کریں جیسے کہ بہت سے صوفیوں کے شطحیات کی کی جاتی ہے۔ ہمارا گمان یہی ہے کہ ان حضرات سے یہ غلطی حقیقت حال سے ناواقفی کی وجہ سے ہوئی اور اس لئے امید رکھنی چاہئے کہ وہ کم سے کم اس کو ضرور تسلیم کریں گے کہ مرزا محمود کے ان بیانات نے قادیانیوں کے عقیدہ کے بارہ میں کسی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے ـــــ اور اگر اب بھی کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو خدارا ہم جیسے ناسخن شناسوں کو بھی بتایا تو جائے کہ کیا تاویل ہو سکتی ہے۔

اور پھر بات صرف کتابوں اور عبارتوں ہی کی نہیں ہے۔ قادیانی مناظرین خاص اس موضوع پر مناظرے کرتے ہیں "اجرائے نبوت" ان کے مناظروں اور مقرروں کی تقریروں کا عنوان ہوتا ہے اور جنھوں نے ان قادیانی مناظرین اور مقررین کی اس موضوع پر تقریریں سنی ہیں وہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے ختم نہ ہونے پر اور آپ کے بعد بھی نبوت کے جاری رہنے پر یہ لوگ زبان اور دماغ کا کتنا زور صرف کرتے ہیں اور ختم نبوت سے متعلق آیات و احادیث میں کیسی کیسی تحریفیں کرتے ہیں اور مرزا غلام احمد کے نبی ثابت کرنے پر کتنے زور لگاتے ہیں۔

بہر حال "وفات مسیح" کی طرح "اجرار نبوت" قادیانی علم کلام کا خاص مسئلہ ہے اور مرزا قادیانی کی نبوت ہی کی بنیاد پر قادیانی امت اُن کے نہ ماننے والے اور ان کی تکذیب کرنے والے سارے مسلمانوں کو کافر کہتی ہے۔

قادیانیوں کے موجودہ خلیفہ و امام مرزا محمود ہی نے "حقیقۃ النبوۃ" کی تصنیف سے بھی چار سال پہلے یعنی ۱۹۱۱ء میں تشحیذ الاذہان میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے پوری صراحت اور صفائی کے ساتھ اس کا اعلان کیا تھا اور خود مرزا غلام احمد کی عبارتوں کے حوالے دے کر ثابت کیا تھا کہ مرزا صاحب کو نہ ماننے والے اس زمانے کے مسلمان بالکل اسی طرح کافر ہیں جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننے والے یہود و نصاریٰ کافر ہیں ـــــ تشحیذ الاذہان کے اس مضمون میں مرزا محمود نے اس دعوے کے ثبوت میں پہلے اپنے باپ مرزا غلام احمد کے ایک خط سے (جو انھوں نے ڈاکٹر عبدالحکیم کو لکھا تھا) ایک عبارت نقل کی ہے جس کا آخری حصہ یہ ہے:-

"خدا نے مجھے ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے وہ مسلمان نہیں ہے۔"

خط کی یہ عبارت نقل کر کے مرزا محمود کہتے ہیں:- (بقیہ بر صفحہ ۱۶)

خاص اشاعت

دعوت اصلاح و تبلیغ کا ترجمان

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، اور اصل میں
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اسی عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارۂ الفرقان"

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مولانا محمد منظور نعمانی ——— اور ——— مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

کی

تبلیغی تقریریں!

جو ہندوستان و پاکستان کے مختلف شہروں کے اہم تبلیغی اجتماعات میں کی گئی تھیں

ان کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہوگا ——— کہ

(۱) دعوت و تبلیغ کی اس جد و جہد کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے۔

(۲) اس کا مقصد و نصب العین اور اسکے اصول کیا ہیں، اور وہ کن امتیازات کی حامل ہے۔

(۳) مسلمانوں سے اس کا کیا مطالبہ ہے، اور ان کے لئے اس کا کیا پیام ہے۔

(۴) دنیا اور آخرت میں اس تحریک سے کن نتائج کی توقع ہے۔

(۵) جو لوگ اس دینی دعوت کو صرف کلمہ و نماز کی تحریک یا جامد خانقاہیت کی دعوت کہتے ہیں وہ اصل حقیقت سے کتنے ناواقف ہیں۔

اس تحریک کے کارکنوں کو ان تقریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا ——— کہ

(۶) مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے سامنے اس دعوت کو کس انداز میں پیش کرنا چاہئے۔

(۷) شبہات اور غلط فہمیوں کو کس طرح صاف کرنا چاہئے۔

(۸) اس کام سے تعلق رکھنے والوں کو کن باتوں کی پابندی خاص طور سے کرنی چاہئے۔

(۹) ان میں بعض تقریریں وہ ہیں جو ایسے مجمعوں میں کی گئیں جن میں غیر مسلم بھی خاصی تعداد میں تھے، ان سے معلوم ہوگا کہ غیر مسلم حضرات کیلئے ہماری دعوت اور ہمارا پیام کیا ہے، اور ہم ان سے کیا کہتے ہیں۔

(۱۰) بوقتِ ضرورت ان تقریروں کو اجتماعات میں بھی سنایا جا سکتا ہے۔

اس میں کل ۱۳ تقریریں ہیں۔ پونے تین سو صفحات۔ مجلد۔ خوشنما۔ مع گرد پوش۔ قیمت :- (عہ)

کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

هدًى للنّاس وبیّنات من الهدیٰ والفرقان

اشاعتِ خاص!

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

بابتہ ماہ ربیع الاوّل و ربیع الثّانی و جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ

مطابق

دسمبر ۱۹۵۲ء و جنوری فروری ۱۹۵۳ء

مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر:- (مولوی) محمد منظور نعمانی

مقامِ اشاعت:- دفتر الفرقان، گوئن روڈ۔ لکھنؤ

چندہ
پاکستان سے
سالانہ (سکہ پاکستانی) صہ
ششماہی " ے
فی پرچہ " ۸/

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ

چندہ
ہندوستان سے
سالانہ ... صہ
ششماہی ... ے
فی پرچہ ... ۸/

جلد ۲۰ | بابت ماہ ربیعین وجمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ ہجری | نمبر ۳-۴-۵

"الفرقان" کے پاکستانی معاونین کی خدمت میں :—

گذشتہ سال جب یہ بات علم میں آئی تھی کہ "الفرقان" کے چندوں کی رقم پاکستان میں کسی ایک صاحب کے پاس جمع ہو کر پاکستانی شرح کے حساب سے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ذریعہ منتقل ہو سکتی ہے، تو ہم نے اپنے پاکستانی خریداروں کے لئے "الفرقان" کا چندہ صرف چار روپئے کر دیا تھا، کیونکہ بینک کی فیس اور دوسرے اخراجات نکلنے کے بعد بھی پاکستانی چار روپئے کے بدلے ہندوستانی پانچ روپئے ہم کو وصول ہو سکتے تھے، لیکن معلوم ہوا ہے کہ اب کچھ دنوں سے یہ صورت قانوناً ختم کر دی گئی ہے کہ کوئی ایک شخص بہت سے خریداروں کی رقم بینک کے ذریعہ پاکستان سے ہم کو روانہ کر سکے، اِسلئے اب ہمارے معاونین "الفرقان" کے لئے پورے پانچ روپئے "مکتبۂ اصلاح ۲۶ مال روڈ لاہور" کے پتہ پر روانہ کریں۔

آئندہ سے لاہور سے "الفرقان" کا وی، پی بھی آپ حضرات کو پانچ روپئے چار آنے کا ہوا کرے گا۔

البتہ اگر کوئی صاحب اپنا چندہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی معرفت براہِ راست ہم کو بھیجیں، تو وہ صرف چار روپئے پاکستانی داخل کریں۔

سُرخ پنسل کا نشان ! اس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مدتِ خریداری اس شمارے پر ختم ہو گئی ہے، لہٰذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ پانچروپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیے، اگر ۵ رمارچ ۱۹۵۳ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی، تو اگلا پرچہ وی، پی بھیجا جائے گا، جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا ——— پاکستان کے حضرات اپنا چندہ منیجر صاحب (مکتبۂ اصلاح ۲۶ مال روڈ، لاہور) کے پتے پر ارسال فرمائیں، اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دیدیں، اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں، اگر آپ کے چندے کی اطلاع ۵ رمارچ ۱۹۵۳ء تک موصول نہیں ہوئی تو (مکتبۂ اصلاح لاہور) سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی، پی ارسال کیا جائے گا ——— دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں ۔ والسلام

ناظم :- الفرقان ۔ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

نگاہِ اوّلیں!

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصلحٰت

محرم کے الفرقان میں اس کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ کبھی کبھی بعض واقعات سے اس کا اندازہ اور تجربہ ہوا کہ ہمارے بعض ایسے دینی دوست جن کا عرصہ سے ہماری دینی دعوت اور ہمارے تبلیغی کام سے تعلق ہے وہ اس دعوت کی روح وحقیقت اور اسکے خاص اصولوں سے بھی اور دین ہی کے سلسلہ کی بعض اور ایسی ضروری باتوں سے بھی ناواقف رہجاتے ہیں جن سے خاصکر اس زمانہ میں کسی ایسے شخص کو ناواقف نہ رہنا چاہئے، جو اپنی دینی اصلاح و ترقی کا طالب ہو، اور احیاءِ دین کی کسی جد وجہد سے اس کا محسوس اور نمایاں تعلق ہو ——— خدا کا شکر ہے کہ لکھنؤ کے بعض رفقاء کو اپنی اس کمی کا خود بہت احساس رہتا تھا۔

ذی الحجہ کے مہینے میں مشورے کی ایک مجلس میں اُن ہی حضرات نے اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی، اور اس کے لئے یہ تجویز رکھی، کہ چند روز کے بعد محرم کے پہلے ہی عشرہ میں مسلسل آٹھ دن جو ایسے چھٹیوں کے آرہے ہیں جن میں بہت سے اُن لوگوں کو بھی فراغت ہوگی جو کسی پروگرام کے لئے ہر وقت اپنے کو فارغ نہیں کرسکتے، اُن میں ایک ایسا تعلیمی اور تربیتی پروگرام رکھ لیا جائے جس کا مقصد اور موضوع اپنے رفقاء کی اس کمی کو پورا کرنا ہو ——— اللہ تعالیٰ کو یہ کام کرانا تھا اُسی مجلس میں یہ فیصلہ کرلیا گیا، اور ۴ محرم سے ۱۱ محرم تک پورے آٹھ دن اس کام میں مشغولیت رہی۔

رفیقِ محترم مولنا سید ابوالحسن علی اور اس عاجز نے مل کر اس کام کا خاکہ اور نقشہ بنایا اور طے کیا کہ ان آٹھ دنوں میں ۴ عنوانوں پر اپنے رفقاء کے سامنے درسی انداز میں تفصیلی باتیں کی جائیں ——— عنوانات یہ تھے:۔

(۱) دین و شریعت اور اُسکے شعبے ——— (عقائد و ایمانیات، عبادات، اخلاق، معاملات و معاشرت، دین کی نصرت، اور سیاست وحکومت)۔

(۲) دینی دعوت سے متعلق ضروری امور ——— یعنی دعوت کے محرکات و موجبات، ہماری اس دعوت کا مقصد اور اسکے اصول، اُسکے امتیازات اور خصوصیات، دعوت کے راستے کی مشکلات و موانع اور ان کا حل، دوسرے دینی اداروں اور دینی تحریکوں کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل۔

(۳) اصلاح وتجدید کی تاریخ ——— (یعنی اس امت میں دینی اصلاح وتجدید کی مساعی کا تسلسل اور اس سلسلہ کی

اہم شخصیتوں کے کام کی کچھ تفصیل)۔

اس مضمون کی ضرورت اسلئے سمجھی گئی کہ ہمارے اس زمانہ میں بہت سے دینی کام کرنے والے بعض خاص تاریخی اسباب کی وجہ سے بڑی جلدی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ صحیح دینی کام یا تو دورِ نبوت میں اور اسلام کے قرنِ اوّل میں ہوا تھا، اور یا بس اب ہم اور ہمارے ساتھی کر رہے ہیں، اور درمیان کے سارے زمانوں میں تو اسلام کو بس بگاڑا ہی گیا ہے ——— یہ غلطی معمولی علمی غلطی نہیں ہے بلکہ بڑی خطرناک غلطی ہے، یہ مان لینے کے بعد دین اور شریعت کا معنوی تواتر اور توارث خطرے میں پڑ جاتا ہے ——— بہرحال اُمّتِ محمدیہ میں دینی اصلاح و تجدید کی تاریخ کو ہم نے اپنے اس پروگرام میں اسی واسطے رکھا کہ ہمارے احباب اور رفقاء اسلاف کی تحقیر اور اُن کے ساتھ بدگمانی کی غلط روی اور گمراہی سے محفوظ رہیں، اور اپنے متعلق زیادہ خوش گمانی اور عُجب نفسی کے مہلک مرض میں مبتلا نہ ہوں۔

(۴) خلافِ اسلام عصری تحریکات اور مسلمانوں کے دین و ایمان پر پڑنے والے اُنکے اثرات۔

پہلا عنوان "دین اور شریعت" اس عاجز کے سپرد کیا گیا، اور ناچیز نے ۶ دن کے ۶ درسوں میں عقائد و ایمانیات، عبادات، اخلاق، معاملات و معاشرت کے متعلق وہ اصولی باتیں بیان کیں جن کا بیان کرنا پیشِ نظر مقصد کے لحاظ سے ضروری اور مفید سمجھا، آخری ساتویں دن دین کی نصرت اور سیاست و حکومت کے متعلق بیان کرنا تھا، لیکن اتفاق سے اس پروگرام کے چھٹے ہی دن میں بخار میں مبتلا ہو گیا، اور ساتویں دن طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ میں اُس روز کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا، اسلئے جو کچھ میں اس سلسلہ میں کہنے کا ارادہ رکھتا تھا وہ رہ ہی گیا۔

"تصوّف و احسان" دین و شریعت ہی کا ایک شعبہ ہے، اور اہم شعبہ ہے، اُس کو ہم لوگوں کے عرض کرنے پر مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی (اُستاذ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء) نے اپنے ذمّے لے لیا تھا، چنانچہ اس موضوع پر موصوف ہی نے پورے بسط و تفصیل سے ایک دن بیان فرمایا۔

دوسرے عنوان "دینی دعوت" کے مختلف پہلوؤں کو مولانا سیّد ابوالحسن علی اور اس عاجز نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا، اور اسی تقسیم کے مطابق کام کیا گیا۔

تیسرا تاریخی موضوع مولانا سیّد ابوالحسن علی نے اپنے ذمّے لیا تھا، اور ہفتہ بھر مسلسل مولانا نے پوری تفصیل سے اس کو بیان فرمایا اور اب موصوف اپنے اس بیان کو ایک مستقل تصنیف کی شکل میں مرتّب فرما رہے ہیں، جس کے متعلق اندازہ ہے کہ چار پانچ سو صفحے سے کم پر ختم نہ ہوگی ——— الفرقان کی اس اشاعت کے آخری صفحات میں اُس کا ابتدائی حصّہ مولانا کے ایک مفصل نوٹ کیساتھ ناظرینِ کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔

چوتھا موضوع "خلافِ اسلام عصری تحریکات" مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی (اُستاذ دینیات و معاشیات

دار العلوم ندوۃ العلماء) کے سپرد تھا، چنانچہ اس خدمت کو موصوف ہی نے انجام دیا۔

اس تعلیمی اور تربیتی پروگرام کی تمام تقریروں کو بعض دوستوں نے ساتھ ساتھ قلمبند کرنے کا بھی اہتمام کیا تھا، اور اپنی اس محنت میں الحمد للہ وہ اچھے خاصے کامیاب رہے۔

پہلے ان سب تقریروں کے خلاصے الفرقان میں یکجا شائع کرنے کو سوچا تھا، اور اندازہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ سو سوا سو صفحات میں تمام تقریروں کا حاصل اور خلاصہ آجائے گا، لیکن جب قلمبند کرنے والے دوستوں نے یہ تقریریں صاف کر کے نظرِ ثانی اور اصلاح کے لئے دیں تو انھیں دیکھ کر یہ رائے قائم ہوئی کہ ان پر تلخیص اور اختصار کا عمل زیادہ نہ کیا جائے اور جس انداز میں یہ باتیں زبانی بیان ہوئی تھیں حتی الوسع اسی انداز میں ان کو شائع کر دیا جائے ——— البتہ اس عاجز نے اپنی تقریروں کے متعلق یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ ایک سلسلہ کی جملہ تقریروں کو ملا کر ایک مسلسل مذاکرہ بنا دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کر دیا جس کے نتیجے میں "دین و شریعت" کے سلسلہ کی ٦ تقریریں ایک مسلسل مذاکرہ کی شکل میں مرتب ہو گئیں ——— یہ مذاکرہ الفرقان کی اس اشاعت کے صفحہ ۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۹٦ تک چلا گیا ہے، گویا بفضلہ تعالیٰ اچھی خاصی ایک کتاب ہو گئی ——— اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ وہ اس سے اپنے بندوں کو بہت فائدہ پہنچائیں گے، اس وقت تو اس کو الفرقان میں اسی طرح شائع کر دینا مناسب سمجھا گیا، لیکن آئندہ کیلئے ارادہ ہے کہ انشاء اللہ کسی قریبی فرصت میں اس پر تھوڑی سی محنت اور کر کے، اور بعض مقامات پر کچھ مفید اور تکمیلی اضافے کر کے (جو ذہن میں ہیں) اس کو مستقل کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا جائے، اور اُس میں دین کی نصرت اور ریاست و حکومت کے متعلق وہ مضامین بھی بڑھا دیئے جائیں جو طبیعت کے ناساز ہو جانے کی وجہ سے تربیتی ہفتہ میں بیان سے رہ گئے تھے ——— نیز تصوف و احسان کے موضوع پر مولانا محمد اویس صاحب کے افادات بھی انشاء اللہ اُس میں شامل کر دیئے جائیں گے، جو گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے اس اشاعت میں نہیں لئے جا سکے، مولانا نے وعدہ فرمایا ہے کہ اب وہ اُن کو کتاب کے نقطۂ نظر سے انشاء اللہ مرتب فرما دیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ کام اپنے خاص فضل و کرم سے پورا کرا دیا، تو پھر "اسلام کیا ہے؟" سے اوپر کے درجہ کی یہ ایک اچھی کتاب انشاء اللہ تیار ہو جائے گی، اور ہمارے تربیتی ہفتہ کی یہ بھی ایک قائم اور باقی رہنے والی برکت ہو گی، اور انشاء اللہ اس عاجز کے باقیاتِ صالحات میں حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے یہ ایک مبارک اضافہ ہو گا۔

والباقیات الصالحات خیرٌ عند ربك ثوابًا وخیر املا

دعوت کے سلسلہ کی تین تقریریں اس اشاعت میں مولانا سید ابو الحسن علی کی شائع کی جا رہی ہیں، اور اس عاجز نے اس سلسلہ کی بھی اپنی تین تقریروں کو ایک ہی مسلسل مذاکرہ بنا دیا ہے ——— یہ دعوتی سلسلہ اس شمارہ کے صفحہ ۹۷ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۳۳ پر ختم ہوا ہے۔

دعوت کے موضوع پر جتنی چیزیں ان صفحات میں آگئی ہیں وہ کسی دوسری جگہ اس طرح مرتب اور یکجا نہ ملیں گی، لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ تقریر یا تحریر عمل کے قائم مقام ہرگز نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ جن لوگوں کا ہماری دینی دعوت سے عملی تعلق نہیں ہے وہ شاید ہماری بعض باتوں کا صحیح منشا بھی نہ سمجھ سکیں۔ دراصل ہماری ان گفتگوؤں کے مخاطب وہ احباب و رفقاء تھے جو ہمارے ساتھ اس عمل میں شریک رہتے ہیں۔

تاہم اُمید ہے کہ بحیثیت مجموعی ان دعوتی مضامین کا مطالعہ انشاء اللہ ہر ناظر کے لئے مفید ہی ہوگا، اور بہت سی غلط فہمیاں اسکے ذریعہ دُور ہو سکیں گی، اور خود کام کرنے والے اسکے ذریعہ اپنی بعض غلطیوں اور بے اعتدالیوں کی اصلاح کر سکیں گے۔

تیسرے سلسلہ "تاریخ اصلاح و تجدید" کے متعلق ابھی اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی اس کو مستقل کتاب کی صورت میں از سرِ نو مرتب فرما رہے ہیں، کافی کام ہو چکا ہے لیکن پھر بھی بہت باقی ہے، اُس کا کچھ ابتدائی حصہ الفرقان کی اس اشاعت میں بھی دیا جا رہا ہے، صفحہ ۱۳۵ سے لیکر آخری صفحہ ۱۶۸ تک وہی ہے، اسکے متعلق خود مولانا نے شروع میں ایک مفصل نوٹ لکھ دیا ہے، اسلئے یہاں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، ناظرین کرام دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کارِ عظیم کو اپنی مرضی کے مطابق جلدی پورا کرائے، اور اپنے بندوں کے لئے نافع بنائے۔

افسوس ہے کہ صفحات میں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے چوتھے موضوع "خلافِ اسلام عصری تحریکات" کے سلسلہ کی مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب کی کوئی تقریر بھی ہم اس اشاعت میں نہیں دے سکے، موصوف سے گذارش کی ہے کہ وہ اس عنوان پر ایک مستقل مقالہ تیار فرما دیں جو انشاء اللہ الفرقان کے کسی شمارے میں شائع ہو جائے گا۔

بڑی ندامت ہے کہ تین مہینے کی اس مشترک اشاعت کی تیاری میں بہت تاخیر ہو گئی، اور ناظرین کرام کو انتظار کی زحمت اُٹھانی پڑی، اس تاخیر کی سب سے زیادہ بلکہ ساری کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو کام مجھ سے متعلق ہوتے ہیں اپنے مخصوص حالات اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے میں اکثر ان کو بروقت انجام نہیں دے سکتا۔

خدا کرے مطالعہ کے بعد آپ مضامین کو مفید سمجھیں، اور اللہ کے بندوں کو اُن سے فائدہ پہونچانے کی کوشش کریں، اور اس طرح آپ کی زحمتِ انتظار کی کچھ تلافی ہو جائے۔

محمد منظور نعمانی

۱۰ر فروری سنہ ۱۹۵۳ء

قارئین الفرقان اب سے بہت پہلے اخبارات میں مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (علیہ الرحمۃ والغفران) کی خبرِ وفات پڑھ چکے ہوں گے اگرچہ کسی کی بھی موت اس حیثیت سے غیر معمولی حادثہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں آنیوالے ہر انسان اور ہر جاندار کی آخری منزل موت ہی ہے اور یہ ہر شخص کی جانی بوجھی بات ہے ــــ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جن بندوں کی زندگی غیر معمولی ہوتی ہے انکی موت بھی اپنے اثرات کے لحاظ سے عام لوگوں کی موتوں کے مقابلے میں غیر معمولی ہی ہوتی ہے، اور دور و نزدیک والے اس سے اس طرح متأثر ہوتے ہیں جس طرح کہ غیر معمولی واقعات و حوادث سے متأثر ہوا کرتے ہیں ــــــــ علم دین میں حضرت مفتی صاحب کی بلند مقامی اور خاصکر فقہ و فتویٰ میں انکی مرجعیت اور سیاسیات میں انکی خاص بصیرت اور ذہن و فکر کا سلجھاؤ یہ تو وہ چیزیں ہیں جن سے کسی درجے میں وہ لوگ بھی واقف ہوں گے جنکی واقفیت کا ذریعہ اخبارات یا دوسرے وسائط ہونگے، لیکن انکے علاوہ حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے غیر معمولی کمالات سے بھی نوازا تھا جن سے صرف وہی حضرات واقف ہوں گے جنھیں نزدیک رہنے اور قریب سے دیکھنے اور برتنے کا زیادہ موقع ملا ہوگا ــــ یہ عاجز حضرت مفتی صاحب کی علمی عظمت کا پوری طرح قائل ہونے کے باوجود انکے دوسرے قسم کے کمالات سے ہمیشہ زیادہ متأثر رہا ــــ ان میں سے انکے جس کمال کا نقش میرے دل پر سب سے زیادہ گہرا ہے وہ انکی بے انتہا تواضع اور بے نفسی ہے، اس بارے میں اس عاجز کا جو تأثر اور احساس ہے واقعہ یہ ہے کہ اسکے اظہار کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ نے ان کو جتنی بلندیاں عطا فرمائی تھیں وہ اتنے ہی متواضع اور بے نفس تھے، ان سے ملنے والے انکے کسی نیاز مند نے بھی کبھی محسوس نہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے کو کچھ بھی سمجھتے ہیں بعض اوقات اپنے بہت چھوٹوں کیساتھ اس طرح پیش آتے اور ایسا معاملہ کرتے کہ انھیں شرم آتی، اس عاجز نے اس مقام کی کسی شخصیت میں کبھی اس درجہ کا تواضع نہیں دیکھا ــــــــ دوسری جس خصوصیت سے یہ عاجز بہت متأثر ہوا وہ یہ ہے کہ سفر و حضر کی سیکڑوں صحبتوں میں میں نے کبھی انکی زبان سے، نہ نجی گفتگو میں، اور نہ مجلسی بحثوں اور گفتگوؤں میں کسی بڑے سے بڑے اپنے مخالف کے متعلق بھی کوئی سخت لفظ کبھی نہیں سنا ــــ اسی طرح کبھی غیبت کا کوئی کلمہ سننا یاد نہیں۔

تیسری خاص بات جس سے یہ عاجز بہت متأثر ہے یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق آتا ہے کہ: "کَانَ یَخْدِمُ نَفْسَہٗ" (کہ آپ خود ہی اپنے خادم تھے، اپنے گھر اور اپنی ذات کے معمولی معمولی کام خود کر لیا کرتے تھے) ــ حضرت مفتی صاحب اس اسوۂ نبوی کے خاص نمونہ تھے، اس بلند مقامی کے باوجود اپنے گھر کے اور بچوں کے بہت سے ایسے معمولی اور حقیر کام خود کیا کرتے تھے جن کے کرنے میں ایک معمولی آدمی بھی اپنی توہین سمجھے گا ــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ عاجز حضرت مفتی صاحب کی ان سیرتی خصوصیات سے اتنا متأثر ہے کہ اگر انکے ہاتھ پر کھلی کرامتیں دیکھتا تو غالباً اس سے زیادہ متأثر نہ ہوتا۔

حضرت مفتی صاحب ان اکابر دین میں سے تھے جن کی علمی عظمت و عقیدت اور ان کے علم پر اعتماد کی وجہ سے بہت سے لوگ غلطیوں اور فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کی وفات اس دورِ فتن میں ایک بڑا دینی سانحہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَہٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَہٗ وَاغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ

اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

دین اور شریعت

محمد منظور نعمانی

چند ضروری باتیں

آئندہ صفحہ سے جو مضمون شروع ہو رہا ہے ناظرین کرام اس کے مطالعہ سے پہلے یہ چند سطریں ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) اکثر پیراگراف کے شروع میں چوکھٹے میں خفی قلم سے جو عنوانات ہیں وہ سب مضمون لکھنے کے بعد لکھے گئے ہیں اور ان کا مقصد پیراگراف کے مضمون کی طرف رہنمائی ہے گویا ان کی حیثیت وہ ہے جو پہلے زمانہ میں فارسی اردو کی کتابوں میں حاشیہ پر لکھے ہوئے "فائدوں" کی ہوتی تھی بہرحال وہ اصل مضمون کا جز نہیں ہیں اسلیے مطالعہ کے وقت ناظرین ان کو نہ پڑھیں، بلکہ اصل مضمون مسلسل پڑھتے جائیں ورنہ بعض جگہ ان کو بے ربطی یا تکرار محسوس ہوگی، اسی لیے ان عنوانات کو جدولوں میں گھیر دیا گیا ہے۔

(۲) یہ مضمون اس طرح نہیں لکھا گیا ہے، جس طرح اطمینان سے بیٹھ کر اور غور و فکر کر کے مقالات تیار کیے جاتے ہیں یا کتابیں لکھی جاتی ہیں بلکہ ناظرین کرام کو جیسا کہ نگاہ اولیں کے صفحات سے معلوم ہو چکا ہے اپنے دعوتی اور تبلیغی سلسلہ کے ایک تعلیمی اور تربیتی پروگرام میں اس عاجز نے "تقریریں" "دین اور شریعت" کے موضوع پر کی تھیں، بعض دوستوں نے ان کو قلمبند کیا تھا، پھر خود انھوں نے محنت کر کے ان کو صاف کیا اور نظر ثانی اور اصلاح کیلئے مجھے دیا، میں نے یہ مناسب سمجھا کہ تھوڑا سا تصرف کر کے اسکو ایک مسلسل مضمون اور مستقل کتاب بنا دیا جائے، اس نقطۂ نظر سے جو چیزیں زائد اور قابل حذف نظر آئیں ان کو حذف کر دیا، کسی بات کی اگر تفصیل اور وضاحت ضروری سمجھی تو وہ کر دی، کسی جگہ اگر کچھ خلا محسوس ہوا تو اس کو پُر کر دیا —— آیات اور احادیث کے حوالے بھی کہیں اصل مضمون ہی میں اور کہیں حاشیہ پر لکھ دیے —— آیتوں اور حدیثوں کے علاوہ اور بھی بعض باتیں میں نے اس سلسلہ میں ایسی بیان کی تھیں جن کا حوالہ اگر مستند کتابوں سے دے دیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا لیکن اسوقت میں اس کام کے لیے وقت نہیں نکال سکا۔ انشاء اللہ جب اسکو کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا اسوقت یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

(۳) آیات احادیث کے ترجموں میں میں نے لفظی ترجمہ کی اور نحوی ترکیب کی پابندی ضروری نہیں سمجھی بلکہ ناظرین کی سہولت فہم کے لیے میں نے گویا مطلب لکھ دیا ہے اور تحریر و تقریر میں اکثر میں ایسا ہی کرتا ہوں۔

(۴) دین کی دعوت و نصرت اور ریاست و حکومت بھی دین کے اہم شعبے ہیں اس تربیتی پروگرام میں آخری دن مجھے اس موضوع پر بھی تقریر کرنی تھی لیکن اتفاق سے اُس دن میں بخار میں مبتلا ہو گیا اور وہ تقریر نہ ہو سکی جو کچھ میں اس سلسلے میں کہنے کا ارادہ رکھتا تھا انشاء اللہ اسکو بھی قلمبند کر کے کتابی اشاعت میں شامل کر دیا جائے گا۔

(۵) تصوف اور احسان بھی دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ پورے دین کی روح اور اس کا قلب ہے، ہمارے تربیتی ہفتہ میں اس پر مولانا محمد اویس صاحب ندوی (استاذ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے تقریر فرمائی تھی انشاء اللہ وہ تقریر بھی کتابی اشاعت میں شریک کر دی جائے گی۔ واللہ المستعان۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

دین و شریعت کی بنیاد اور اس کے دو حصے اعتقادی و عملی

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ "دین اور شریعت" کی بنیاد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و ہدایت پر ہو، یعنی آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علوم اور جو احکام لائے (جو قرآن مجید میں اور حدیثوں میں محفوظ ہیں) وہی دین اور شریعت کی اساس اور بنیاد ہیں، ان میں سے کچھ کا تعلق اعتقاد سے ہے اور کچھ کا اعمال سے ——— یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائی ہوئی ہدایت میں ایک حصہ تو وہ ہے جس میں کچھ ایسی حقیقتوں کی اطلاع دی گئی ہو جن کو ہم از خود نہیں جان سکتے تھے اور ہم کو یہ حکم ہو کہ ہم ان حقیقتوں کو مانیں اور ان پر ایمان لائیں ——— یہ دین کا ایمانی اور اعتقادی حصہ ہو، اور یہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے ——— اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں عملی زندگی کے متعلق احکام ہیں کہ یہ کام کرو اور یہ نہ کرو، یہ دین کا عملی حصہ ہو، اور پھر اس میں بہت سے شعبے ہیں، مثلاً عبادات کا شعبہ، اخلاق و آداب کا شعبہ، معاملات کا شعبہ، معاشرت کا شعبہ، وغیرہ وغیرہ۔ دین اور شریعت ان سب کو حاوی ہے، اور یہ سب اس کی شاخیں ہیں ——— اس سلسلۂ درس میں انشاء اللہ دین کے ان سب شعبوں کے متعلق اصولی اور ضروری ضروری باتیں کہنی ہیں۔ سب سے پہلے ایمانی اور اعتقادی حصہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ایمان

پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ شریعت کی خاص اصطلاح میں ایمان اس کو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کو اللہ کا رسول مانا جائے، اور یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہدایت کے واسطے وحی کے ذریعہ ان کو بہت سی وہ باتیں بتلاتا ہو جو ہم آنکھ کان وغیرہ اپنے علمی ذرائع سے معلوم نہیں کر سکتے اور اس بنا پر ان کی ان سب باتوں کی تصدیق کی جائے جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہونچائیں، اور ان پر یقین کیا جائے۔ پس کسی آدمی کے مومن ہونے کے لیے یہ ضروری ہو کہ وہ ان سب باتوں کو حق مانے جن کی اطلاع اللہ کے پیغمبر دیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی کسی نے انکار کیا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ کا رسول بھی مانتا ہوں اور آپ نے اللہ کی توحید اور اس کی صفات کے بارے میں جو کچھ بتلایا ہو اس کو بھی میں حق مانتا ہوں، لیکن قیامت اور جنت دوزخ کے متعلق جو کچھ آپ نے اطلاعیں دی ہیں (جو ہم قرآن و حدیث میں پڑھتے ہیں)، اُن کو میری عقل قبول نہیں کرتی، لہذا میں اس کو تسلیم نہیں کرتا، تو ایسا شخص مومن نہیں۔

ہو سکتا۔

الغرض ایمان اس کا نام ہے کہ "کل ما جاء بہ الرسول صلعم من عند اللہ" کی تصدیق کی جائے یعنی ان سب باتوں کو حق مانا جائے اور قبول کیا جائے جو پیغمبر اللہ کی طرف سے پہونچائے اور بتلائے۔[1]

عقائد اور ایمانیات

جن باتوں پر ایمان لانے اور اعتقاد رکھنے کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہو، اُن میں سے کچھ کا تعلق اللہ کی ذات و صفات سے ہو اور کچھ کا تعلق دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً رسولوں سے، ملائکہ سے، قیامت سے، میں پہلے دین کے اُس ایمانی اور اعتقادی حصہ کو لیتا ہوں جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو، کیوں کہ مقصدی حیثیت سے یہی حصہ سب سے زیادہ اہم ہو۔

وجود باری تعالےٰ

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانا جائے یعنی اس پر یقین کیا جائے کہ اس ساری کائنات کی پیدا کرنے والی اور عالم کے اس کارخانے کو چلانے والی ایک ہستی ہو اور وہ اللہ ہو۔

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ تاریخ سے اور دُنیا کی مذہبی کتابوں سے معلوم ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا عقیدہ دنیا کی قوموں میں ہمیشہ سے رہا ہو، یعنی اتنی بات ہر زمانہ میں اور تمام قوموں میں مانی جاتی رہی ہو کہ اس دُنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہو، اور وہ بڑی طاقتوں والا ہو۔ اور غالباً یہی وجہ ہو کہ قرآن مجید میں مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں آنے والے جن پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہو اُن کی تعلیم اور دعوت کے سلسلے میں توحید وغیرہ کا تو ذکر آتا ہو لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ماننے پر کوئی خاص زور دیا ہو۔ ——خود قرآن مجید کا رویہ بھی یہی ہو کہ اللہ کی توحید اور اس کی صفات کے بیان سے تو وہ بھرا ہوا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کا وجود منوانے پر اس میں زیادہ زور نہیں دیا گیا ہو، کیونکہ یہ ساری انسانی دنیا کا گویا ایک مسلّمہ مسئلہ ہو، اور انسانوں کی فطرت اگر بالکل مسخ نہ ہو جائے تو اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ہستی کا مسئلہ ان کے لیے ایسا ہی فطری اور بدیہی ہو جیسا کہ اپنے وجود اور اپنی ہستی کا مسئلہ، اور یہی وجہ ہو کہ ہمارے اس

---

[1] جو لوگ اللہ کے کسی پیغمبر کی حیات مقدسہ میں براہ راست ان کی زبان سے اُن کی ہدایت اور تعلیم سُنیں، اُن کے لیے تو ان کی ہر اُس بات کی تصدیق شرط ایمان ہو جو پیغمبر اُن کے سامنے اللہ کی طرف سے بیان کریں، اگر وہ اُن کی ایسی ایک بات کا بھی انکار کریں گے تو مومن نہ رہیں گے لیکن جب پیغمبر دنیا میں نہ رہیں تو صرف ان باتوں کی تصدیق کرنا شرط ایمان ہو جن کا ثبوت ان پیغمبر سے ایسے یقینی قطعی اور بدیہی طریقہ سے ہو جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، دین کی ایسی تعلیمات کو خاص علمی اصطلاح میں "ضروریات دین" کہتے ہیں، ان سب پر ایمان لانا شرط ایمان ہو، اگر ان میں سے کسی کا بھی کوئی انکار کرے تو مومن نہیں رہے گا، اور اگر وہ پہلے مسلمان تھا تو اسلام سے اس کا رشتہ کٹ جائے گا۔ ۱۲

زمانہ میں بھی جس کو دہریت کا زمانہ کہا جاتا ہے ان یوروپین ممالک میں بھی جو دہریت کا سرچشمہ سمجھے جاتے ہیں، خدا کے منکروں کی تعداد خدا کے ماننے والوں کے مقابلہ میں اقل قلیل ہے، حتیٰ کہ روس جو خدا بیزاری اور خدا دشمنی کا کہا جاتا ہے کہ مرکز ہے، وہاں بھی خدا کے منکر خدا کے ماننے والوں کی بہ نسبت اقلیت میں ہیں۔[1]

بہرحال اسی لیے اس مسئلہ کو زیادہ قابل بحث نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس مسئلہ کو قرآن پاک نے بالکل بے دلیل چھوڑ دیا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ کے بالکل فطری اور بدیہی ہونے کی وجہ سے اس پر ایسی توجہ نہیں دی گئی جیسی کہ توحید پر یا صفات الٰہی پر دی گئی ہے، بلکہ سوچنے والوں کے لیے معمولی رہنمائی کر دینا اور بس اشارے کر دینا کافی سمجھا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ط (انعام ع ۱۲) (بے شک اللہ ہی ہے پھاڑنے والا دانے اور گٹھلی کا)

مطلب یہ ہے کہ انسان برابر دیکھتے ہیں اور تجربہ کرتے ہیں کہ غلّہ کے کسی دانہ کو یا کسی پھل کی گٹھلی کو زمین میں دبا دیا جاتا ہے، پھر وہ دانہ اور گٹھلی اندر ہی اندر پھٹتے ہیں اور اُن میں سے ایک نہایت نرم و نازک ریشہ نکلتا ہے، اور وہ سطح زمین کو چیرتا ہوا اوپر نکل آتا ہے، تو غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دانہ کو یا گٹھلی کو زمین کے اندر کس نے قاعدہ سے شگافتہ دیا، اور کس نے اس بے جان اور سوکھے ہوئے دانہ یا گٹھلی میں سے وہ ہرا جاندار ریشہ یعنی انکھوا نکالا، پھر وہ ریشہ جو سوت کے دھاگے سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے کس کی طاقت اور کارفرمائی سے زمین کو چیرتا ہوا اوپر نکل آیا؟ —— تو قرآن پاک کی اس آیت میں بتلایا گیا کہ بس سمجھ لو کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے اور اسی کی کارفرمائی سے ہوا، اور یہ سب کچھ اللہ ہی نے کیا (اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ط)

اسی طرح ایک جگہ فرمایا گیا۔

"وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○" (ذاریات ع ۱)

(اور یقین لانے والوں کے لیے زمین میں ہماری نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور خود تمہارے اندر بھی ہیں، تو کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا)

---

[1] چند سال ہوئے یورپ کے کسی محقق نے مغربی ممالک میں خدا کے منکروں اور ماننے والوں کے اعداد و شمار بڑی محنت سے فراہم کر کے اخبارات میں شائع کیے تھے، جس میں یورپ کا بھی تناسب دیا گیا تھا، یہ مضمون ہندوستان کے بعض اخبارات میں خود اس عاجز نے پڑھا تھا لیکن افسوس ہے کہ محفوظ نہیں کیا —— خیر وہ تو پرانی بات تھی، ابھی ۴ر جنوری کے "قومی آواز لکھنؤ" میں جرمنی کے مشہور پروٹسٹنٹ چرچ لیڈر پاسٹر نی موئلر کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے اپنے روس کے حالیہ دورے کے تاثرات اور مشاہدات بیان کیے ہیں، اسکے دو فقرے یہ ہیں —— "اندازاً اس وقت روس کی ۵۵ فی صدی آبادی گرجا گھروں سے متعلق ہے" —— "اس وقت خود ماسکو میں ۴۶ گرجا گھر موجود ہیں اور ان کے علاوہ پورے سوویٹ یونین میں ۲۰ ہزار گرجا گھر قائم ہیں اور گرجا گھر کے بڑے پادری سے لے کر معمولی راہبوں تک کو کلیساؤں کی ترقی کی امید ہے" (قومی آواز ۴ر جنوری صفحہ ۵ کالم ۱ و ۲) —— یہ بیان پاسٹر نی موئلر نے عالمی چرچ کونسل کی سنٹرل کمیٹی کے ممبران کے سامنے دیا ہے ۱۲ م

مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اپنی بصیرت سے کام لے اور دیکھنا چاہے تو زمین میں ہماری ہستی اور ہماری قدرت کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور خود انسانوں کے وجود میں بھی ہماری نشانیاں موجود ہیں، ذرا انسان غور تو کرے کہ ماں کے رحم میں اس کی یہ موزوں صورت کس نے بنائی، کس نے دیکھنے والی آنکھ بنائی، کس نے سننے والے کان بنائے، کس نے ذائقہ لینے والی زبان اور سونگھنے والی ناک بنائی، کس نے اس کی زبان کو گویائی دی —— کس نے ماں کے پستانوں میں اس کے لیے دودھ کی نہر جاری کی، کس کے قبضہ میں اس کی زندگی اور موت ہے؟

انسان اگر خود اپنے بارہ میں اس طرح غور کرے تو ہر سوال کا جواب خود اس کی عقل یہی دے گی کہ یہ سب کچھ نظر نہ آنے والی ایک قدرت و حکمت والی ہستی نے کیا اور وہی اللہ ہے۔

اور ایک اور جگہ بڑے عجیب سوالیہ پیرایہ میں فرمایا گیا:۔

"اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ" (ابراہیم ع ۲)

(کیا اس اللہ کی ہستی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے)

یعنی جو شخص زمین کو دیکھتا ہے اور زمین پر جو کچھ ہوتا رہتا ہے اس کو بھی دیکھتا رہتا ہے اور اوپر جو آسمان اور ستارے وغیرہ نظر آتے ہیں اُن کو بھی جو دیکھتا ہے اس کے لیے زمین و آسمان کے خالق کے بارے میں شک کرنے کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟

بہرحال اللہ تعالیٰ کی ہستی کا مسئلہ چونکہ بالکل فطری اور بدیہی مسئلہ تھا اس لیے اس کے متعلق قرآن پاک میں صرف اس قسم کے اشارات کر دینا کافی سمجھا گیا —— اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور خطبات میں بھی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی ہستی کے متعلق کوئی خاص بحث نہیں ملتی اور نہ اس کی ضرورت تھی، کیونکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ مسئلہ دراصل بالکل بدیہی ہے، اس کے لیے کسی بحث اور استدلال کی ضرورت ہی نہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے مخاطب تھے وہ سب اس کو ماننے والے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے وجود پر بحث کرنے اور دلائل دے کر اس کو ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، بلکہ ایسا کرنا اس ماحول میں غالباً غلط اور خلاف حکمت ہوتا —— دراصل اللہ تعالیٰ کی ہستی کا مسئلہ انکار یا شک کے قابل ہی نہیں اور اسی لیے یہ گمراہی کبھی بھی انسانوں میں زیادہ نہیں پھیلی، بلکہ بسا اوقات تو ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بظاہر خدا کا انکار کرنے والوں کو جب ٹٹولا گیا تو اندازہ ہوا کہ اُن کے بھی دل کے کسی گوشہ میں خدا کی ہستی کا اقرار چھپا ہوا موجود ہے۔

توحید ہاں خدا کی توحید کا مسئلہ ایسا ہے جس میں بہت سی قومیں گمراہ ہوئی ہیں، اور اسی لیے تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور تعلیم کا یہ خاص موضوع رہا ہے۔ اور قرآن مجید میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

ہیں تو اس مسئلہ کی ایسی تکمیل اور تفصیل کی گئی ہو کہ کوئی گوشہ نہیں چھوڑا گیا ہو ___ قرآن پاک میں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی احادیث میں اس بارہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہو اس کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ شرک میں وہی شخص گرفتار ہوتا ہو جس کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح علم نہیں ہوتا، اور جس کو صفات خداوندی کا صحیح علم ہو جائے اس سے کبھی شرک نہیں ہو سکتا۔

مثلاً جو شخص یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ ہی پیدا کرنے والا ہو، اللہ ہی پالنے والا ہو، اللہ ہی رزق دیتا ہو، اللہ ہی اولاد دیتا ہو، اللہ ہی مارتا اور جلاتا ہو، اللہ ہی تندرست اور بیمار کرتا ہو، اللہ ہی امیر یا غریب بناتا ہو، غرض اس دُنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہو سب اللہ ہی کے حکم سے اور اسی کے کرنے سے ہوتا ہو۔ سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا بھی محتاج نہیں ہو، تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر یقین رکھتا ہو، ظاہر ہو کہ وہ نہ اللہ کے سوا کسی سے اپنی حاجتیں مانگے گا، نہ کسی کی عبادت کرے گا، نہ کسی کو راضی اور خوش کرنے کے لیے نذریں اور منتیں مانے گا۔

بیان توحید کا ایک طریقہ

تو قرآن شریف میں اور اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیثوں میں بھی توحید کو سمجھانے اور دل میں بٹھانے کے لیے ایک تو یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہو تاکہ بندے یہ جان لیں کہ جب اللہ کی ایسی شان ہو اور اس میں یہ سب صفتیں موجود ہیں تو بس وہی بندگی اور عبادت کے لائق ہو ___ قرآن شریف کے اس طریقۂ تعلیم اور طریقۂ بیان کو سب سے پہلے آپ سورۂ فاتحہ میں دیکھیے! ___ پہلے بندوں سے کہلوایا گیا :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝

(ہر قسم کی حمد و ستائش اُسی اللہ کے لیے ہو جو ساری کائنات کا رب اور پروردگار ہو، بڑی رحمت والا اور نہایت مہربان ہو، انصاف کے دن کا مالک ہو (یعنی ایک آنیوالے دن جب اصلی جزا اور سزا وہی دینے والا ہو)

اللہ تعالیٰ کی یہ صفات بیان کرا کے آگے کہلایا گیا کہ :-

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝

(یعنی جب اللہ تعالیٰ ہی رب اور پالنے والا ہو اور ہماری زندگی کی ساری ضرورتیں وہی مہیا کرتا ہو، اور وہ بڑی رحمت والا اور نہایت مہربان بھی ہو، اور ان صفات جمال کے ساتھ وہی آخرت والی زندگی میں جزا اور سزا دینے والا صاحب جلال وجبروت حاکم بھی ہو تو بس پھر اسی کی عبادت ہم کریں گے اور اپنی ضرورتوں میں صرف اسی سے مدد مانگیں گے)

بیان توحید کا دوسرا طریقہ

اور کہیں بیان توحید کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہو کہ پہلے توحید کا ذکر کیا گیا اور

یہ بیان فرمایا گیا کہ اللہ ہی عبادت اور بندگی کے لائق ہے، اور بس وہی الٰہ اور معبود ہے۔ اور اس کے بعد بطور دلیل اور سند کے اللہ کی شان اور صفات بیان کی گئیں، مثلاً آیت الکرسی میں پہلے فرمایا گیا "اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" (اللہ کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں) اور آگے اس کی صفات اور اس کی شان کو اس طرح بیان فرمایا گیا۔

"اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" یعنی وہی زندۂ جاوید ہے، اور اسی کی زندگی اپنی ذاتی زندگی ہے، اور اس کے سوا جسکو زندگی ملی ہے وہ اسی کی دی ہوئی ہے، اور عارضی ہے، اور وہی زندۂ جاوید ہستی اس ساری کائنات کو تھامے ہوئے اور سنبھالے ہوئے ہے، (حَیّ و قَیُّوم کا یہی مطلب ہے)۔ —— آگے فرمایا "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" نہ اُسے اونگھ لگتی ہے اور نہ نیند آتی ہے، یعنی وہ ہمہ وقت بیدار اور باخبر ہے، کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ اُس کی طرف اپنی کسی ضرورت کے لیے متوجہ ہو اور وہ اس وقت اپنے آرام میں اور اُونگھ یا نیند کی حالت میں ہو، اُونگھ یا نیند جیسی چیزوں کا اس کے پاس گزر ہی نہیں۔ "لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، وہی سب کا مالک و مختار ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" کون ہے جو اس کی جناب میں اسکی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش بھی کر سکے، یعنی کسی کی بھی یہ مجال نہیں۔ "یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ" جو کچھ بندوں کے سامنے اور حاضر ہے وہ اُس کو بھی جانتا ہے، اور جو اُن کے پیچھے ہے اور اُن سے غائب اور اوجھل ہے وہ اُس سے بھی واقف ہے، اور مخلوقات اور بندوں کے علم کا حال یہ ہے کہ اللہ کے غیر متناہی علم میں سے وہ کسی ایک چیز کو بھی پوری طرح نہیں جان سکتے۔ اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے، تو وہ بس اسی کو اور اس کے بتانے کے بقدر ہی جان سکتے ہیں —— آگے فرمایا گیا ہے "وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ" اس کا تختِ حکومت زمین و آسمان کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے، اور اُن کے تھامنے سے وہ تھکتا نہیں، اور وہ اونچی شان والا بڑی عظمت والا ہے۔

تو اس آیت الکرسی میں پہلے توحید کا ذکر کیا گیا (اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) اور اس کے بعد اللہ کی وہ شان اور وہ صفتیں بیان کی گئیں جن کے جاننے کے بعد آدمی خود بخود اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ صرف یہی ہستی الٰہ و معبود ہے، اور عبادت اور بندگی صرف اُسی کا حق ہے۔

اسی طرح سورۂ اخلاص میں پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان فرمائی گئی "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" یعنی کہو اور اقرار کرو، کہ وہ اللہ ایک ہے، یکتا ہے، اور اُس کے بعد اُس کی وہ صفات بیان کی گئیں جن کو

جاننے کے بعد آدمی خود اسی نتیجہ پر پہونچتا ہو، فرمایا گیا "اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝" یعنی اللہ بے نیاز ہو، وہ کسی کا محتاج نہیں ہو، اور اس کے علاوہ سارے موجودات اس کے محتاج ہیں۔ "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" نہ کوئی اُس کی اولاد نہ وہ کسی کی اولاد، "وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝" اور کوئی اس کے برابر اور ہمسر نہیں ـــــ ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں اللہ کی جو شان اور صفت بیان کی گئی ہو اس کو جاننے کے بعد آدمی خود بخود یہ سمجھ سکتا ہو کہ الٰہ اور معبود بننے کے لائق صرف یہی ذات ہو جس کی شان یہ ہو کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، اور سب اُس کے محتاج ہیں، اور نہ کوئی اس کی جنس ہو اور نہ کوئی اُس کے مانند اور ہمسر ہو،

یہ میں نے قرآن مجید کے بیانِ توحید کے متعلق ایک اُصولی بات کہی ہو، اس سے توحید اور قرآن مجید کے توحیدی مضامین کو سمجھنے کے لیے ایک راستہ کھل جاتا ہو۔

عرب کے مشرکین بھی ایک درجہ توحید کے قائل تھے

توحید ہی کے متعلق اسی طرح کی ایک اُصولی بات اور بھی سمجھ لینی چاہیے! اور وہ یہ کہ توحید کا یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا ایک درجہ تو وہ ہو جس کو بہت سے مشرکین بھی مانتے ہیں، مثلاً اتنی بات کہ زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کا پیدا کرنے والا اور بنانے والا ایک ہی ہو، ایسا نہیں ہو کہ کچھ چیزیں کسی نے پیدا کی ہوں اور کچھ کسی نے، تو خود قرآن مجید میں جا بجا اس کی شہادت موجود ہو کہ اتنی بات تو عرب کے مشرک بھی مانتے تھے ـــــ لفظوں کے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ کئی جگہ قرآن مجید میں یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہو کہ اگر ان مشرکوں سے پوچھا جائے کہ بتلاؤ زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہیں گے اور اقرار کریں گے کہ اللہ نے" (وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ [1]) بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ بھی مانتے اور اقرار کرتے تھے کہ اس سارے کارخانہ کو چلانے والا بھی اللہ ہی ہو، وہی روزی دیتا ہو، وہی مارتا اور جلاتا ہو۔ چنانچہ سورہ یونس میں فرمایا گیا ہو:-

"قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ [2]"

(یعنی اے پیغمبر آپ ان مشرکوں سے پوچھیے کہ بتاؤ کون تمھیں زمین و آسمان سے روزی دیتا ہو، اور کون

---

[1] عنکبوت ع ۶۔ [2] یونس ع ۴۔

کانوں اور آنکھوں کا مالک ہو، اور کس کا ان چیزوں پر اختیار ہو، اور کون زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہو، اور کون ہو جو اس تمام کارخانۂ ہستی کا انتظام کر رہا ہو؟ تو آپ جب ان سے پوچھیں گے تو وہ صاف کہیں گے کہ یہ سب کرنے والا صرف اکیلا اللہ ہو)

بہرحال اتنی توحید کے قائل عرب کے مشرک بھی تھے۔

پھر ان کا شرک کیا تھا؟

تو اب غور کرنے کی بات یہ ہو کہ پھر ان کا شرک کیا تھا؟۔

قرآن مجید ہی سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و مالک اور مدبّر و منتظم یعنی اس پورے کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ جن ہستیوں کو ہم دیوی اور دیوتا مانتے ہیں وہ اگرچہ اسی اللہ کے پیدا کیے ہوئے اور مخلوق ہیں لیکن ان کا اللہ سے ایسا خاص تعلق ہو کہ اگر وہ کسی کو کچھ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، اور کسی سے کچھ چھیننا چاہیں تو چھین سکتے ہیں۔ کسی کو دولت دے کر امیر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کسی سے دولت چھین کر اس بیچارہ کو غریب و فقیر بنانا چاہیں تو بنا سکتے ہیں اسی طرح اگر کسی کو بیمار یا تندرست کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کسی کو اولاد دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، ـــــ الغرض یہ مشرکین سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص تعلق کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو ایسے جزوی کاموں کے اختیارات دے دیے ہیں۔ اور اس بنا پر وہ انھیں راضی اور خوش رکھنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے، ان کی مورتیوں کے گرد طواف کرتے تھے، اور اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں ان سے مدد مانگتے تھے، تو قرآن پاک نے ان کے اسی خیال اور اسی طرز عمل کو شرک قرار دیا ہو، اور اکثر قوموں اور ملکوں کے مشرکوں میں یہی شرک رہا ہو، ایسے مشرک دنیا میں غالباً بہت کم ہوئے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہو کہ اس دنیا کے پیدا کرنے اور چلانے میں اللہ کا کوئی ساتھی اور شریک ہو، اور جہاں تک ہمارے معلومات ہیں کسی مشرک قوم نے کبھی اپنے دوسرے معبودوں کو اللہ کے برابر نہیں سمجھا، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مشرکین عرب کے متعلق تو قرآن و حدیث میں صاف صاف اس کی شہادت موجود ہو، اور قرآن مجید ہی میں ان کے اس طرز عمل کا تذکرہ کئی جگہ فرمایا گیا ہو، کہ جب وہ کشتی میں دریا کا سفر کرتے تھے اور اس کی موجیں خطرہ کی صورت پیدا کر دیتی تھیں تو وہ اپنے سب دیوتاؤں کو بھول جاتے تھے اور صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے اور اسی سے کس لگاتے تھے، چنانچہ ایک جگہ فرمایا گیا:-

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ [1]

(جب سمندر میں تم پر کوئی مصیبت اور آفت آتی ہو تو اللہ کے سوا اپنے ان سب دیوتاؤں کو تم بھول جاتے ہو، جن کو تم دوسرے موقعوں پر پکارا کرتے ہو)

[1] سورۂ بنی اسرائیل ع ۷۔

اور ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:۔

"وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ"[۵۱]

(اور جب سمندر کی موجیں بادلوں کی طرح اُن کو گھیر لیتی ہیں تو اس وقت وہ اپنے اعتقاد کو اللہ کے لیے خالص کر کے بس اُسی کو مدد کے لیے پکارتے ہیں)

بہر حال مشرکین عرب کے قول سے بھی اور عمل سے بھی یہ بات بالکل ظاہر ہو کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خدا کے برابر نہیں سمجھتے تھے، بلکہ خدا کو سب سے بالا اور برتر سمجھتے تھے، اور اپنے دیوتاؤں کو خدا کی مخلوق اور خدا کا مملوک جانتے تھے۔

مشرکین عرب کا تلبیہ حدیث کی کتابوں میں مشرکین عرب کا تلبیہ بھی نقل کیا گیا ہو جو وہ اپنے مشرکانہ حج میں پڑھتے تھے، اس کے آخری الفاظ یہ نقل کیے گئے ہیں "اِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ" یعنی وہ اپنے حج کے تلبیہ میں اللہ تعالیٰ سے کہتے تھے کہ "اے اللہ ہم آپ کی بارگاہ میں حاضر ہیں، آپ کا کوئی شریک نہیں، ہاں ایسے شریک ہیں جو آپ کی ملکیت میں ہیں آپ ان کے مالک ہیں، اور وہ خود کسی چیز کے مالک نہیں ہیں:"

مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت اور قرآن میں اس کی تردید بہر حال مشرکین عرب کا شرک یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کی طرح دُنیا کا خالق یا رازق سمجھتے ہوں یا کسی حیثیت سے یا کسی صفت میں بھی اللہ کے برابر کہتے ہوں، بلکہ ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و مالک اور مدبر و منتظم ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور تقرب کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں اور یہ چاہیں تو بناؤ بگاڑ کر سکتے ہیں، اور اسی بنیاد پر یہ ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے، یعنی سجدہ اور طواف جیسے اعمال کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے، اور اُن سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے۔ بس ان کا یہی خیال اور یہی عمل شرک تھا، اور اکثر مشرک قوموں میں اسی قسم کا شرک رہا ہو، اور اسی وجہ سے قرآن پاک میں اسی شرک کا رد زیادہ کیا گیا ہو۔

ایک جگہ فرمایا گیا:۔

"وَاتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً لَّا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ وَلَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا"[۵۲]

(اور ان مشرکوں نے اللہ کے سوا ایسے معبود بنا لیے ہیں جو کوئی چیز بھی نہیں بنا سکتے، اور وہ خود اللہ کے

---

۵۱ سورۂ لقمان، ع ۴۔ ۵۲ فرقان، ع ۱۔

بنائے ہوئے ہیں، اور دوسروں کا کیا ذکر خود اپنے نفع نقصان پر بھی انھیں اختیار نہیں، اور نہ اس دُنیا کے مرنے جینے پر، اور نہ حیات بعد الموت پر انھیں کوئی اختیار ہو، یعنی ان کے قبضہ و اختیار میں کچھ بھی نہیں ہو)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہو:۔

"قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ"[۱]

(اے پیغبر ان مشرکوں سے کہیے کہ جن کو تم اللہ کے سوا مالک و مختار سمجھے ہو، وہ ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں، نہ آسمانوں میں، نہ زمین میں، اور اُن میں اُن کا کوئی ساجھا بھی نہیں، اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہو)

یعنی زمین و آسمان کی کوئی ذرہ برابر چیز بھی نہ تو ان کی ملکیت ہو، نہ اس کی ملکیت میں خدا کے ساتھ ان کی کوئی شرکت ہو، اور ایسا بھی نہیں ہو کہ بغیر ملکیت اور شرکت کے خدا اُن سے کسی معاملہ میں مدد لیتا ہو۔

اور سورہ بنی اسرائیل میں ایک جگہ فرمایا گیا:۔

"قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا"[۲]

(اے پیغبر ان مشرکوں سے کہیے کہ اللہ کے سوا جن کو تم نے مالک و مختار اور قابل عبادت سمجھ رکھا ہو، انھیں تمھاری کسی تکلیف کے دور کرنے اور ہٹا دینے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہو، یعنی یہ محض تمھاری خام خیالی ہو)

اور سورۂ یونس کے آخری رکوع میں بڑے اہتمام اور بڑی تفصیل کے ساتھ فرمایا گیا:۔

"قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَا اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ"[۳]

(اے نبی آپ کہیے کہ اے لوگو! اگر تمھیں میرے دین اور میرے طریقہ کے بارہ میں کوئی شک و شبہ ہو، تو سُن لو، میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میرا طریقہ اور میرا دین یہ ہو کہ اللہ کے سوا تم جن کی عبادت اور پرستش کرتے ہو

---

[۱] سبا ع ۲۔ [۲] بنی اسرائیل ع ۶۔ [۳] یونس ع ۱۱۔

میں ان کی عبادت نہیں کرتا اور نہیں کروں گا، بلکہ میں صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا جو تمہیں موت دینے والا ہے، اور مجھے اسی اللہ کا حکم ہو کہ میں ایمان والوں میں سے ہو جاؤں ـــــــ اور یہ کہ تم سیدھا کرو اپنا رخ اللہ کی اطاعت اور عبادت کے لیے سب طرف سے یکسو ہوکر، اور ہرگز نہ ہو مشرکوں میں سے ـــــــ اور نہ پکارو اللہ کے سوا اُن ہستیوں کو جو نہ تمہیں کوئی نفع پہونچا سکتی ہیں اور نہ کوئی تکلیف دے سکتی ہیں، اور اگر تم نے ایسا کیا تو پھر تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ـــــــ اور یقین کرو کہ اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہونچائے تو اللہ کے سوا کوئی اس کو دور کر سکنے والا نہیں، اور اگر وہ تمہارے لیے کسی بھلائی کا ارادہ کرے اور اپنی رحمت سے نوازنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کو روک سکنے والا اور ہٹانے والا کوئی نہیں، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے نوازے اور نصیب فرمائے، وہ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے)

تو ان آیتوں میں اور ان کے علاوہ سیکڑوں آیتوں میں مشرکین عرب کے جس شرک کا رد کیا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ کچھ ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگرچہ یہ اللہ کی مخلوق اور مملوک ہیں لیکن خدا کے ساتھ ان کا ایسا تعلق اور اس کے کارخانہ میں ان کا ایسا دخل ہے کہ یہ ہماری تکلیفیں دور کر سکتے ہیں، اور دولت اور عزت اور اولاد جیسی چیزیں ہمیں دے سکتے ہیں اور اسی عقیدہ کی بنا پر وہ اپنی حاجتیں اُن سے مانگتے تھے، دُعائیں کرتے تھے اور انھیں خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے، یعنی جس طرح خدا کو راضی کرنے کے لیے اور اپنی عاجزی اس کے سامنے ظاہر کرنے کے لیے اُس کی عبادت اور پرستش کی جاتی ہے اسی طرح وہ اپنے ان معبودوں کی بھی عبادت کرتے تھے ـــــ تو قرآن پاک نے ان کے اس عقیدہ کو بھی شرک قرار دیا، اور عبادت و استعانت کے ان کے عمل کو بھی۔

ان مشرکوں کے معبود کون تھے

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہ ہستیاں کون تھیں جن کے متعلق یہ مشرکین ایسا عقیدہ رکھتے تھے اور جن کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اُن سے دُعائیں کرتے تھے اور جن کی عبادت کرتے تھے؟ ـــــــ

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مشرکین یہ سارے معاملات پتھر کی مورتیوں ہی کے ساتھ کرتے تھے، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ پتھر کی یہ مورتیاں ان کی اصل معبود نہیں تھیں، بلکہ مشرکین کا یہ مشرکانہ عقیدہ اور مشرکانہ عمل اُن بزرگ روحوں اور اُن روحانی ہستیوں کے ساتھ تھا جن سے یہ پتھر کے بُت منسوب تھے ـــــ قرآن مجید میں سورۂ نوح میں قوم نوح کے چند بتوں کے یہ نام آئے ہیں۔ وَدّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر اور ان کے متعلق روایات میں ہے کہ دراصل یہ نام چند بزرگوں کے ہیں جو واقعی بزرگ اور اہل اللہ تھے، جب وہ انتقال کر گئے تو کچھ زمانہ کے بعد اُن کے عقیدت مندوں نے ان کی یاد کے لیے ان کی نشانی کے طور پر ان کے مجسمے بنائے اور ان کی تعظیم

کرنے لگے، بعد کی نسلوں کو شیطان نے ان کی عبادت کے راستہ پر لگا دیا۔ اسی طرح مشرکین عرب جن بتوں کی پرستش کرتے تھے وہ بت بھی کچھ روحانی ہستیوں کی نشانی یا یادگار سمجھے جاتے تھے اور دراصل عبادت ان روحانی ہستیوں کی کی جاتی تھی اور انہی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جاتا تھا، جس طرح ہندوؤں میں مثلاً کرشن جی یا رامچندر جی کی مورتیوں کی پوجا کی جاتی ہے، تو عبادت اور پوجا اس مورتی کی مقصود نہیں ہوتی بلکہ کرشن جی اور رامچندر جی کی شخصیت کی عبادت مقصود ہوتی ہے اور اس مورتی کو اُن کے دھیان اور اُن کی پوجا کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اور اسی نسبت سے اس کا احترام کیا جاتا ہے، اور جس طرح کہ بہت سے مسلمان کہلانے والے جاہل تعزیوں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں ان کو جھک کر سلام کرتے ہیں اور سنا ہے کہ اُن پر عرضیاں تک لٹکاتے ہیں اور ان کے ساتھ وہ سب حرکتیں کرتے ہیں جو بت پرست اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن یہ تعزیہ دار اور تعزیہ پرست دراصل کاغذ اور بانس سے بنے ہوئے اُس تعزیہ میں کوئی غیبی طاقت اور قدرت نہیں سمجھتے بلکہ وہ یہ سب کچھ "امام حسین" کے نام پر کرتے ہیں، اور تعزیہ کو اُن کی نشانی اور یادگار سمجھتے ہیں، تو یہ وہی بالکل بت پرستوں والی منطق ہے، ———— ہاں بعض نہایت احمق قسم کے گنوار سنا ہے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بانس اور کاغذ سے بنے ہوئے تعزیہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، تو اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مشرکوں میں بھی بعض اتنے احمق تھے جو اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے پتھر کے بتوں ہی کو حاجت روا سمجھتے تھے اور اس لیے براہ راست اُن ہی کی عبادت کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ہ" (کیا تم پتھر کی ترشی ہوئی ان مورتیوں کو معبود بناتے ہو جن کو خود تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشا اور بنایا ہے)

تو ایسی آیتیں دراصل اُسی احمق طبقہ کے مشرکوں سے متعلق ہیں جو پتھر کے بتوں ہی میں کرشمہ سمجھتے تھے اور اُن سے اپنی حاجتیں مانگتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے، اور جو مشرک اتنے احمق نہیں تھے اور وہ پتھر کے بتوں کو اصل معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ کچھ واقعی یا فرضی بزرگ روحوں اور روحانی ہستیوں کو نفع و ضرر کا مختار اور حاجت روا سمجھتے تھے، اور انہی کی دراصل عبادت کرتے تھے اور بتوں کو صرف ان کی نشانی یا ان کی جلوہ گاہ سمجھتے تھے تو ان سے فرمایا گیا:—

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ[لہ]

(جن ہستیوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ تو تمہاری ہی طرح ہمارے بندے ہیں)

اور ایک دوسرے موقع پر سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا کہ وہ تو خود ہمارے محتاج ہیں، ہمارے در کے بھکاری ہیں، اپنی ضرورتیں ہم سے مانگتے ہیں، ہمارے قرب کے طلبگار رہتے ہیں اور اس راستے میں کوشش کرتے

لہ اعراف ع ۲۴

رہتے ہیں اور ہمارے رحم کے امیدوار اور ہمارے عذاب سے ترساں ہو لرزاں رہنے والے ہیں۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں :-

"أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ[1]"

تو اس قسم کی آیتوں میں اُن مشرکوں کے شرک کا رد کیا گیا ہو جو بتوں کو اصلی معبود اور حاجت روا نہیں سمجھتے تھے بلکہ کچھ مقرب روحانی ہستیوں کو ایسا سمجھتے تھے، اور بتوں کو ان کا نمائندہ یا ان کی نشانی یا جلوہ گاہ سمجھتے تھے، اور افسوس ہو کہ یہی حال بہت سے جاہل تعزیہ پرستوں اور قبر پرستوں کا بھی ہو وہ بزرگان دین کے متعلق اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور اسی بنا پر اُن کی قبروں اور تعزیوں کے سامنے جھکتے اور نذریں چڑھاتے ہیں۔

مشرکین خدا کو سب سے بڑا اور اصل خالق و مالک ماننے کے باوجود دوسروں سے کیوں اپنی حاجتیں طلب کرتے تھے

شرک کے اور مشرکوں کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی یہیں سمجھ لینا چاہیے۔ بہت سوں کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہوگا اور پیدا ہونا چاہیے کہ یہ مشرک جب یہ جانتے اور مانتے تھے کہ ساری دنیا کا اصل خالق اور مالک، اور سارے کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ایک اللہ ہی ہو، اور جن کو وہ دیوی دیوتا اور حاجت روا و مشکل کشا سمجھتے ہیں وہ بھی اسی کے مملوک اور مخلوق ہیں، اور اگر ان کو کچھ اختیار بھی ہو تو وہ جزوی ہی ہو، اور کُلّی اختیار صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہو، اور وہ خدا موجود ہو، اور اس سے بھی مانگا جا سکتا ہو تو وہ خدا کے ہوتے ہوئے اپنی حاجتیں اِن دیویوں دیوتاؤں سے کیوں مانگتے تھے اور کیوں بجائے خدا کے ان کی عبادت کرتے تھے ؟

یہ سوال عرب کے پرانے زمانے کے مشرکوں کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہو، اور ہمارے زمانے کے مشرکوں مثلاً بُت پرست ہندوؤں کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے، بلکہ مسلمان کہلانے والوں میں جو تعزیہ پرست اور قبر پرست قسم کے لوگ ہیں اُن کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہو، اور میں نے اس پر بہت غور کیا ہو اور میں اس نتیجہ پر ہو پہنچا ہوں کہ یہ سب مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کو راضی کرنا اور خوش کرنا اور پھر اس سے اپنے کام کرا لینا تو بہت مشکل ہو، کیونکہ اللہ تو جب راضی ہوگا جب اس کے بتلائے ہوئے سب مذہبی احکام پر چلا جائے، جھوٹ نہ بولا جائے، بے ایمانی نہ کی جائے، کسی کو دھوکا نہ دیا جائے، کسی کا حق نہ مارا جائے سارے حرام اور ناپاک کاموں سے بچا جائے، اور پاک زندگی گذاری جائے — اور یہ ان مشرکوں کے لیے بہت مشکل ہو، یہ تو ساری عمر پاپڑ بیلنا ہوا، اس لیے وہ خدا کو راضی کر کے اُس سے اپنے کام کرانے سے تو مایوس ہیں، اور اس کے سوا انھوں نے جن بھوتی بچی، واقعی یا فرضی ہستیوں کو حاجت روا

---

[1] بنی اسرائیل ع ۶۔

اور نفع و نقصان کا مختار سمجھ رکھا ہو، ان کے متعلق ان کا خیال ہو کہ ان کو صرف پانچ پیسوں کے بتاشوں سے راضی کرکے یا ان کے سامنے بس ڈنڈوت اور سجدہ کرکے یا دو چار پیسے کے ہار پھول چڑھا کے اور ایک چراغ جلا کے سارے کام کرائے جاسکتے ہیں، — میرے نزدیک تو سارے شرک کی جڑ بنیاد یہی شیطانی دھوکہ ہو۔

اس شیطانی دھوکے سے نکالنے کی قرآنی تدبیر

اللہ کی مخلوق کو شیطان کے اس فریب سے نکالنے کی صورت یہی ہو کہ انھیں یہ بتایا جائے کہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہو، نہ پیدائش، نہ پرورش، نہ موت، نہ حیات، نہ تندرستی، نہ بیماری، نہ امیری، نہ غریبی، نہ عزت، نہ ذلت، بلکہ سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہو، اور وہی کسی کو کچھ دے سکتا ہو، اور ساری کائنات اُسی کی محتاج ہو جیسا کہ فرمایا گیا۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝[۵۱]

(کہو اے اللہ سارے ملک اور ساری کائنات کے مالک! تو ہی ہو، جس کو چاہے حکومت و بادشاہت دے اور جس سے تو چاہے چھین لے، جسے تو چاہے عزت دے اور جسے چاہے رسوائی اور ذلت دے، ہر خیر اور ہر قسم کی بھلائی صرف تیرے ہی قبضہ اور اختیار میں ہو (اور صرف خیر اور بھلائی ہی نہیں بلکہ ہر چیز خواہ بھلی ہو یا بُری) تیری قدرت میں ہو، تو ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہو، اور رات دن کا یہ نظام تیرے ہی چلانے سے چل رہا ہو، اور تو ہی زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہو، اور جس کو تو چاہے بےحساب روزی دیتا ہو)

اور کہیں فرمایا گیا:۔ "بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ"[۵۲] (ہر چیز کا اختیار صرف اسی کے ہاتھ میں ہو)

کہیں فرمایا گیا:۔ "لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"[۵۳] (زمین و آسمان کے سارے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں)

کہیں فرمایا گیا:۔ "مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ"[۵۴] (اللہ آدمیوں کے لیے جس رحمت کا دروازہ کھولے اور جو نعمت کسی کو دینا چاہے، کوئی نہیں ہو اُسے روک سکنے والا، اور جو وہ نہ دینا چاہے اور روک لے تو کوئی نہیں ہو اس کے بعد اس کو دے سکنے والا، اور جاری کرنے والا)

---

۵۱ آل عمران ع ۳ ۵۲ یٰسین۔ ع ۵۔ ۵۳ شوریٰ۔ ع ۲۔ ۵۴ فاطر۔ ع ۱۔

قرآن مجید میں مشرکوں کو شرک سے بچانے کے لیے زیادہ تر یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے، یعنی ان کو بتلایا گیا ہے کہ شیطان نے تمھیں یہ غلط باور کرا رکھا ہے کہ کسی اور کے ہاتھ میں بھی کچھ اختیار ہے، اور اللہ کے سوا اور بھی کوئی ایسی ہستی ہے جس کے قبضہ میں تمھارا بناؤ بگاڑ اور تمھاری حاجتیں ہیں، لہٰذا بس اللہ ہی کو اپنا حاجت روا سمجھو، اور جو مانگنا ہو اُسی سے مانگو، اور اسی کی عبادت کرو۔

توحید اور شرک سے متعلق دو اہم باتیں

اس موقع پر دو باتیں اور بھی ایسی ہیں جن کا سمجھ لینا ضروری ہے، ایک یہ کہ عبادت کیا ہے جس کا غیر اللہ کے لیے کرنا شرک ہے؟۔ اور دوسری بات یہ کہ اس عالم اسباب میں ہم بہت سی چیزوں سے کام لیتے ہیں، جیسے پانی سے پیاس بجھاتے ہیں، آگ سے اور سورج سے روشنی اور گرمی حاصل کرتے ہیں، دوا سے شفا حاصل کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح اپنے جیسے بہت سے آدمیوں سے ہم بہت سے موقعوں پر مدد لیتے ہیں، مثلاً حکیموں، ڈاکٹروں سے علاج میں مدد لیتے ہیں، مقدمات میں وکیلوں سے مدد لیتے ہیں، اسی طرح اپنے کاموں میں نوکروں مزدوروں سے مدد لیتے ہیں، علیٰ ہٰذا القیاس بہت سے غریب اور فقیر امیروں سے مدد کے اور اعانت کے طالب ہوتے ہیں تو اس کی کیا حیثیت ہے اور یہ شرک کیوں نہیں ہے؟۔

میں پہلے دوسری بات کو بتانا چاہتا ہوں، اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم اسباب میں جن چیزوں میں جو خاصیتیں اور جو تاثیریں رکھ دی ہیں، جیسے پانی میں پیاس بجھانے کی تاثیر، اور آگ میں اور سورج میں روشنی اور گرمی پہونچانے کی تاثیر، اور دوا میں مرض کو دور کرنے کی تاثیر، تو سب جانتے ہیں کہ ان تاثیروں میں خود ان چیزوں کا کوئی اختیار نہیں ہے، بلکہ اللہ نے ان کو ہمارے لیے مسخّر کر دیا ہے، اس لیے ان سے کام لینے میں شرک کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان چیزوں کی حیثیت تو ہمارے خادموں کی ہے اور ان سے کام لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم اپنے جانوروں گھوڑوں اور گدھوں سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح جن بندوں کو اللہ نے کوئی ایسی قابلیت دے دی ہے جس سے وہ دوسروں کو بھی کوئی نفع یا امداد پہونچا سکتے ہیں، جیسے حکیم، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ تو ان کے متعلق ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ ان میں کوئی غیبی طاقت نہیں ہے، اور ان کے اپنے قبضہ میں کچھ بھی نہیں ہے، اور یہ بھی ہماری ہی طرح اللہ کے محتاج بندے ہیں، بس اتنی بات ہے کہ اللہ نے انھیں اس عالم اسباب میں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم ان سے فلاں کام میں مدد لے سکتے ہیں، اس بنا پر ان سے کام لینے اور اعانت حاصل کرنے میں بھی شرک کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، شرک جب ہوتا ہے جب کسی ہستی کو اللہ کے قائم کیے ہوئے اس ظاہری سلسلۂ اسباب سے الگ غیبی طور پر اپنے ارادہ اور اختیار سے کارفرما اور متصرف سمجھا جائے اور اس اعتقاد کی بنا پر اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگی جائے اور اسے راضی کرنے کے لیے

عبادتی کام کیے جائیں۔

عبادت کسے کہتے ہیں۔؟

دوسرا سوال عبادت کے متعلق تھا، کہ عبادت کسے کہتے ہیں؟۔ عبادت دین اور شریعت کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ کسی ہستی کو غیبی طور پر نفع و ضرر کا مختار اور حاجت روا سمجھ کر اُسے راضی اور خوش کرنے کے لیے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے جو تعبدی اور تعظیمی کام کیے جاتے ہیں، جیسے سجدہ، طواف، نذر، قربانی اور اس کے نام کی وظیفہ خوانی وغیرہ وغیرہ تو ایسے اعمال کو دین کی خاص اصطلاح میں عبادت کہتے ہیں، اور یہ صرف اللہ کا حق ہے۔ اور جو کوئی کسی غیر کے ساتھ ایسا معاملہ کرے وہ بلاشبہ مشرک ہے، اور میں بتلا چکا ہوں کہ اکثر مشرک قوموں کا شرک یہی رہا ہے کہ انھوں نے اللہ کے سوا کچھ ہستیوں کو نفع و ضرر کا مختار سمجھا، اور ان کے راضی کرنے کے لیے عبادت کی قسم کے کام کیے، اور یہ ظلم عظیم ہے جس کی ہرگز معافی نہیں۔

یہاں تک میں نے جس شرک کا بیان کیا ہے یہ وہ حقیقی شرک ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں اس جرم کی قطعاً معافی اور بخشش نہیں ہے اور جو لوگ اس شرک کی حالت میں دنیا سے جا چکے یا جائیں گے ان کے لیے اسی طرح جہنم کا ابدی عذاب ہے جس طرح کہ اللہ و رسول کے منکروں کے لیے ہے۔

لیکن شریعت میں بعض ایسی چیزوں کو بھی شرک کہہ دیا جاتا ہے جن میں اس درجہ کا حقیقی شرک تو نہیں ہے لیکن اس کا کچھ رنگ اور شائبہ ہے یا اُن سے اس شرک حقیقی کا اندیشہ ہے۔ جیسے کہ حدیث میں غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک فرمایا گیا ہے، یا ٹونے ٹوٹکے کے قسم کی چیزوں کو شرک بتلایا گیا ہے، یا ریا کو شرک قرار دیا گیا ہے تو اس سے وہ حقیقی شرک مراد نہیں ہے، بلکہ یہ اس سے کم درجہ کے شرک ہیں، اسی لیے "شرکٌ دُونَ شرکٍ" علماء کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ بعض شرک اس بڑے اور حقیقی شرک سے کم درجہ کے بھی ہیں، یہاں تک کہ اہل اللہ جن کی توحید کامل ہوتی ہے وہ تو دنیا اور دنیا کی چیزوں کی محبت کو بھی شرک کہتے ہیں، ان کے نزدیک حُبِّ مال شرک ہے، حُبِّ جاہ شرک ہے، بیوی بچوں کی وہ محبت جو اللہ کے ساتھ بندہ کے تعلق پر ذرا بھی اثر ڈالے اور اللہ کی طرف سے غفلت کا باعث ہو ان کے نزدیک وہ شرک ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کو بُت پرستی کی قسم کا شرک کہتے ہیں، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ یہ چیزیں توحید کے اصل مقام کے منافی ہیں۔

توحید اور شرک کے سلسلہ میں ایک چیز اور بھی قابل ذکر ہے، ہمارے اس زمانہ میں یورپ کے اثرات نے پرانے زمانے کے شرک سے تو لوگوں کو بہت کچھ بیزار کر دیا ہے کیونکہ اس کی بنیاد محض توہم پرستی اور جہالت پر تھی، اب ہر پڑھا لکھا آدمی اگر اس میں ذرا بھی شعور ہو اور اس نے پڑھ لکھ کر کچھ بھی سوچنا سیکھا ہو، وہ بتوں کی پوجا کو، ستاروں، درختوں اور دریاؤں کی پوجا کو، اسی طرح جانوروں کی پوجا کو، انتہائی درجہ کی حماقت اور بیوقوفی سمجھتا ہے، چاہے رسمی طور پر یا اپنے قومی کلچر کا جز سمجھتے ہوئے وہ خود بھی ان چیزوں کی پوجا کرتا ہو، لیکن اس کا دل ضرور اس سے منکر ہو چکا ہے ـــــ لیکن اس یورپ کے اثرات نے ان پرانے اور دقیانوسی بتوں کے بجائے کچھ نئے بُت تراش کے دُنیا میں پھیلا دیے ہیں اور آج کل انھی اپٹوڈیٹ "معبودوں" کی پوجا کا

دور ہو — ان بتوں کے نام ہیں: قوم — وطن — قومی مفاد — وطنی مفاد — پیٹ — دولت — حکومتی اقتدار — وغیرہ وغیرہ — واقعہ یہ ہے کہ اپنی قوم اور اپنے وطن کی بہی خواہی اور اس سے محبت ہرگز کوئی بری بات نہیں ہے، بلکہ بالکل فطری چیز ہے اور ایک درجہ میں اس کا حکم ہے، اسی طرح قومی مفاد اور وطنی مفاد کا لحاظ اور معاش کی فکر، دنیا میں راحت اور عزت سے زندگی گزارنے کی خواہش اگر اس میں دوسروں کے حقوق کی رعایت ہو تو ہرگز بُری چیز نہیں ہے۔ ایسے ہی کسی اچھے مقصد کے لیے مثلاً عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے یا خلق اللہ کی خدمت کے ارادہ سے حکومتی اقتدار حاصل کرنے کی فکر اور اس کے لیے کوشش ہرگز غلط چیز نہیں ہے، اور انبیاء علیہم السلام نے ان باتوں سے کبھی نہیں روکا ہے بلکہ ان مسائل کے بارہ میں احکام دیے ہیں — لیکن ہمارے اس زمانہ میں ان چیزوں نے اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ کر ایک درجہ کے معبودوں اور طاغوتوں کا درجہ حاصل کر لیا ہے، اب قوم اور وطن کی مصلحت اور قومی اور وطنی مفاد کی خاطر سب کچھ کر لینا ایک اصول اور عقیدہ بن گیا ہے، اگرچہ اس میں کیسی ہی بے انصافی ہو اور دوسروں پر اس کا کچھ ہی اثر پڑتا ہو، اسی طرح پیٹ اور دولت اور حکومت کی خواہش کو بھی اللہ کے احکام سے آزاد سمجھ لیا گیا ہے، گویا پیٹ ایک معبود ہے جس کی جس طرح بھی پوجا کی جائے صحیح ہے، اسی طرح دولت اور حکومت گویا ایک دیوی ہے جس پر دین و اخلاق کے سارے اصول اور احکام قربان کیے جا سکتے ہیں — آج گویا بہت سے انسانوں نے ان ہی چیزوں کو اپنا معبود بنا لیا ہے، اور دنیا اس رو میں بہی جا رہی ہے، یہ وطن پرستی، قوم پرستی، شکم پرستی، دولت اور حکومت پرستی اس زمانہ کے شرک ہیں، اور اسلامی توحید میں ان کی کوئی گنجائش نہیں، — ہمیں سب نئے پرانے مشرکوں کو سامنے رکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ میں کہنا چاہیے " اِنَّا بُرَآءُ مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ "

اور ان سب پرستشوں کی جڑ نفس پرستی ہے، یعنی اللہ کے احکام کی پابندی اور پیروی کے بجائے جو جی میں آئے اور جو من کو بھائے وہ کرنا — یہی ہر شرک بلکہ ہر برائی اور ہر معصیت کی بنیاد ہے گویا اس لحاظ سے سب سے بڑا بت ہمارا نفس ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ کلمہ شریف کی تشریح کرتے وقت زیادہ زور اسی پہلو پر دیتے تھے ان کے نزدیک توحید کا اور لا الٰہ الا اللہ کا خاص تقاضا ہم سے یہ ہے کہ جو جی چاہے وہ نہیں کرنا، بلکہ ہر معاملہ میں جو اللہ کا حکم ہو وہ کرنا — قرآن پاک میں بھی ایک جگہ خواہش نفس کو "الٰہ" کہا گیا ہے "افرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ" — اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ کے احکام سے بے پرواہ ہو کر اپنے جی کی چاہت پر چلتا ہے وہ گویا اپنے نفس کا پجاری ہے اور اُس کا نفس اس کا معبود ہو گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے "اعدیٰ اعدائک نفسک التی بین جنبیک" "تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا وہ نفس ہے جو تمہارے پہلوؤں کے بیچ میں ہے" پس ہمیں لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ ان سب چیزوں کی نفی کرنی چاہیے جن میں معبودیت اور طاغوتیت کا کوئی بھی شائبہ ہے، اور ہر قسم اور ہر درجہ کے شرک سے اپنی حفاظت اور اپنے اندر بیزاری پیدا کرنی چاہیے اور ہر پہلو سے اپنی توحید کو کامل اور

خالص بنانا چاہیے جس طرح شرک اللہ تعالیٰ کو انتہائی مبغوض ہے اسی طرح توحید اسکو انتہائی محبوب ہے اور سارے دین کی روح اور جان ہے۔

خاتم النبیین کی تکمیل توحید

توحید اور شرک ہی کے سلسلہ میں سب سے آخر میں میں یہ بات اور بتلانا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے، اور اب کبھی کوئی پیغمبر آنے والا نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ توحید کی تعلیم کو اس قدر مکمل کر دیا ہے جس کے بعد شرک تو کیا شائبۂ شرک کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں رہی، اور ان سب راستوں کو بند کر دیا گیا جن سے شیطان شرک کو لا سکتا تھا۔

سب سے بڑا خطرہ یہ ہو سکتا تھا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کو شیطان نے ان کے بارے میں گمراہ کیا کہ وہ ان کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگی اسی طرح یہ امت شیطان کے فریب میں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کوئی مشرکانہ عقیدہ قائم نہ کر بیٹھے۔ حضورؐ نے اس کا دروازہ بند کرنے کے لیے صاف صاف فرما دیا:-

"لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ اِنَّمَا اَنَا عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ"

یعنی نصاریٰ نے جس طرح اپنے پیغمبر عیسیٰ بن مریم کو اڑایا تم میرے ساتھ یہ معاملہ نہ کرو، میں بس اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، اس لیے مجھے بندہ اور رسول ہی کہو،

اسی طرح اپنے آخری مرض میں ارشاد فرمایا:-

"لَعَنَ اللّٰهُ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِهِمْ مَسَاجِدَ ...... اِنِّیْ اَنْهَاکُمْ عَنْ ذَالِكَ"

اللہ کی لعنت یہودیوں اور نصرانیوں پر ان بدبختوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا....

.... دیکھو خبردار میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔

اور اللہ سے دعا فرمائی "اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُعْبَدُ" (یعنی اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی پوجا کی جائے)

ایک روایت میں آتا ہے کہ بعض صحابہ نے کسی ملک میں دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے اکابر کو سجدہ کرتے ہیں تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ ہم آپ کو سجدہ کریں، آپ نے پہلے ان سے پوچھا کہ بتاؤ جب میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا تو کیا تم میری قبر کو بھی سجدہ کروگے؟ ان صحابی کو چونکہ قبر کے سجدہ کے بارہ میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی توحید میں اس کی کوئی گنجائش ہو نہیں سکتی اس لیے

انھوں نے صاف فرمایا کہ حضرت میں قبر کو تو سجدہ نہیں کروں گا۔ تو آپ نے ان سے فرمایا "فلا تسجدلی واسجد للحی الذی لا یموت" پس تم مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ اسی کے لیے مخصوص رکھو جو ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہو، اور جس کو کبھی فنا اور موت نہیں ہو ـــ اور سجدہ تو سجدہ حدیثوں میں ہو کہ آپ نے اپنے لیے صحابہ کو قیام تعظیمی سے بھی منع فرمایا، دراصل یہ سارے احکام اور یہ ساری احتیاطیں اسی لیے تھیں کہ شرک کے لیے کوئی گنجائش اور کوئی راستہ باقی نہ رہ جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ کی روک تھام اور راہ بندی کا اندازہ اس واقعہ سے خوب کیا جا سکتا ہو کہ حضور کے شیر خوار صاحبزادہ حضرت ابراہیم (علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی جس دن وفات ہوئی اتفاق سے اُسی دن سورج کو گہن لگا ـــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں پرانے جاہلی اعتقادات اور خیالات کے مطابق لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ سورج کو یہ گہن میرے گھر کی اس غمی کی وجہ سے لگا ہو اس لیے آپ نے اعلان کرا کے تمام مسلمانوں کو اسی وقت مسجد میں جمع کیا، اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا۔

"اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰیَتَانِ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰہِ لَا یَنْکَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَیٰوتِہٖ فَاِذَا رَاَیْتُمْ ذَالِکَ فَافْزَعُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ"

لوگو! حقیقت یہ ہو کہ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات سے ان کے گہن کا کوئی تعلق نہیں۔ جب تم ان کو گہن لگتا دیکھو تو اللہ کو اور اس کی قدرت کو یاد کرو اور اس سے ڈرو اور نماز میں لگ جاؤ۔

یہ دراصل عقیدۂ توحید ہی کی حفاظت کے لیے حضور نے فرمایا، آپ نے اس کو بھی برداشت نہیں کیا کہ کسی کو سورج کے گہن میں آنے کے متعلق یہ خیال ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی غمی کی وجہ سے یہ ہوا ہو اسی طرح شریعت کے احکام میں بھی توحید کی حفاظت کا اور شرک کی روک تھام کا انتہائی لحاظ کیا گیا ہو۔

مثلاً سورج کے طلوع اور غروب کے وقت اور نصف النہار کے وقت نماز سے منع فرما دیا گیا تاکہ آفتاب پرستوں سے ظاہری مشابہت بھی نہ ہو اور کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

اسی طرح دیکھیے کہ ہر نماز میں رکوع و سجدہ ضروری ہو، اور بغیر رکوع و سجدہ کے گویا نماز ہوتی ہی نہیں، لیکن جنازہ کی نماز میں سے رکوع و سجدہ نکال لیا گیا تاکہ کسی دیکھنے والے کو بھی یہ شبہ نہ ہو کہ ہم اس میت کے سامنے جھک رہے ہیں۔ یا سجدہ کر رہے ہیں۔

اللہ کی شان ہے اور شیطان کی کامیابی لائق رنج اور قابل عبرت ہو کہ جس دین میں شرک کے راستوں کو اس طرح بند کیا گیا تھا اسی کے نام لیواؤں میں شرک کی تمام وہ قسمیں آج موجود ہیں جن میں اگلی امتیں مبتلا ہو کر مشرک ہوئی تھیں۔

یہاں میں اس کا بھی ذکر کر دوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے بخشے ہوئے علم سے اس کی پیشینگوئی بھی فرمائی تھی۔ فرمایا تھا:۔

"لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْراً بِشِبْرٍ وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ"

یعنی ضرور ایسا ہونا ہو کہ تم یعنی میری امت کے کچھ لوگ ایسے غلط رو اور گمراہی پسند ہوں گے کہ اگلی اُمتوں کے بالکل قدم بہ قدم چلیں گے، اور جن برائیوں اور گمراہیوں میں اگلے مبتلا ہوئے تھے وہ ان سب میں مبتلا ہوں گے

آپ مسلمان کہلانے والے قبوریوں اور تعزیہ پرستوں کو دیکھیے! یہ سب حضور کی اس پیشین گوئی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں، شیطان نے ان مشرکانہ اعتقادات اور مشرکانہ اعمال کو ان کے دلوں میں ایسا اُتار دیا ہو کہ وہ اس سلسلہ میں قرآن و حدیث کی کوئی بات سُننے کے روادار نہیں، میں تو انہی لوگوں کو دیکھ کر اگلی اُمتوں کے شرک کو سمجھتا ہوں، اگر مسلمانوں میں یہ لوگ نہ ہوتے تو واقعہ یہ ہو کہ میرے لیے اگلی امتوں کے شرک کا سمجھنا بڑا مشکل ہوتا۔ اللہ انھیں ہدایت دے، یہ لوگ واقع میں ہیں تو بڑے گمراہ لیکن اُمت میں ان کے ہونے کا ایک یہ فائدہ ضرور ہے کہ انہی کو دیکھ دیکھ کر توحید کی تعلیم کو اتنا نکھارنا پڑتا ہو۔

الحمدللہ توحید اور شرک کا بیان کافی تفصیل سے ہوگیا، میں نے اپنے نزدیک اس کی کوشش کی کہ اس موضوع سے متعلق کوئی ضروری بات بیان سے رہ نہ جائے۔ اگرچہ ہماری عام تبلیغی دعوت میں توحید کے متعلق اور اسی طرح دوسرے عقائد کے متعلق اتنی تفصیل نہیں کی جاتی، لیکن آپ حضرات کے سامنے میں نے یہ تفصیل اس لیے ضروری سمجھی کہ ہم آپ میں سے کسی کو اس بارہ میں کوئی غلط فہمی اور کوئی ذہنی الجھاؤ نہ رہے ہمارے نزدیک یہ ضروری ہو کہ ہمارے خاص ساتھیوں کا ذہن توحید جیسے بنیادی عقائد و مسائل کے بارے میں بالکل صاف رہے بلکہ اس تربیتی سلسلہ کا موضوع اور مقصد یہی ہو۔

اب اس کے بعد باقی عقائد اور دین کے دوسرے شعبوں کے متعلق انشاءاللہ عرض کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر بات صحیح اور حق کہنے کی توفیق دے۔

جن حقیقتوں پر ایمان لانا ہمارے لیے ضروری ہو، ان میں سے ایک آخرت کا عقیدہ ہو، قرآن مجید میں اکثر مقامات پر "ایمان باللہ" کے ساتھ "ایمان بالیوم الآخر" کا ذکر کیا جاتا ہو، مثلاً کہیں فرمایا گیا ہو "مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" کہیں ارشاد ہوا "يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ"۔۔۔

آخرت پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہو

آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی بتلائی ہوئی اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے اور اس پر یقین کیا جائے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی اور ایک اور عالم آنے والا ہو اور وہاں انسان کو اس دنیا میں کیے ہوئے اس کے بُرے اور بھلے اعمال کی جزا اور سزا ملے گی، یہ اس عقیدہ کا اجمال ہو قرآن و حدیث میں اس کی پوری پوری تفصیل فرمائی گئی ہو۔

آخرت عقلاً بھی ضروری ہے

آخرت کے بارہ میں اتنی اجمالی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں خود بھی آسکتی ہو کہ ہماری اس زندگی کے بعد کوئی اور ایسی زندگی ضرور ہونی چاہیے جس میں لوگوں کو اُن کے اعمال کی جزا اور سزا ملے۔ کیونکہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ عمر بھر بڑی بڑی برائیاں کرتے ہیں، ڈاکے مارتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں، رشوتیں لیتے ہیں، کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں، لوگوں کے حق مارتے ہیں اور زندگی بھر عیش اُڑاتے رہتے ہیں اور اسی حال میں مرجاتے ہیں، اسی طرح بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہو کہ وہ بیچارے بڑی نیکی کی زندگی گزارتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، کسی کے ساتھ دغا اور دھوکا نہیں کرتے، کسی کا حق نہیں مارتے، اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں، اس کی مخلوق کی خدمت بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود ان کی ساری زندگی تنگی اور تکلیف سے گزرتی ہو، کبھی کوئی بیماری آزاری ہو، کبھی کوئی تکلیف اور پریشانی ہے اور اسی حال میں اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، تو جب یہ دنیا خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا ہو اور وہ ہمارے سب اچھے بُرے اعمال کو دیکھتا ہو اور ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اس دنیا میں نہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ اور انعام مل رہا ہو اور نہ مجرموں پاپیوں کو ان کے پاپ اور ظلم کی کوئی سزا دی جارہی ہو تو خود بہ خود یہ بات سمجھ میں آتی ہو کہ پھر اللہ کی طرف سے یہ جزا اور سزا کسی دوسری زندگی میں ملنی چاہیے، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اللہ کے یہاں ایسا اندھیر ہو کہ نہ نیکوں کی نیکی کی کوئی قدر ہو اور نہ ظالموں اور بدکاروں کی بدمعاشی اور بدکاری اور ان کے ظلم و ستم پر کوئی بازپرس ہو اور سارے پارساؤں اور پرہیزگاروں اور چوروں ڈاکوؤں کے ساتھ اندھیر نگری والا ایک ہی برتاؤ ہو، اللہ تعالیٰ کی ہستی تو بہت بلند ہو یہ طرز عمل تو کسی بھلے آدمی کے بھی شایان

شان نہیں کہ وہ شریفوں اور شریروں اور ظالموں اور مظلوموں کے ساتھ ایک ہی سا برتاؤ کرے — قرآن مجید میں ارشاد ہو "اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ" (کیا ایسا ہو سکتا ہو کہ ہم فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کریں) الغرض اس دنیا میں جزا اور سزا کے نہ ہونے سے خود بخود یہ بات سمجھ میں آتی ہو کہ اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ایسی ہونی چاہیے جس میں لوگوں کو ان کے کیے کی جزا اور سزا ملے۔

جزا اور سزا اس دُنیا میں کیوں نہیں دی جاتی

اور اس میں حکمت یہ ہو کہ اگر اسی دنیا میں ہر بُرائی اور بھلائی کی سزا اور جزا مل جایا کرتی تو پھر یہ زندگی امتحانی زندگی نہ رہتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان کی دنیا بنایا ہو، اور جزا و سزا کو یعنی عذاب و ثواب کو غیب کے پردہ میں رکھ کر انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ یہ اعلان کرایا ہو کہ جو کوئی یہاں میرے احکام کی فرمانبرداری کرے گا میں اس کو آئندہ زندگی میں یہ انعام دوں گا اور جو کوئی سرکشی کرے گا اور نافرمانی کی زندگی گزارے گا میں اس کو ایسی ایسی سزائیں دوں گا۔ تو اگر بالفرض ہر بُرائی بھلائی کا بدلہ اسی دنیا میں ہاتھ کے ہاتھ اور نقد مل جایا کرتا تو یہ امتحان نہیں ہو سکتا تھا پھر تو ہر آدمی نافرمانی سے اسی طرح بچتا جس طرح آگ میں کودنے سے ہر ایک بچتا ہو اور نیکی کرنے کے لیے ہر ایک اسی طرح مجبور ہوتا جس طرح کھانے پینے کے لیے مجبور ہوتا ہو اور پھر عذاب و ثواب بے معنی ہوتا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ جزا اور سزا کو دوسرے عالم میں رکھنے کی یہ بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں کو جو صلہ اور انعام دینا چاہتا ہو اور جیسی چین و آرام والی زندگی انھیں بخشنا چاہتا ہو، اس دنیا میں اس کا کوئی امکان ہی نہیں ہو اور اسی طرح اپنے نافرمانوں کو وہ جو سخت ترین سزا اور عذاب دینا چاہتا ہو اس کی برداشت کی بھی ہماری اس دنیا میں طاقت نہیں ہو، یعنی وہ اتنا سخت ہو کہ اگر وہ اس دنیا میں ظاہر ہو جائے تو یہاں کا سارا چین و آرام ختم ہو جائے اور یہ دنیا سوخت ہو کر رہ جائے۔ یہ دنیا تو بڑی کمزور اور بہت محدود طاقت رکھنے والی دنیا ہو اور پھر اس کا نظام ایسا ہو کہ اس میں راحتیں اور تکلیفیں ملی جلی ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں کو جو چین و آرام کی زندگی دینا چاہتا ہو وہ کسی ایسی ہی جگہ اور ایسے ہی کسی عالم میں ممکن ہو جہاں کسی تکلیف کا گزر نہ ہو اور وہاں صرف بہار ہی بہار ہو، اور اسی طرح اپنے مجرموں اور نافرمانوں کو جو سخت سزا اور جو دردناک عذاب وہ دینا چاہتا ہو وہ کسی ایسے ہی عالم میں ممکن ہو جہاں بس دکھ ہی دکھ اور تکلیف ہی تکلیف ہو —— بہر حال اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہو کہ وہ بندوں کے اچھے بُرے اعمال کی جزا اور سزا اس دنیوی زندگی کے بعد والی زندگی میں اور دوسرے عالم میں دے گا، بس وہی عالمِ آخرت کا عالم ہو اور اس کے دو حصے ہیں، ایک جنت اور ایک دوزخ، جنت میں اللہ کے انعام اور اس کے خاص فضل و کرم کا ظہور ہوگا، اور دوزخ میں اُس کے صرف قہر و غضب کا ظہور ہوگا، اور یہ دونوں ظہور اعلیٰ پیمانہ پر ہوں گے

اور بس وہیں پوری خدائی شان ظاہر ہوگی۔

خدائی شان اور اسکے جلال وجمال کے ظہور کیلئے بھی آخرت کی ضرورت ہے

تو عالم آخرت کی اور جنت و دوزخ کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اللہ کے قہر اور قدرا ور جلال و جمال کا ظہور اعلیٰ پیمانہ پر ہو سکے، ہماری اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا اگرچہ ظہور ہے، لیکن پورے ظہور کی اس دنیا میں برداشت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ظہور بہت محدود ہے، یعنی یہاں اللہ کی جن جمالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے اور جن جلالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے پورے اور کامل ظہور کی ہماری یہ دنیا تاب ہی نہیں لا سکتی، بہرحال اس لیے بھی ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال و جمال کا کامل ظہور ہو سکے۔

دراصل یہ ظہور ہی تو عالم کی تخلیق کا خاص مقصد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ بساط اسی لیے بچھائی ہے کہ اس کی صفاتِ کمال کا ظہور ہو پس آخرت کو اگر نہ مانا جائے تو یہ مقصد کہاں پورا ہوگا، لہذا اس دنیا کے خاتمہ کے بعد عالم آخرت کا برپا ہونا ضروری۔۔ اور ناگزیر ہے۔

آخرت کی تفصیلات نبوت ہی کے راستہ سے معلوم ہو سکتی ہیں

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اتنی اجمالی بات تو انسانی عقل خود بخود بھی سمجھ سکتی ہے، ہاں اس کی تفصیلات نبوت ہی کے راستہ سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سب پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو آخرت کی اور جنت دوزخ کی تفصیلات بتلائی تھیں، لیکن ان امتوں نے پوری طرح ان کو محفوظ نہیں رکھا، اور اب محفوظ اور مستند بیان صرف اللہ کے آخری نبی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ان کی لائی ہوئی اللہ کی کتاب قرآن مجید کا ہے جو جوں کا توں محفوظ ہے، اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس سے عقلِ انسانی انکار کر سکے اور وہ ناممکن اور محال ہو۔

آخرت کی تفصیلات میں شبہ علم وعقل کی نارسائی کی وجہ سے ہوتا ہے

ہاں چونکہ عالم آخرت کی چیزیں ہماری دیکھی بھالی نہیں ہیں، اور ہم نے ان کا کبھی تجربہ اور مشاہدہ نہیں کیا ہے اس لیے وہ ہمیں اچنبھے کی سی معلوم ہوتی ہیں اور ان کا سمجھنا بعض لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے، لیکن یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بچے سے جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں ہو اگر کسی آلہ کے ذریعہ یہ کہا جائے کہ اے بچے! تو عنقریب ایک ایسی دنیا میں آنے والا ہے جہاں لاکھوں میل کی زمین ہے، اور اس سے بھی بڑے سمندر ہیں اور آسمان ہے، چاند سورج اور لاکھوں ستارے ہیں اور جہاں ہوائی جہاز اڑتے ہیں اور ریلیں دوڑتی ہیں، اور لڑائیاں ہوتی ہیں جن میں توپیں گرجتی ہیں، اور ایٹم بم چلتے ہیں تو وہ بچہ اگر کسی طرح ان باتوں کو سمجھ بھی لے تو اس کے لیے ان باتوں کا یقین کرنا بڑا مشکل ہوگا، کیونکہ وہ جس دنیا میں ہے اور جس کو دیکھتا اور جانتا ہے وہ تو بس اس کے ماں کے پیٹ کی ایک بالشت بھر کی دنیا ہے ـــــ بالکل ایسا ہی

معاملہ آخرت کے بارے میں اس دنیا کے انسانوں کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ عالم آخرت اس دنیا کے مقابلہ میں اسی طرح بے حد وسیع اور بے انتہا ترقی یافتہ ہوگا جس طرح ماں کے پیٹ کے مقابلہ میں ہماری یہ زمین و آسمان والی دنیا بے حد وسیع اور ترقی یافتہ ہے، اور جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے اس دنیا میں آنے کے بعد وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جس کو وہ ماں کے پیٹ کے زمانہ میں سمجھ بھی نہیں سکتا تھا، اسی طرح آخرت کے عالم میں پہونچ کر سب انسان وہ سب کچھ دیکھ لیں گے جو اللہ کے پیغمبروں نے وہاں کے متعلق بتلایا ہے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ نبوت کے راستہ سے آخرت کے متعلق جو تفصیلات ہمیں معلوم ہوئی ہیں وہ سب یقینی اور حق ہیں اور ان میں کوئی چیز بھی ناممکن اور محال نہیں ہے، ہاں چونکہ یہاں ہمارا علم اور مشاہدہ بہت محدود اور ناقص ہے اس لیے بعض لوگوں کو وہ باتیں اچنبھے کی سی معلوم ہوتی ہیں اور کم عقل لوگ اپنی نادانی سے ان میں شبہ کرتے ہیں، لیکن ایمان کا اور عقل سلیم کا فیصلہ یہی ہے کہ اللہ نے اور اس کے صادق مصدوق رسول نے آخرت کے متعلق یعنی اس دنیا کے بعد والی زندگی کے متعلق اور وہاں کی جزا سزا کے متعلق جو کچھ بتلایا ہے اس سب کو حق مانا جائے اور اس پر یقین کیا جائے ـــــ یہ بالکل عقلی اور فطری بات ہے کہ جس چیز کو ہم نہیں جانتے اور ہم نے خود اس کو نہیں دیکھا، اس کے متعلق ہم اُن سچے لوگوں کے بیان پر اعتماد کریں جن کو اس کا علم کسی مستند ذریعہ سے ہوگیا ہو، یا جنھوں نے اسکو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور جن کی سچائی اور پاکبازی بھی ثابت ہو چکی ہو، پس مرنے کے بعد عالم برزخ اور قبر کے بارے میں اور پھر قیامت کے بارہ میں اور حشر نشر اور حساب کے بارہ میں اور جنت دوزخ کے بارہ میں جو کچھ قرآن پاک نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے اس سب پر ہمارا ایمان ہے اور ہم کو یقین ہے کہ وہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہونے والا ہے جس طرح کہ بتلایا گیا ہے، بس یہی معنی ہیں آخرت پر ایمان لانے کے

آمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

اللہ اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضا

اس کے بعد مجھے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد آپ پر ہم پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم جانوروں کی سی من مانی زندگی نہ گزاریں، بلکہ اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری والی زندگی گزاریں، تاکہ ہمارا خالق اور مالک جس کے قبضہ میں سب کچھ ہے وہ ہم سے راضی ہو، اور آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں ہم اس کے غضب اور عذاب سے بچ سکیں اور وہ جنت اور وہ انعامات حاصل کر سکیں جن کا اس نے اپنے فرمانبردار اور اطاعت شعار بندوں کے لیے وعدہ فرمایا ہے۔

رسالت

رسالت کی ضرورت

جب اللہ کو اور آخرت کو ماننے کے بعد ہمارے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ اس دنیا میں ہم اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری والی زندگی گزاریں تو ہم اس کے محتاج ہو گئے کہ کسی طرح سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کے احکام ہمارے لیے کیا ہیں، اور اس کی طرف سے کن کاموں کی اجازت ہو اور کن کاموں اور کن باتوں کی ممانعت ہو، اور یہ ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو براہ راست یہ باتیں بتلاتا نہیں، اور جو تھوڑی سی سمجھ بوجھ اور عقل انسانوں کو ملی ہوئی ہو وہ اس دنیا کی روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے تو کسی حد تک کافی ہو لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس میں بالکل نہیں کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہو اور وہ کن کاموں سے راضی اور کن سے ناراض ہوتا ہو، بس ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسالت اور پیغمبری کا سلسلہ قائم فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہماری ضرورت کے لیے سورج پیدا فرمایا جس سے ہم گرمی اور روشنی حاصل کرتے ہیں اور جس طرح اس نے ہمارے لیے غذا کی پیداوار کا نظام قائم کیا، اسی طرح اس نے ہماری اور صرف ہماری ضرورتوں کے لیے نبوت کا نظام قائم فرمایا، یعنی طے فرمایا کہ اپنے خاص اور منتخب نمائندوں کے ذریعہ عام بندوں تک وہ اپنی ہدایت اور اپنا قانون پہونچایا کرے گا، پس معلوم ہوا کہ نبوت و شریعت درحقیقت خود ہماری ضرورت ہو، اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت و ربوبیت کا تقاضا ہو۔ جس طرح کہ مثلاً سورج اور ہوا پانی ہماری ضرورتیں ہیں اور اللہ کی رحمت و ربوبیت نے ہماری ضرورت کے لیے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہو۔

پس وہ لوگ بڑے جاہل اور حقیقت ناشناس ہیں جو دین اور شریعت کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بوجھ ہو جو اللہ کی طرف سے انسانوں پر لاد دیا گیا ہو، اور اس کا تعلق اللہ کی بس صفتِ حاکمیت اور مالکیت سے ہو۔ بہرحال نبوت اور شریعت ہماری ضرورت ہو اور اللہ کی بہت بڑی نعمت ہو کیوں کہ بندے اسی کے راستہ سے اللہ کی رضا کے مقام تک اور جنت تک پہونچیں گے۔

رسول کون ہونا چاہیے

اب ایک سوال یہ سامنے آتا ہو کہ نبی کون ہونا چاہیے؟ — اس بارہ میں بعض قوموں کو بڑے مغالطے لگے ہیں، بعضوں نے تو کہا ہو کہ خود خدا کسی روپ میں آکر انسانوں کو اپنا قانون بتاتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادشاہ اپنی رعیت کے پاس اپنا حکم نامہ بھیجنا چاہتا ہو اور خود ہی پوسٹ مین کی وردی پہن کر اور اس کا روپ بھر کے اپنا حکم نامہ گھر گھر بانٹتا پھرتا ہو، ایسی جہل اور غلط بات ان ہی لوگوں نے کہی، اور ان ہی لوگوں نے قبول کی جنھوں نے خدا کی شان کو بالکل نہیں سمجھا۔ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝

نبی فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہی ہو سکتا ہے

اور بعضوں نے خیال کیا کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیے کیونکہ فرشتہ اللہ کی بڑی مقدس اور سراپا نورانی مخلوق ہے، لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ نبی اور پیغمبر کے لیے مقدس ہونے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ جن انسانوں کی ہدایت کا کام اس کو کرنا ہے وہ ان کے رجحانات، ان کے مزاج اور ان کے احساسات اور جذبات سے واقف ہو، اور فرشتے بے شک مقدس اور نورانی تو ہیں، لیکن انسانی جذبات اور احساسات اور انسانی مزاج اور اس کی خواہشات سے وہ بیچارے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہیں، بلکہ وہ تو ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً بھوک، پیاس، غصہ، حسد، نفسانی شہوت، ان چیزوں کی حقیقت کو فرشتہ سمجھ ہی نہیں سکتا، یہ بات معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان کی زندگی میں بہت سی کیفیتیں ایسی ہیں جو اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان اُن سے گزرتا ہے، مثلاً جس شخص میں شہوت کا مادہ ہی نہ ہو یعنی وہ فطرتاً اس سے خالی ہو وہ شہوت کی حقیقت کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے گا۔ اسی طرح جس شخص نے کبھی سوتے میں خواب نہ دیکھا ہو، اس کو ہزار سمجھایا جائے وہ خواب کی اصل حقیقت کو کبھی نہیں سمجھ سکتا، اور ایک شہوت یا خواب ہی پر منحصر نہیں، اکثر انسانی احساسات کا حال یہی ہے، جس نے کبھی آم نہیں چکھا، اس کو کسی طرح آم کا ذائقہ نہیں سمجھایا جا سکتا، مادر زاد اندھے کو گلاب کے پھول کی رنگت اور اس کی حسین صورت دو گھنٹے کی تقریر سے بھی نہیں سمجھائی جا سکتی۔ — بہر حال انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو ہدایت کرنے والا ہو وہ انسان کے حالات سے اور اس کے رجحانات اور احساسات سے پوری طرح واقف ہو، اور یہ بات چونکہ انسان ہی کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ہمیشہ انسانوں ہی میں سے بھیجے، اور جو بے وقوف اور احمق یہ کہتے تھے کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں اُن سے کہا گیا کہ " قُل لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا "[1] اس کا مطلب یہی ہے کہ نبی اور رسول اسی جنس میں سے ہونا چاہیے، جن کی طرف اور جن کی ہدایت کے لیے وہ بھیجا جائے تو اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتے آباد ہوتے اور رسول ان کی ہدایت کے لیے بھیجنا ہوتا تو ہم کسی فرشتہ ہی کو نبی بنا کر بھیجتے۔ لیکن جب زمین میں مستقل آبادی انسانوں ہی کی ہے اور ان ہی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نبی کی ضرورت ہے تو یہ ضرورت تو انسان ہی سے پوری ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہی انسانوں کے مسائل اور ان کے احوال اور ان کے طبعی تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے — بہر حال نبی انسان ہی ہو سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب انسان ہی تھے۔ ہماری مذہبی کتابوں میں خاص طور سے عقائد کی کتابوں میں نبی اور رسول کی تعریف میں کہا جاتا ہے۔ هُوَ اِنْسَانٌ بَعَثَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی الخ یعنی نبی وہ انسان ہوتا ہے جس کو اللہ اپنی ہدایت اور اپنا پیغام لے کر اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے، اور پیغمبرانہ ذمہ داریاں اس کے سپرد کرتا ہے۔

[1] بنی اسرائیل ع ۱۱

یہاں تک کی گفتگو سے یہ معلوم ہوگیا کہ نبوت اور رسالت ہماری زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نبی اور رسول انسانوں ہی میں سے ہونا چاہیے۔

دنیا میں انبیاء برابر آتے رہے ہیں

اب آگے میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے اور جس نے انسان کے لیے وہ سب چیزیں پیدا کی ہیں جن کی انسان کو اپنی زندگی میں ضرورت ہے، اس نے انسان کی اس سب سے بڑی ضرورت کو بھی ہمیشہ پورا کیا ہے، یعنی جب سے اس دنیا میں انسانوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے اسی وقت سے نبوت کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ضرورتِ وقت کے مطابق مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں اور علاقوں میں اس کے پیغمبر آتے رہے ہیں ۔۔۔ ہم یہ تو نہیں بتلا سکتے ہیں کہ کل پیغمبر کتنے آئے، قرآن مجید میں ان کی تعداد نہیں بتلائی گئی اور نہ اس کی ضرورت تھی، لیکن یہ صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ کوئی ملک اور کوئی مقام ایسا نہیں جہاں ہم نے رسول نہ بھیجا ہو۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے "وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ" دوسری جگہ فرمایا گیا "وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ" (یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس ہمارا رسول نہ پہنچا ہو) ۔۔۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا۔ "وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ رَّسُولًا" (یعنی ہم نے ہر انسانی آبادی میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں) ان پیغمبروں میں سے چند خاص پیغمبروں کے نام اور ان کے کچھ احوال بھی قرآن مجید میں بیان فرمائے گئے ہیں اور باقیوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا، لیکن ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان سب پر ایمان لائیں اور اُن سب کو یکساں طور پر اللہ کے راست باز اور پاک باز بندے سمجھیں اور ان سب کا ادب کریں، اس کے بغیر ہم مومن نہیں ہو سکتے، قرآن مجید میں ایمان والوں کا اصول اور عقیدہ یہ بیان کیا گیا ہے "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ" کہ ہم اللہ کے پیغمبروں میں کوئی تفریق نہیں کرتے بلکہ سب کو مانتے ہیں۔

ایمان سب نبیوں پر اور پیروی صرف نبی وقت کی

بہرحال مومن ہونے کے لیے سب پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے، ہاں اطاعت اور پیروی صرف نبی وقت کی کی جاتی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی جو احکام لاتا ہے وہ اس کے اپنے احکام نہیں ہوتے بلکہ خدا کے احکام ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہوتا ہے کہ جس زمانے کے لیے وہ جو احکام بھیجے ان ہی کا اتباع کیا جائے، نئے احکام آنے کے بعد پہلے احکام منسوخ ہو جاتے ہیں۔

پہلی شریعتوں کی منسوخی کی ایک عام فہم مثال

اس کو آپ مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ فرض کیجیے ایک ملک ہے اس کے رہنے والے بہت گرے ہوئے اور پست حالت میں ہیں، غربت بھی ہے، جہالت بھی ہے، صحتیں بھی خراب ہیں تو حکومت اُن کے لیے بہت ہلکے قوانین مقرر کرتی ہے اور بہت سی رعایتیں اور سہولتیں دیتی ہے، لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد ملک ترقی کر جاتا ہے اور لوگوں کی حالت کچھ اچھی ہو جاتی ہے تو پھر اس حالت کے مطابق نیا قانون بنا دیا جاتا ہے، اب اس نئے قانون کے بعد اگر کوئی انسان اُسی پہلے قانون پر چلے اور نئے قانون کو نہ مانے تو وہ مجرم اور سزا کے قابل ہوگا

کیوں کہ وہ حکومت کی نافرمانی کرتا ہو اور حکومت کے امتیازی اختیارات خود استعمال کرنا چاہتا ہو۔ — بس انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی شریعتوں کا حال بھی ایسا ہی سمجھ لیجیے، اللہ تعالیٰ نے کسی قوم اور کسی زمانہ کے لوگوں کی حالت کے مطابق اپنے کسی پیغمبر کے ذریعہ ایک قانون بھیجا، پھر ایک مدت کے بعد جب حالات کچھ بدل گئے اور دوسرے پیغمبر کو بھیجا گیا تو قانون میں بھی کچھ تبدیلی کردی گئی تو اس وقت بندوں کا فرض ہوگا کہ ایمان تو پہلے پیغمبروں پر بھی لائیں، اور احترام سب کے لائے ہوئے قوانین کا کریں (کیونکہ سب اللہ ہی کے قوانین ہیں) لیکن ہر زمانہ میں پابندی اسی قانون کی کی جائے گی جو نئی وقت کے ذریعہ اس زمانہ کے لیے اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہوگا، حتیٰ کہ اگر پہلے کوئی پیغمبر بھی اپنے قبر سے اٹھ کر بعد والے زمانہ میں آجائیں تو ان کو بھی اسی بعد والے قانون کی اور بعد والی شریعت کی پیروی اور پابندی کرنی پڑے گی۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اِتِّبَاعِيْ"۔ یعنی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر موسیٰ علیہ السلام بھی اگر آج زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری ہی شریعت کی پیروی کرنی ہوتی — اور یہی وجہ ہو کہ آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام صحیح حدیثوں کی اطلاع کے مطابق اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کا عمل شریعت محمدیؐ ہی پہ ہوگا کیونکہ اس زمانہ اور اس دور کے لیے حکم خداوندی یہی ہو اور پہلی شریعتوں اور پہلے الٰہی قوانین کو خود اللہ تعالیٰ نے منسوخ قرار دے دیا ہو اور اب ان پر چلنا گویا خدا کی نافرمانی ہو۔

بہرحال یہ ایک ایمانی اصول ہو کہ ایمان تو بلاتفریق اللہ کے سب پیغمبروں پر لایا جائے اور سب کا ادب و احترام کیا جائے۔ چاہے وہ کسی قوم اور کسی ملک میں اور کسی زمانہ میں آئے ہوں اور چاہے ان کی زبان کوئی رہی ہو، لیکن پیروی صرف اس پیغمبر کی شریعت کی کی جائے جو اس دور اور اس زمانہ کا پیغمبر ہو۔

انبیاءؑ شریعت ساز نہیں بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں

میرے اس بیان سے ایک بات آپ کو یہ بھی معلوم ہو گئی کہ انبیاء علیہم السلام شریعت ساز نہیں ہوتے بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں، یعنی ان کا منصب یہ نہیں ہو کہ وہ اپنی طرف سے عقائد یا احکام تجویز کریں بلکہ وہ اللہ کی طرف سے لانے والے اور پہنچانے والے ہوتے ہیں اور اپنی جانب سے وہ اس میں کوئی تغیر و تبدل بھی نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ یہ مضمون ہو کہ کفار مکہ رسول اللہ علیہ وسلم سے کبھی کبھی کہتے تھے کہ آپ جو کچھ ہمیں سناتے اور بتلاتے ہیں اس میں سے بعض باتیں ہمیں پسند نہیں، لہٰذا آپ ان میں کچھ ترمیم و تبدیلی کر دیجئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہو جائیں گے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دیتے تھے کہ میرا کام تو صرف اللہ کی بات کو جوں کا توں پہونچانا ہو، مجھے کسی ترمیم و تبدیلی کا بالکل اختیار نہیں، چنانچہ اس بارہ میں ایک جگہ ارشاد ہو "قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ

إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ‘‘ (یعنی میں اپنی طرف سے ذرا بھی ردو بدل نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ مجھے وحی کی جاتی ہے اور جو حکم بھیجا جاتا ہے میں تو بالکل اسی کی پیروی کرتا ہوں۔)

ایک دوسرے موقع پر قرآن مجید میں فرمایا گیا ’’وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ‘‘ (یعنی ہمارے یہ رسول دین کی جو تعلیم دیتے ہیں تو یہ ان کے اپنے جی کی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ وحی ہے جو ہماری طرف سے ان کی طرف بھیجی جاتی ہے)

الغرض انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو احکام وہ لاتے ہیں وہ ان کے اپنے احکام نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے احکام ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کے صرف لانے والے اور پہونچانے والے ہوتے ہیں۔

انبیاء کے اجتہاد کی حیثیت

ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی معاملہ پیش آگیا اور اس بارہ میں وحی کے ذریعہ کوئی واضح حکم ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں آیا ہوا ہو تو اس صورت میں وہ اجتہاد بھی کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام ان کے پاس پہلے آچکے ہیں، اور جو علم پہلے مل چکا ہے وہ اس کی روشنی میں غور و خوض کر کے اس معاملے کا حکم بیان فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی طبیعت سے اور اپنی ذاتی رائے سے جو چاہیں فیصلہ فرمادیں اور حکم دے دیں۔ بلکہ پہلے آئے ہوئے اللہ کے احکام ہی سے جو کچھ ان کی سمجھ میں آتا ہے اسی کو وہ خدا کے حکم کی حیثیت سے بیان فرما دیتے ہیں ــــ اور انبیاء علیہم السلام کے ایسے اجتہادات عموماً صحیح ہی ہوتے ہیں۔ اور اگر کبھی لغزش ہوتی ہے تو فوراً وحی کے ذریعہ ان کو اطلاع دے دی جاتی ہے اور اس کی تصحیح کر دی جاتی ہے اور جب وحی کے ذریعہ کوئی تصحیح نہ کی جائے تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حکم الٰہی وہی ہے جو نبی نے اپنے اجتہاد سے سمجھا اور پھر وہ مسئلہ اجتہادی نہیں رہتا بلکہ ملحق بالوحی ہو جاتا ہے یعنی اس کا حکم وہی ہوتا ہے جو وحی کے ذریعہ آنے والے احکام کا ہوتا ہے۔

ائمہ مجتہدین کا اجتہاد

جب اجتہاد کا ذکر آگیا ہے تو یہیں ائمہ کے اجتہاد کی نوعیت اور حیثیت کو بھی سمجھ لیجیے! کچھ مسائل تو وہ ہیں جو قرآن مجید میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں صاف طور سے بیان کر دیے گئے ہیں، ان کے بارہ میں تو اجتہاد کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، لیکن ان کے علاوہ بہت سے ایسے حوادث اور واقعات پیش آتے ہیں جن کا حکم قرآن پاک میں یا احادیث نبوی میں نہیں ملتا تو ان کے بارہ میں مجتہدین کو اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے، یعنی ان حضرات نے قرآن و حدیث سے تشریع کے جو اصول اور اس کی جو بنیادیں سمجھی ہیں وہ ان سے ان حوادث اور واقعات کا حکم نکالتے ہیں ــــ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی اور والی بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت فرمایا کہ تمہارے سامنے جو مقدمات اور مسائل آئیں گے ان کا فیصلہ تم کس طرح کیا کرو گے؟ انھوں نے عرض کیا کہ پہلے تو میں کتاب اللہ کی طرف اور

اس کے بعد آپ کی سنت کی طرف، یعنی آپ کے طرزِ عمل اور آپ کے ارشادات اور فیصلوں کی طرف رجوع کروں گا، اور اگر دونوں جگہ سے مجھے اُس معاملہ کا حکم نہیں ملے گا تو پھر میں اجتہاد کروں گا"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اُس جواب سے بہت خوش ہوئے اور ان کو شاباش دی اور اللہ کی حمد کی اور اس کا شکر ادا کیا۔

یہ حدیث گویا مجتہدین کے اجتہاد کی بنیاد ہے۔ — جن صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت میں فقاہت کا مقام حاصل ہو گیا تھا وہ سب حسب ضرورت اجتہاد فرماتے تھے، پھر پہلی صدی ہجری کے آخر میں اور دوسری صدی میں اور اس کے بعد بھی ایسی بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنی زندگی کا سرمایہ اس کام پر لگا دیا اور انھوں نے دین کی یہی خاص خدمت کی۔ کہ قرآن و حدیث میں اور فقہاء صحابہ کے طرزِ عمل میں غور کر کے تشریع کے اصول نکالے اور پھر ان کی روشنی میں ان مسائل کا حکم دریافت کرنے کی کوشش کی جن کا قرآن و حدیث میں بیان ہم کو نہیں ملتا، اور اس طرح شریعت اسلامی کا فقہ مرتب اور مدون ہوا۔ — دین کی یہ خدمت اور کوشش بہت سے مجتہدین نے کی تھی لیکن ان میں سے آئمہ اربعہ کا فقہ غالباً زیادہ مرتب اور جامع ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول ہوا۔

اجتہاد کا حق کس کو ہے

اجتہاد کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہو کہ ہر ایک کا کام نہیں ہو، جن بزرگوں نے یہ کام کیا ان کا کتاب و سنت کا علم نہایت وسیع تھا، انھوں نے ان لوگوں کو دیکھا تھا بلکہ ان ہی سے علم دین حاصل کیا تھا جنھوں نے دینی تعلیم و تربیت براہ راست صحابۂ کرام سے یا ان کے خاص شاگردوں سے حاصل کی تھی۔ پھر اس مستند اور وسیع علم اور اس تعلیم و تربیت کے علاوہ ان میں تعلق باللہ اور تقویٰ اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دراصل یہ کام انھیں کا تھا جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو لیا۔

نئی روشنی کے بے علم مجتہد

لیکن آج اجتہاد کو ایسی معمولی بات سمجھ لیا گیا ہو کہ بعض لوگ دین سے متعلق اردو کے صرف چند رسالے پڑھ کے یا زیادہ سے زیادہ قرآن و حدیث کے چھپے ہوئے ترجمے دیکھ کے اپنے کو اجتہاد کا حقدار سمجھنے لگتے ہیں اور مسائل میں بالکل مجتہدانہ انداز میں رائے زنی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہو کہ "ضَلُّوْا فَاَضَلُّوْا" وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

خیر اجتہاد اور مجتہدین کا یہ ذکر تو انبیاء علیہم السلام کے اجتہاد کے تذکرہ کے ساتھ جملہ معترضہ کے طور پر محض استطراداً آ گیا، ورنہ میں تو اس وقت نبوت و رسالت کے متعلق کچھ ضروری ضروری باتیں آپ سے کر رہا تھا۔ اور وہی اس وقت کا موضوع ہو۔

میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام شریعت ساز نہیں ہوتے بلکہ صرف شریعت رساں ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے سورۂ نجم کی آیت "مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" ابھی پڑھی تھی۔

اس آیت کے متعلق ایک بات اب بعد میں خیال میں آئی ہے اور وہ عرض کرتا ہوں۔

ما ینطق عن الہویٰ کا مطلب

بعض لوگوں کی گفتگوؤں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کا مطلب شاید یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کلام فرماتے تھے وہ سب وحی ہوتا تھا، اور وحی کے سوا آپ کوئی لفظ بولتے ہی نہ تھے ـــــ یہ بات اس طرح صحیح نہیں ہے، بلکہ آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ پیغمبرانہ حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کلام فرماتے ہیں اور جو احکام پہونچاتے ہیں، وہ سب وحی ہے، اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہوتی جو آپ اپنی طرف سے اور اپنی طبیعت سے فرماتے ہوں، الغرض اس آیت کا تعلق انہی باتوں سے ہے جو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم اور پیغام کی حیثیت سے پہونچاتے تھے، ورنہ اپنے اہل خانہ سے اور اپنے خدام اور اصحاب کرام سے آپ جو بھی گفتگوئیں فرماتے تھے، ظاہر بات ہے کہ وہ وحی الٰہی تو نہیں ہوتی تھی۔

نبوت وہبی ہے کسبی نہیں

نبوت کے متعلق مجھے یہ ایک بات اور بتلانی ہے کہ وہ وہبی ہے کسبی نہیں ہے۔ اس کو آپ یوں سمجھیے کہ اس دنیا میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن کو کسب اور کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی اگرچہ وہ ملتی تو ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے اور اس کی عطا سے، لیکن ان کے حاصل ہونے میں انسان کی سعی اور کوشش کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے، مثلاً کوئی خاص علم اور فن حاصل کرنا، یا کھیتی کے ذریعہ غلہ حاصل کرنا، یا صنعت و تجارت کے ذریعہ دولت پیدا کرنا، تو ایسی تمام چیزوں کو کسبی کہا جاتا ہے، اور کچھ چیزیں وہ ہیں جو محض اللہ کی عطا سے حاصل ہوتی ہیں اور کسی کی کوشش اور جد و جہد کو ان کے حاصل کرنے میں کوئی دخل نہیں ہوتا، جیسا کہ مثلاً پیدائشی خوبصورتی، فطری ذہانت اور دانشمندی تو اس قسم کی چیزوں کو وہبی کہا جاتا ہے۔ اور نبوت اسی قسم کی چیز ہے، یعنی وہ سعی اور کوشش سے حاصل نہیں کی جاتی بلکہ وہ محض موہبت الٰہی ہے۔

معجزات: نبوت کے سلسلہ میں معجزات کو بھی سمجھ لینا چاہیے، کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر ایسے غیر معمولی واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو ان کی ذہنی حیثیت اور طاقت سے بالاتر ہوتے ہیں، یعنی ان جیسا دوسرا انسان ان کو کر کے نہیں دکھا سکتا، ایسے واقعات کو معجزات کہتے ہیں۔

معجزہ نبی کا نہیں بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے

اور یہ معجزات اس نبی کا ذاتی فعل نہیں ہوتے بلکہ درحقیقت اللہ کا فعل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ اپنے اس پیغمبر کی سچائی ظاہر فرماتا ہے، ہماری عقائد کی کتابوں میں معجزہ کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ " ھو فعل اللہ تعالیٰ یظھر الخ " جس کا مطلب یہ ہوا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، جو اس کے بھیجے ہوئے نبی کی سچائی اور صداقت ظاہر کرنے کے لیے اس نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، الغرض معجزہ کا وجود اور ظہور

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہو اور وہ براہ راست اسی کا فعل ہوتا ہو اور نبی صرف اس کے مظہر ہوتے ہیں،

معجزہ غبی انسانوں کی ضرورت ہو

انسانوں میں بعض طبیعتیں ایسی غبی ہیں جو کسی پیغمبر کی پیغمبری کی جب ہی قائل ہوتی ہیں جب کہ اس کے ہاتھوں پر بعض ایسے غیر معمولی واقعات ظاہر ہوں، تو اللہ تعالیٰ ایسے غبیوں کے لیے اپنے نبیوں کو معجزات بھی دیتے ہیں، اور جو لوگ ذکی اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں ان کو پیغمبر کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی، ان کے لیے پیغمبر کی زندگی اور اس کا پیغام ہی معجزہ ہوتا ہو، اکابر صحابہ میں غالباً ایک بھی ایسے نہیں ہیں جن کو ایمان لانے کے لیے معجزہ دیکھنے کی ضرورت ہوئی ہو۔ — بہر حال معجزہ پیغمبر کی یا پیغمبری کی ضرورت نہیں ہو بلکہ غبی انسانوں کی ضرورت ہو، اسی لیے یہ ممکن ہو کہ کسی پیغمبر کے ہاتھ پر کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہو، اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہو کہ اللہ کے ایک رسول جن کا درجہ بڑا اور بلند ہو ان کو معجزے کم دیے جائیں اور جن کا درجہ اتنا بلند نہ ہو ان کی قوم میں غبیوں اور بیوقوفوں کی کثرت کی وجہ سے معجزے زیادہ دے دیے جائیں۔ الغرض معجزہ نہ تو نبی کا فعل ہو نہ نبوت کی شرط ہو، اور نہ فضیلت کا معیار ہو، بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کی سچائی کی شہادت اور نشانی کے طور پر حسب ضرورت ظاہر کیا جاتا ہو۔ اور جب اللہ چاہتا ہو جب ہی ظاہر ہوتا ہو۔ میرا مطلب یہ ہو کہ معجزہ دکھانا نبی کے اپنے اختیار میں نہیں ہو کہ نبی جب چاہے معجزہ دکھا دے، بلکہ وہ صرف اللہ ہی کے قبضہ اور اختیار میں ہو۔

قرآن مجید کا بیان کہ معجزے اللہ ہی کے اختیار میں ہیں

قرآن مجید میں اس کا جا بجا ذکر ہو کہ مکہ کے شریر اور معاند کافر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو فلاں معجزہ دکھلیئے۔ فلاں معجزہ دکھلائیے! اسکے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہی فرماتے تھے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہو، نہ میں اس کا دعویٰ کرتا ہوں، میرا کام تو صرف اللہ کا پیغام پہونچانا ہو، — سورۂ بنی اسرائیل میں تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہو کہ کافروں نے آپ سے کیا کیا معجزے دکھانے کی فرمائش کی، اور آخر میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو۔ "قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا" آپ ان جاہلوں سے کہہ دیجیے کہ میں تو بس اللہ کا پیغام پہونچانے والا ایک انسان ہوں — یعنی میں نے کب دعویٰ کیا ہو کہ ایسے معجزے دکھانا بھی میرے قبضہ میں ہو جو تم مجھ سے ایسی لغو فرمائشیں کرتے ہو۔ اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر آپ کو حکم ہو "قُلْ إِنَّمَا الْآيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ" آپ ان جاہلوں سے کہہ دیجیے کہ جو نشانیاں اور معجزے تم چاہتے ہو وہ اللہ ہی کے پاس ہیں اور اسی کے قبضہ میں ہیں وہ جب چاہے دکھائے یا نہ دکھائے۔ مطلب یہ ہو کہ یہ چیزیں میرے اختیار سے باہر ہیں، اس لیے تمہارا مجھ سے یہ فرمائش کرنا غلط ہو۔

معجزہ ہی کے ساتھ کرامت اور استدراج کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔

کرامت جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی سچائی ظاہر کرنے کے لیے اس کے ہاتھ پر ایسے غیر معمولی اور خارق عادت واقعات ظاہر کرتا ہے جو اس جیسے دوسرے انسانوں سے نہیں ہو سکتے اور ان کے ظہور سے غبی سے غبی انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ درحقیقت یہ اللہ کا نبی ہے اور اللہ کی تائید اس کے ساتھ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کسی سچے نبی کے بعض نیک اور مقبول اُمتیوں کے ہاتھ پر بھی کبھی کبھی ان کی مقبولیت کی نشانی کے طور پر ایسے خارق عادت واقعات ظاہر فرما دیتا ہے، بس ان ہی واقعات کو کرامت کہتے ہیں، اور جس طرح معجزہ نبی کا ذاتی اور اختیاری فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے اسی طرح کرامت بھی ولی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے اور اللہ ہی کے ارادہ اور اختیار سے اُس کے مقبول بندہ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ صرف اس کا مظہر ہوتا ہے۔ — عقائد اور تصوف کی کتابوں میں کرامت کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے کہ "هُوَ فِعْلُ اللّٰهِ تَعَالیٰ خَارِقٌ لِلْعَادَةِ يَظْهَرُ عَلیٰ يَدِ عَبْدٍ ظَاهِرٍ صَلَاحُهٗ وَتَقْوَاهُ" جس کا مطلب یہ ہوا کہ کرامت اللہ کا وہ غیر معمولی اور خارق عادت فعل ہے جو اس کے کسی ایسے بندہ کے ہاتھ پر ظاہر ہو جس کی زندگی بالکل علانیہ طور صلاح و تقوے کی زندگی ہو۔

ولی کون ہوتا ہے اسلامی شریعت اور قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ایسے ہی شخص کو ولی کہا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ پر جو غیر معمولی واقعات ظاہر ہوں بس ان کو کرامت کہا جاتا ہے، بغیر صلاح و تقویٰ اور بغیر اتباع شریعت کے ولایت اور کرامت کا کوئی امکان نہیں، قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے "اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَاۤءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝" اللہ کے ولیوں کو نہ خوف ہوگا، نہ غم، وہ ولی وہ لوگ ہیں جو صاحبِ ایمان ہیں اور صاحبِ تقویٰ ہیں یعنی پیغمبرِ وقت پر جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں اور اُس کی شریعت پر چلتے ہیں تو ایسے بندگانِ خدا کے ہاتھ پر اگر کوئی غیر معمولی اور خارق عادت چیز ظاہر ہو تو وہ کرامت کہلاتی ہے اور وہ ان کی ولایت اور مقبولیت کی نشانی ہوتی ہے۔

استدراج اور جن لوگوں کی زندگی میں تقویٰ اور اتباع شریعت علانیہ طور سے نہ ہو اور اس کے باوجود ان سے ایسی چیزیں ظاہر ہوں تو اگر وہ جادو اور شعبدے کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے تو پھر بندوں کے ابتلاء اور امتحان کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہے، جیسا کہ حدیثوں میں دجال کے متعلق آتا ہے کہ وہ اپنے حکم سے بارش برسا کے اور مردے زندہ کرکے دکھلائے گا، تصوف کی کتابوں میں حضرت بایزید بسطامیؒ سے نقل کیا گیا ہے، آپ فرماتے تھے۔

لو نظرتم الی رجل یرتقی فی الهواء ویمشی فی الماء فلا تغتروا به حتی تنظروه کیف تجدونه عند الامر والنهی وحفظ الحدود واداء الشریعه۔

اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ ہوا میں اڑتا ہو اور سطح آب پر خشکی کی طرح چلتا ہو تو دھوکا نہ کھانا اور صرف

ان باتوں کو دیکھ کر اس کو ولی اور اللہ کا مقبول بندہ نہ سمجھ لینا، جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ اللہ کے احکام اوامر و نواہی اور اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود کے بارے میں اس کا طرز عمل کیا ہے اور شریعت پر ٹھیک ٹھیک چلتا ہے یا نہیں۔

کرامت ولایت کی شرط نہیں ہے

کرامت کے متعلق ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہر ولی سے کرامات کا ظہور بالکل ضروری نہیں بلکہ اکثر اولیاء اللہ وہی ہوتے ہیں جن سے مدۃ العمر میں کوئی کرامت بھی ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایسا ولی جس سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو درجہ میں اس دوسرے ولی سے بڑا ہو جس سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئی ہوں، فضیلت کا معیار بس تقویٰ ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔

اولیاء اللہ سے عناد کا نتیجہ خدا دشمنی ہے

اسی جگہ ایک بات یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کسی ولی کو ولی ماننا شرط ایمان تو نہیں ہے لیکن جو واقعی اولیاء اللہ ہیں خواہ وہ اس دنیا سے جا چکے ہوں یا موجود ہوں اُن سے عداوت اور بغض و عناد رکھنا سخت محرومی اور بڑا وبال ہے، صحیح حدیث قدسی ہے۔ "مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ" یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے — اس لیے اولیاء اللہ کے ساتھ ہمارا رویہ ہمیشہ ادب اور عظمت کا ہونا چاہیے، ہاں اس کی گنجائش ہے کہ ادب اور عظمت کے باوجود کسی خاص معاملہ میں ہمیں ان کی رائے سے اختلاف ہو، کیونکہ وہ پیغمبروں کی طرح معصوم اور واجب الاطاعت نہیں ہیں۔

یہاں ولایت و کرامت کا یہ تذکرہ "ضمناً" آگیا تھا ورنہ بیان معجزہ کا ہو رہا تھا۔

معجزہ کی حقیقت اور نوعیت تو آپ سمجھ چکے، اب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

تاریخ اور سیرت کی روایات کے علاوہ صحیح احادیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے روشن معجزات کا ذکر ہے، اور وہ چیزیں اتنی مشہور ہیں کہ آپ سب حضرات ان کو یقیناً جانتے ہوں گے اس لیے یہاں میں اُن کے ذکر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، وہ سب اب تاریخی باتیں ہیں اور اس وقت کی دُنیا کے سامنے نہیں ہیں — میں آپ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اس زندۂ جاوید معجزہ کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو اس وقت بھی اپنی اسی اعجازی شان کے ساتھ زندہ ہے اور حضور کی نبوت کی دلیل دے رہا ہے جس شان کے ساتھ وہ اب سے قریباً ساڑھے تیرہ پونے چودہ سو برس پہلے ظاہر ہوا تھا، یعنی "قرآن مجید"

قرآن مجید

اگرچہ اتنی بات تو اجمالی طور پر ہر مسلمان جانتا ہے اور اس پر عقیدہ رکھتا ہے کہ قرآن شریف حضور کا

معجزہ ہے، لیکن میں اس وقت آپ کے سامنے اس کی کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

اعجاز قرآن کے چند عام فہم پہلو

قرآن پاک بہت سے پہلوؤں سے معجزہ ہے، لیکن میں اس وقت صرف اُن پہلوؤں کو بیان کرنا چاہتا ہوں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جن پر غور کر کے ہر منصف مزاج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یقین آج بھی حاصل کر سکتا ہے۔

قرآن پاک کی معجزانہ محفوظیت

میں سب سے پہلے قرآن مجید کی محفوظیت کو لیتا ہوں، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کے زیادہ تر مضامین وہ ہیں جن سے اس دور کے اہل عرب ناواقف اور نامانوس تھے، پھر اس کی زبان اگرچہ عربی ہے لیکن ان کی عام بول چال کی عربی اور ان کی شاعری اور خطابت کی زبان سے بھی بہت زیادہ ممتاز اور نرالی ہے، یہاں تک کہ حدیث کی یعنی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور قرآن مجید کی زبان اور طرز بیان میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے، ان وجوہ سے قرآن کا حفظ کرنا اہل عرب کے لیے بھی زیادہ آسان نہ تھا، پھر قرآن لکھے ہوئے صحیفہ کی شکل میں اتارا نہیں گیا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا گیا، پھر چونکہ عرب میں اس وقت نوشت وخواند کا عام رواج نہ تھا اس لیے ایسا بھی نہیں ہوا کہ اس کے متعدد نسخے ساتھ ساتھ تیار ہوتے رہے ہوں۔ انتہا یہ ہے کہ خود حضور لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے اس لیے آپ نے کبھی قرآن مجید کی ایک آیت بھی قلمبند نہیں کی، اور اگر کبھی کسی دوسرے نے کوئی آیت یا سورت لکھی تو آپ خود اس کو ملاحظہ فرما کے اس کی تصحیح نہیں فرما سکتے تھے، پھر وہ دو چار ورق کا کوئی چھوٹا سا صحیفہ نہیں بلکہ اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے، ان سب تاریخی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے کہ جس کتاب کی یہ تاریخ اور یہ سرگزشت ہو اس کا چودہ سو برس تک اس طرح محفوظ رہنا کہ مشرق و مغرب، عرب و عجم، یورپ و ایشیا، افریقہ و امریکہ، ہر جگہ کے مسلمانوں کے پاس ایک ہی قرآن ہے، جس میں اول سے آخر تک ایک آیت بلکہ ایک حرف کا بھی فرق نہیں ہے، تو انصاف پسندوں کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ اس بات کی روشن دلیل نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، اور صرف اللہ کی قدرت نے اس کو اس طرح محفوظ رکھا، ورنہ اس عالم میں جو ہر قسم کے انقلابات اور تغیرات کا آماجگاہ رہا ہے اس کو اس طرح محفوظ نہ رہنا چاہیے تھا، اسی لیے قرآن کے سوا کسی اور کتاب کا کوئی نام نہیں بتا سکتا جس کی ایسی تاریخ اور سرگزشت ہو، اور پھر وہ محفوظ ہو۔

اس کی معجزانہ علمی شان

قرآن مجید کے اعجاز کا دوسرا پہلو اس کی معجزانہ علمی شان ہے، آپ اس پر یوں غور کیجیے کہ قرآن پاک کو خدا کی کتاب بتلاتے ہوئے ایک ایسے شخص نے دنیا کے سامنے پیش کیا جو زندگی کے کسی ایک دن میں بھی کسی مدرسہ کا طالب علم نہیں رہا بلکہ ایک ایسی بستی میں پیدا ہوا جس میں کوئی مدرسہ اور مکتب نہ تھا، نہ علمی

چرچے تھے، نہ علمی صحبتیں تھیں، نہ تحصیل علم کے لیے وہ کہیں باہر گیا، وہ اپنی عمر کے چالیسویں سال تک علوم و معارف سے اسی طرح بیگانہ اپنی سادہ فطرت پر ایک نہایت شریف اور سچا انسان تھا، عمر کے چالیس سال پورے ہونے پر اچانک اس کی زندگی اور اس کے طرز عمل میں ایک غیر معمولی تبدیلی ہوئی اور اس نے بتایا کہ اللہ نے اس کو نبوت سے سرفراز کیا ہو، اور اس پر وحی آتی ہو، اب اس نے اپنی بستی والوں کو قرآن مجید سنانا شروع کیا اور کہا کہ یہ میرا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہو، وہی کلام قرآن مجید کے نام سے ہمارے سامنے موجود ہو، یہ ایک حقیقت ہو کہ اس میں اللہ کی توحید اور ذات و صفات کے متعلق جو کچھ دنیا کو بتایا گیا ہو وہ بلاشبہ علم و معرفت کا آخری نقطہ ہو اور اس بارہ میں ہم پوری علمی دنیا کو چیلنج کر سکتے ہیں، پھر اس میں مشکل سے مشکل مسائل کو مثلاً آخرت اور حشر نشر کو جس طرح سمجھایا گیا ہو وہ تفہیم و استدلال کا عجیب و غریب نمونہ ہو، اسی طرح اس میں جو اخلاقی نصیحتیں ہیں کسی بڑے سے بڑے حکیم اور معلم اخلاق کی نصیحتیں اس سے بہتر بلکہ اس درجہ کی بھی نہیں دکھلائی جا سکتیں پھر اس میں جو قانون ہو انسانوں کے لیے اس سے بہتر قانون نہ آج تک وضع ہوا ہو نہ وضع ہو سکتا ہو۔ ہم اس مسئلہ پر بھی دنیا کو چیلنج کر سکتے ہیں کہ انسانوں کی فطرت کے لیے کوئی قانون بھی قرآن کے پیش کردہ قانون سے بہتر وضع نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح عبادات کا جو نظام قرآن مجید میں انسانوں کے لیے پیش کیا گیا ہو اگر دنیا بھر کے سوچنے والے بھی سوچیں تو ہرگز اس سے بہتر نہیں سوچ سکتے، صرف نماز ہی پر غور کیا جائے اور اس کی ترتیب اور اس کے اذکار میں تفکر اور تدبر کیا جائے تو عقل دنگ رہ جاتی ہو اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ نسخۂ کیمیا ہرگز ایک اُمّی انسان کا تصنیف کیا ہوا نہیں ہو سکتا — بہرحال قرآن مجید کے اعجاز کا یہ ایک نہایت عام فہم پہلو ہو کہ اس میں جو علوم و معارف اور جو نصائح اور قوانین ہیں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق جو تعلیمات اور ہدایات ہیں اُن کو ہرگز عرب کے ایک ایسے اُمّی کی دماغی محنت اور سوچ فکر کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا جس نے نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ کسی لکھے پڑھے آدمی کی کبھی اسے صحبت ملی — ایک ایسے سادہ فطرت اُمّی کے ہاتھوں سے قرآن پاک جیسے علمی شاہکار کا ملنا علمی دنیا کی نگاہ میں مُردوں کو جلانے اور اندھوں کو سوانکا کرنے سے بھی بڑا معجزہ ہو۔ اور آپ کو یہ زندۂ جاوید علمی معجزہ اسی لیے دیا گیا کہ آپ کا دور علمی روشنی کا دور ہو، پہلی دنیا عجیب باتوں اور محیر العقول کرشموں سے زیادہ متاثر ہونے والی تھی، اور ہماری یہ دُنیا، خاص طور سے ہمارا یہ دور علوم و فنون کا دور ہو اور اس زمانہ میں علوم کی قیمت اور وقعت عملی کرشموں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہو۔

قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت | قرآن پاک کے اعجاز کا ایک مشہور عام پہلو یہ بھی ہو کہ فصاحت و بلاغت

ہیں وہ آپ ہی اپنی نظیر ہو، اور اُس جیسا فصیح وبلیغ کلام پیش کرنے سے دُنیا ہمیشہ عاجز رہی ہو اور عاجز رہے گی ــــ یہ بات صرف خوش عقیدگی کی نہیں ہو، بلکہ یہ بالکل سچی حقیقت ہو، عربی زبان وادب کے بے شمار قدیم و جدید نمونے دنیا میں موجود ہیں، مصنفوں کی تصنیفیں ہیں، خطیبوں کے خطبے ہیں، شاعروں کے قصیدے اور ان کے دیوان ہیں۔ اسی طرح اخلاق پر، تاریخ وسیر پر، قانون پر اور دوسرے موضوعات پر مختلف زمانوں کی لکھی ہوئی عربی کتابیں کتب خانوں میں بھری پڑی ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے بڑے ہزاروں ارشادات اور آپ کے ممتاز صحابۂ کرام کے خطبات اور ملفوظات، احادیث و آثار کی کتابوں میں محفوظ ہیں ــــ قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کو ان سب نمونوں کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے، ہر عربی داں کو بالکل بدیہی طور پر محسوس ہوگا کہ قرآن کا اسلوب بیان ان سب سے الگ، سب سے ممتاز اور سب سے بالاتر ہو۔

میں آپ کو اسی زمانے کا ایک واقعہ سناؤں، اس سے انشاء اللہ آپ حضرات بھی قرآن مجید کے اس اعجازی پہلو کو کسی حد تک سمجھ سکیں گے، شاید آپ میں سے بھی بعض دوستوں نے علامہ طنطاوی جوہری کا نام سنا ہو، یہ ہمارے اس زمانہ کے ایک مصری عالم ہیں" جواہر القرآن" کے نام سے ان کی ایک تفسیر ابھی چند برس ہوئے مصر سے شائع ہوئی ہو، اس سے معلوم ہوتا ہو کہ جدید مغربی علوم خصوصاً سائنس اور فلسفہ پر ان کی بڑی نظر ہو اور طبیعات کے تو معلوم ہوتا ہو وہ بڑے ہی ماہر ہیں، انھوں نے خود اپنا یہ واقعہ لکھا ہو کہ میں جرمنی میں تھا، ایک دن وہاں کے چند مستشرق دوستوں کے ساتھ (یعنی عربی زبان اور عربی علوم سے دلچسپی رکھنے والے چند جرمنی فضلاء کے ساتھ) بیٹھا ہوا تھا، ان میں سے ایک ممتاز فاضل نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ بھی عام مسلمانوں کی طرح قرآن کے بارہ میں خیال رکھتے ہیں کہ وہ عربیت اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہو؟ میں نے کہا ہاں میں اس پر یقین رکھتا ہوں، اس نے بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہا میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم جیسا صاحب علم اور روشن خیال آدمی بھی ایسا عامیانہ خیال رکھتا ہوگا ــــ میں نے کہا اس میں تعجب کی کیا بات ہو یہ تو ایک علمی مسئلہ ہو، اور ابھی اس کا امتحان ہو سکتا ہو۔ میں ایک جملہ دیتا ہوں، آپ سب حضرات خوب غور و فکر کرکے اس کو فصیح و بلیغ عربی میں ادا کریں ــــ بس وہ جملہ یہ ہو کہ "جہنم بے حد وسیع ہو" ان سب نے دیر تک غور و فکر کرکے چند جملے بنائے "اِنَّ جَهَنَّمَ لَوَسِيعَةٌ" "اِنَّ جَهَنَّمَ لَفَسِيحَةٌ" "اور اس سے ملتے جلتے چند اور جملے ــــ اور میرے سامنے رکھ دیے میں نے کہا کہ اور محنت کر لیجیے اور جتنا جی چاہے وقت لے لیجیے، لیکن انھوں نے کہا کہ ہم اپنی محنت اور غور و فکر ختم کر چکے ــــ اس کے بعد میں نے کہا کہ اب ذرا دیکھیے کہ قرآن مجید نے اسی مضمون کو کس طرح ادا کیا ہو ــــ ارشاد ہو۔ "يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ" (اور وہ دن جب کہ ہم جہنم سے کہیں گے کہ کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ بھی ہو؟) علامہ طنطاوی لکھتے ہیں کہ جیسے ہی میں نے سورۂ ق کی یہ آیت پڑھی چونکہ وہ

عربی داں اور سخن شناس تھے، اچھل پڑے۔ اور انھوں نے اپنی رائیں پیٹ ڈالیں اور اقرار کیا کہ بے شک ہم عاجز رہے ۔

بہرحال کسی منصف مزاج عربی داں کو اس میں قطعاً شک نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے، اور وہ ہرگز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کسی ایسے اُمّی انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتا جس کو شعر و خطابت سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔

ان سب پہلوؤں سے قرآن پاک آج بھی معجزہ ہے

قرآن پاک ان سب پہلوؤں سے جس طرح اب سے پونے چودہ سو برس پہلے کی دنیا کیلیے معجزہ تھا، بالکل اسی طرح وہ آج کی دنیا کے لیے بھی معجزہ ہے اور ہم اس کو ہاتھ میں لے کر ساری دنیا کو پکار کر کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت چونکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس معجزہ کو بھی قیامت تک باقی اور روشن رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، اور ختم دنیا تک پیدا ہونے والے سب انسانوں کے لیے یہ اللہ کی حجت ہے۔ جس کو کوئی شک و شبہ ہو وہ ذرا سے غور و فکر سے کام لے کر اطمینان حاصل کر سکتا ہے اور صداقت اور سچائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، اس کے بعد بھی جو لوگ سوچنا اور دیکھنا نہیں چاہتے وہ وہی ہیں جنھیں اپنے اللہ کو راضی کرنے کی اور اپنے انجام کی کوئی فکر نہیں ہے، اس لیے ان کا انجام جہنم کے ابدی عذاب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

آنحضرتؐ کا ایک دوسرا زندہ تاریخی معجزہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی طرح کا ایک اور عام فہم اور زندہ تاریخی معجزہ وہ محیر العقول روحانی اور ایمانی انقلاب ہے جو آپ کے ذریعہ دنیا میں برپا ہوا تھا، اور تاریخ نے اسکو بعد والوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے پوری طرح محفوظ کر دیا ہے ــــ اسلام کی اور عرب کی تاریخ جاننے والے دوست دشمن سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عربوں کی دینی اور اخلاقی اور تہذیبی حالت کیا تھی، وہ اللہ سے کتنے بے تعلق اور مرنے کے بعد والی زندگی سے کتنے بے فکر تھے، ان میں کس درجہ وحشت اور جہالت تھی، لڑائی بھڑائی، لوٹ مار، قتل و غارت، بے حیائی اور بے شرمی، قمار و شراب، ظلم و جفا اور اسی طرح کے دوسرے فواحش و منکرات ان میں کس قدر عام تھے ــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف چند سال کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت نے ان کی کیسی کایا پلٹی، وہ کیسے خدا پرست بن گئے، ان پر فکر آخرت کا کتنا غلبہ ہو گیا، وہ کیسے مہذب اور حسنِ اخلاق کا کتنا اعلیٰ نمونہ بن گئے، انصاف اور رحمدلی میں وہ دُنیا سے کتنے ممتاز ہو گئے ــــ اور اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی دو شہنشاہیوں روم اور فارس کو زیر کر کے ان کے تخت و تاج کا وارث بن جانے کے بعد بھی وہ کیسے خدا پرست اور خدا ترس زاہد و درویش بنے رہے۔ تاریخ نے عرب کے اس روحانی اور ایمانی انقلاب کی پوری تفصیلات کو محفوظ رکھا ہے، اور اسلام کا کوئی متعصب

متعصب دشمن بھی اس تاریخی حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت سے عربوں کی زندگی میں یہ انقلاب برپا ہوا تھا ـــ اور اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ یہ بلاشبہ آپ کا معجزہ تھا، اور جس کو اس کے معجزہ ہونے سے انکار ہو وہ اپنے سارے علمی اور عقلی اور روحانی اور مادی ذرائع کو استعمال کر کے اس سے چھوٹے ہی پیمانہ پر ایسا انقلاب برپا کر کے دکھلائے۔

ایک بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز مکالمہ

یہاں میں آپ کو اسی شہر لکھنؤ کا ایک بڑا دلچسپ قصہ سناؤں، انشاء اللہ اس سے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کو بڑی صفائی کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔ میرے ایک چچا تھے۔ حقیقی چچا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ابھی ۵-۶ سال ہوئے ان کا انتقال ہوا ہو، بڑے ذہین اور حاضر دماغ تھے، عالم فاضل تھے، اور فطری مناظر تھے، اور طبیب بھی کامیاب تھے۔ خود انھوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا، کہ وہ سفر میں تھے اور اسی لکھنؤ کے اسٹیشن پر انھیں ٹرین کے انتظار میں دو تین گھنٹے ٹھہرنا تھا، انھوں نے سوچا کہ یہ وقت کسی کام میں لگنا چاہیے، اور غور کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ نگار کا دفتر تلاش کر کے نیاز فتحپوری صاحب سے کچھ باتیں کی جائیں، چنانچہ تانگہ کرایہ پر کیا اور نگار کے دفتر پہونچ گئے۔ نیاز صاحب موجود تھے، چچا صاحب نے ان سے کہا کہ میں آپ سے ایک نہایت اہم مسئلہ پر بات کرنا چاہتا ہوں، اور اس کے لیے آپ کا ایک گھنٹہ لینا چاہتا ہوں، نیاز صاحب نے (شاید ان کی مولویانہ صورت دیکھ کر) پہلے تو اتنا وقت دینے سے انکار کیا، لیکن بالآخر ان کے اصرار اور ان کی منطق نے انھیں مجبور کر دیا، اور وہ متوجہ ہو کر بیٹھ گئے ـــ چچا صاحب نے ان سے کہا کہ میں کبھی کبھی آپ کا رسالہ نگار دیکھتا ہوں، اس لیے آپ کی ذہانت اور آپکے زور قلم اور آپ کے علمی خصوصیات سے واقف ہوں، میں اس وقت آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ اس صلاحیت اور قابلیت کو ایک بڑے اور بہت مفید کام پر لگانے کی آپ سے درخواست کروں، آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں برائیاں اور بداخلاقیاں کتنی بڑھ گئی ہیں، اور ساری دنیا کو چھوڑیے اپنے اسی شہر لکھنؤ کو دیکھیے، خالص انسانی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے یہاں کے عام باشندے بیچارے کس قدر پست حالت میں ہیں۔ کتنی بڑی تعداد ہو جو جاہل ہو، اُجڈ ہو، تنگ نظر ہو، گندگی پسند ہو، پھر ہر کام اور ہر پیشہ میں جھوٹ ہو، دھوکہ ہو، خود غرضی ہو، بے ایمانی ہو، غرض جو چیزیں انسانوں میں نہیں ہونی چاہئیں وہ سب موجود ہیں۔ اور جو اچھی باتیں ہونی چاہئیں وہ بالکل نہیں ہیں۔ تہذیب نہیں ہو، شرافت نہیں ہو، امانت نہیں ہو، سچائی نہیں ہو، انصاف نہیں ہو، ایسی حالت میں آپ جیسی اعلیٰ قابلیت رکھنے والوں کا فرض ہو کہ وہ سب کام چھوڑ کے اس بگڑی ہوئی انسانیت کو درست کرنے پر اپنی ساری قوتیں لگادیں، آپ جیسے حضرات اگر اس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں اور جس طرح منصوبے بنا کر قوموں اور ملکوں میں بڑے بڑے کام کیے جاتے ہیں اس طرح اس کام کو آپ کریں تو بہت جلدی

دنیا کی کایا پلٹ جائے گی، اور سب سے پہلے اسی لکھنؤ سے شروع کیجئے، اس کام کے لیے میں اپنی پوری خدمات آپ کے حوالے کرتا ہوں، ہمیں امید ہو کہ بس سال دو سال میں ہم لکھنؤ کو تو ایک نیا اور ساری دنیا کے لیے نمونہ کا لکھنؤ بنا دیں گے، ہمیں اس مہم میں ہر شریف اور معقول آدمی کی ہمدردی اور اس کا تعاون حاصل ہوگا، اور پھر تھوڑے عرصہ میں ساری دنیا کو ہم ایک اچھی شریف دنیا بنا سکیں گے۔

نیاز صاحب نے یہ سن کر کہا، مولانا! آپ کس خواب وخیال میں ہیں، آپ بڑے سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں، میرے اور آپ کے جیسے اگر سینکڑوں بھی ہوں تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔

بچا صاحب نے کہا کیوں نہیں ہو سکتا؟ آپ بہترین لکھنے والے ہیں آپ کے ہاتھ میں پریس کی طاقت ہو اور غالباً آپ تقریر بھی بہترین کرتے ہوں گے اور مجھے بھی کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھنا بولنا آتا ہو، اور جس دن ہم یہ کام شروع کریں گے ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ سارے اخبارات اور رسائل ہمارا ساتھ دیں گے اور سیکڑوں ہزاروں لکھنے اور بولنے والے ہمارے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے اور آپ دیکھیں گے کہ چند دنوں میں فضا بالکل پلٹ جائے گی اور دنیا میں ایک نئی بہار آ جائے گی، اگر ہم ساری دنیا کو نہیں بدل سکے تو کم از کم اپنے ملک کو یا اپنے صوبہ کو تو بدل ہی ڈالیں گے۔ آپ ہمت کیجیے اور پھر دیکھیے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سب ہو جائے گا۔

نیاز صاحب نے پھر کہا کہ مولانا آپ بہت ہی سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس دنیا کو شاید آپ بالکل نہیں جانتے اس دنیا کا بدلنا ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں ہو۔

بچا صاحب نے کہا، اچھا میں ایک بات پوچھتا ہوں، مجھے اندازہ ہو کہ تاریخ پر آپ کی خوب نظر ہو، اور آپ یقیناً اس سے واقف ہوں گے کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں ایک دفعہ ایسا کام ہوا تھا، اور اس قوم میں ہوا تھا جو تعلیم و تہذیب میں بالکل کوری تھی اور جہالت اور اُجڈپن میں اور تمام برائیوں اور بداخلاقیوں میں ہماری اس دنیا کے جاہلوں اور غنڈوں سے بہت بڑھی ہوئی تھی، اور ایک ایسی شخصیت کے ذریعہ ہوا تھا جو خود نوشت وخواند سے بالکل ناآشنا تھی۔ نہ اس کے ہاتھ میں پریس تھا نہ کوئی اخبار یا رسالہ اس کی آواز کو بلند کرنے والا تھا، نہ اس کے ساتھ مقرروں کی کوئی ٹیم تھی نہ اس کے پیغام کو قوم میں پھیلانے والے شاعر اس کے ساتھ تھے تو جب اس بے سرو سامانی کی حالت میں ایک اکیلے امی انسان نے ایک پوری قوم کو بدل دیا تو ہم اور آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی جن کے ہاتھ میں قلم اور پریس کی طاقت بھی ہو اور ہزاروں ہم جیسے اور آدمی بھی ہمارا ساتھ دینے کو دنیا میں موجود ہیں، اور حکومتیں بھی ہمارے اس کام میں یقیناً ہم سے پورا تعاون کریں گی تو پھر آپ کیوں مایوس ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر عرب میں وہ انقلاب ۲۰ سال میں ہوا تھا تو ہم اپنے ان وسائل کی وجہ سے ایک سال میں وہ انقلاب برپا کر سکیں گے، بس اس کی ضرورت ہو کہ ہم آپ ہمت کر کے فیصلہ کریں، اور

دوسرے سارے کام چھوڑ کے اپنی ساری قوتوں کو اس پر لگا دیں۔

نیاز صاحب نے کہا مولانا میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا لیکن بات یہی ہو کہ یہ کام ہمارے اور آپ کے بس کا نہیں ہو اور آپ میرے اور اپنے متعلق اور اس دنیا کے متعلق بڑی غلط قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

بچا صاحب نے کہا اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ ایک تاریخ داں کی حیثیت سے اس تاریخی واقعہ کو بھی تسلیم کرتے ہیں یا نہیں کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں ایسا انقلاب ہو چکا ہو۔

نیاز صاحب نے کہا! ہاں یہ ایک مسلّم واقعہ ہو اور اس سے کون انکار کر سکتا ہو۔

بچا صاحب نے کہا، مجھے آپ سے بس یہی جواب لینا تھا ـــــ عرصہ ہوا میں نے معجزات کے انکار پر آپ کا ایک مضمون پڑھا تھا، یہ وقت میں نے آپ سے اسی لیے لیا تھا کہ آپ کو معجزہ کی حقیقت سمجھا دوں اور آپ کو بتا دوں کہ آپ بھی معجزہ کے قائل ہیں، اللہ کے پیغمبر کے ذریعہ جو ایسی چیز ظاہر ہو جس کے کرنے سے اس جیسے دوسرے انسان عاجز ہوں، بس وہی معجزہ ہو، آپ نے اس وقت بار بار اقرار کیا ہو کہ اللہ کے ایک اُمّی پیغمبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ عرب میں جو اصلاحی انقلاب ہوا تھا، آپ ہر طرح کے بہتر سے بہتر وسائل رکھنے کے باوجود اپنے کو اس سے عاجز سمجھتے ہیں کہ صرف شہر لکھنؤ میں بھی ایسا انقلاب برپا کر سکیں ـــــ "

بچا صاحب فرماتے تھے کہ اس بات کے ختم ہونے کے ساتھ میرے وقت کی گنجائش بھی ختم ہو گئی، اور اگرچہ نیاز صاحب (شاید اپنے ابتدائی رویہ کی تلافی کے لیے) اور کچھ دیر بیٹھنے پر اصرار کرتے رہے، لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے میں فوراً اسٹیشن آ گیا۔

حقیقت یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور تعلیم و تربیت سے جو روحانی اور ایمانی انقلاب عرب میں برپا ہوا وہ بھی قرآن مجید ہی کی طرح آپ کا ایک زندہ تاریخی معجزہ ہو، مگر افسوس ہم مسلمانوں کی موجودہ حالت نے اس پر بہت ہی غلیظ پردے ڈال دیے ہیں۔ اور دنیا کے لیے اس کا سمجھنا مشکل بنا دیا ہو۔

ایک اور زندہ معجزہ میں معجزات کے سلسلے میں آپ کے ایک اور علمی معجزہ کا ذکر کرتا ہوں، وہ بھی الحمد للہ محفوظ اور زندہ ہو۔ اور جس کا جی چاہے آج بھی اس میں ذرا غور کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپ کی نبوت و رسالت کا یقین حاصل کر سکتا ہو، اور خود میرا حال یہ ہو کہ الحمد للہ میں زیادہ تر اسی میں غور کر کر کے اپنے ایمان کو تازہ کیا کرتا ہوں، اور وہ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں، اللہ تعالیٰ حضرات محدثین کو بہتر سے بہتر جزا دے اور ان کی قبروں کو اپنے انوار رحمت سے بھر دے، انھوں نے حضور کے دوسرے اقوال و افعال کی طرح آپ کی

مختلف اوقات اور مختلف حالات کی دعاؤں کو بھی ہمارے لیے اپنی کتابوں میں محفوظ کر دیا، پھر بعد میں اللہ کے بعض بندوں نے ان دعاؤں کو الگ کتابی شکل میں بھی مرتب کر دیا۔ اور اب چھوٹی بڑی بیسوں کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں صرف حضور کی دعاؤں ہی کو کسی خاص ترتیب سے جمع کیا گیا ہو۔— جس شخص میں خدا پرستی اور روحانیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہو یا اس کو ان چیزوں کی ذرا بھی حس ہو وہ اگر ان دعاؤں پر یا ان کے ترجموں ہی پر غور کرے تو اس کو اس میں شک نہیں رہ سکتا کہ یہ دعائیں صرف اسی منور قلب سے نکل سکتی ہیں جس کو انسانیت بلکہ ساری کائنات کا بھی زیادہ سے زیادہ عرفان حاصل ہو اور اللہ کی معرفت میں بھی اس کا مقام بلند سے بلند تر ہو اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی کھوٹ نہ ہو۔— الحمدللہ ثم الحمدللہ اس عاجز کو تو حضور کی ہر دعا سے یہ نور یقین نصیب ہوتا ہے اور میں صاف کہتا ہوں کہ شاید میری کم علمی کی وجہ سے میرا ذوق و وجدان حضور کی نبوت و رسالت کے بارہ میں دوسری تمام چیزوں سے زیادہ تسکین اور یقین آپ کی دعاؤں سے حاصل کرتا ہے۔— بہر حال حضور کی محفوظ دعائیں بھی آپ کا نہایت روشن اور زندہ جاوید معجزہ ہیں، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اللہ نے کسی کے دل کو ذرا بھی روشنی دی ہو تو اس کے لیے حضور کی زندگی کا ہر پہلو بلکہ اس کی ہر ادا معجزہ ہے۔

معجزات کے سلسلہ میں میری گفتگو بہت طویل ہو گئی لیکن الحمدللہ بعض باتیں ایسی ذکر میں آ گئیں جن سے انشاء اللہ ہم سب کے ایمان و یقین میں تازگی پیدا ہوئی ہوگی اور آئندہ بھی ان کو یاد کر کے بوقت ضرورت یہ تازگی پیدا کی جا سکے گی، اور جو انسان اپنی بدقسمتی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، انشاء اللہ یہی چند باتیں بوقت ضرورت اور موقع پر آپ ان کے سامنے بھی رکھ سکیں گے۔ اور ان کو غور و فکر کی دعوت دے سکیں گے۔

اب میں نبوت و رسالت ہی کے متعلق ایک آخری بات اور کہنا چاہتا ہوں۔

مقام نبوت، اور کسی کو نبی ماننے کا مطلب

جب آپ نے نبوت و رسالت کی حقیقت سمجھ لی تو یہ بات بھی آپ پر واضح ہو گئی ہوگی کہ کسی کو نبی اور رسول ماننا ایسی بات نہیں ہے جیسے کہ کسی کو شاعر مان لینا یا کسی کو قوم کا لیڈر مان لینا یا کسی کو حکیم یا ڈاکٹر مان لینا، کسی کو شاعر یا لیڈر یا حکیم یا ڈاکٹر ماننے کے بعد ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ ہم اس کے فن میں بھی اس کی ہر بات کو قبول کریں، لیکن کسی کو نبی و رسول ماننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ یہ غیبی حقیقتوں کے بارہ میں جو کچھ ہمیں بتلاتا ہے اور ہم کو جو ہدایات دیتا ہے، سب اللہ کی طرف سے دیتا ہے اور اس کی یہ ساری باتیں گویا اللہ کی باتیں ہیں، اس لیے یہ سب حق ہی حق ہیں، اور ان میں کسی کو چون و چرا اور شک و شبہ کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔— اس واسطے ہر انسان کا فرض ہے کہ کسی ہستی کو نبی و رسول ماننے کے بارہ میں تو ہرگز

سہل انگاری سے کام نہ لے بلکہ خوب دیکھ بھال کے اور جانچ پرکھ کے کسی کو اللہ کا نبی یا رسول مانے، لیکن جب دل اور دماغ کسی ہستی کو نبی اور رسول مان لیں اور ان کی نبوت و رسالت پر آدمی ایمان لے آئے تو پھر عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ ان کی ہر بات کی تصدیق کی جائے اور ان کی ہر اطلاع پر آمنا و صدقنا کہا جائے اور ان کے ہر حکم کو اللہ کا حکم سمجھ کر اس کی اطاعت کی جائے —— آپ خالص عقل کی روشنی میں غور کیجیے جب کسی ہستی کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اللہ کا پیغمبر ہے تو اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جھوٹا نہیں ہے، مکار نہیں ہے، کسی بیماری یا دھوکہ میں مبتلا نہیں ہے، اس پر اللہ کی وحی آتی ہے اور جو غیبی حقیقتیں ہمارے مشاہدہ اور ادراک کی دسترس سے باہر ہیں ان کے بارہ میں وہ جو کچھ بتلاتا ہے اور جو احکام ہم کو دیتا ہے ان سب کا علم اللہ کی وحی سے اس کو حاصل ہوتا ہے، اب آپ ہی سوچیے کہ یہ سب کچھ مان لینے کے بعد پیغمبر کی کسی دی ہوئی اطلاع میں اس بنیاد پر شک کرنا کہ وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی یا کسی حکم کے بارہ میں اس لیے متردد اور مذبذب ہونا کہ اس کی حکمت اور فلاسفی کو ہم نہیں سمجھتے، کس قدر جاہلانہ اور احمقانہ بات ہے، لیکن آج کل کے بہت سے پڑھے لکھے مدعیانِ عقل جب دین و مذہب کے موضوع پر بات کرتے ہیں تو اسی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

> کسی کو نبی ماننے کے بعد اس کی بات میں شک کرنا کفر سے زیادہ غیر منطقی بات ہے

میرے نزدیک تو اللہ کے کسی سچے پیغمبر کو پیغمبر نہ ماننا اگرچہ کفر ہے لیکن اتنی غیر منطقی بات نہیں ہے جتنی غیر منطقی بات وہ لوگ کرتے ہیں جو کسی ہستی کو نبی و رسول ماننے کے باوجود اس کی باتوں میں شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں، درحقیقت یہ بھی کفر و نفاق ہی کی ایک قسم ہے اور نہایت ہی غیر منطقی اور احمقانہ قسم ہے۔

> اطمینان قلبی کے لیے دلیل یا حکمت دریافت کرنے میں مضائقہ نہیں

ہاں اس میں مضائقہ نہیں کہ ایک شخص پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اور اصولی طور پر اس بات کو قبول کر لینے کے بعد کہ یہ اللہ کے نبی ہیں اور یہ جن باتوں کی خبر دیتے ہیں، اور جو احکام سناتے ہیں وہ سب حق ہیں اور اللہ کی طرف سے ہیں اور میں نے ان سب کو قبول کر لیا، اور مان لیا (تو اس اصولی اور قطعی ایمان کے بعد اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ)، وہ شخص مزید اطمینان اور قلبی انشراح حاصل کرنے کے لیے دین کی ہر بات کو سمجھنے اور ہر حکم کی حکمت جاننے کی کوشش کرے اور اس کے لیے خود غور و فکر کرے یا اس قسم کی کتابیں دیکھے یا ایسے لوگوں سے استفادہ کرے جو اس کے اہل ہوں ——
الحمدللہ ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اللہ کے پیغمبروں نے جو کچھ بتلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ صحیح اور مستند طریقہ سے ہم تک پہونچا ہے وہ بالکل عقل و فطرت کے مطابق ہے اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقل و حکمت کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو، لیکن کیا ہر شخص کے پاس معیاری عقل و حکمت موجود ہے۔

> ہماری عقلوں کی پرواز

ہماری عقلوں کا حال تو یہ ہے کہ جب تک وہ خوردبین ایجاد نہیں ہوئی تھی جس سے پانی کے

جراثیم دیکھے جاتے ہیں اگر اس وقت کوئی ہم سے کہتا کہ پانی کے ایک ایک قطرہ میں ہزاروں زندہ کیڑے ہوتے ہیں تو ہم اس کو گپ سمجھتے۔ اسی طرح اب سے سو دو سو سال پہلے اگر کوئی کہتا کہ ایک ایسی غیر جاندار سواری بھی ہوتی ہو جو سینکڑوں آدمیوں کو سوار کر کے پانچسو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آسمانی فضا میں اُڑتی ہو تو سننے والے اس کو نرا جھوٹ سمجھتے لیکن آج یہ دونوں چیزیں واقعہ بن کر ہمارے سامنے آچکی ہیں، پس جن بچاری عقلوں کا حال یہ ہو کہ چند دنوں بعد جو چیزیں اس دنیا میں سامنے آنے والی ہیں ان کو بھی وہ نہیں سمجھ سکتیں اُن غریب عقلوں کو انبیاء علیہم السلام کی باتوں کے لیے میزان اور معیار بنانا یقیناً حماقت ہو۔

الغرض صحیح اور دانشمندانہ طرز عمل یہ ہو کہ آدمی کسی کو اللہ کا پیغمبر تو خوب دیکھ بھال کے اور جانچ پرکھ کے مانے، لیکن مان لینے کے بعد آنکھ بند کر کے اس کی ہر بات کی تصدیق کرے اور اس کے ہر حکم کو واجب الاطاعت جانے، یہی عقل کا تقاضا ہو اور یہی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہو۔

پیغمبر کی بعض باتوں کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا بھی کفر ہو

اسی لیے وہ شخص مومن نہیں جو اللہ کے پیغمبر کی بعض باتوں کو مانے اور بعض کو نہ مانے پیغمبر کے ہر فیصلہ کا ماننا قرآن شریف میں شرطِ ایمان قرار دیا گیا ہو۔ ارشاد ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (نساء۔ ع ۹)

(اے پیغمبر، تمہارے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں جب تک کہ اپنے اختلافات میں تم کو حکم نہ مانیں اور پھر جب تم کوئی فیصلہ دے دو تو اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی اور ناگواری نہ پائیں اور اس کو بالکل تسلیم کرلیں۔

اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہو:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ (احزاب۔ ع ۵)

اور کسی ایمان والے مرد یا ایمان والی عورت کو جب اللہ و رسول کسی بات کا حکم دیدیں تو ان کو اپنے اس معاملہ میں کوئی اختیار اور حق نہیں رہتا (بلکہ ان کا کام صرف ماننا اور تسلیم کرنا ہو)

بہرحال اس بات کو قرآن پاک میں بھی بار بار بیان کیا گیا ہو اور عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھنے میں آنے والی ہو کہ کسی کو اللہ کا پیغمبر مان لینے کے بعد اس کے ہر حکم اور اس کی ہر دینی بات کا ماننا ضروری ہو ___ اور اس کی کسی بات کا انکار بھی اس کی پیغمبری کا انکار ہو۔

منکرین حدیث کی گمراہی

اس موقع پر اس زمانہ کے بعض لوگوں کی ایک گمراہی کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہو، آپ نے سنا ہوگا کہ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث دین میں حجت نہیں،

یعنی اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہیں، صرف قرآن کا ماننا ضروری ہے، اور بس وہی دینی حجت ہے، دراصل یہ گمراہی نبوت کا مقام نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے، ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بس ایک چٹھی رساں کی طرح سمجھا ہے جس کا کام صرف خط پہونچا دینا ہوتا ہے، ان ظالموں کا خیال ہے کہ دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بس اتنا ہی تھا کہ قرآن ان پر نازل ہوا اور انھوں نے اس کو پہونچا دیا۔ — حالانکہ نبی دین کے بیان میں بھی اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح یہ ایک کام تھا کہ قرآن مجید کو انھوں نے اللہ کے بندوں تک پہونچایا اسی طرح یہ بھی ایک کام تھا کہ قرآن پاک میں جس انسانی زندگی کے صرف اصول بیان کیے گئے ہیں، ان کی تفصیلات اور ان کی عملی صورتیں آپ لوگوں کو بتائیں، مثلاً قرآن پاک میں نماز کا حکم تو سیکڑوں جگہ دیا گیا لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ اور اس کے تفصیلی احکام ایک جگہ بھی نہیں بیان کیے گئے، اسی طرح کھانے پینے میں کیا چیزیں حلال ہیں اور کیا حرام اس کا بھی قرآن پاک میں بہت مجمل اور مختصر بیان فرمایا گیا ہے، مثلاً کتا کھانا جائز ہے یا ناجائز، زمین کے کیڑے مکوڑے کا کھانا حلال ہے یا حرام، قرآن پاک میں اس بارہ میں کوئی صاف اور واضح حکم موجود نہیں ہے، بلکہ مجملاً بس یہ فرمایا گیا ہے کہ

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ —"

ہمارے یہ رسول ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کا حلال ہونا اور گندی چیزوں کا حرام ہونا بیان کرتے ہیں۔

بہرحال اس قسم کی ساری چیزوں کی تفصیل بیان کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مامور اور نائب ہیں۔ اور آپ نے اس قسم کے جو تفصیلی احکام امت کو دیے وہ سب اللہ کی وحی سے اور اس کے دیے ہوئے علم سے دیے، اور آپ کے ان ہی احکام سے اسلامی زندگی کا نقشہ تیار ہوتا ہے، — خود قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام جس طرح "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ" بتایا گیا ہے۔ (جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، اور اللہ کی باتیں اللہ ہی کے الفاظ میں ان لوگوں کو سناتے اور پہونچاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرا کام "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" اور تیسرا کام "يُزَكِّيْهِمْ" بھی بتلایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہ رسول ہماری کتاب کی اور حکمت کی تعلیم بھی دیں گے اور لوگوں کے تزکیہ کا کام بھی کریں گے۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ قرآن مجید ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" یعنی آپ کو یہ کام بھی کرنا ہے کہ جو کتاب ہماری طرف سے لوگوں پر نازل کی گئی ہے آپ ان کے سامنے اس کی تبیین کریں، یعنی اس میں جو چیزیں مجمل چھوڑی گئی ہیں آپ ان کی تفصیل بیان کریں۔

پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کا کام بس قرآن پہونچا دینا تھا اور دینی حجت بس وہی ہے جو قرآن میں ہے اس کے سوا اپنے دین کے لیے ہمیں کسی اور چیز کی یعنی حدیث وسنت کی ضرورت نہیں، وہ دراصل اللہ کی بات يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ" اور "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" سے انکار کرتے ہیں۔

حدیث وسنت کا سارا مستند ذخیرہ دراصل ان ہی آیات کی تفسیر ہو، اور ہم اس ذخیرہ کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کام یعنی کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیہ اور تبیین سے قریب قریب اسی طرح استفادہ کرسکتے ہیں جس طرح صحابہؓ کرام نے کیا تھا۔

علاوہ ازیں اگر اللہ تعالیٰ صرف قرآن ہی بھیجنا چاہتا تھا تو اس کی تو زیادہ بہتر شکل یہ ہوتی کہ آسمان سے ایک صحیفہ آتا اور کعبہ کی چھت پر اتار دیا جاتا، یا کعبہ کی دیواروں سے وہ کلام اہل مکہ کو سنوا دیا جاتا، جس طرح حضرت موسیٰ کو ایک درخت سے سنوایا گیا تھا۔ بلکہ اس سے اہل مکہ زیادہ متاثر ہوتے۔ رسالت کے لیے انسانوں کا انتخاب تو اسی لیے ہوتا ہو کہ "انسان پیغمبر" ہی اللہ کے پیغام کی مراد واضح کرسکتا ہو، اور اس زندگی کی تفصیلات بتاسکتا ہو جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے چاہتا ہو اور وہی اپنی زندگی سے اس کا نمونہ پیش کرسکتا ہو۔

الغرض حدیث وسنت کا انکار کرنے والا طبقہ جو قرآن پاک کا مقدس نام لے کر امت کو دھوکا دیتا ہو، یہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کا مدعی ہو لیکن درحقیقت اس نے مقام نبوت کو سمجھا نہیں ہو اور اس کی بات ایسے لوگوں کو بڑی اچھی اور بڑی آسان معلوم ہوتی ہو جو مسلمان رہنا بھی چاہتے ہیں، مگر شریعت کی پابندیوں سے بھاگتے ہیں، انکار حدیث کے اصول کو مان لینے کے بعد ان کے لیے ہر آوارگی اور ہر نفس پرستی کے جائز ہونے کا راستہ نکل آتا ہو، کیوں کہ قرآن مجید ایمان اور عمل صالح والی اور تقوے والی جس زندگی کا مطالبہ کرتا ہو اس کی تفصیلات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھیں وہ حدیث و سنت ہی سے معلوم ہوتی ہیں۔ قرآن پاک میں تو نماز کی بھی تفصیل نہیں بتلائی گئی ہو۔

دراصل یہ فتنہ بڑا اسلام سوز اور دین کُش فتنہ ہو۔

وحدتِ ادیان کے مبلغین اور حدیث کے منکرین کی مشترک غلطی

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک کے بعض اچھے پڑھے لکھے اور مذہبی خیالات رکھنے والے ہندو صاحبان "وحدتِ ادیان" کے نظریہ کے قائل ہیں اور وہ اپنے اس عقیدہ کی تبلیغ بھی کرتے ہیں کہ نجات کے لیے کسی خاص دین پر چلنا ضروری نہیں بلکہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں اور اس لیے ہر مذہب پر چلنے سے نجات حاصل ہوسکتی ہو، پنڈت سندر لال جی الہ آبادی ان لوگوں میں خاص شہرت اور امتیاز رکھتے ہیں اور میں ان کو ذاتی طور پر بھی کچھ جانتا ہوں، دلوں کا بھید تو اللہ ہی جانتا ہو، لیکن میں اپنی دانست میں ان کو نیک نیت اور نیک دل سمجھتا ہوں، ان کا یہ خاص مشن ہو، وہ مسلمانوں کو خصوصیت سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں، وہ خود ہندو ہوتے ہوئے اور ہندو مذہب کے پابند ہوتے ہوئے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں اور قرآن پاک کو خدا کی کتاب سمجھتے ہیں۔[1] مسلمانوں سے جو چند باتیں وہ خاص طور پر کہا کرتے ہیں

---

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس شریعت کو وہ "اسلامی شریعت" کہتے ہیں (جو مسلمانوں کو دوسرے اہل مذاہب سے جدا کرتی ہے) ـــــ وہ قرآن میں نہیں ہے، حتیٰ کہ جو نماز مسلمان پڑھتے ہیں وہ بھی قرآنی نہیں ہے، بلکہ غیر قرآنی ہے، قرآن میں صرف "صلوٰۃ" کا حکم ہے اور اگر کوئی مندر میں بیٹھ کر ایشور کا دھیان کرتا ہے یا پرارتھنا کرتا ہے تو وہ بھی صلوٰۃ کے قرآنی حکم پر عمل کرنے والا ہے۔ ـــــ عجب زمانہ ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی اور سکھلائی ہوئی نماز اور آپ کی لائی ہوئی شریعت سے مسلمانوں کو توڑنے کے لیے اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن ہی کو استعمال کیا جاتا ہے۔

دراصل مسلمانوں میں منکرین حدیث وسنت اور ہندوؤں میں پنڈت سندر لال جی جیسے حضرات کی غلطی کی بنیاد ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ یہ دونوں گروہ مقام نبوت سے ناآشنا ہیں اور دونوں کی بات ماننے کا نتیجہ یہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے اصولی مطالبوں کے ادا کرنے کی جو تفصیلی شکل اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کو بتلائی ہے (جو حدیث وسنت ہی سے معلوم ہوتی ہے اور جس سے اسلامی زندگی کی عمارت مکمل ہوتی ہے) اس سے خدانخواستہ مسلمان ہٹ جائیں ـــــ

اس وقت کی میری گفتگو کا موضوع دراصل یہ فتنے اور یہ مسئلے نہیں تھے، میں تو عقائد اور ایمانیات کے سلسلہ میں نبوت اور رسالت پر گفتگو کر رہا تھا، اور یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی کو نبی ماننے کے بعد اس کی ہر اس بات کا تسلیم کرنا از روئے ایمان اور از روئے عقل بھی ضروری ہو جاتا ہے جو وہ اللہ کے دیے ہوئے خاص علم سے ہم کو بتلائے ـــــ اس سلسلہ میں منکرین حدیث کا، اور پھر ان کی وجہ سے "وحدت ادیان" والوں کا یہ تذکرہ زبان پر آگیا، اور اچھا ہوا کہ آگیا، اس کی بھی ضرورت تھی ـــــ اب میں پھر اپنے اصل موضوع پر آتا ہوں۔

اب تک جن تین عقیدوں پر میں نے گفتگو کی یعنی توحید، آخرت، رسالت، یہ "امہات العقائد" (یعنی بنیادی عقیدے) کہلاتے ہیں۔

امہات العقائد کی خصوصیت

اگرچہ ان کے علاوہ اور بھی چند ایسے اہم عقیدے ہیں جن پر ایمان لانا اور یقین کرنا مسلمان ہونے کی شرط ہے، لیکن ان تین عقیدوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس زندگی کا

(حاشیہ صفحہ ۵۶) ؎ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی ہے لیکن جو شخص نبوت اور پیغمبری کی حقیقت نہ جانتا ہو اس سے کچھ مستبعد نہیں، گاندھی جی جیسے بڑے آدمی بھی اس غلطی میں اسی وجہ سے مبتلا تھے کہ وہ اپنی ساری مہاتمائی تبدیلیوں کے باوجود نبوت کی حقیقت اور مقام نبوت سے آشنا نہیں تھے ان کے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دل سے رسول ماننے میں اور ہندو مذہب کے مطابق زندگی گزارنے میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ وہ نبی کی لائی ہوئی شریعت کا اتباع ضروری نہیں سمجھتے تھے، بہرحال مقام نبوت نہ جاننے ہی کا یہ نتیجہ تھا۔"

پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے ہیں، اس کا پورا نظام ان ہی تین بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور وہی شخص اس زندگی کو اپنا سکتا ہے جو ان تین بنیادی باتوں کو تسلیم کرلے، گویا اسلامی نظام زندگی کی یہ تین فکری اور اعتقادی بنیادیں ہیں، اسی لیے دین میں ان کی خاص اہمیت ہے۔ اور اسی واسطے ان کو "امہات العقائد" کہتے ہیں۔ الحمدللہ ان تینوں کا بیان اچھی خاصی تفصیل سے ہوگیا۔

باقی عقائد اب ان کے علاوہ باقی عقائد کے متعلق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں —— میں پوری تفصیل سے ابھی بتلا چکا ہوں کہ کسی کو نبی و رسول ماننے کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر اس بات پر ایمان لایا جائے جو وہ اللہ کی طرف سے بتلائے اور اس کی کسی ایک بات کا انکار بھی اس کی نبوت کا انکار اور کفر ہے، اس لیے ہر اس حقیقت پر یقین کرنا اور اس پر عقیدہ رکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، جس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ البتہ جن مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک زمانہ نہیں پایا اور آپ کی دینی تعلیم ان کو بالواسطہ پہونچی (جیسا کہ ہمارا حال ہے) ان کے لیے یہ حیثیت صرف ان ہی تعلیمات اور ان ہی عقائد کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے قطعی اور یقینی طریقہ سے ثابت ہیں جس میں کسی شک و شبہ کی اور کسی احتمال کی گنجائش نہیں، اور ہر دور میں ان کی شہرت بھی اتنی عام رہی ہے کہ دین سے معمولی واقفیت رکھنے والے عوام بھی ان سے واقف رہے ہیں —— اور جن چیزوں کی قطعیت اور شہرت اس درجہ کی نہیں ہے (اگرچہ ان کا ثبوت ہمارے لیے قابل اطمینان ہو) تو ان کی حیثیت اور ان کا حکم یہ نہیں ہے، یعنی ان کا انکار کرنا بھی اگرچہ ایک درجہ کی گمراہی ہے، لیکن کفر نہیں ہے۔

عقائد کی دو قسمیں جب یہ اصولی بات آپ نے سمجھ لی تو خود بخود یہ بھی آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عقائد دو قسم کے ہیں، یا یوں کہیے کہ دو درجے کے ہیں ——

ایک وہ جن کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا قطعی اور یقینی ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور ہر دور میں ان کو ایسا تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہے کہ اس کی وجہ سے ان میں کسی تاویل کی بھی گنجائش نہیں۔

دوسرے وہ جن کا ثبوت اگرچہ قابل اطمینان اور پکا ہے لیکن اس درجہ کی قطعیت اور ایسا تواتر ان کو حاصل نہیں ہے جس کے بعد کسی احتمال اور تاویل کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

امہات العقائد یعنی توحید، رسالت، قیامت آخرت پہلی قسم کے عقیدے ہیں، ان کے علاوہ قرآن مجید کا کتاب اللہ ہونا، آخرت میں جنت اور دوزخ کا ہونا، فرشتوں کا ایک مستقل مخلوق ہونا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دنیا میں بہت سے نبیوں کا آنا اور آپ کا خاتم النبیین یعنی سب سے آخری نبی ہونا اور سلسلۂ نبوت کا آپ پر ختم ہو جانا، یہ سب بھی اسی درجے کے عقیدے ہیں کہ ان کا ثبوت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی

یقینی اور قطعی ہو جیسا کہ توحید، رسالت، اور قیامت کا اور ان کو اُسی درجہ کا تواتر اور ہر دور میں اسی قسم کی عام شہرت امت میں حاصل رہی ہو، اس لیے ان سب باتوں کا حکم بھی یہی ہو کہ ان میں سے کسی ایک بات کا انکار کر کے بھی آدمی مسلمان نہیں رہ سکتا، اگرچہ اس کا یہ انکار کسی تاویل سے ہو ـــــ

ضروریات دین

جن چیزوں کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درجہ کا ہو، اہل علم کی خاص اصطلاح میں ان کو "ضروریات دین" کہتے ہیں، یعنی وہ دینی باتیں اور دینی حقیقتیں جن کا تعلیم رسول ہونا بالکل یقینی اور قطعی ہو اور ان کو ہر دور میں ایسا تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہو کہ ان میں کسی تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو۔

دوسرے درجے کے عقائد

دوسرے درجے کے عقائد کی مثال میں، عذاب قبر، اور قیامت اور آخرت کی بعض تفصیلات مثلاً میزان، صراط، شفاعت، رویتہ باری تعالیٰ وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے ـــــ قیامت سے پہلے دجال کے ظہور اور حضرت مسیح کے نزول اور الامام المہدی کی آمد اور اسی طرح بعض اور علامات قیامت کا درجہ بھی یہی ہے، یعنی ان کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگرچہ قابل اطمینان اور پکا ہے لیکن "ضروریات دین" کے معیار کا نہیں، اسلیے کسی شبہ یا کسی تاویل کی بنیاد پر ان میں سے کسی چیز کا انکار کرنا اگرچہ ایک درجہ کی گمراہی ہے لیکن اس کو کفر یا ارتداد نہیں کہا جا سکتا۔

بیان عقائد ہی کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی بیان کرنا چاہتا ہوں۔

امت میں اختلاف عقائد کا آغاز

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان عقائد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن ان ہی کے زمانہ میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے جو بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ اپنے ساتھ اپنے پرانے خیالات اور اپنا طرز فکر بھی لے کر آئے اور ان سب کے خیالات کی پوری اصلاح اور تصحیح نہیں ہو سکی (اور اس عالم اسباب میں یہ ممکن بھی نہیں تھا) بس اُن ہی عقائد کا اور طرز فکر کا وہ اصولی اختلاف شروع ہوا جس نے امت میں بہت سے فرقے پیدا کیے۔ فروع میں اور غیر اہم مسائل میں رائے اور تحقیق کا اختلاف ایسی چیز نہیں ہے جس سے فرقہ بندی پیدا ہو، بلکہ یہ تو ناگزیر اور قدرتی ہے۔ فرقے جس اختلاف سے بنتے ہیں وہ عقائد اور اصول کا اختلاف ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صحابۂ کرام میں بالکل نہیں تھا، اپنے عقائد اور اپنے طرز فکر کے لحاظ سے وہ سب ایک جماعت تھے، پھر بعد میں جو فرقے پیدا ہوئے اگرچہ وہ بے گنتی ہیں لیکن اصولی طور پر ہم ان کو "اہل السنۃ والجماعۃ" اور "غیر اہل السنۃ والجماعۃ" کہہ سکتے ہیں۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا اصول

"اہل السنۃ والجماعۃ" کا امتیاز یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو دین کی اصل واساس ماننے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یعنی آپ کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل کو اس کی

شرح اور اس کے اجمال کی تفصیل سمجھتے ہیں، اور جو چیزیں قرآن مجید میں بیان نہیں کی گئی ہیں اور سنت میں ان کا بیان ہو، اُن کے نزدیک وہ بھی واجب الاتباع اور جزو دین ہیں ـــــ اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی یہ حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ جماعتِ صحابہ کی یہ حیثیت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب و سنت کا جو منشا انھوں نے سمجھا اور جن امور پر ان کا اجماع ہو گیا وہ بھی واجب الاتباع ہیں اور کسی مسلمان کو حق نہیں ہو کہ انکے اجماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کے خلاف اپنی کوئی رائے رکھے ـــــ دین کی کسی حقیقت اور کسی مسئلہ پر صحابۂ کرام کے اجماع و اتفاق کے معنی اہلسنت کے نزدیک یہ ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل قطعی ہو اور اس سے اختلاف کرنا ضلالت ہو، کیونکہ دین جس ماحول اور جس فضا اور جن حالات میں آیا اور جس زبان میں آیا، صحابۂ کرام یقیناً اس کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، پھر انھوں نے دین براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا اور آپ کی صحبت اور تربیت سے مستفیض ہوئے اس لیے کوئی بھی ان سے زیادہ دین کا عارف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی روح اور منشا کو سمجھنے والا نہیں ہو سکتا، پس دین وہی ہو جو انھوں نے سمجھا، الغرض "اہل السنۃ والجماعۃ" دین کی کسی حقیقت اور کسی مسئلہ پر صحابۂ کرام کے اجماع اور اتفاق کو فیصلہ کن چیز سمجھتے ہیں جس سے اختلاف کرنے کی ان کے نزدیک کسی کو گنجائش نہیں، بس یہ ہو اصولی مسلک "اہل السنۃ والجماعۃ" کا، بلکہ ان کو "اہل السنۃ والجماعۃ" اسی لیے کہا جاتا ہو کہ انھوں نے کتاب اللہ کے بعد سنت اور جماعت صحابہ کی دین میں اتنی اہمیت تسلیم کی ہو اور اپنے کو ان کا اتنا پابند بنا دیا ہو۔

دوسرے فرقے باقی دوسرے فرقوں کا حال یہ ہو کہ وہ سنت کو اور جماعت صحابہ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ ـــ ان فرقوں میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے دو فرقے خوارج اور روافض ہیں ـــــ روافض کی اگرچہ بہت سی شاخیں ہیں، لیکن اتنی بات قریباً سب میں مشترک ہو کہ دین کے معاملہ میں صحابۂ کرام اُن کے نزدیک قطعاً قابل اعتماد نہیں، بلکہ ان کے اکثر فرقے تو جمہور صحابہ کو معاذ اللہ منافق اور مخرب دین سمجھتے ہیں، اور جو مقام سنت کا ہونا چاہیے وہ اُن کے نزدیک ان کے ائمہ کے اقوال و افعال کا ہو، بلکہ واقعۃً ان کے سارے مذہب کی بنیاد ان کے ائمہ کی روایات ہی پر ہو۔ ان کے بعض فرقوں کے نزدیک تو قرآن مجید بھی مشکوک اور ناقابل اعتماد ہے، اس لیے ان کے نزدیک دین کا ماخذ ان کے ائمہ کی روایات ہی ہیں ـــــ

اور خوارج کا حال یہ ہو کہ وہ قرآن مجید کو تو دین کا بالکل محفوظ اور قطعی ماخذ مانتے ہیں، اور سنت کی اہمیت بھی انکے نزدیک قریب قریب ویسی ہی ہو جیسی کہ اہل السنہ کے نزدیک ہو، لیکن صحابۂ کرام کے اجماعی فیصلوں کا اتباع جس طرح اہل السنہ ضروری سمجھتے ہیں وہ نہیں سمجھتے۔ گویا ان کے نزدیک یہ ہو سکتا ہو کہ دین کی کسی حقیقت کو اور قرآن و سنت کی کسی بات کو سمجھنے میں صحابۂ کرام کی پوری جماعت غلطی کر جائے، اور بعد والے اس کو صحیح سمجھیں،

لیکن اہل سنت اس خیال کو گمراہی بلکہ سینکڑوں گمراہیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔

روافض اور خوارج کے بعد اسلام کے اسی ابتدائی دور میں اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہوئے، مثلاً معتزلہ، جہمیہ، مرجیہ، قدریہ، جبریہ وغیرہ ——— میں نے جہاں تک سمجھا ہو اہل السنۃ والجماعت کے اور ان کے تمام اختلافات کی اصل بنیاد یہی ہو کہ اہل السنۃ ظاہر کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نصوص کو اپنی ناقص عقل اور رائے کے مطابق کرنے کے لیے ان میں تاویلیں نہیں کرتے اور صحابۂ کرام کے اجتماع اور اتفاق کو دین کے بارہ میں قطعی سند اور واجب الاتباع مانتے ہیں ——— اور یہ دوسرے فرقے اپنی عقل و رائے کو اور اپنی صوابدید کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے کتاب وسنت کے نصوص میں بھی تاویلیں کرتے ہیں، اور صحابۂ کرام کے اجتماعی مسلک سے اختلاف کرنے میں بھی انھیں کوئی دریغ نہیں ہوتا ——— گویا ان دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں اہل السنۃ کا امتیاز اور ان کی خصوصیت یہ ہو کہ انھوں نے "ما انا علیہ واصحابی" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابۂ کرام کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑا ہو، وہ اس کے مقابلہ میں اپنی عقل اور رائے کی اور دنیا کے قیل وقال کی پروا نہیں کرتے ——— بہرحال اہل السنۃ والجماعت اور ان دوسرے فرقوں کے درمیان عقائد اور خیالات میں جتنے بھی اختلافات ہیں وہ سب طرز فکر کے اسی بنیادی فرق کا نتیجہ ہیں۔

میں مثال کے طور پر اہل السنۃ کے اور ان فرقوں کے بعض اختلافی مسائل کا بھی ذکر کرتا ہوں اس سے طرز فکر کا یہ بنیادی فرق ان شاء اللہ اور زیادہ کھل کر آپ کے سامنے آجائے گا۔

مرتکبِ کبیرہ کے بارہ میں اختلاف اور اس کی بنیاد

خوارج کا مشہور مسئلہ ہو کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی کافر قطعی کافر ہو جاتا ہو اور آخرت میں اس کا انجام بالکل وہی ہو گا جو کافروں کا ہونے والا ہو، ان کے اس مسئلہ کی بنیاد کتاب و سنت کے بعض ان نصوص پر ہو جن میں بعض کبیرہ گناہوں پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہو یا "لا ایمان" یا "لیس منا" یا "لا سہم فی الاسلام" جیسے الفاظ فرمائے گئے یا لعنت یا عذاب نار کی وعید وارد ہوئی ہو۔

ان کے مقابلہ میں دوسرا فرقہ مرجیہ ہو جو کہتا ہو کہ آخرت کے عذاب سے بچنے کے لیے صرف ایمان کافی ہو ایمان لانے کے بعد اگر کوئی شخص عمر بھر کبیرہ گناہ کرتا رہے تو دوزخ میں نہیں جائے گا، بس اتنا ہی ہو گا کہ گناہ نہ کرنے والے اہل ایمان کے مقابلہ میں اس کا مقام اور درجہ کچھ کم ہو گا ——— یہ لوگ ان نصوص سے استدلال کرتے ہیں جن میں صرف ایمان پر جنت کی بشارت دی گئی ہو، اور ان کے خلاف جو نصوص ہیں اُن سب کی تاویل کرتے ہیں، اسی طرح خوارج ان نصوص کی تاویل کرتے ہیں جو ان کے مسلک کے خلاف ہیں، اور جن سے معلوم ہوتا ہو کہ گناہ کبیرہ کرنے سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا۔

لیکن اصل بات یہ ہو کہ ان دونوں فرقوں کے جو پیشرو تھے جن سے ان کا سلسلہ شروع ہوا ہو، اس مسئلہ میں

ان کا اپنا اپنا ایک خیال اور رجحان تھا، خوارج کا رجحان بعض خاص تاریخی اسباب کی بنا پر اس طرف تھا کہ گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کو کفر قرار دیا جائے اور مرتکبینِ کبائر کو کافروں میں شمار کیا جائے، اور مرجیہ کے پیشرؤں کا رجحان یہ تھا کہ ایمان کے بعد گناہ کو (اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو) بہت ہلکی اور معمولی بات سمجھا جائے۔ پس جو نصوص جس فرقہ کو اپنے رجحان اور اپنے خیال کے مطابق نظر آئے ان کو تو انھوں نے اپنی سند بنا لیا، اور جو خلاف نظر پڑے ان کا یا تو کسی بنیاد پر انکار کر دیا یا اُن میں تاویل کر ڈالی —

اور اہلسنت نے بجائے یہ طرز اختیار کرنے کے اپنے اصول کے مطابق یہ دیکھا کہ صحابۂ کرام نے اس مسئلہ کو کس طرح سمجھا اور اُن کا مسلک اس بارہ میں کیا تھا؟ بس اسی کو انھوں نے اختیار کر لیا، اور وہ یہ تھا کہ کبائر کا ارتکاب نہ تو بالکل کفر ہے جس کی وجہ سے آدمی اسلام سے بالکل نکل جاتا ہو جیسا کہ خوارج کہتے ہیں اور نہ ایسی ہلکی اور معمولی بات ہے جیسا کہ مرجیہ کا خیال ہے بلکہ وہ موجب عذاب اور موجب لعنت ہے لیکن اگر اللہ چاہے تو معاف ہو سکتا ہے بس اسی کو اہل السنۃ والجماعۃ نے اختیار کر لیا، اور اس باب کے تمام نصوص کا مطلب وہی قرار دیا جو صحابۂ کرام نے سمجھا تھا۔

مسئلہ رویت باری تعالیٰ

دوسرا مسئلہ جس کا میں بطور مثال ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا مسئلہ ہے، صحیح احادیث میں اس کا صاف صاف ذکر آیا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان والوں کو بشارت سنائی ہے کہ جنت میں ان کو دوسری نعمتوں کے علاوہ حق تعالیٰ کا دیدار بھی نصیب ہوگا اور اہل ایمان کے لیے یہ نعمت جنت کی باقی سب نعمتوں سے زیادہ خوش کن اور لذت بخش ہوگی — قرآن مجید میں بھی ایک جگہ فرمایا گیا ہے "وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" یعنی اس دن کچھ چہرے تروتازہ اور بارونق اور اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔" جس کا ظاہر مطلب یہی ہے کہ آخرت میں اللہ کے اطاعت شعار بندوں کے چہرے روشن اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور ان کو جمالِ حق کے نظارہ کی دولت نصیب ہوگی۔

معتزلہ کے انکار کی بنیاد

معتزلہ جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین کے بارہ میں عقل پر اس سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں جتنا کہ وہ بیچاری اٹھا سکتی ہے اور وہ ہر دینی حقیقت کو اپنی عقل سے سمجھ لینے کے بعد ماننا چاہتے ہیں، چونکہ رویت باری کا مسئلہ ان کی سمجھ میں نہیں آسکا اور ان کی عقلوں نے اس سے انکار کیا اس لیے وہ اس کے منکر ہوگئے۔ ان کے انکار کی اصل بنیاد دراصل ان کا یہ عقلی شبہ ہے کہ آنکھوں سے تو جسم اور رنگ اور سطح رکھنے والی کسی ذاتی چیز ہی کو دیکھا جا سکتا ہے اور اس کو بھی جب دیکھا جا سکتا ہے جب کہ وہ آنکھ کے سامنے کی جانب ہو اور اتنے فاصلہ پر ہو کہ وہاں تک ہماری نگاہ کام کر سکے، حق تعالیٰ جو مادہ سے اور مادہ کے تمام خواص سے منزہ ہیں۔ اور کسی مکان اور کسی سمت میں نہیں ہیں بلکہ لامکان اور وراء الوراء ہیں ان کو آنکھ سے کیونکر دیکھا جا سکتا ہے — بہرحال معتزلہ نے رویت باری کے مسئلہ کو عقل سے نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اس کا انکار کر دیا، اور نصوص کی تاویلیں کیں اور ان کے

مختلف جوابات دیے ۔ اور یہی راہ شیعوں نے اختیار کی ۔

اہلِ سنت کے اثبات کی بنیاد

لیکن اہلِ سنت نے جب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث صحیحہ میں اس کی صاف صاف بشارت دی ہے اور صحابہ کرام نے ان نصوص سے یہی سمجھا ہے کہ اہلِ ایمان کو جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا اور یہی ان حضرات کا عام عقیدہ ہے تو اہلِ سنت نے اسی کو اختیار کر لیا، اور معتزلہ جیسے عقل پرستوں کے عقلی شبہات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ــــ بس یہی ہے اہل السنۃ والجماعۃ اور دوسرے فرقوں کے طرزِ فکر کا بنیادی فرق ۔

اس سے آپ کو یہ وسوسہ نہ ہو کہ اہل السنۃ کا مذہب خلافِ عقل ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل السنۃ والجماعت کا ایک عقیدہ اور ایک مسئلہ بھی عقل کے خلاف نہیں ہے ، الحمد للہ متکلمین اہلِ سنت نے اسی وسوسہ کے دور کرنے کے لیے ایک ایک مسئلہ کی معقولیت بھی نہایت روشن دلائل سے ثابت کر کے دکھا دی ہے ۔

اسی رویتِ باری کے مسئلہ کو دیکھیے ، اہلِ سنت نے اس کے منکرین اہلِ اعتزال اور اہلِ تشیع کے عقلی شبہات کے ایسے نفیس جوابات دیے ہیں کہ عقلِ سلیم بالکل مطمئن ہو جاتی ہے ۔ اگر کسی کو اس مسئلہ کی تفصیلی بحث دیکھنی ہو تو ردِ شیعہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مشہور کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" میں دیکھ لی جائے ، یا مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلویؒ کی کتاب "عقائد الاسلام" کا مطالعہ کر لیا جائے ــــ اس سلسلہ میں ایک مختصر سی بات میں یہاں بھی ذکر کیے دیتا ہوں تاکہ آپ میں سے کسی کے دل میں اگر کوئی خلجان ہو تو اس کا ازالہ ہو جائے ۔

معتزلہ کے عقلی شبہ کا جواب

معتزلہ کے عقلی شبہ کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ اس دنیا میں کسی چیز کو دیکھنے کا جو طریقہ اور جو قانون ہے اور اس کے جو شرائط ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کو دیکھنا ان کے بغیر ممکن ہی نہیں ، حالانکہ یہ بنیاد ہی سرے سے غلط ہے ، خود معتزلہ بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے ۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو دیکھتے ہیں ، مادی کو بھی اور غیر مادی کو بھی اور چونکہ اللہ تعالیٰ خود لامکان ہیں اس لیے کسی مخلوق کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محاذاۃ میں یعنی اس کے سامنے اور اس کی سیدھ میں ہے ، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ سب کو دیکھتے ہیں ۔ پس معلوم ہوا کہ معتزلہ رویت کے جس قانون کو قانونِ کُلّی سمجھتے ہیں وہ دراصل کُلّی نہیں ہے ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو محدود قوتِ بینائی اس دنیا میں ہماری آنکھوں کو دی گئی ہے ، اس کا یہ حال ہے کہ وہ عام طور سے صرف مادی چیزوں کو دیکھتی ہے اور وہ بھی جب کہ وہ ہمارے سامنے ہوں اور ایک محدود فاصلہ پر ہوں ــــ پس اس بنیاد پر آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا انکار کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے ، کیونکہ وہاں اہلِ جنت کی تمام قوتوں میں ہزاروں لاکھوں گنا اضافہ ہوگا ، پس وہاں قوتِ بینائی بھی وہ بخشی جائے گی جو حق تعالیٰ کے دیدار کی بھی لذت لے سکے ۔

اسی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تدبیروں سے اور خوردبین اور دوربین جیسے آلات کی مدد سے اب وہ چیزیں دیکھ لی جاتی ہیں جن کو دیکھنے کا لوگ پہلے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، پس اس میں کچھ بھی استبعاد نہیں کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو وہ قوت بینائی نصیب فرمادیں جس سے حق تعالیٰ کی بھی رویت ہو سکے۔ بہرحال معتزلہ وغیرہ نے جس عقلی شبہ کی بنا پر رویت باری کے مسئلہ سے انکار کیا تھا اس میں پہلے بھی کوئی جان نہیں تھی، اور اب اس زمانہ کی نئی ایجادوں اور نئے انکشافات نے تو اس قسم کے تمام احمقانہ شبہات کا خاتمہ کر دیا ہو، آج ایسی ہزاروں چیزیں بازاروں میں دُکان دُکان بک رہی ہیں جن کا اگر کوئی شخص اب سے ۵ سو برس پہلے ذکر کرتا تو لوگ بالکل ناممکن سمجھتے ـــ میں کہا کرتا ہوں کہ اب اس زمانہ میں کسی دینی حقیقت کے متعلق کسی کا یہ کہنا کہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتی اس لیے ہم اس کو نہیں مانتے، اپنی انتہائی بے عقلی کا اعلان کرنا ہو۔ ـــ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا تھا۔ "سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ" (ہم ان کو آفاق میں اور خود اُن کے اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے) ہمارے اس زمانہ کی ایجادات نے سینکڑوں ان شئوں کا سمجھنا لوگوں کے لیے آسان کر دیا ہو جن کو لوگ اپنی حماقت سے خلاف عقل سمجھا کرتے تھے۔

بات اپنی جگہ سے بہت دور چلی گئی، میں آپ حضرات کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا، کہ معتزلہ وغیرہ نے رویت باری کا انکار صرف اس لیے کیا کہ ان کی عقل اس کے سمجھنے سے قاصر رہی اور اہلِ سنت نے صرف یہ دیکھ کر اس کو مان لیا اور بطور عقیدہ کے قبول کر لیا کہ ظاہر نصوص سے انھوں نے یہی سمجھا، اور صحابۂ کرام کو انھوں نے اسی عقیدہ پر پایا۔

مسئلہ جبر و قدر اسی طرح قدریہ اور جبریہ نے جبر و قدر کے مسئلہ میں اپنے رجحانات اور اپنے عقلی قیاسات کی بنا پر قدر یا جبر کا مسلک اختیار کیا، اور جن نصوص کو انھوں نے اپنے خیال اور اپنے رجحان کے کچھ موافق سمجھا ان کو اپنے اس عقیدہ کی سند بنایا۔ اور جو نصوص صراحۃً ان کے خلاف تھے ان کا یا تو کسی حیلہ سے انھوں نے انکار کیا یا ان میں تاویلیں کیں، لیکن اہلِ سنت نے ظواہر نصوص اور صحابۂ کرام کے مسلک کی تقلید کی، انھوں نے دیکھا کہ صحابۂ کرام دنیا کی ہر چیز کو اور بندوں کے بھی تمام احوال اور اعمال کو اللہ کی قضا و قدر سے مانتے ہیں اور بندہ کو اپنے اعمال میں صاحبِ ارادہ ماننے کے باوجود مختار مطلق نہیں مانتے، جیسا کہ قدریہ کہتے ہیں اور نہ اس کو جمادات اور نباتات کی طرح مجبور محض مانتے ہیں جیسا کہ جبریہ کا خیال ہو، پس اسی کو انھوں نے اپنا مسلک اور عقیدہ بنا لیا اور اس سلسلہ کے تمام نصوص کا مطلب وہی قرار دیا جو صحابۂ کرام نے سمجھا تھا۔ اور وہی ظاہر مطلب بھی تھا۔

الغرض دوسرے تمام فرقوں کے مقابلہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کا امتیاز اور ان کا شعار یہی ہو کہ وہ صحابۂ کرام کے اجتماعی مسلک کو واجب الاتباع سمجھتے ہیں اور اُن کا بنیادی اُصول یہی ہو کہ دین کی جس حقیقت کو اور کتاب و

سنت کی جس بات کو صحابۂ کرام کی جماعت نے جس طرح سمجھا اور مانا اور ان کے درمیان اس میں اختلاف رائے نہیں ہوا اس کو اسی طرح سمجھنا اور ماننا ضروری ہو اور کسی کیلیے اسمیں اختلاف رائے کی اور نئے سرے سے اس پر غور کرنے کی گنجائش نہیں ہو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایک مکتوب میں طریقۂ اہل سنت کی وضاحت

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مکتوب میں جس کو محدثین نے سند کے ساتھ روایت کیا ہو اہل السنۃ کے اس مسلک کی بڑی واضح ترجمانی کی ہو، کسی شخص نے اسی قضا و قدر کے مسئلہ کے متعلق ان سے سوال کیا تھا — آپ نے جواب میں پہلے تو تقویٰ اور اللہ ورسول کی اطاعت اور سنت کے اتباع والتزام کی تاکید فرمائی اور اس کے بعد تحریر فرمایا:۔

"فَارْضَ لِنَفْسِكَ مَا رَضِيَ بِهِ الْقَوْمُ لِاَنْفُسِهِمْ فَاِنَّهُمْ عَلٰى عِلْمٍ وَقَفُوْا وَبِبَصَرٍ نَافِذٍ كَفُّوْا وَلَهُمْ عَلٰى كشف الامور كانوا اقوىٰ وَبِفَضْلٍ مَا كانوا فيه اولىٰ فَاِنْ كان الهدىٰ ما انتم عليه لقد سبقتموهم اليه"

"مطلب یہ ہو کہ صحابہ کرام کی جماعت نے اپنے لیے جو خیال اور عقیدہ پسند کیا اور جس کو انھوں نے اپنایا تم بھی اسی کو اپنے لیے پسند کرو اور اس کو اپنا مسلک بناؤ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم لائے تھے صحابۂ کرام اس سے پوری طرح واقف تھے اور دین کے بارہ میں انھیں وہ گہری بصیرت حاصل تھی جس سے ہر مسئلہ کی تہ تک پہونچتے تھے، اور دینی حقیقتوں کے سمجھنے پر وہ ہم تم سے زیادہ قادر تھے اور دین کے علم وفہم میں وہ دوسروں سے بہت زیادہ فضیلت رکھتے تھے — پھر بھی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنے اس خیال میں جو تم نے صحابۂ کرام کے خلاف قائم کیا ہو، تم راہ راست پر ہو تو گویا اس کے مدعی ہو کہ تم دین میں صحابۂ کرام کی پوری جماعت سے آگے بڑھ گئے ہو۔ ظاہر ہو کہ یہ کس قدر احمقانہ اور گمراہانہ بات ہو"

اس کے بعد چند سطروں میں نفس مسئلہ کو بیان فرمایا ہو جس کا خلاصہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی حدیثوں میں مسئلہ تقدیر کو بیان فرمایا ہو اور صحابۂ کرام نے آپ ہی سے اس عقیدہ کو لیا، اور آپ کی حیات میں آپ کے سامنے اور آپ کی وفات کے بعد بھی ان کا عقیدہ اور ان کا یقین رہا۔ اور وہ اسی کو دوسروں کے سامنے بیان کرتے رہے، اور کتاب اللہ سے بھی انھوں نے یہی سمجھا ہو کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہو اور ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ سب پہلے سے اللہ کے علم میں ہو اور لوح محفوظ میں مکتوب ہو اور تقدیر الٰہی اس کا فیصلہ کر چکی ہو" — یہ سب لکھنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

وَلَئِنْ قلتم لِمَ انزل الله آية كذا ولم قال كذا؟ لقد قرأوا منه ما قرأتم وَعَلِمُوْا مِنْ تاويله ما جهلتم وقالوا بعد ذالك

بِحِلَّه مکتاب وقدرہ۔

"مطلب یہ ہو کہ اگر تم قرآن مجید کی بعض آیات کو اس کے خلاف پا رہے ہو، اور اپنی دانست میں تم ان آیتوں کو مسئلہ تقدیر کے خلاف سمجھتے ہو تو یہ تو سوچو کہ یہ سب آیتیں قرآن مجید میں صحابہ کرام نے بھی پڑھی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور آپ کے فیض صحبت سے وہ قرآن کو تم سے بہتر سمجھنے والے تھے، اس کے باوجود وہ اس مسئلہ تقدیر کے قائل ہوئے تو پس اس سے تمہیں خود سمجھ لینا چاہیے کہ تم ان آیتوں کا مطلب سمجھنے میں غلطی کھا رہے ہو۔"

پس اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک اور ان کا بنیادی اصول بالکل یہی ہو جو حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مکتوب میں بیان فرمایا ہو، یعنی دین کے بارے میں جماعت صحابہ پر پورا اعتماد کرنا اور ان کے مقابلہ میں اپنے علم و فہم کو ناقص اور نارسا سمجھتے ہوئے ان کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کی پوری پوری تقلید کرنا ۔۔۔ اس طریقہ میں بڑی سلامتی اور بڑی احتیاط ہو، اور جمہور امت کا مسلک یہی رہا ہو اور یہی وہ صحیح مسلک ہو جس کو حدیث شریف میں "ما انا علیہ واصحابی" فرمایا گیا ہو۔

سلف صالحین کے اتباع ہی میں فتنوں سے حفاظت ہو

دراصل بعد والوں کے لیے خیریت اسی میں ہو کہ وہ اپنے سلف صالحین کا اتباع کریں جب آدمی اس سے آزاد ہو جاتا ہو تو شیطان اس کو آسانی سے کسی گمراہی اور فتنہ میں مبتلا کر سکتا ہو، جن لوگوں نے سلف صالحین کا دامن مضبوطی سے تھام لیا، وہ ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہے، اور جنھوں نے اپنی عقل اور اپنے فہم و علم پر زیادہ بھروسہ کیا اور سلف کے اجماعی فیصلوں کی بھی پابندی ضروری نہ سمجھی وہ شیطان کا شکار ہو گئے ۔۔۔ جتنے گمراہانہ خیالات اور گمراہ فرقے پہلے پیدا ہوئے، یا اب ہمارے زمانے میں پیدا ہو رہے ہیں وہ سب سلف صالحین کے مقابلہ میں اپنے علم و فہم پر زیادہ اعتماد کرنے اور ان کے اتباع سے اپنے کو آزاد سمجھنے ہی کا نتیجہ ہیں ۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگان اہل سنت کو جزائے خیر دے، انھوں نے اس راز کو خوب سمجھا، اور صحابۂ کرام اور ان کے طریقہ پر چلنے والے سلف صالحین کے اتباع کو اتنی اہمیت دے کر جمہور امت کو شیطان کے جال میں پھنسنے سے بچا لیا۔

اس زمانہ میں سلف صالحین کا اتباع ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہو

خاص کر ہمارے اس زمانہ میں جب کہ آزاد خیالی کی وبا عام ہو اور بہت سے لوگ صرف اردو کے رسالے پڑھ پڑھ کر دین کے بارہ میں بالکل مجتہدانہ بلکہ آزادانہ طور پر غور کرنے کا اپنے کو حقدار سمجھنے لگتے ہیں تو اس وقت تو ہمیشہ سے زیادہ اتباع سلف کے اس اصول

۵۔ ابوداؤد "کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ"

پر مضبوطی سے جمنے کی اور دوسروں کو جمانے کی ضرورت ہو، ہر فتنہ اور ہر گمراہی سے اس میں حفاظت ہو اور اسی میں سلامتی ہو۔

ایک گمراہ کن مغالطہ

اس جگہ ایک مغالطہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہو۔

بعض لوگ جن کی نظر میں سلف کے اتباع کی اتنی اہمیت نہیں ہو، وہ کہا کرتے ہیں کہ اصل چیز بس قرآن و حدیث ہو، اور دین میں ہم قرآن و حدیث کے سوا کسی چیز کو سند نہیں مانتے ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فقرہ بہت چست اور بہت چلتا ہوا ہو، اور فی نفسہٖ صحیح بھی ہو، لیکن یہ لوگ اس کو بہت غلط معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا اب یہ "كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيدَ بِهِ الْبَاطِلُ" کے قبیل سے ہو۔

واقعہ یہ ہو کہ سب ایمان والوں کے نزدیک، دین کا اصل ماخذ کتاب و سنت ہی ہیں، لیکن کتاب و سنت کوئی بولتے ہوئے انسان تو ہیں نہیں کہ ہم جا کے ان سے کوئی سوال کریں اور وہ ہم کو ہماری زبان میں فوراً جواب دیدیں، بلکہ کتاب و سنت سے کسی چیز کو معلوم کرنے کی صورت یہی ہو سکتی ہو کہ کوئی شخص جو کتاب و سنت کی زبان اور اُن کے اسلوب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ دین کے مقصد و مزاج اور تشریع کے اصول کا بھی پورا واقف اور ماہر ہو وہ غور کرے اور کتاب و سنت کے مقصد و منشار کو سمجھے، اب ہم لوگ جو دین میں سلف صالحین کی برتری کے قائل ہیں اور اس لیے ان کے اتباع میں سلامتی سمجھتے ہیں۔ ہمارا اصول اور طریقہ کار تو یہ ہو کہ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ سلف صالحین نے اس بارہ میں کتاب و سنت کا مقصد و منشار یہ سمجھا ہو اور ان سب کا یہ متفقہ مسلک ہو تو ہم صرف اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور اسی کا اتباع ضروری جانتے ہیں اور اُس کے خلاف ہر رائے کو تسویل شیطانی سمجھتے ہیں۔ ——— اور جو لوگ سلف صالحین کا اتباع نہیں چاہتے اور جن کو ان کے علم و فہم سے زیادہ اپنے علم و فہم پر اعتماد ہو وہ اپنی رائے اور اپنی سمجھ کا اتباع کرتے ہیں۔ اور کتاب و سنت کا نام لے کر دوسروں کو بھی اسی کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں ——— پس ہمارے اور ان کے طرز فکر اور طرز عمل میں فرق یہ نہیں ہو کہ وہ دین میں اصل سند کتاب و سنت کو قرار دیتے ہیں اور ہم سلف صالحین کو ——— بلکہ یہ ہو کہ ہم کتاب و سنت کا منشا متعین کرنے کے بارہ میں سلف صالحین کے فہم و فکر کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور وہ اپنے خیالات اور اپنے فہم پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی بجائے سلف کے ان کی تقلید کریں۔

خوارج کا قرآنی نعرہ اور حضرت علیؓ کا جواب

گویا بالکل وہی معاملہ ہو جو خوارج کے اور سیدنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے درمیان پیش آیا تھا، مشہور واقعہ ہو، آپ حضرات نے شاید اس سے پہلے بھی سُنا ہو گا کہ ایک جگہ خوارج کا مجمع تھا، امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؓ ان کو سمجھانے کے لیے تشریف لے گئے، خوارج نے شور مچایا کہ ہم بس

کتاب اللہ کی مانیں گے، ہم سے جو کچھ منوانا ہو قرآن سے منواؤ، ہم قرآن کے سوا کچھ نہیں سننا چاہتے (جیسا کہ آج کل کے بھی بہت سے گم راہ فرقے ایسے ہی نعرے لگایا کرتے ہیں) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید ہاتھ میں لیا اور اس کو اوپر اٹھا کے فرمایا "اَيُّهَا الْمُصْحَفُ حَدِّثْ" — "اَيُّهَا الْمُصْحَفُ حَدِّثْ" — یعنی اے قرآن بول — اے قرآن ان سے کچھ کہہ — جس معاملہ میں یہ جھگڑا کر رہے ہیں، اس کی حقیقت ان کو بتلا! بار بار یہی فرمایا — پھر کچھ دیر خاموش رہ کر خوارج سے مخاطب ہو کر فرمایا، تم نے دیکھ لیا کہ قرآن میرے کہنے سے بھی کچھ نہیں بولا — گویا اس تدبیر سے انھیں بتلایا کہ قرآن کی پیروی کی صورت یہی ہو کہ جو قرآن کے جاننے والے اور سمجھنے والے ہیں وہ جو کچھ قرآن سے سمجھ کر بتلائیں اس کی پیروی کی جائے — اس کے بعد آپ نے کہا کہ احمقو! جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست قرآن کو اور دین کو حاصل کیا، کیا تم سمجھتے ہو کہ تم ان سے زیادہ قرآن کو اور دین کو جاننے والے ہو؟ پھر آپ نے انکے خیالات اور شبہات کا تفصیلی رد کیا —

اس واقعہ سے مجھے صرف یہ بتلانا تھا کہ ہمارے اس زمانہ کے جو لوگ اور جو نئے فرقے اتباع سلف کے اصول کے قائل نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم صرف کتاب وسنت کو مانتے ہیں، دراصل ان کی ذہنیت بالکل وہی ہو جو ان خوارج کی تھی اور وہ لوگوں کو سلف کے اتباع سے توڑ کر اپنے متبعین میں داخل کرنا چاہتے ہیں اور جو سادہ لوح ان کی بات مانتے ہیں وہ درحقیقت سلفِ صالحین کے اتباع سے آزاد ہو کر خود ان کے متبع اور مقتدی بن جاتے ہیں اور اسی سے اُمت میں نئے نئے فرقے اور نئے نئے گروہ پیدا ہوتے ہیں۔

بہرحال دین کے بارہ میں سلفِ صالحین کے اعتماد اور ان کے اتباع کو ہم اس زمانہ میں نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔

فقہی مسائل میں تقلید — یہ ساری گفتگو تو ایمانیات اور عقائد میں تھی، فروع اور فقہی مسائل میں بھی ہمارے نزدیک ائمہ حق کی تقلید اور سلف کے اتباع ہی میں سلامتی ہو، خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جب کہ اجتہاد اتنا آسان اور اتنا ارزاں ہو گیا ہو کہ جو لوگ قرآن وحدیث کے اردو ترجمے بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بھی اپنے کو اجتہاد کا حقدار سمجھتے ہیں۔[۵]

---

[۵] حضرت شاہ ولی اللہؒ اگرچہ مجتہدانہ طرزِ فکر رکھتے ہیں لیکن حجۃ اللہ البالغہ میں اس مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے صاف فرماتے ہیں "ان هذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجمعت الامة او من يعتد به منها على جواز تقليدها الى يومنا هذا وفي ذالك من المصالح ما لا يخفى سيما في هذه الايام التي قصرت فيها الهمم جداً واشربت النفوس الهوى واعجب كل ذي رأي برايه — مطلب یہ ہو کہ مذاہب اربعہ کی تقلید جائز اور صحیح ہونے پر پوری امت کا یا کہنا چاہیے کہ اس کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جو حضرات اہل علم کسی خاص فقہی مسلک کی تقلید پر مطمئن نہیں ہیں ان کے لیے بھی اتنا تو نہایت ضروری ہو کہ جن مسائل پر آئمہ مجتہدین خصوصاً آئمہ اربعہ غور کر کے متفق ہو چکے ہیں ان میں کوئی نئی راہ اختیار نہ کریں، اور جن مسائل میں ان حضرات کے درمیان اختلاف ہو ان میں بھی ان سب سے الگ کوئی نئی رائے قائم نہ کی جائے۔ اس اصول کی پابندی نہ کرنے میں سخت بے احتیاطی اور خود رائی بھی ہو اور امت میں اس سے انتشار بھی پیدا ہوتا ہو۔ خصوصاً ہم آپ جیسے لوگ جو اس اُمت کی کچھ دینی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے نہایت ضروری ہو کہ وہ اپنے خیالات اور اپنے طرز عمل سے اُمت میں انتشار نہ پیدا کریں، اور لوگوں کو اپنے سے بدگمان اور دور کرنے والی باتوں سے بچیں ــــ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "فیوض الحرمین" میں ذکر کیا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں) مجھے تین ایسی باتوں کی تاکید اور وصیت فرمائی جو میرے ذاتی رجحان اور طبعی میلان کے خلاف تھیں ــــ اُن میں سے ایک فقہی مسائل میں مذاہب اربعہ کی تقلید کا مسئلہ بھی تھا۔

میرے نزدیک اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہندستان میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کو دینی اصلاح کا جو کام کرنا تھا اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ عوام دین و مذہب کے بارہ میں ان سے برگشتہ اور بدگمان نہ ہوں اور ان پر اعتماد کریں۔ بہر حال ہم جیسوں کے لیے تو یہ نہایت ضروری ہو ــــ اس وقت امت جس حال میں ہو اس کو ہمارے نئے نئے اجتہادات کی ضرورت نہیں، بلکہ اس میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کے لیے عملی جد و جہد کی، اور اس راستہ میں اپنی جانوں کو بے قیمت کرنے کی ضرورت ہو۔

عقائد اور اصول کے سلسلہ میں الحمد للہ وہ سب باتیں کہہ چکا جن کا بیان اس سلسلہ میں ضروری سمجھتا تھا اب شریعت کے دوسرے عملی شعبوں کے متعلق اسی طرح کچھ اصولی باتیں کہنی ہیں۔

(حاشیہ صفحہ (۶۸) قابل اعتبار عناصر کا امتزاج ہو، خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جب کہ علم کم ہو اور ہوی پرستی اور خود رائی زیادہ تو اب قرآن مذاہب کی تقلید میں دین کی بڑی حفاظت اور مصلحت ہو۔)

عملی شریعت

میں نے عرض کیا تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو دینی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے، اُس کا ایک حصّہ تو وہ ہے جس کا تعلق عقائد و نظریات سے ہے ——— جس کا بقدرِ ضرورت بیان میں کر چکا ——— اور دوسرا حصّہ وہ ہے، جس کا تعلق اعمال و اخلاق سے ہے ——— کبھی کبھی صرف اسی حصّے کے لئے بھی شریعت کا لفظ بولا جاتا ہے۔

شریعت کے شعبے

اور اسکے چند شعبے ہیں ——— عبادات ——— اخلاق ——— معاملات و معاشرت ——— دینی جد و جہد، اور سیاست و حکومت۔

عبادات کی خصوصی اہمیت

جس طرح امہات العقائد کو دوسرے عقائد کے لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے، اسی طرح شریعت کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں عبادات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ عبادات کے ذریعہ عبد اور معبود کا تعلق دوسری سب چیزوں سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے، اور عبادات کو زندگی کے دوسرے شعبوں کی اصلاح اور درستی میں بھی خاص دخل ہے۔

عبادت کے متعلق جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے اُس سے پہلے آپ عبادت کا مطلب سمجھ لیجئے۔

عبادت سے کیا مُراد ہے؟

عبادات سے مُراد خاص وہ اعمال ہیں جو بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اُسکے سامنے اپنی عاجزی اور بیچارگی اور بندگی اور سرافگندگی ظاہر کرنے کے لئے کرتا ہے، اور اُس سے اس کا مقصد صرف اللہ کی رضا اور اس کا تقرب حاصل کرنا ہوتا ہے ——— عربی میں ان عبادات کو قُربات بھی کہتے ہیں ——— جیسے:- نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ و صدقات، ذکر و تلاوت، قربانی جیسے تعبدی اعمال جو صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے، اور اپنے رُوحانی پہلو کی درستی اور ترقی کے لئے کئے جاتے ہیں، اور وہ صرف عبد و معبود کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

عبادت کا مقصد

عبادت کا ایک تعلق معبود سے ہے اور ایک عبد سے ہے، یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ ہماری عبادات سے معبود کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اور اس کی شان میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آتا ہے، کہ:- اگر سارے انسان اور سب اوّلین و آخرین اعلیٰ درجہ کے متقی اور عبادتگذار ہو جائیں

تو اللہ کی شان اور اس کی عظمت و کبریائی میں ذرہ برابر زیادتی نہیں ہوگی، اور اگر سب کے سب بدترین قسم کے نافرمان اور پورے شیطان بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کی شان میں اور اُسکے عظمت و جلال میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی۔

بہرحال ہماری عبادات سے اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اور نہ اُس کی شان کبریائی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، بلکہ ہماری عبادتیں دراصل صرف ہمارے ہی فائدے اور ہماری ہی تکمیل کے لیے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں عبادت کا حکم صرف اِسلئے دیا ہے کہ اُسکے ذریعہ ہم ترقی کریں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو بڑھائیں اور اس کی خاص رضا اور رحمت کے مستحق بنیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بندے میں اور مولا میں کوئی مناسبت ہی نہیں، کہاں زمین و آسمان کا خالق و مالک حق تعالیٰ شانہٗ، اور کہاں ایک ناپاک بدبودار قطرے سے پیدا ہونے والا اور گندے خون سے بننے والا انسان۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین پر رینگنے والے ایک گھنونے حقیر کیڑے میں اور دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ میں جو نسبت ہے، بندہ میں اور مولا میں وہ بھی تو نہیں ہے، پھر بندہ اُس کا قرب اور اُس کی رضا اور محبت کیسے حاصل کرے؟ ——

بس اس کی صورت یہی ہے کہ اس کی انتہائی برتری اور کبریائی اور اُسکے سامنے اپنی انتہائی ذلت و پستی اور عاجزی و بے چارگی اور عبدیت و فدائیت کا اعتراف اور اپنے عمل سے اس کا اظہار کرے، بس یہی چیز بندے کو پاک اور بلند کرکے اللہ کا مقرب اور محبوب بنا دیتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جاتا ہے۔

انسان کے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کا نشوونما عبادت سے ہوتا ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں دو پہلو ہیں، ایک مادیت اور بہیمیت کا، اور ایک رُوحانیت اور ملکوتیت کا، اور اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ اُس کا خاص تعلق ملکوتی اور رُوحانی پہلو سے ہے، اور انسان کا یہی پہلو اصل قیمتی پہلو ہے جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہے۔ دنیا میں انسان جو کھاتا پیتا ہے اور اس قسم کی اپنی جو دوسری خواہشیں پوری کرتا ہے، اُس سب کا تعلق اُسکے بہیمی اور مادی پہلو سے ہے جو انسان میں اس سفلی عالم کا حصہ ہے، اور جس میں دوسرے حیوانات بھی انسان کے شریک ہیں، اور اِسلئے اس کھانے پینے سے اور اس طرح کے دوسرے کاموں سے براہ راست اس مادی اور بہیمی پہلو کا نشوونما ہوتا ہے —— رُوحانی پہلو جو انسان میں عالم ملکوت کا حصہ ہے اور جس کی وجہ سے وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، اس کی ترقی اور اُسکے نشوونما کا ذریعہ عبادات ہیں ——

عبادت ہی کے ذریعہ انسان ملاء اعلیٰ سے ایک خاص مناسبت اور ربط پیدا کرتا ہے، گویا عبادت نہ کرنے والے انسان کی حیثیت صرف ایک ترقی یافتہ اور بولتے چالتے جانور کی ہے، بلکہ وہ دوسرے جانوروں سے بدتر ہو (اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ) اور اللہ کی عبادت کرنے والے انسان کی حیثیت ایک ایسی مخلوق کی ہے جس کا قالب اگرچہ مادی ہے اور اس عالم کا ہے، لیکن اُس میں رُوح فرشتوں کی ہے، اور وہ اگرچہ اس زمین پر چلتا ہے اور اُس کا مادّ

اگرچہ اسی عالم سفلی کا ہے، لیکن اُس کی رُوح ملاءِ اعلیٰ کی ہے، اور اس کو اپنے پیدا کرنے والے سے خاص ربط ہے۔

بہرحال، انسان کے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کا نشوونما عبادت ہی سے ہوتا ہے، اور عبادت ہی عالمِ ملکوت اور ملاءِ اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کا خاص ذریعہ ہے ——— عبادات کے علاوہ دین کے جو دوسرے احکام ہیں، اگرچہ اُن سب کی تعمیل میں بھی اجر و ثواب ہے، یعنی اخلاق میں بھی اجر و ثواب ہے، اور جو معاملہ اور جو برتاؤ کسی کے ساتھ اللہ کے حکم کے مطابق کیا جائے اُس میں بھی اجر و ثواب ہے، اسی طرح دین کی جد و جہد بھی بڑے اجر و ثواب کی چیز ہے، بلکہ انشاء اللہ میں ابھی آپ کو بتلاؤں گا کہ بعض پہلوؤں سے دین کے ان دوسرے شعبوں کی عبادت سے بھی زیادہ اہمیت ہے، لیکن ملاءِ اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کی جو تاثیر اور انسان کے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کی ترقی اور تکمیل کی جو خاصیت عبادات میں ہے وہ کسی دوسرے عمل میں نہیں ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام اعمال اگرچہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق کئے جائیں، اور ہماری نیت بھی حکمِ الٰہی کی تعمیل کی، اور رضاءِ الٰہی حاصل کرنے کی ہو، لیکن ان کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے، مثلاً:- اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست و حکومت، تعلیم و تعلّم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ان سب اعمال کا رُخ مخلوق کی طرف ہے۔ خالق کے ساتھ ان کا تعلق اتنا ہی ہے کہ یہ بھی اُسکے احکام ہیں ——— لیکن عبادات کا تعلق براہِ راست صرف معبود سے ہے، اور اس میں بندے کا رُخ صرف اللہ ہی کی طرف ہوتا ہے، غیر کی اس میں کہیں لگاوٹ ہی نہیں ہے یہی عبادات کا امتیاز ہے، اور دین میں عبادات پر زیادہ زور دینے کا یہی راز ہے۔

عبادات کے بارے میں مادیت زدہ لوگوں کی غلط فہمی

جن لوگوں کی فکر و نظر پر مادیت زیادہ غالب آچکی ہے وہ عبادات کے اس امتیاز کو نہیں سمجھ سکے، اسلئے انھوں نے عبادات میں بھی وہ فائدے ڈھونڈے جن کا تعلق اس عالمِ محسوسات سے ہے۔ یہاں تک کہ "عنایت اللہ مشرقی" جیسے بعض لوگ تو اس قدر نیچے گرے، کہ نماز جیسی عبادت کو بھی جو دراصل انسانی رُوح کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونے اور اس مادی عالم سے کٹ کر کچھ وقت کے لئے عالمِ تجرد اور ملاءِ اعلیٰ سے وابستہ ہو جانے کا خاص الخاص ذریعہ ہے، انھوں نے اس کو قواعد پریڈ کی قسم کی ایک ورزش قرار دے دیا، اور کہا کہ اس سے ڈسپلن پیدا ہوتا ہے، پابندیٔ وقت کی عادت پڑتی ہے، اور اسی قسم کی خرافات، اور بعض لوگ جو اتنے نیچے نہیں گرے، انھوں نے کچھ اور فائدے بیان کئے، جو اتنے پست اور گھٹیا تو نہیں ہیں، لیکن بہرحال اُن کا تعلق بھی اسی عالمِ محسوسات سے ہے۔

یہ ساری غلطیاں عبادت کی حقیقت اور اُسکے موضوع اور غایت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اور ذہنوں پر مادیت اور عالمِ محسوسات کی اہمیت کے غالب آجانے کی وجہ سے ہوتی ہیں ——— بقول کسی کے:-

"فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست"

مقصدِ حج کے بارے میں اسی قسم کی ایک غلط فہمی

ایک دفعہ میں اور مولانا علی میاں ایک جگہ گئے ہوئے تھے، کچھ ہی دنوں پہلے الفرقان کے حج نمبر میں مولانا موصوف کا مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" نکلا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حج کے موضوع پر اللہ تعالیٰ نے مولانا سے یہ عجیب وغریب مضمون لکھوا دیا تھا، عجب تاثیر اور عجب سوز سے بھرا ہوا ہے، خود میرا حال یہ ہے کہ میں نے بارہا اس کو پڑھا ہے، لیکن ہر دفعہ اس نے رُلایا ہی اور بہت بہت رُلایا ہے ——— ایک بڑے اچھے تعلیم یافتہ دوست جن کا دینی مطالعہ اور دینی علم بھی اچھا خاصا ہی وہ ملنے آئے، مولانا کے مضمون کی تعریف کی، اور آخر میں کہا:——— لیکن اس میں ایک بڑی کمی یہ رہ گئی ہے کہ حج کے اجتماع کا جو خاص مقصد اور فائدہ ہے اُس کا آپ نے بالکل ذکر نہیں کیا ——— میں نے عرض کیا وہ کیا ہے؟ ——— فرمایا: یہی کہ تمام دنیا کے مسلمان اور اُن کے نمایندے جمع ہو کر وقت کے اہم مسائل پر غور کریں ——— میں نے عرض کیا:- یہ آپ نے کہاں سے سمجھا ہے؟ ——— فرمایا، کہ:- دسویں تاریخ سے لیکر بارھویں تیرھویں تک منیٰ کے میدان میں جو سارے حجاج کو ٹھہرنے کا حکم ہے، اس کا مقصد اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ شہر کے شور و شغب اور ہنگاموں سے بالکل الگ رہ کر اطمینان سے وہاں کی پُرسکون میدانی فضا میں دنیا کے اہم مسائل پر غور کریں ——— میں نے دریافت کیا، کہ:- جناب حج کر چکے ہیں، اور آپ نے منیٰ میں حجاج کے ٹھہرنے کا منظر دیکھا ہے؟ ——— فرمایا:- ابھی تو نہیں، اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے ——— میں نے عرض کیا، کہ:- جب اللہ تعالیٰ نصیب فرمائیں گے، تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ کتنی بڑی غلط فہمی میں تھے۔

حیرت ہے کہ حج کا یہ مقصد سمجھنے والے، یا اس قسم کی چیزوں کو حج کا "خاص فائدہ" بتانے والے، اور ان باتوں کو زیادہ اہمیت دینے والے، یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہر مُلک کے خواص اور نمایندے اور اہل الرائے حضرات کو بُلایا جاتا، کم از کم اُن کے جمع ہونے پر خاص زور دیا جاتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر اُس مسلمان پر حج فرض کیا گیا ہے جو وہاں پہونچنے کی استطاعت رکھتا ہو، اور عمر میں صرف ایک دفعہ فرض کیا گیا ہے۔ پھر غور کرنے کی بات ہے کہ احرام، طواف، سعی (یعنی صفا مروہ کے پھیرے) قربانی، مکہ سے منیٰ جانا، منیٰ سے عرفات دوڑنا، عرفات سے رات کو چل کر مزدلفہ آنا، وہاں سے پھر منیٰ، اور منیٰ سے پھر مکہ بھاگنا، اور پھر مکہ سے منیٰ واپس جانا، اور پھر وہاں ٹھہر کر روزانہ رمیِ جمار کرنا، آخر دیوانوں کے سے ان اعمال، اور اس مجنونانہ دوڑ بھاگ سے، اور "عالم اسلامی کی کانفرنس" والے مقصد سے کیا ربط اور جوڑ ہے[1]۔

---

[1] حج کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی حج کے ساتھ تشبہ اختیار کر کے اُنکے جذبۂ عبدیت اور کمالِ فدویت و فدائیت کو یاد کیا جائے، اور اُنکی اُس مبارک عشقی نسبت اور اسکی برکات سے حصہ لینے کی کوشش کی جائے، حج کے تمام اعمال سے یہی ظاہر ہوتا ہے ۱۲۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ حج کے اجتماع سے یہ فائدہ اٹھایا نہیں جاسکتا، یا ایسا کوئی فائدہ اٹھانا نہیں چاہئے، بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حج وغیرہ عبادات کا موضوع یہ نہیں ہے، اور جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور اس طرح سوچتے ہیں اُنکی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے عبادات کی حقیقت اور اسکے اصل مقصد اور موضوع کو نہیں سمجھا ہے۔ عبادت کا اصل مقصد اور اس کی اصل غایت وہ ہے جس کا تعلق اس عالم محسوسات سے نہیں ہے، لیکن ان لوگوں کی نظروں میں چونکہ عالم محسوسات ہی کی وقعت اور اہمیت زیادہ ہے، اور ان کے ذہنوں کا رُخ چونکہ اس مادی عالم ہی کی طرف ہے، اسلئے یہ بیچارے عبادات کا مقصد اور اسکے خاص فائدے بھی اسی میں ڈھونڈھتے ہیں، اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ کہتے ہیں ———— ان باتوں سے "عبادات" کی امتیازی اہمیت بالکل ختم ہوجاتی ہے، اور پھر وہ معمولی مقاصد کی معمولی تدبیریں رہ جاتی ہیں۔

ہاں! ہمیں اس سے انکار نہیں کہ عبادات سے بہت سے ایسے فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں جس کا تعلق اسی عالم محسوسات سے ہے، لیکن وہ عبادات کا مقصد اور غایت نہیں ہیں، بلکہ ان کو برکات کہا جاسکتا ہے۔

بہرحال عبادات کا اصل مقصد و موضوع صرف معبودِ برحق کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنا اور اپنے کو پاک کرنا اور اپنے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کو نشو و نما دینا ہے، اور انسانوں کے تمام اعمال میں محض عبادات ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق صرف معبود سے ہے، اور کسی اور کا اس میں کوئی حصّہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی عبادت کسی نیت سے اور کسی پہلو سے بھی غیر اللہ کے لئے نہیں کی جاسکتی، اور اگر کوئی کرے گا تو وہ مشرک ہوجائے گا، دوسرے کسی عمل کی یہ شان نہیں ہے۔

اور عبادت کے شعبے کی اسی اہمیت اور نزاکت کی وجہ کر دوسرے تمام شعبوں سے زیادہ اس میں پابندیاں لگائی گئی ہیں، اور اسکے احکام زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، جو چیز جتنی اعلیٰ اور جتنی قیمتی اور جتنی نازک ہوتی ہے اُس کا قانون بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔

ارکانِ اربعہ

یہاں تک تو میں نے عبادات کے متعلق عمومی اور اصولی باتیں کہیں، اب میں خاص طور سے عبادات اربعہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کے متعلق الگ الگ کچھ کہنا چاہتا ہوں، آپ جانتے ہیں کہ ان کو اسلام کا رکن قرار دیا گیا ہے، اور دین میں ان کی غیر معمولی اہمیت ہے، گویا یہی وہ بنیادی ستون ہیں، جن پر دین کی پوری عمارت قائم ہوتی ہے۔

نماز اور اس کی خاص اہمیت

پھر ان میں نماز سب سے اہم اور افضل ہے، اور اُس کی وجہ ظاہر ہے، آپ جانتے ہیں کہ ہر چیز کی قدر و قیمت اُسکے مقصد کے لحاظ سے ہوتی ہے، مثلاً موٹر کی قیمت اُس کی خوبصورتی اور اسکے رنگ کے اعتبار سے نہیں لگتی، بلکہ موٹر جس مقصد کے لئے لیا جاتا ہے جو موٹر اس مقصد کے لحاظ سے جتنا بڑھیا ہوگا اتنی ہی اس کی قیمت زیادہ ہوگی۔ اسی طرح مثلاً بھینس کی قیمت اس کی خوبصورتی یا اس کی چال کے حساب سے نہیں لگائی جائے گی،

بلکہ دودھ کے حساب سے لگائی جائے گی، یعنی جو بھینس جس قدر زیادہ دودھ دے گی وہ اتنی ہی بڑھیا اور قیمتی سمجھی جائے گی ـــــــ بس اسی طرح سمجھئے کہ عبادت کا جو مقصد اور فائدہ ہے (یعنی اللہ کا قرب حاصل کرنا، اور رُوحانی اور ملکوتی پہلو کو نشو و نما دینا، اور ملاءِ اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنا) - چونکہ نماز اس صفت میں دوسری تمام عبادات سے بڑھی ہوئی ہے، اسلئے وہی سب سے اہم اور افضل ہے، اور اسی لئے اس کی شرطیں سخت ہیں، مثلاً جسم کا پاک ہونا، کپڑوں کا پاک ہونا، زمین کا پاک ہونا، وضو سے ہونا وغیرہ وغیرہ ـــــــ آپ حضرات جانتے ہیں کہ جتنا اہتمام نماز کے لئے کرنا پڑتا ہے، اتنا کسی عبادت کے لئے کرنا نہیں پڑتا۔

نماز کا تعلق اللہ کی صفتِ حاکمیت سے بھی ہے، اور محبوبیت سے بھی

نماز کی اہمیت کو ایک اور طریقے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ بعض عبادات وہ ہیں جن کا خاص تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت اور مالکیت سے ہے، یعنی بندہ اپنے اس عمل سے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے مالک اور حاکم ہیں، اور میں ان کا عبد اور مملوک ہوں ـــــــ مثلاً زکوٰۃ خاص طور سے اسی پہلو کو ظاہر کرتی ہے ـــــــ اور بعض عبادات وہ ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ محبوبیت سے ہے، یعنی اُن کے ذریعہ اس کا اظہار ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا طالب ہے، اور وہ اس سے محبت اور فدائیت کا تعلق رکھتا ہے، اور اُس کی رُوح اور اُس کا دل اُس سے وابستہ ہے، مثلاً روزہ سے اسی پہلو کا اظہار ہوتا ہے، اس میں عاشقوں کی طرح کھانا پینا چھوڑ دیا جاتا ہے، اور حج تو سراسر عشق و محبت کی شوریدگی اور دیوانگی کی تصویر ہے، عاشقوں کا سا لباس، محبت کے دیوانوں کی سی حرکتیں، دل میں کسی کا خیال لے کر کعبہ کے گرد گھومنا، اُسکے ایک گوشے میں لگے ہوئے ایک پتھر کو بار بار چومنا، جنگلوں میں نکل جانا، راتوں اور دنوں کو وہاں پڑا رہنا، یہ سب چیزیں عشق و محبت کی سرمستی کو ظاہر کرتی ہیں، اور گویا یہی حج کی رُوح ہے۔

لیکن نماز ان دونوں پہلوؤں کو جامع ہے، ادب اور سکون و وقار کے ساتھ دربار میں حاضر ہونا، غلاموں اور چاکروں کی طرح صف باندھ کے نگاہیں نیچی کرکے دست بستہ کھڑا ہو جانا، ایک نظام کے ساتھ اسکے سارے ارکان ادا کرنا ـــــــ ان چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی مالکیت و حاکمیت اور بندہ کی عبدیت و مملوکیت کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے ـــــــ لیکن نماز میں بندہ کے اندر کی جو حالت ہونی چاہئے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی خاص صفتِ محبوبیت سے ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد :- "قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوة" (نماز میں میری آنکھ کی ٹھنڈک کا سامان ہے)۔ اور نماز کا وقت آ جانے پر حضرت بلالؓ سے آپؐ کا فرمانا :- "اَرِحْنِي يَا بِلَال" (بلالؓ! نماز کا بندوبست کر کے ہمارے بے چین دل کی راحت اور ہمارے دردِ دل کی دوا کا انتظام کرو) - یہ اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"نماز است کہ راحت دہ بیماران است "ارحنی یا بلال" رمز بست ازیں ماجرا

د "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اشارۂ الست بایں متمنا"

حضرت مجددؒ کے ایک خلیفہ خواجہ عبدالواحد لاہوری کے متعلق نقل کیا جاتا ہے، کہ ایک دن فرمایا :-

"کیا جنت میں نماز ہوگی ؟"

کسی نے عرض کیا، کہ حضرت! جنت دار العمل تو ہے نہیں، وہ تو دار الجزاء ہے، پھر وہاں نماز کیوں ہونے لگی ——— یہ سُنکر بڑے درد کے ساتھ روتے ہوئے فرمایا :-

"پھر بغیر نماز کے وہاں کیسے گذرے گی"

اللہ کے جن بندوں کی نمازیں حقیقی نمازیں ہیں، اُن کو نمازیں جو لذت اور کیفیت ملتی ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک جگہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"رتبۂ نماز در رنگ رتبۂ رویت است در آخرت، نہایت قرب در دنیا در نماز ست، ونہایت قرب در آخرت در حین رویت"

بہرحال عبادات میں نماز ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت و مالکیت سے بھی پورا پورا ہے، اور اس کی صفتِ محبوبیت سے بھی، اس کا قالب بندہ کی عبدیت اور مملوکیت کی نہایت مکمل اور نہایت حسین تصویر ہے، اور اس کی رُوح میں عشق کی لذت اور محبت کا سوز و گداز بھرا ہوا ہے، ان دونوں پہلوؤں کی یہ کامل جامعیت صرف نماز ہی میں پائی جاتی ہے، اور یہ بھی تمام عبادات سے اُسکے افضل اور اہم ہونے کی ایک وجہ ہے۔

نماز ایمان کا خارجی وجود ہے

نماز کی اہمیت اور امتیاز کے سلسلہ میں ایک بات میری سمجھ میں یہ بھی آتی ہے، اور کبھی کبھی میں اس کو کہا بھی کرتا ہوں کہ نماز ظاہری اور تفصیلی ایمان ہے، اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ایمان تو دراصل ایک باطنی حقیقت ہے، اور دل کا ایک معاملہ ہے، لیکن اس کا وجود نماز سے ظاہر ہوتا ہے، اور نماز گویا ایمان کا ایک محسوس پیکر ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ نماز، ایمان ہی کی اندرونی کیفیت کا خارج میں ایک محسوس اور مُتشکل وجود ہے ——— بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کا ایک باطنی وجود ہوتا ہے اور ایک ظاہری، پس ایمان کا ایک وجود تو باطنی ہے، اور وہ انسان کے دل کی ایک خاص کیفیت ہے، اور اسی کا ایک وجود ظاہری ہے، اور وہ نماز ہے ——— میرا خیال ہے کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر نماز کو اسی واسطے ایمان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ——— "مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیعَ اِیْمَانَکُمْ" ——— کے متعلق مفسرین عموماً یہی فرماتے ہیں، کہ یہاں نماز ہی کو ایمان کہا گیا ہے ——— اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے، اُسکے بعد آپ کو حکم ہوا، کہ کعبۃ اللہ کو قبلہ بنائیں، اور اُس کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھا کریں ——— چنانچہ پھر اسی پر عمل ہونے لگا ——— بعض لوگوں کے دل میں یہ خلش تھی کہ ابتک

بیت المقدس کی طرف جو نمازیں پڑھی گئیں، اُن کا کیا ہوگا، کیا وہ سب ضائع جائیں گی؟ یہ آیت "مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ" (یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تمھارے ایمان کو ضائع کرے) کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر نازل ہوئی، اور اسکے ذریعہ تسلی دی گئی کہ تمھاری پہلی نمازیں بھی ہرگز ضائع نہیں جائیں گی، بلکہ وہ اللہ کے یہاں قبول ہوچکی ہیں۔

الغرض اس آیت میں نماز کو ایمان فرمایا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہی ہے کہ نماز اندرونی ایمانی حقیقت کا ظاہری اور خارجی وجود ہے — اور میرا خیال ہے کہ ایمان اور نماز کے اسی خاص تعلق کی وجہ سے ترکِ نماز کو بعض حدیثوں میں کفر کہا گیا ہے، اور ان ہی احادیث کی بناء پر بعض ائمہ کا یہ فتویٰ ہے کہ عمداً نماز ترک کرنے سے آدمی اسلام سے بالکل نکل جاتا ہے — یہ حضرات ترکِ نماز کو دوسرے فرائض کے ترک اور دوسرے کبیرہ گناہوں جیسا گناہ قرار نہیں دیتے، بلکہ اُن کے نزدیک ترکِ نماز سجدۂ صنم، اور سجدۂ صلیب کی قسم کا ایسا عمل ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے منافیِ ایمان ہے، یعنی جس طرح بُت کے سامنے یا صلیب کے سامنے سجدہ کرنا ایک ایسا کافرانہ عمل ہے، کہ اگر بالفرض کفر کے عقیدے کے ساتھ نہ بھی ہو، تب بھی وہ کفر ہے، اسی طرح ان ائمہ کے نزدیک نماز نہ پڑھنا بھی اسی قسم کا کافرانہ عمل ہے۔

الغرض نماز کا ایمان سے ایک ایسا خاص تعلق ہے جو دوسری عبادات اور دوسرے فرائض اور ارکان کا نہیں ہے اور اس بناء پر بھی دوسری تمام عبادات کے مقابلے میں نماز کو خاص اہمیت اور امتیاز حاصل ہے۔

نماز زندگی کے تمام شعبوں پر اثر ڈالتی ہے!

ایک خصوصیت نماز کی یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے سب شعبوں پر اپنا اثر ڈالتی ہے، اور پوری زندگی کو اللہ کی یاد والی اور اس کی اطاعت والی زندگی بناتی ہے، بشرطیکہ حقیقی نماز ہو۔ نماز میں یہ تاثیر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں کے اعمال کی جانچ آخرت میں اسی طرح ہوگی کہ اُن کی صرف نمازوں کو دیکھ لیا جائے گا، اگر وہ درست اور ٹھیک ہوں گی، تو پوری زندگی کو درست قرار دیدیا جائے گا، اور اگر اُن میں نقص اور خرابی ہوگی تو ساری زندگی ناقص اور خراب قرار دیدی جائے گی۔ اس کا راز یہی ہے کہ نماز اگر واقعی نماز ہو، تو وہ پوری زندگی کو پاک صاف بنا دیتی ہے، دوسری عبادات سے نماز کے افضل اور اہم ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔

اپنی نمازوں کی تکمیل اور ترقی کی ضرورت

نماز کے متعلق مجھے آخری اور عملی بات آپ حضرات سے اپنی نمازوں کی اصلاح اور ترقی سے متعلق کہنی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب نماز کی اہمیت کو کچھ سمجھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں، لیکن ہم میں سے اکثر اپنی نمازوں کی موجودہ سطح پر بالکل قانع ہیں، اور انھیں اپنی نمازوں کے بہتر بنانے کی کوئی فکر نہیں ہے، یہ بڑے خسارے کی بات ہے — ابھی میں نے حضرت مجددؒ کا قول نقل کیا، کہ

نماز کا دنیا میں وہ مقام ہے جو آخرت میں دیدارِ الٰہی کا ہے — بس اب آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ اپنی نمازوں کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کی ہمیں کتنی فکر اور کوشش کرنی چاہئے۔

نماز میں ترقی اور تکمیل کی بے انتہا گنجائش ہے — جو بہتر سے بہتر اور اچھی سے اچھی نماز دنیا میں پڑھی جاتی ہے، اگر کوشش جاری رکھی جائے تو اُس میں بھی ہزاروں درجہ اور ترقی ہو سکتی ہے۔

اس کی چند اصولی تدبیریں

میں اس سلسلہ میں چند اصولی باتیں عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اُن سے فائدہ پہنچائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نماز کے ضروری مسائل اگر نہیں سیکھے ہیں تو سیکھے جائیں اور مقررہ شرائط کے مطابق خشوع خضوع کے ساتھ صحیح نماز ادا کرنے کا ہمیشہ اہتمام رکھا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھ کر اور اس کا پورا دھیان رکھ کر نماز پڑھنے کی عادت ڈالی جائے، اور اس بارے میں اپنی پوری ہمت اور فکر سے کام لیا جائے — یعنی اپنے امکان کی حد تک اس کی پوری کوشش کی جائے، کہ نماز ایسی ہو جیسی کہ اُس وقت ہوتی، جب اللہ تعالیٰ اپنے پورے جلال وجمال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے، اور وہ ہمیں نماز ادا کرنے کا حکم دیتے، اور اُس وقت ہم اُن کے سامنے کھڑے ہو کر ادا کرتے — اگرچہ یہ بات ہمارے آپ کے لئے آسان نہیں ہے، بہت مشکل ہے، لیکن اپنی حد تک اس کی کوشش پوری کرنی چاہئے، انشاء اللہ کوشش کرنے سے بہت کچھ فرق ہو جائے گا — اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہونے لگیں تو یہ مراقبہ کر لیا کریں، یعنی یہ سوچ لیا کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں، میں اگرچہ نہیں دیکھ سکتا، لیکن وہ مجھے دیکھ رہے ہیں، اور میں اُن کے حضور میں نماز ادا کر رہا ہوں — پھر پوری نماز میں، قیام میں، قعود میں، رکوع میں، سجود میں، یہی دھیان اور خیال رہے — اگر اس کیفیت کا ذرہ بھی نصیب ہو جائے تو بہت ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ نماز میں جن چیزوں کا پڑھنا بالکل مقرر ہے، مثلاً:- ثنا، سورۂ فاتحہ، رکوع سجدہ کی تسبیحات، تشہد یعنی التحیات، درود شریف وغیرہ — کم از کم ان کا مطلب، تو ضرور ایسا یاد کر لیا جائے کہ ان چیزوں کے پڑھتے وقت آپ کو دھیان رہے کہ ان لفظوں میں آپ اپنے مالک ومعبود سے کیا عرض کر رہے ہیں، تاکہ آپ کے دل کی کیفیت بھی اس کے مطابق رہے، اس سے حضورِ قلب میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔

جو لوگ بے سمجھے بوجھے نمازیں پڑھتے ہیں اُن سے فرض تو ضرور ادا ہو جاتا ہے، لیکن اُن کی وہ نمازیں بڑی گھٹیا درجہ کی نمازیں ہیں اور اُن سے اُن کی نمازوں کو شکایت ہوگی، کہ اُنھوں نے اُنکی طرف سے ایسی بے توجہی برتی۔

یہاں ایک غلطی کو بھی صاف کرتا چلوں، جو اس زمانے کے بعض لوگوں کو اس مسئلہ میں ہوتی ہے، اُن کا خیال ہے کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے ہیں اور معنی مطلب سمجھے بغیر نمازیں پڑھتے ہیں (جیسا کہ عام مسلمانوں کا حال ہے) اُن کی نمازیں بالکل فضول ہیں، اور وہ سرے سے ادا ہی نہیں ہوتیں — یہ خیال قطعاً غلط ہے اور اس میں سخت غلو ہے — اگر

نماز کا مقصد صرف اتنا ہی ہوتا کہ جو کچھ اس میں پڑھا جاتا ہے اس کو سمجھا جائے، تو بے شک ایسے لوگوں کی نمازیں بالکل فضول ہی ہوتیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ نماز سے بہت سی چیزیں مطلوب ہیں — مثلاً وقت آجانے پر اور نماز کی پکار بلند ہونے پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اللہ کے حضور میں حاضر ہو جانا، اللہ کے حکم کے مطابق اپنے کو پاک کر کے سب طرف سے رُخ پھیر کے اللہ کی طرف اپنا رُخ کر لینا، اپنے آپ کو ایک عاجز بندے کی حیثیت سے اُس کے سامنے پیش کر دینا، اس کی بارگاہ میں ادب اور تعظیم کے ساتھ دست بستہ کھڑا ہو جانا، جھک کر اور خاک پر پیشانی رکھ کر اپنی بندگی اور نیازمندی کا اظہار کرنا، جس حال میں جو کچھ پڑھنے کا حکم ہے اس کو پڑھنا — پس چونکہ عام نمازی مسلمان جو بیچارے معنی مطلب سمجھے بغیر نمازیں پڑھتے ہیں ان کی نمازوں سے یہ مقاصد پورے ہو جاتے ہیں اسلئے ان کی نمازیں ادا تو یقیناً ہو جاتی ہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ معنی مطلب سمجھنے کا جو خاص نور ہے، ان کی نمازیں اس سے خالی رہتی ہیں، اور یہ بہت بڑا گھاٹا اور بہت بڑی محرومی ہے، اسلئے اس میں بے پروائی ہرگز نہیں کرنی چاہئے، جس طرح اس دنیا کی اپنی چیزوں کے متعلق ہمارا جی چاہتا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر اور حسین و جمیل ہوں، اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنی نمازوں کے متعلق ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ وہ حسین و جمیل اور نورانی ہوں۔

بہرحال ہمارے جن دوستوں نے ابھی اس طرف توجہ نہیں کی ہے انھیں خود بھی توجہ کرنی چاہئے، اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دینی چاہئے، اور انھیں بتلانا چاہئے کہ بہت تھوڑی سی محنت اور معمولی توجہ سے نماز کے مقررہ اذکار کا مطلب یاد کیا جا سکتا ہے، اور اس سے ان کی نمازوں میں بہت ترقی ہو سکتی ہے، انشاء اللہ ایسا کرنے سے خارجی خیالات بھی کم آئیں گے۔

نماز میں خیالات آنے کی شکایت

جب ذکر آ گیا ہے تو نماز میں خیالات آنے کے متعلق بھی کچھ عرض کر دوں۔ اکثر حضرات اسکی شکایت کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے بہت شکستہ دل ہوتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے نماز خراب ہو جاتی ہو، خواہ مخواہ ایسے وہموں میں نہیں پڑنا چاہئے — اپنی طرف سے اس کی فکر اور کوشش تو ضرور کرنی چاہئے کہ نماز میں بیرونی خیالات نہ آئیں، لیکن اسکے باوجود جو خیالات آپ سے آپ دل میں آ جاتے ہیں، جن کو ہم اپنے ارادہ اور اختیار سے نہیں لاتے اُن سے ہرگز نماز خراب نہیں ہوتی، اور یہ کوئی پریشان ہونے کی بات نہیں ہے، تاہم اس کی فکر اور کوشش جاری رکھنی چاہئے کہ نماز میں ایسے خیالات نہ آئیں، اور سمجھ کے نماز پڑھنے سے، اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری کا دھیان رکھنے سے ان خیالات میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔

نماز کی تکمیل اور ترقی کے سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ اللہ کے ایسے بندوں کے پاس رہا جائے، اور انکی نمازوں کو دیکھا جائے، جن کی نمازیں اللہ کے فضل سے کامل ہیں، کم از کم ہماری نمازوں کے اعتبار سے کامل ہیں، اور جب یہ میسر نہ ہو تو ایسی کتابیں ہی دیکھی جائیں جن کے دیکھنے سے ہمیں اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کا شوق پیدا ہو، اور اس معاملے میں رہنمائی حاصل ہو سکے — جیسے کہ امام غزالیؒ کی "کیمیائے سعادت" وغیرہ — "نماز کی حقیقت" کے نام سے اس عاجز کا بھی

ایک رسالہ ہے، اس میں بھی حضرات بزرگان دین کی ایسی چیزیں اس عاجز نے خاص اہتمام سے نقل کی ہیں جن سے نماز کی ترقی اور تکمیل کا شوق اور اہتمام پیدا ہو، اور اس سلسلہ میں رہنمائی بھی حاصل ہو ـــــ اور چونکہ اُسکے وہ خاص مضامین میرے اپنے نہیں ہیں، بلکہ میں نے ان کو عربی یا فارسی کتابوں سے صرف اُردو میں منتقل کر دینے کا کام کیا ہے، اور صاف لفظوں میں اس حقیقت کا وہیں اظہار بھی کر دیا ہے، اسلئے اسکے اظہار میں میں کوئی حجاب اور شرم محسوس نہیں کرتا، کہ جب کبھی میں خود بھی اپنی ہی لکھی ہوئی اس کتاب کو دیکھتا ہوں تو الحمد للہ ہر دفعہ اپنی نماز کو بہتر بنانے کا شوق اسکے مطالعے سے پیدا ہوتا ہے، اور مجھے نفع ہوتا ہے ـــــ

میں نے یہ بات آپ حضرات کے سامنے اس لالچ میں کہدی ہے کہ شاید اس سے آپ کو بھی اُسکے مطالعہ کا شوق ہو، اور آپ کی نمازوں میں اس سے کوئی ترقی ہو، اور پھر "الدال علی الخیر کفاعلہ" کے اصول پر مجھے بھی اُس کے اجر میں کوئی حصّہ مل سکے۔

نماز کو بہتر بنانے کی ایک نبوی تدبیر

نماز کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی یاد آگئی، اور وہ خود رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بتلائی ہوئی تدبیر ہے، اور اس پر عمل کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں ـــــ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک صحابی کو نصیحت فرمائی تھی:- "اِذَا قُمْتَ فِیْ صَلٰوتِكَ فَصَلِّ صَلٰوةَ مُوَدِّعٍ"[1]، مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو، تو الوداع کہنے والے کی سی نماز پڑھو، یعنی جو شخص اس دنیا کو اور دنیوی زندگی کو الوداع کہنے والا ہو، اور ہمیشہ کے لئے سب سے رخصت ہونے والا ہو، اس کی نماز جیسی ہونی چاہئے، تم ویسی نماز پڑھا کرو ـــــ جس کی عملی صورت یہ ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہونے لگیں تو یہ خیال کریں کہ کیا خبر ہے شاید یہی میری آخری نماز ہو، اور اسکے بعد کوئی اور نماز ادا کرنے کا مجھے موقع نہ ملے، بس یہ خیال کرکے اور اچھی طرح اس کا مراقبہ اور دھیان کرکے اپنی نماز کو ظاہر اور باطن کے لحاظ سے بہتر سے بہتر ادا کرنے کی کوشش کریں، انشاء اللہ اس تدبیر سے بے حد نفع ہوگا، اور نماز میں جان آجائے گی۔

نماز کی ترقی کے سلسلہ کی جو باتیں ذہن میں تھیں وہ میں کہہ چکا، اب نماز ہی کے سلسلہ میں ایک اور بات عرض کرنی ہے:-

نوافل

فرض تو روزانہ صرف پانچ نمازیں ہیں، ان کے علاوہ کچھ سنتیں ہیں اور کچھ نوافل ہیں، اور توفیق کے مطابق فرضوں سے آگے پیچھے والی سنتیں اور ان کے ساتھ کے نوافل بھی الحمد للہ ہم آپ اکثر پڑھ لیتے ہیں ـــــ لیکن ان کے علاوہ جو نوافل ہیں جیسے تہجد، اشراق، اوابین جن کی رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابۂ کرام کو ترغیب دیتے تھے، اور خود بھی پڑھا کرتے تھے، اور آپ نے اُنکے بڑے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں، ان کی توفیق ہم کو بہت کم ہوتی ہے ـــــ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم آپ پر یہ فضل فرمایا ہو کہ

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الرقاق-۱۲

دین سے ایک درجہ کا تعلق بخشتا ہے، اور اپنے کرم سے اس کی رغبت دی ہے، اس نعمت کا خاص شکر یہ ہے کہ اس کی قدر کریں، اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، اور کم از کم خاص خاص اوقات کے یہ نوافل پڑھ لیا کریں۔ ان میں وقت کا صرف بہت کم ہے، اور ثواب بہت زیادہ بتلایا گیا ہے ——— بالخصوص تہجد کی عادت ضرور ڈالنی چاہئے۔

تہجد کی غیر معمولی اہمیت اور اس کی خاص برکات

قرآن مجید سے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طرزِ عمل سے بھی تمام غیر فرض نمازوں میں تہجد کی خاص فضیلت اور اہمیت معلوم ہوتی ہے، سورۂ مزمل میں جس طرح تہجد کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے میری سمجھ میں یہ آتا ہے، کہ تہجد میں بعض وہ تاثیریں اور برکتیں ہیں جو فرائض میں بھی نہیں ہیں اسلئے اسکو فرض ہونا چاہئے تھا لیکن امت کی آسانی کے لئے اس میں رخصت دیدی گئی ہے ——— بلکہ اکثر علماء کی تحقیق یہ ہے کہ تہجد شروع میں فرض ہی تھا، سورۂ مزمل کے دوسرے رکوع کی آیتیں جب نازل ہوئی ہیں اُس وقت امت کی سہولت کے لئے رخصت دی گئی، اور اس کی فرضیت اٹھالی گئی، اور اس کو سنت قرار دے دیا گیا ——— لیکن اپنی بعض خصوصیات اور انوار کے لحاظ سے وہ دوسری سب نمازوں میں ممتاز ہے ——— تہجد ہی وہ نماز ہے جس میں حضور کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا، اور اسکے باوجود آپ پڑھتے تھے ——— اور تہجد ہی کا وقت وہ وقت ہے جس کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اطلاع دی ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی وہ خاص عنایتیں متوجہ ہوتی ہیں جو دوسرے اوقات میں نہیں ہوتیں ——— آپ اسی وجہ سے تہجد کے لئے ازواج مطہرات کو بھی اٹھادیتے تھے ——— اسی طرح صحابۂ کرام کو تہجد کی خاص تاکید فرماتے تھے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا:—

"عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَإِنَّهُ دَأْبُ الصَّالِحِيْنَ قَبْلَكُمْ وَهُوَ قُرْبَةٌ لَّكُمْ إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَمَكْفَرَةٌ لِّلسَّيِّئَاتِ وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْإِثْمِ" یعنی تم تہجد کو لازم پکڑلو کیونکہ وہ تم سے پہلے اللہ کے صالح بندوں کا دستور العمل رہا ہے، اور تم کو تمہارے رب سے وہ قریب کرنے والا ہی اور تمہارے گناہوں کے لئے کفارہ بننے والا ہے، اور تم کو گناہوں سے روکنے والا ہے۔[1]

اور ظاہر بات ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس قسم کے دینی احکام صرف صحابۂ کرام کے لئے نہیں تھے، بلکہ ان ارشادات کے مخاطب قیامت تک کے سب مسلمان ہیں، ہمیں محسوس کرنا چاہئے کہ گویا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) براہِ راست ہم کو ارشاد فرمارہے ہیں، اور آپ نے اس حدیث میں تہجد کی جو برکات اور اسکے جو خواص بیان فرمائے ہیں اُن پر پورا یقین کرکے ہمیں اس پر عمل کرنا چاہئے۔

---

[1] رواہ الترمذی عن ابی امامۃ۔ مشکوٰۃ باب التحریض علی صلوٰۃ اللیل۔ ۱۲

تہجد کی اہمیت کا اندازہ اُس حدیث سے بھی ہوتا ہے جس میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی ترغیب دی ہے کہ گھر میں اگر مرد تہجد کے لئے پہلے اُٹھے تو بیوی کو بھی اٹھانے کی کوشش کرے، یہانتک کہ اگر وہ نہ اُٹھے تو اُسکے منھ پہ پانی کا ہلکا سا چھینٹا مار کے اُس کو بیدار کرنے کی کوشش کرے، اور اسی طرح اگر گھر کی بیوی پہلے اٹھ جائے تو وہ اپنے شوہر کو اٹھانے کی کوشش کرے، اور اگر ضرورت پڑے تو اسی طرح وہ بھی جگانے کے لئے پانی کا ہلکا سا چھینٹا اسکے منھ پہ مارے[1] ——— حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا کرنے والے شوہروں اور بیویوں کو بڑی پیاری دعا دی ہے، اسی حدیث میں ارشاد ہے :-

"رحم اللہ رجلاً قام من اللیل" اور "رحم اللہ امرأۃ قامت من اللیل"

یعنی ایسا کرنے والے مردوں پر اور ایسا کرنے والی بیویوں پر خدا کی خاص رحمت ہو ——— اور ایک دوسری روایت میں "رحم اللہ" کی جگہ "نضر اللہ" کا لفظ آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے شوہروں اور ایسی بیویوں کو تازہ اور شاداب رکھے۔

فرض نمازوں کے علاوہ کسی سنت یا نفل کے لئے حضورؐ نے ایسی ترغیب نہیں دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد غیر فرض نمازوں میں سب سے زیادہ اہم اور افضل ہے ——— بلکہ ایک حدیث کے تو صاف الفاظ یہ ہیں :-

"افضل الصلوٰۃ بعد الفریضۃ صلوٰۃ اللیل"[2] یعنی فرض کے بعد سب نمازوں میں افضل تہجد ہے۔

لیکن چونکہ اُس وقت کا اٹھنا نفس کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے، اِسلئے بہت سے وہ حضرات بھی جن کو الحمد للہ دین سے اچھا خاصا تعلق ہے وہ بھی تہجد کے لئے نہیں اُٹھتے ——— حالانکہ تہجد کی فضیلت اور اہمیت میں اس کو بھی دخل ہے کہ اُس وقت کے اُٹھنے میں نفس کو مشقت پڑتی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں صاف فرمایا گیا ہے :-

"ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأً واقوم قیلاً" "اشد وطأً" کا مطلب یہی ہے کہ تہجد نفس کو خوب کچلنے والا اور روندھنے والا عمل ہے ——— بہرحال یہی تو اس کی فضیلت ہے، اور اسی سے تو اسکی خاص قیمت ہے۔

دینی دعوت اور تہجد

خاصکر ہمیں آپ کو جو الحمد للہ ایک دینی دعوت سے تعلق رکھتے ہیں، تہجد کا خاص طور سے اہتمام کرنا چاہئے قرآن شریف کے ایک اشارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد میں دین کے راستے کی طاقت پیدا کرنے کی بھی

---

[1] یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ یہ حکم اُن میاں بیویوں کو ہے جن میں دینی ذوق ہو، اور ایسا کرنے سے آپس میں ناراضی اور اختلاف بڑھنے کا اندیشہ نہ ہو، جن گھروں میں دینی ذوق ہوگا وہاں ایسا کرنے سے محبت بڑھے گی ——— یہ حدیث مشکوٰۃ میں ابوداؤد اور نسائی کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۲

[2] رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ مشکوٰۃ باب فی صیام التطوع۔ ۱۲

خاص تاثیر ہے ـــــ سُورۂ مزمل میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ حکم دینے کے بعد کہ تم رات کے آدھے حصّے میں، یا اس سے کم، یا اس سے کچھ زیادہ تہجد پڑھا کرو متصلاً فرمایا گیا ہے:-

"اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا" یعنی ہم تم پر ایک بہت بھاری بات کا بوجھ ڈالیں گے"

گویا اشارہ فرمایا گیا ہے، کہ تہجد اُس بوجھ کو اُٹھانے کے لئے تیار کرنے والی چیز بھی ہے، اور اس سے ایک خاص طاقت پیدا ہوتی ہے۔

تہجد کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ صحابۂ کرام میں تہجد عام طور سے طویل پڑھنے کا رواج تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگ جس طرح قرآن شریف مُصْحَف میں دیکھ کے تلاوت کرتے ہیں، یہ تلاوت تو اُن کے یہاں مروج تھی نہیں، عام طور سے پورا قرآن مجید یا اُس کا کافی حصّہ لوگوں کو حفظ ہوتا تھا، اور اس کو تہجد ہی میں عموماً پڑھا جاتا تھا، میں نے ایک روایت میں کہیں دیکھا تھا کہ ایک صحابی نے غالباً اپنے لڑکے کی شکایت کی تھی کہ وہ رات کو تہجد میں قرآن پڑھنے کے بجائے دن کو پڑھتا ہے۔

بہر حال جو حضرات صحابۂ کرام کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ حضرات تہجد میں بہت طویل قرأت فرماتے تھے، گویا تہجد ہی ان کی تلاوت کا وقت تھا۔

اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ہمیں اس کی بھی تقلید کرنی چاہئے، ہم میں سے جن کو قرآن مجید کا کچھ زیادہ حصّہ یاد ہے وہ تہجد میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر جلدی فارغ ہونے کی کوشش نہ کیا کریں ـــــ میں نے عرض کیا تھا کہ یہی وہ نماز ہے جس میں حضورؐ کے پائے مُبارک پر ورم آجاتا تھا۔

آخر شب میں اللہ کا ذکر

نماز کے علاوہ ذکر و تلاوت کے لئے بھی وہ وقت سب سے بہتر ہے۔ ایک حدیث میں ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:-

"اقرب ما یکون الرب من العبد فی جوف اللیل الآخر فان استطعت ان تکون ممن یذکر اللہ فی تلک الساعۃ فکن"[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصّے میں ہوتے ہیں، اسلئے اگر تم سے ہو سکے کہ اُس وقت تم اللہ کا ذکر کرنے والے بندوں میں ہو، تو ضرور ایسا کرو، اور وہ قیمتی وقت غفلت میں نہ گذارو۔

ذکر کے متعلق یہ آخری بات تو میں نے ضمناً بیان کر دی، ورنہ در اصل میں اپنی نمازوں کی ترقی اور تکمیل کے متعلق آپ حضرات سے کچھ عرض کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں میں نے ضرورت سمجھی کہ تہجد کی طرف بھی آپ حضرات کو توجہ دلاؤں۔

---

[1] رواہ الترمذی عن عمرو بن عبسۃ مشکوٰۃ باب التحریض علی صلوٰۃ اللیل ۱۲-

اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان باتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے، اور آپ حضرات کو بھی نفع پہنچائے۔

اب میں باقی ارکان، زکوٰۃ، روزہ، اور حج کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں:۔

زکوٰۃ ارکان میں نماز کے بعد زکوٰۃ کا درجہ ہے، زکوٰۃ کا مقصد بھی دوسری عبادات کی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا اور اپنے نفس کی تطہیر اور اُس کا تزکیہ ہے ـــــ یہ حقیقت ہے کہ اکثر رذائل کی جڑ حبِ دنیا (حبِ مال اور حبِ جاہ) ہے ـــــ اور حبِ مال حبِ جاہ سے زیادہ عام ہے۔ زکوٰۃ حبِ مال کو توڑنے کا خاص ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زکوٰۃ کی اہمیت نماز ہی کے قریب قریب ہے۔ اسلام میں زکوٰۃ کا جو مقام ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد جن قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ فرمایا اور پھر تمام صحابۂ کرام نے اُن کے اس فیصلہ سے اتفاق کیا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنے کی بات ہے کہ مسلمانوں سے دین کا مالی مطالبہ صرف زکوٰۃ ہی پر ختم نہیں ہوتا ہے، بلکہ اسکے علاوہ اور بھی حقوق ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں صراحۃً ارشاد ہے:۔

"ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ" (مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی بعض اور حقوق ہیں)۔

فقہا نے اپنے اپنے موقع پر اُن حقوق کو بیان بھی کیا ہے۔

قرآن مجید میں "انفاق فی سبیل اللہ" کا، یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا مطالبہ اتنی کثرت سے اور اتنی تاکید سے کیا گیا ہے اور اس کے لئے جا بجا ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ گویا وہ ایمان کا لازمی جز ہے ـــــ یوں تو ہم مسلمانوں میں اللہ کے تمام ہی احکام سے بے فکری اور بے اعتنائی عام ہو گئی ہے، اور بہت کم لوگوں کو اسکی فکر رہ گئی ہے لیکن سب سے زیادہ بے اعتنائی اس انفاق کے مسئلہ میں ہو رہی ہے ـــــ خصوصاً ہمارے اس زمانے میں دولت کی محبت اور خود غرضی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اپنی دولت دوسرے ضرورت مندوں پر صرف کرنے کا رواج بہت ہی کم ہوتا جا رہا ہے ـــــ اور اللہ کے جو بندے اس فریضے کو ابھی تک ادا کرتے بھی ہیں، اُن میں سے اکثر اسکے مصرف کے بارے میں اور ادائیگی کے طریقہ میں بڑی بے فکری اور بے اعتنائی برتتے ہیں ـــــ اور اسی لئے وہ برکات ان کو حاصل نہیں ہوتیں جن کا قرآن پاک میں راہِ خدا میں مال خرچ کرنے والوں کے لئے پختہ وعدہ کیا گیا ہے۔

نماز کی طرح زکوٰۃ کو بھی بہتر طریقے پر ادا کرنے کی فکر ضروری ہے! زکوٰۃ بھی جب نماز کی طرح ایک رکن ہے تو اس کو بھی بہتر سے بہتر طریقے سے ادا کرنے کی ہمیں نماز ہی کی طرح فکر کرنی چاہئے، جس طرح وہ نماز بے رُوح اور بے نور ہے جو بے فکری سے ادا کی گئی ہو اسی طرح وہ زکوٰۃ بھی بے رُوح اور بے نور ہے جس کو بہتر سے بہتر

طریقے پر ادا کرنے کی فکر نہ کی گئی ہو، اور ادائیگی میں اُسکے آداب کا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔

زکوٰتوں کو نورانی بنانے کی تدابیر زکوٰۃ کو نورانی بنانے کے لئے جن چند باتوں کا خاص طور سے لحاظ کرنا چاہئے وہ یہ ہیں:۔
اوّل یہ کہ نماز کی طرح اُسکے مسائل سیکھے، اور نیت میں اخلاص پیدا کرے۔

دوسرے یہ کہ تلاش کرکے اور سوچ سمجھ کے ایسے مصرف میں صرف کرے، جس کو صحیح تر اور بہتر سمجھے، اور جس پر صرف کرنے سے اللہ کی رضا کی اور اجر کی زیادہ اُمید ہو۔

تیسرے یہ کہ جس کو دے اُس پر اپنا کوئی احسان نہ سمجھے، اور نہ اُس کو حقیر جانے، بلکہ اُس کا احسان مانے کہ اُسکی وجہ سے ہمارا یہ فرض اچھی طرح ادا ہو گیا، اور اپنی اس ممنونیت کو اپنے عمل سے اور اپنی زبان سے ظاہر کرے۔

چوتھے یہ کہ دیتے وقت نماز کی طرح یہ دھیان کرے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں اور میرے اس عمل کو اور میری نیت کو دیکھ رہے ہیں، اور میں اُن ہی کے حکم سے اور اُن کے سامنے اُن کے اس بندہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

پھر دے کے اللہ تعالیٰ سے قبول فرمانے کی اور برکت کی دُعا کرے، اسکے علاوہ بھی جو چاہے اللہ سے مانگے۔ جس طرح نمازوں کے بعد دُعا کی جاتی ہے۔

اگر زکوٰتیں اس طرح ادا کی جائیں تو انشاء اللہ دنیا میں بھی اُن کی برکتیں دیکھ لی جائیں — تجارتوں میں اور زمین کی پیداواروں میں وہ برکت ہو کہ اہلِ دنیا کی سمجھ میں نہ آئے۔

روزہ نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسرا عملی رکن "روزہ" ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رُوحانیت اور ملکوتیت کا جو حصہ رکھا ہے، روزہ اُس کو ترقی دینے کا، اور نفس کی تطہیر اور تزکیہ کا خاص ذریعہ ہے، اور قناعت اور صبر و تقویٰ جیسی ملکوتی صفات کے نشو و نما میں روزہ کو خاص دخل ہے — علاوہ اسکے روزہ میں انسان پیٹ کے اور شہوتِ نفس کے خالص مادی اور بہیمی تقاضوں سے بے تعلق ہو کر ملاءِ اعلیٰ اور عالمِ ملکوت سے خاص ربط اور مناسبت پیدا کر لیتا ہے — لیکن نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ سے بھی یہ مقاصد جب ہی حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ وہ عبادت والی فکر کے ساتھ رکھا جائے، اور اُسکے آداب کا پورا لحاظ کیا جائے، اور اُن تمام باتوں سے پرہیز کیا جائے جو ان مقاصد کے منافی ہیں جن میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہر قسم کے معاصی سے بچا جائے، خاصکر تمام بُری باتوں سے مُنھ کی، اور زبان کی حفاظت کی جائے، اگر ایسا نہیں کیا گیا، تو روزہ سے یہ رُوحانی نتائج ہرگز حاصل نہیں ہونگے، حدیث شریف میں ہے:۔

"من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة ان یدع طعامه وشرابه"

یعنی جو شخص روزہ میں بھی جھوٹ بولنا اور غلط اور دھوکہ فریب کے کام کرنا نہ چھوڑے، تو اللہ کو اسکی کوئی

حاجت نہیں ہے کہ وہ کھانا پینا چھوڑ کر صرف بھوکا پیاسا رہے"

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے :۔

"رب صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع" یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کو اُن کے روزہ سے سوائے بھوکا رہنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بہرحال نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ میں بھی اس کی ضرورت ہے کہ فکر اور اہتمام سے ایسے روزے رکھے جائیں جن سے ہماری روحوں کو پاکیزگی حاصل ہو، اور ہم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔

روزے کی برکات حاصل کرنے کی شرطیں اور تدبیریں

اس کے لئے ایک شرط تو یہی ہے کہ ہر قسم کے معاصی سے، اور خاص طور سے منھ اور زبان سے تعلق رکھنے والے گناہوں سے، بلکہ مکروہات سے بھی پورا پرہیز کیا جائے، حتیٰ کہ حدیث شریف میں ہے، کہ: "چیخ کے بھی نہ بولا جائے" ——— اور اسکے برعکس نیکیوں کی مقدار روزہ کے ایام میں بڑھادی جائے، خاصکر منھ اور زبان سے تعلق رکھنے والی نیکیوں کی، مثلاً تلاوت اور ذکر کی کثرت کی جائے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا، اور اسکے حکم اور امر کا زیادہ سے زیادہ استحضار رکھا جائے، یعنی بار بار اس کا مراقبہ اور دھیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں، اور میں نے اُن کے حکم سے اور اُن کے لئے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے، اور وہ میرے اس حال کو دیکھ رہے ہیں، خاصکر جب بھوک یا پیاس کا احساس ہو تو دل سے کہا جائے کہ اگرچہ کھانا اور پانی حاضر اور موجود ہے، لیکن اللہ کے حکم کی وجہ سے اور اللہ کو راضی کرنے کیلئے تجھے بھوکا اور پیاسا ہی رہنا ہے، تیرا مالک و معبود آج تیری اسی بھوک اور پیاس سے خوش ہے، اور آج کی یہ بھوک پیاس انشاءاللہ تجھے آخرت کی سخت ترین بھوک پیاس سے بچانے والی ہے۔

افطار اور سحر میں کم کھانا بھی روزہ کو نورانی بنانے والی چیز ہے، اور بسیار خوری سے روزہ میں ظلمت اور کدورت پیدا ہوتی ہے، اور اس کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔

نفلی روزوں کے بارے میں اُسوۂ نبوی اور ہمارا طرزِ عمل

روزہ کے سلسلہ میں ایک اس چیز کی طرف بھی مجھے آپ حضرات کو توجہ دلانی ہے کہ نماز کے باب میں تو ہمارا یہ حال ہے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے، جو صرف فرض رکعتوں پر قناعت کرتا ہو اور سنن و نوافل نہ پڑھتا ہو، بلکہ اگر کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرے تو اُسے بُری نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اُسکے متعلق اچھا خیال قائم نہیں کیا جائے گا۔ لیکن روزہ کے باب میں قریب قریب ہم سب کا طرزِ عمل یہ ہی ہے کہ بس رمضان کے روزے سال میں ایک دفعہ رکھ لیتے ہیں ——— بہت کسی نے ہمت کی تو عرفہ کا، یوم عاشوراء کا، اور شب برات کا ایک ایک روزہ رکھ لیا، حالانکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح فرض نمازوں کے علاوہ

نفل نمازیں پڑھتے تھے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے تھے، اسی طرح آپ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی کثرت سے رکھتے تھے، اور ان کی بھی امت کو ترغیب دیتے تھے ——— ہر مہینے ایام بیض کے، یعنی تیرھویں، چودھویں، پندرھویں تاریخوں کے ۳ روزے تو آپ قریب قریب ہمیشہ ہی رکھتے تھے ——— اسکے علاوہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو آپ کا اکثر روزہ ہوتا تھا۔ ہمیں اپنے عمل سے حضورؐ کی اس سنت کو بھی زندہ کرنا چاہئے ———
روزہ تو بڑی برکت والی اور روح کو بہت پاک اور نورانی بنانے والی چیز ہے۔ روزے کے انوار و برکات سے پورے گیارہ مہینے محروم رہنا بڑے خسارے کی بات ہے۔

نفلی روزے نہ رکھنے کا اثر ہمارے رمضان کے روزوں پر

بلکہ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ گیارہ مہینے مسلسل روزے نہ رکھنے کی وجہ سے ہمارے رمضان کے روزے بھی گھٹیا ہوتے ہیں۔ اگر ہر مہینے کچھ روزوں کا معمول رہے تو روزہ کی کیفیات اور اسکے انوار سے ایک خاص مناسبت قائم رہے، اور پھر رمضان آنے پر ہماری حالت کچھ اور ہی ہوا کرے۔
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ یوں تو آپ ہر مہینے کچھ روزے رکھتے تھے لیکن خصوصیت سے شعبان میں بہت روزے رکھتے تھے، بلکہ کبھی کبھی قریباً پورے مہینے کے روزے رکھتے تھے میرے خیال میں اس کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ روزے کی حقیقت سے، اور اسکے انوار سے طبیعت مبارک کی مناسبت اور زیادہ بڑھ جائے۔ واللہ اعلم۔
بہرحال نفل نمازوں کی طرح ہمیں نفلی روزوں سے بھی شوق پیدا کرنا چاہئے، اور ان کی عادت ڈالنی چاہئے ——— اللہ تعالیٰ توفیق دے کم از کم ہر مہینے ۱۳ — ۱۴ — ۱۵ کا روزہ رکھ لیا کریں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معمول بھی یہی تھا، اور ایک حدیث میں آتا ہے، کہ :- "ہر مہینے میں تین روزے، اور ہر سال پورے رمضان کے روزے رکھنا اجر و ثواب کے لحاظ سے ایسا ہے جیسا کہ کوئی ہمیشہ بارہ ۱۲ مہینے روزے رکھے"

حج

حج اسلام کا آخری رکن ہے ——— اور دوسری عبادات کی طرح اس کی بھی اصل غایت تو اللہ کی رضا ہی ہے، لیکن اس کی ایک خاص اور امتیازی نوعیت ہے۔
اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے ساتھ حضور سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو، اور آپ کی وساطت سے آپ کی امت کو بھی ایک خاص تعلق ہے، حج در اصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان ہی کی عبدیت اور فدائیت کی نسبت کا ایک ظاہری و باطنی خاکہ ہے، اور حج کے حکم کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا جو بندہ وہاں پہونچ سکے وہ عمر میں ایک دفعہ ضرور اللہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے اسکے خلیل کی ہیئت بنا کر پہونچے، اور ان کے کامل عبدیت اور کامل محبت والے مسلک سے اپنی وابستگی کا ثبوت دے، اور اللہ کے جو شعائر اس سرزمین میں ہیں ان سے عظمت و محبت کے اپنے تعلق کا اظہار کرے،

اور اپنے ظاہر و باطن کو ابراہیمی رنگ میں رنگنے کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرے اور اُس کی روح وہاں کے خاص انوار و برکات سے اپنا حصہ لے۔

حج کے متعلق اس سے زیادہ کہنا آپ کے لئے کچھ مفید نہ ہوگا، حج کی باتیں حج کرنے ہی سے سمجھ میں آتی ہیں۔

حج کے لئے روح اور باطن کو تیار کرنے کی ضرورت

ہاں! جب اللہ تعالیٰ توفیق دے، اور آپ میں سے کوئی بھائی ارادہ فرمائیں تو اس کے لئے کچھ پہلے سے اپنی رُوح اور اپنے باطن کو تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

افسوس ہے کہ لوگ مادی ضروریات کی تو فکر کرتے ہیں، نمک مرچ، اچار چٹنی تک ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، دس دس جوڑے کپڑے بنواتے ہیں، اور مہینوں پہلے سے ان چیزوں کے انتظام کی فکر کرتے ہیں، لیکن حج کے لئے رُوحانی تیاری کی فکر کرنے کا بالکل رواج نہیں، اسی لئے جیسے جاتے ہیں ویسے آجاتے ہیں —— ان مادی ضروریات کا انتظام اگرچہ بالکل جائز ہے، بلکہ بقدرِ ضرورت، ضروری ہے، لیکن یہ حج کی اصل تیاری نہیں ہے۔ حج کی اصل تیاری حج کرنا سیکھنا اور اپنی رُوح اور اپنے باطن کو حج کے انوار اور برکات لینے کے قابل بنانا ہے۔

آفاتِ حج کے سلسلہ کا یہ بڑا ضروری کام ہے کہ حج کا ارادہ کرنے والوں کو اس طرف توجہ دلائی جائے اور ان کو اس کی اہمیت اور ضرورت بتلائی جائے۔ حج میں رُوح پیدا کرنے کی اور رسمی حج کو حقیقی بنانے کی یہی صورت ہے۔

اب تک میں نے اعمال اور عبادات کے سلسلے میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا ذکر کیا ہے —— ایمان کے بعد اسلام کے یہ چار رکن ہیں۔

ارکانِ اسلام کے رکن ہونے کا مطلب اور ان کا امتیاز

ان کے رکن ہونے کا مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ چاروں چیزیں ایمان کی طرح مقصود بالذات ہیں اور اپنی معین شکل و صورت کے ساتھ مطلوب ہیں اور ایک مسلمان کے مسلمان ہونے کا ان سے عملی ثبوت ملتا ہے —— ان کے علاوہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اگرچہ وہ دین میں ضروری ہیں، لیکن ان کی شکل و صورت شریعت نے اس طرح مقرر نہیں کی ہے بلکہ صرف اصول بتلا دئے ہیں، یا وہ مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ کسی مقصد کا ذریعہ ہیں، مثلاً دین سیکھنا سکھانا بھی ضروری ہے، فرائض میں سے ہے۔ اسی طرح مثلاً دین کی نصرت اور حمایت بھی فرائض میں سے ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ ارکان کی طرح ان کی شکل اور ہیئت مقرر نہیں کی گئی ہے اور یہ مقصود بالذات بھی نہیں ہیں، بلکہ تعلیم و تعلم اسلئے ضروری ہے کہ دین پر چلنا اُس پر موقوف ہے، اسی طرح دین کی نصرت اور حمایت دین کی حفاظت اور اسکی ترقی اور ترویج کے لئے مطلوب ہے۔

ایک دوسری بات اس سلسلہ میں یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نام ہے اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری کا گویا عبدیت ہی کا دوسرا نام اسلام ہے، اور عبدیت کی صفت کا جیسا اظہار ان چار چیزوں سے ہوتا ہے ایسا کسی دوسرے دینی

عمل سے نہیں ہوتا، گویا اسی امتیاز کی وجہ سے ان کو رکن قرار دیا گیا ہے —— علاوہ ازیں انکے رکن قرار دیئے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہو کہ اگر یہ چاروں عبادتیں صحیح طور پر ادا کی جائیں، جیسا کہ ان کا حق ہے، تو ان کا اثر پوری زندگی پر پڑتا ہو، اور پھر پوری زندگی اسلام والی اور عبدیت والی زندگی بن سکتی ہو، لیکن شرط یہی ہو کہ یہ صرف ظاہری اور رسمی نہ ہوں، بلکہ اپنے ظاہر و باطن اور اپنے قالب و رُوح میں یہ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نماز، روزے اور زکوٰۃ و حج سے کچھ نسبت رکھتی ہوں —— واقعہ یہ ہے کہ ان چاروں چیزوں میں بڑی تاثیر اور بڑی جان ہے —— ہماری نمازیں اور ہمارے روزے، ہماری زکوتیں اور ہمارے حج اگر آج ہماری زندگیوں پر کوئی بڑا اثر نہیں ڈال رہے ہیں تو اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ بے رُوح اور بیجان ہیں۔

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم　　دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں طولِ امد کی وجہ سے جو تغیرات ہوا کرتے ہیں اُن میں سے ایک بڑا تغیر یہ ہوتا ہو کہ انکی عبادات میں رسمیت آجاتی ہو۔ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمّت میں بھی یہ تغیر آیا —— اُن مسلمان کہلانے والوں کا اس وقت ذکر نہیں جنھوں نے سرے سے ان ارکان ہی کو چھوڑ رکھا ہے، اور کافروں کی طرح عملاً ان ارکان سے بے تعلق اور بے پروا ہو کر زندگی گذار رہے ہیں، اُن کا جو حشر ہونے والا ہے وہ مرنے کے بعد آنکھوں کے سامنے آجائے گا —— بلکہ ہم اور آپ جیسے مسلمان جن کا تعلق الحمد للہ ان ارکان سے باقی ہو اُن کا بھی عام حال یہ ہے کہ انکے پاس ان اعمال کا صرف ظاہری خاکہ باقی ہے اور رُوح نکل چکی ہو، بہت کم اللہ کے بندے ہونگے جن کا حال اس عموم سے مستثنیٰ ہو۔ اگر ہمارے ان ارکان میں سے رُوح نہ نکل چکی ہوتی تو کم از کم اُمّت کے اُن طبقوں کا حال کچھ اور ہوتا جن کا تعلق ان ارکان سے اب بھی باقی ہو۔ وہ اپنے اخلاق میں، معاملات میں، معاشرت میں، اور اپنی پوری زندگی میں دنیا سے بالکل ممتاز ہوتے، جس سے اُن کا واسطہ پڑتا، اور جو اُن کو برتتا وہ اُن کے وجود کو رحمت سمجھتا، اور اُن میں ایک خاص محبوبیت اور خوشبو محسوس کرتا —— یہ بالکل حقیقت ہو، اس میں ذرا بھی شاعری نہیں ہے۔

اور اب بھی اللہ کے جن بندوں کا حال اس بگڑے ہوئے عموم سے مستثنیٰ ہے یعنی اُنکی عبادات میں رُوح ہو اور اُنکی نمازوں اُنکے روزوں اور اُنکی زکوٰۃ اور اُنکے حجوں کو رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نماز روزے اور آپ کی زکوٰۃ و حج سے کوئی نسبت ہے، اُنکی زندگی اب بھی ممتاز ہے، اور دیکھنے برتنے والوں کیلئے اُن میں محبوبیت اور خوشبو موجود ہے، لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ ہمارے اس زمانے میں ایسے بندے تو کبریتِ احمر کی طرح کم ہیں ہی، لیکن اُن کے دیکھنے اور برتنے والے بھی کم ہیں۔

ارکان میں حقیقت پیدا کرنے کی کوشش احیاءِ دین کے سلسلہ کا بنیادی کام ہے

اللہ تعالیٰ توفیق دے، اسوقت خدمتِ دین اور احیاءِ دین کے سلسلہ کا بنیادی کام یہ ہے کہ ان ارکان میں رُوح اور حقیقت پیدا کرنے کی کوشش کیجائے، اور اُمّت کی نمازوں، روزوں، زکوتوں اور حجوں کو ظاہر اور باطن کے لحاظ سے حضورؐ کے نماز روزے اور زکوٰۃ و حج کے منہاج پر لانے کیلئے جدوجہد کیجائے۔

عبادات کے سلسلے میں مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا، اب اسکے بعد شریعت کے دوسرے شعبوں کے متعلق اسی طرح کی کچھ اصولی باتیں عرض کرنی ہیں۔

اخلاقِ حسنہ

دین میں اخلاق کی اہمیت

جس طرح عبادت دین اور شریعت کا ایک شعبہ ہے اور اُس کا ہم بندوں سے مطالبہ کیا گیا ہے، اسی طرح اخلاق کا بھی ایک شعبہ ہے، اور دین میں اس کی بھی بڑی اہمیت ہے، بلکہ ایک پہلو سے دین کے دوسرے تمام شعبوں کے مقابلے میں اس کو فوقیت اور بالاتری حاصل ہے، اور وہ پہلو یہ ہے کہ اخلاق میں بندہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے یعنی اخلاق دراصل خدائی صفات ہیں، اور ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم بھی اپنی بندگی کی حیثیت کے مطابق وہی صفات اختیار کریں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے:۔ "تخلّقوا بِاَخلاقِ اللّٰہِ" (اللہ تعالیٰ والے اخلاق کو اپنے اخلاق بناؤ) —— اخلاق کی اسی امتیازی حیثیت کو سمجھنے کیلئے پہلے آپ ایک اصولی بات یہ سمجھ لیجئے کہ بندے کے جن اعمال سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور جن پر بندہ کو اجر و ثواب ملنے والا ہے وہ چار قسم کے ہیں۔

اعمالِ صالحہ کی ۴ قسمیں

ایک وہ اعمال جن کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اُس کی معبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بندگی اور اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے —— یہ شان عبادات کی ہے، گویا بندہ اپنی عبدیت کا اظہار عبادات ہی کے ذریعہ کرتا ہے۔

دوسری قسم وہ اعمال ہیں کہ دراصل بندہ اُن کو اپنی دنیوی ضرورت اور نفس کی خواہش سے کرنے پر مجبور ہے، لیکن جب بندہ اُن کو اللہ کی ہدایت اور اللہ کے احکام کی پابندی کے ساتھ کرتا ہے تو اُن پر بھی وہ اللہ کی رضا کا اور اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے —— مثلاً روزی کمانے کے لئے کھیتی باڑی یا تجارت یا مزدوری کرنا بندے کی اپنی ضرورت ہے۔ اسی طرح نکاح کرنا اور بچوں کا پالنا اپنی ضرورت اور اپنے نفس کی خواہش ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں کچھ احکام دیدیئے ہیں کہ اگر اُن کی پابندی کے ساتھ یہ کام کئے جائیں تو بندہ ان کاموں پر بھی اسی طرح اللہ کی رضا کا اور آخرت کے اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے جس طرح کہ عبادات پر مستحق ہوتا ہے —— یہ شان معاملات اور معاشرت کی ہے۔

تیسری قسم وہ اعمال ہیں جو دراصل انبیاء علیہم السلام کے ہیں، اور دوسرے لوگ اُن کو اُن کی نیابت میں اور اُن ہی کے مشن کی خدمت کے طور پر کرتے ہیں —— جیسے کہ دینی دعوت، دین کی نصرت، دین کے راستے میں جدوجہد اور قربانی، دین کی تعلیم اور تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ سب اعمال بھی اللہ تعالیٰ کو بہت راضی کرنے والے ہیں، اور بلاشبہ ان میں بہت بڑا اجر و ثواب ہے، اور ان کا خاص امتیاز یہ ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی نیابت والے اعمال ہیں، اور ان اعمال کے کرنے والوں کو انبیاء علیہم السلام سے ایک خاص نسبت ہوتی ہے جو دوسرے اعمال سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اور چوتھی قسم وہ اعمال ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا رنگ ہے —— یہ شان اخلاق کی ہے —— مثلاً رحم ایک خُلق ہے جو دراصل اللہ تعالیٰ میں ہے، اور وہ اس کی وجہ سے رحمٰن اور رحیم ہے، پھر بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنے اندر بھی رحم کی

صفت پیدا کریں، اور ہر قابلِ رحم مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں۔

اسی طرح خطا قصور معاف کرنا، اور دوسروں کے عیب چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں۔

علیٰ ہذا حیا اور حلم اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں، اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی ان کو اختیار کریں۔

ایسے ہی جود و کرم، سخاوت، حاجت مندوں کی مدد کرنا، عدل و انصاف کرنا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کریں۔

اسی طرح نیکوں سے اور نیکیوں سے محبت اور ان کو پسند کرنا، اور بُروں سے اور بُرائیوں سے بغض اور ان سے ناراض ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ اُن کا حال بھی یہی ہو۔

اخلاق میں ایک گونہ اللہ تعالیٰ کی نیابت ہے

الغرض بندے کے تمام اعمال اور احوال میں صرف اخلاق کی یہ شان ہے کہ بندہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے، یعنی وہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ خود کرتے ہیں یہ شان کسی دوسرے عمل کی نہیں ہے ـــــ اسلئے اس پہلو سے اخلاق کو بندے کے دوسرے تمام اعمال کے مقابلہ میں امتیاز اور برتری حاصل ہے۔

اخلاق کے متعلق چند احادیث نبوی

جب آپ نے شعبۂ اخلاق کے اس امتیاز کو سمجھ لیا تو اب اخلاق کی اہمیت سے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چند حدیثیں سُنئے ـــــ ارشاد فرمایا:-

"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ"[1] (اللہ نے مجھے اسلئے نبی بنا کر بھیجا ہے کہ میں اخلاقی خوبیوں کو درجۂ کمال تک پہنچادوں)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:-

"اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا"[2] (ایمان میں سب سے زیادہ کامل وہ مومنین ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں)۔

ایک حدیث کے الفاظ ہیں:-

"اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ"[3] (قیامت کے دن مومن کی میزانِ اعمال میں سب سے زیادہ وزن دار چیز جو رکھی جائیگی، وہ اُس کا اچھا اخلاق ہوگا)۔

---

[1] رواہ مالک واحمد مشکوٰۃ باب حسن الخلق ۱۲۔

[2] رواہ ابوداؤد والدارمی مشکوٰۃ باب حسن الخلق ۱۲۔

[3] رواہ الترمذی وابوداؤد مشکوٰۃ ۱۲۔

آپ حضرات نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ان ارشادات سے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ دین میں اخلاق کے شعبہ کی کتنی اہمیت ہے اور اس کا کیا درجہ اور مقام ہے، لیکن ہم مسلمانوں میں جو کچھ دیندار بھی ہیں اُن میں سے بھی اکثر کا اب حال یہ ہے کہ وہ شعبۂ عبادات کی اہمیت تو کچھ محسوس کرتے ہیں مگر اخلاق اور اسی طرح معاملات اور معاشرت کے متعلق جو احکام ہیں اُنکی اہمیت کو وہ محسوس نہیں کرتے، بہت سے لوگ تو کچھ ایسا سمجھتے ہیں کہ گویا ان احکام کی پابندی بڑا بزرگ اور کامل بننے کے لئے ضروری ہے اور نجات کے لئے بس نماز روزہ کافی ہے — حالانکہ دوزخ سے اور اللہ کے عذاب سے بچنے کے لئے جس طرح نماز روزہ ضروری ہے اسی طرح بُرے اخلاق کا چھوڑنا اور اچھے اخلاق کا اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

قرآن وحدیث میں اخلاق کی تاکید اور بُرے اخلاق پر سخت وعیدیں

قرآن وحدیث میں جس طرح نماز روزہ وغیرہ عبادات کی تاکید فرمائی گئی ہے اسی طرح اخلاقِ حسنہ کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے، اور جس طرح عبادت کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح بہت سے بُرے اخلاق پر بھی جہنم کی اور عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

مثلاً بُخل (یعنی مال کی ایسی محبت اور اُس سے ایسی دلبستگی جو خرچ کے موقعوں پر خرچ کرنے میں رکاوٹ بنے) ایک اخلاقی رذیلہ ہے، اُسکے متعلق ارشاد ہے:—

"وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ط بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ط سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط" مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن کو دولت دی ہے اور وہ اُس میں بخل کرتے ہیں (اور جہاں اس کو خرچ کرنا چاہئے وہاں خرچ نہیں کرتے) وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ اُن کے حق میں کوئی اچھی چیز ہے، بلکہ وہ اُن کے حق میں شرِ محض ہے، قیامت کے دن یہی دولت جس میں وہ بخل کرتے ہیں ان کے گلے کا طوق بنائی جائے گی۔

اس آیت میں بُخل پر (جو صرف ایک اخلاقی رذیلہ ہے) کتنی بڑی وعید سنائی گئی ہے۔

اسی طرح سورۂ ہُمَزہ میں ایسے لوگوں کو جن میں مال کی گہری محبت، اور دوسروں پر طعنہ زنی اور عیب چینی کے بُرے اخلاق ہوں، دوزخ کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے — ارشاد ہے:—

"وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ ۚ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۚ" یعنی ان لوگوں کے لئے انجام کی بڑی خرابی ہے جن کا حال یہ ہے کہ وہ دوسروں کو رو در رو طعنے دیتے ہیں، اور پیٹھ پیچھے لوگوں کے عیوب اور ان کی برائیاں بیان کرتے ہیں، اور انھیں مال و دولت سے ایسی گہری محبت ہے کہ وہ اس کو جوڑ جوڑ کے رکھتے ہیں اور گنا کرتے ہیں، گویا کہ اُن کا یہ مال ہمیشہ باقی رہے گا، یہ لوگ ضرور بالضرور دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

الغرض ان آیتوں میں جن بُرائیوں پر دوزخ کی اور عذاب کی وعید ہے وہ صرف اخلاقی بُرائیاں ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بعض برے اخلاق کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ یہ دوزخ میں لے جانے والے ہیں اور جنت سے محروم کرنے والے ہیں۔ مثلاً کبر کے متعلق ارشاد فرمایا: "لا یدخل الجنۃ من فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر[1]" (یعنی جسکے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جا سکے گا) —— اسی طرح ایک حدیث میں ہے: "لا یدخل الجنۃ قتات[2]" (جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کی عیب جوئی کرنیوالا اور انکے راز معلوم کر کر کے ان کو پھیلانیوالا جنت میں نہ جا سکے گا) —— اسی طرح ایک حدیث میں ہے "تجدون شر الناس یوم القیمۃ ذا الوجھین یاتی ھؤلاء بوجہ وھؤلاء بوجہ[3]" (یعنی قیامت میں سب سے برے حال میں وہ دو رُخا آدمی ہوگا جو ایک گروہ سے ایک رُخ سے ملے اور دوسرے گروہ سے دوسرے رُخ سے، مطلب یہ ہے کہ ان سے ان کی سی بات کرے اور اُن سے اُن کی سی) —— اسی طرح ایک حدیث میں ہے:۔ "لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس[4]" (یعنی اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم نہیں کریگا جو اسکے بندوں کیساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرتا) —— بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک حدیث میں اطلاع دی ہے کہ: "ایک عورت صرف اپنی اس بے رحمانہ حرکت کی وجہ سے دوزخ میں جائیگی کہ اُسنے ایک بلّی کو بند کر رکھا تھا اور اُسے کھانے کیلئے کچھ نہیں دیا، یہانتک کہ وہ بھوکی مر گئی[5]" —— اور اس کے برعکس مخلوق پر رحم کرنیوالوں کیلئے اللہ کی خاص رحمت کی خوشخبری سنائی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے: "الراحمون یرحمھم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء[6]" (یعنی رحم کرنیوالوں پر اللہ کی رحمت ہوگی، تم زمین پر بسنے والی مخلوق پر رحم کرو، آسمان والا خالق تم پر رحمت کریگا) —— ایک حدیث میں ہے، حضورؐ نے اس واقعہ کی اطلاع دی کہ: "ایک عورت اس عمل پر بخشی گئی کہ پیاس سے تڑپنے والے ایک کتے کو دیکھ کر اُس کا دل دُکھا، اور اُس نے بڑی محنت سے کنوئیں سے پانی نکال کے اُس کو پلایا، اور اُسکی جان بچائی[7]"

اور جس طرح ان حدیثوں میں جو بعض برے اخلاق کے متعلق میں نے اس وقت آپکے سامنے نقل کیں، عذاب کی اور دوزخ کی وعیدیں ہیں، اسی طرح بعض برے اخلاق کے متعلق حدیثوں میں آتا ہے کہ جس میں یہ باتیں ہوں وہ مومن نہیں —— مثلاً ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا:۔

"والذی نفسی بیدہ لا یؤمن عبد حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ[8]" (قسم اُس اللہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی بندہ اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا یہ حال نہ ہو کہ وہ اپنے ہر بھائی کے لئے وہی چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے) —— یعنی اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ پورا مومن اور سچا مسلمان نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین بار قسم کھا کر ارشاد فرمایا:۔

"واللہ لا یؤمن، واللہ لا یؤمن، واللہ لا یؤمن، قیل من یا رسول اللہ! قال الذی لا یامن جارہ بوائقہ[9]" خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہیں، خدا کی قسم اُس کو ایمان

---

[1] رواہ مسلم مشکوٰۃ [2] مشکوٰۃ [3] مشکوٰۃ [4] بخاری ومسلم مشکوٰۃ [5] رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ [6] ابوداؤد۔ مشکوٰۃ۔ [7] مشکوٰۃ۔

[8] رواہ البخاری ومسلم مشکوٰۃ۔ [9] رواہ مسلم مشکوٰۃ۔۱۲

نصیب نہیں" — عرض کیا گیا: حضرتؐ! کون؟ — ارشاد فرمایا: "وہ بدبخت جس کی شرارتوں سے اُسکے پڑوسی امن میں نہیں"۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا:-

"لیس المومن الذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ" [1] یعنی وہ بے درد اور بے رحم مومن نہیں جس کا حال یہ ہو کہ وہ اطمینان سے پیٹ بھر کے کھائے اور اُسکے پہلو میں اُس کا پڑوسی فاقہ سے رہے"

آپ غور کیجئے ان سب حدیثوں میں جن بُرائیوں پر دوزخ کی اور عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، اور جنت سے، یا ایمان سے محرومی کا اعلان فرمایا گیا ہے وہ سب اخلاق کے سلسلہ کی چیزیں ہیں — ان حدیثوں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دین میں اخلاق کی کتنی اہمیت ہے — شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے "کتاب الایمان" میں لکھا ہے، کہ:-

"حدیثوں میں جن جن باتوں کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جس میں یہ باتیں ہونگی وہ جنت میں نہیں جاسکے گا یا یہ کہ جس میں یہ باتیں ہوں وہ مومن نہیں ہے، اُن کا درجہ کم سے کم یہ ہے کہ وہ شریعت میں حرام ہیں اور اُن سے اپنے کو بچانا واجب ہے"

بہرحال اخلاق کی اصلاح کا معاملہ صرف تکمیلی چیز نہیں ہے کہ صرف بزرگ اور کامل بننے کے لئے اس کی ضرورت ہو بلکہ سچی بات یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے اور دوزخ سے بچنے کے لئے جس طرح نماز روزہ ضروری ہے، اسی طرح بُرے اخلاق سے بچنا اور اچھے اخلاق کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ خاصکر وہ اخلاق جن کی حدیث و قرآن میں خصوصیت کے ساتھ تاکید فرمائی گئی ہو مثلاً: صبر، توکل، سچائی، امانت داری، اخلاص، اللہ و رسول کی سچی اور کامل محبت، دوسروں کی خیرخواہی، دوسروں کے ساتھ نیک گمانی، دوسروں کی پردہ پوشی، رحم، عفو و درگزر، غصہ کا پی جانا، سخاوت، عدل و انصاف، تواضع اور خاکساری، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ — ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح جو ان کے اضداد بُرے اخلاق ہیں جن کو رذائل کہا جاتا ہے، ان کو اپنے اندر سے نکالنے کی کوشش بھی بے حد ضروری ہے۔

تصوف کا اصل مقصد تزکیہ اخلاق ہی ہے

تصوف کا خاص مقصد دراصل یہی ہے، اسی کا نام تزکیہ نفس ہے، اور اس کے لئے اللہ کے اُن بندوں سے تعلق رکھنے کی، اور رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جو اسکے خاص طبیب ہیں — واقعہ یہ ہے کہ ایسے بندگانِ خدا کی رہنمائی کے بغیر ان بیماریوں سے نجات حاصل کرنا اور نفس کے دھوکوں سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ بزرگوں کی خانقاہیں دراصل انہی باطنی امراض کے شفاخانے تھے، لیکن بہت سے لوگوں نے اب اُن کو تجارت کی دُکان بنا لیا ہے —

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوات واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا۔

اسکے بعد میں معاملات اور معاشرت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں:-

---

[1] مشکوٰۃ-۱۲

معاملات اور معاشرت!

معاملات اور معاشرت کا تعلق دراصل ہماری زندگی کی ضرورتوں اور ہماری خواہشوں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا فضل فرمایا ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں بھی احکام دیکر ہمارے لئے ان کو بھی ثواب کا اور اپنی رضا اور اپنا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ معاملات سے مُراد مالی لین دین کے معاملات ہیں، جیسے قرض، امانت، خرید فروخت، نوکری، مزدوری وغیرہ۔ اور معاشرت سے مُراد رہن سہن کا وہ برتاؤ ہے جو اُن لوگوں کیساتھ کیا جاتا ہے جن سے کسی قسم کا تعلق اور واسطہ پڑتا ہے، خواہ مستقل اور دائمی واسطہ ہو، جیسے ماں باپ اور میاں بیوی کا، یا گھر کے برابر میں رہنے والے پڑوسی کا ——— اور خواہ عارضی اور وقتی ہو، جیسا کہ مثلاً سفر کے ساتھیوں کا۔

دین میں معاملات اور معاشرت کی خصوصی اہمیت

اخلاق کی طرح دین میں ان دونوں شعبوں کی بھی بہت بڑی اہمیت ہے، بلکہ ان کو دوسرے شعبوں کے مقابلہ میں اس حیثیت سے خاص امتیاز حاصل ہے کہ ان میں اپنی دنیوی منفعت اور مصلحت اور اپنی خواہشِ نفس کی اور اللہ کے احکام کی کشمکش دوسرے تمام شعبوں سے زیادہ رہتی ہے، مثلاً کاروبار میں منفعت اس میں نظر آتی ہے اور نفس کی خواہش بھی عموماً یہی ہوتی ہے کہ جھوٹ سچ اور جائز ناجائز کا لحاظ نہ کیا جائے، بلکہ جیسا موقع ہو اور جس طرح بھی زیادہ نفع کی اُمید ہو وہ کر گذرا جائے، لیکن اللہ کا دین یہ کہتا ہے کہ خبردار چاہے سراسر نقصان ہو، اور چاہے بالکل دوالہ نکل جائے لیکن جھوٹ ہرگز نہ بولو، اور صرف اُس طریقے سے کاروبار کرو جس کو اللہ نے حلال کیا ہے۔ اسی طرح معاشرت یعنی آپس کے برتاؤ کا حال ہے، اُس میں بھی خواہشِ نفس اور اللہ کے حکم کے درمیان اکثر مقابلہ اور تصادم رہتا ہے، اسلئے بندہ کی بندگی اور فرمانبرداری کا سب سے زیادہ سخت امتحان معاملات اور معاشرت کے احکام میں ہے۔

معاملات اور معاشرت کی اہمیت کا ایک دوسرا پہلو

اور دوسرا پہلو ان شعبوں کی اہمیت کا یہ ہے کہ ان کا تعلق اللہ کے بندوں کے حقوق سے بھی ہے ——— یعنی نماز روزہ اگرچہ ارکانِ دین ہیں اور اس حیثیت سے ایمان کے بعد انہی کا درجہ ہے لیکن وہ صرف حق اللہ ہیں اور جو شخص انہیں کوتاہی کرتا ہے وہ صرف خدا کا مجرم ہوتا ہے اور اگر توفیق ملجائے اور سچے دل سے استغفار اور توبہ کر کے اپنے یہ گناہ معاف کرالے تو اللہ تعالیٰ کے کرم سے معافی ہی کی اُمید ہے ——— لیکن معاملات اور معاشرت میں اگر گڑبڑ ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی بھی نافرمانی ہوئی، اور کسی نہ کسی بندہ کی اُسمیں حق تلفی بھی ضرور ہوئی، اور بندے تو عموماً ہم ہی جیسے کم حوصلہ اور تنگ ظرف ہیں وہ تو قیامت میں اپنی پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑینگے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "بعض لوگ نماز روزہ کی قسم کی بہت سی نیکیاں یہاں سے کما کے لیجائینگے لیکن اُنکے معاملات اور اُنکی معاشرت خراب ہوگی، کسی کا حق مارا ہوگا کسی کا دل دُکھایا ہوگا، کسی کی غیبت کی ہوگی وغیرہ وغیرہ" ——— جب وہ محشر میں مقام حساب میں پہنچیں گے تو جن لوگوں کے معاملاتی اور معاشرتی حقوق انکے ذمے ہونگے وہ مدعی بنکے کھڑے ہو جائینگے اور اللہ تعالیٰ سے انصاف کے طالب ہونگے، پھر اللہ تعالیٰ انصاف اور فیصلہ فرمائینگے، اور اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نماز، روزہ، صدقہ خیرات کی قسم کی ان لوگوں کی ساری نیکیاں ان مدعیوں کو دلوا دیجائینگی، اور جب ان نیکیوں سے بھی ان لوگوں کے پورے حقوق ادا نہ ہونگے تو اُن مدعیوں کے کچھ گناہ ان لوگوں پر لاد دیئے جائینگے، اور بالآخر یہ لوگ جہنم میں ڈلوا دیئے جائینگے۔

بہرحال اس پہلو سے معاملات اور معاشرت کی بڑی اہمیت ہے، اور غالباً اسی حیثیت سے ایک حدیث میں معاملات اور معاشرت کی اصلاح کو

درجہ نماز روزہ اور صدقہ خیرات سے افضل کہا گیا ہے۔ — یہ حدیث ابوداؤد شریف کتاب الادب میں ہے، اسکے الفاظ یہ ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا:۔ "الا انبئکم بافضل من درجۃ الصلوٰۃ والصیام والصدقۃ؟" (یعنی میں تمھیں وہ بات بتلاؤں جو نماز، روزہ اور صدقہ سے بھی افضل اور اہم ہے؟) - عرض کیا گیا حضرت ضرور بتلائیں! - ارشاد فرمایا:۔ "اصلاح ذات البین" (یعنی آپس کے معاملاتی اور معاشرتی تعلقات کی اصلاح اور درستی) — ابوداؤد ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے آپؐ نے فرمایا:۔ "فساد ذات البین ھی الحالقۃ لا اقول تحلق الشعر ولکن تحلق الدین" (یعنی آپس کے معاملاتی اور معاشرتی تعلقات کی خرابی مونڈ دینے والا اُسترا ہے، یہ اُسترا بالوں کو نہیں مونڈتا ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتا ہے، اور جڑ سے اس کا بالکل صفایا کر دیتا ہے)۔

ان حدیثوں سے دین کے ان شعبوں کی اہمیت سمجھی جا سکتی ہے۔ آجکل اچھے خاصے دیندار حلقوں میں بھی معاملات اور معاشرت کی اصلاح اور درستی کا اتنا اہتمام نہیں جتنا کہ ہونا چاہئے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی زندگی نماز روزہ وغیرہ عبادات کے لحاظ سے کچھ غنیمت بھی ہے، معاملات اور معاشرت انکی بھی اسلامی نہیں ہے — الا من شاء اللہ — ایسی حالت میں عبادتیں کیا قبول ہوں — حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے خود سنا ہے، آپؐ فرماتے تھے کہ:۔ "جس شخص نے دس درہم کا کوئی کپڑا خریدا، اور اُس میں ایک درہم بھی حرام کا تھا، تو جبتک وہ اُس کپڑے کو پہنے رہے گا اللہ کے یہاں اُسکی کوئی نماز قبول نہ ہوگی"[1]

بہرحال اللہ کی رضا اور رحمت حاصل کرنے کیلئے جس طرح نماز روزہ اور اخلاقِ حسنہ ضروری ہیں اُسی طرح معاملات اور معاشرت کی درستی بھی ضروری ہے — یعنی ہر قسم کے کاروبار میں، نوکری میں، مزدوری میں، اور ہر معاملے میں شریعت کے جو احکام ہیں انکی پوری پابندی کی جائے، اور جن لوگوں کیساتھ جس قسم کا برتاؤ کرنے کا حکم ہے اُنکے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے۔ یہ معاملہ اتنا نازک ہے کہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔ "لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا"[2] (یعنی جو ہمارے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا، اور بڑوں کیساتھ اُدب اور عظمت کا برتاؤ نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

میں نے ابھی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا تھا کہ جن چیزوں کے متعلق حضورؐ نے یہ فرمایا ہے کہ:۔ "جو یہ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے" اس کا کم سے کم درجہ واجب کا ضرور ہے۔ پس اس حدیث کی رو سے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ، اور بڑوں کے ساتھ ادب اور عظمت کا برتاؤ گویا ہمارے دینی اور شرعی واجبات میں سے ہے۔

معاشرت کا اصل اصول یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کی دل آزاری سے بچا جائے اور ان کا حق ادا کرنے کی اور (شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے) ان کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کی اور ان کے حق کے مطابق ان کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے، اس معاملہ میں اسلام کا جو منشا اور جو نقطۂ نظر ہے اُس کا کچھ اندازہ اس حدیث سے کیا جا سکتا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ:۔

"جب تین آدمی ایک جگہ بیٹھے ہوں تو ایک کو تنہا چھوڑ کر اُن میں سے دو الگ باتیں نہ کریں (ممکن ہے اس سے اُس کا

(بقیہ صفحہ ۱۳۴ پر دیکھئے)

---

[1] رواہ احمد والبیہقی۔ مشکوٰۃ۔ باب الکسب وطلب الحلال۔ ۱۲ — [2] رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ۔ ۱۲

دینی دعوت اور اصلاحی جد و جہد کے محرکات

دعوت و تبلیغ کے سلسلہ کی پہلی تقریر

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس وقت جو کچھ کہنا ہے اسکا تعلق کسی خاص جماعت یا گروہ کی دینی دعوت اور جد و جہد سے نہیں ہے بلکہ اس وقت کا موضوع گفتگو عام دعوت الی اللہ ہے۔ اور مجھے یہ بتلانا ہے کہ دینی دعوت و تبلیغ کا کام کیوں ہمارے لئے ضروری ہے اور اس کے کیا خاص محرکات ہیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر دعوت و تبلیغ کا کام ہم کیوں کریں۔ ظاہر ہے کہ دعوت کے کام میں طرح طرح کے مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ ہو تو اور بھی بہت سی عبادتیں ہیں جو بظاہر اس کام سے زیادہ افضل ہیں۔ اور ان میں یہ دردسری بھی نہیں ہوتی —— ہمیں اس وقت اسی سوال کا جواب دینا ہے اور یہ بتلانا ہو کہ بحیثیت مسلمان کے ہمارے لئے دعوت الی اللہ کا کام کیوں ضروری ہے۔ اور وہ کونسی چیزیں ہیں جو ہم مسلمانوں کو اس کام پر مجبور کرتی ہیں؟

اس وقت ہم دعوت کے صرف چند محرکات کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اس وقت ذہن میں ہیں۔

۱۔ دنیا میں دو دور ہیں۔ ایک وہ دور جس میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اس دور کو دورِ نبوت کہہ لیجئے! دوسرا دور وہ ہے جب کہ نبوت ختم ہو چکی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ بند ہے اس دور کو ختم نبوت کا دور کہہ لیجئے! یہ دوسرا دور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے۔ نبوت کے دور میں دعوت و ہدایت کے کام کی اصل ذمہ داری انبیاء علیہم السلام پر ہوتی تھی۔ اور ان کے متبعین صرف تبعاً ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن ختم نبوت کے اس دور میں پوری ذمہ داری خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر یعنی اُس قوم اور اُس جماعت پر آگئی جو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی ہے اور اس نے اطاعت کا عہد کیا ہے۔ اب اس

امت کو دنیا میں وہ ضرورت پوری کرنا ہے جو کہ انبیاء و مرسلین کرتے تھے حالانکہ یہ امت خود نبی نہیں ہے۔

اس کو یوں سمجھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی بعثت کے ساتھ آپ کی امت بھی دعوت کے کام کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے مبعوث کی گئی ہے۔ لیکن امت کی یہ بعثت نبی والی بعثت نہیں ہے ـــــ نبوت اور بعثت الگ الگ دو لفظ ہیں۔ نبوت کا لفظ صرف اس برگزیدہ انسان کے لئے آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کے لئے منتخب فرمایا ہو۔ اور بعثت کا لفظ قوم کے لئے بھی آسکتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ اپنی امت کے لئے بھی استعمال فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ آپ نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ (یعنی تم اس لئے نہیں مبعوث کئے گئے ہو کہ مشکلات پیدا کرو بلکہ آسانی پیدا کرنے کے لئے مبعوث کئے گئے ہو)۔ قرآن مجید میں اس مفہوم کے لئے اُخراج کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ)۔ خود صحابہ کرامؓ کی زندگی کے واقعات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ اس کام کے لئے مبعوث کیے گئے ہیں۔ اور اس خیال نے ان میں یقین پیدا کر دیا تھا کہ جس کام کے لئے وہ پیدا کیے گئے ہیں اسکو پورا کئے بغیر وہ ختم نہیں ہو سکتے ہیں۔ اور اللہ ضرور ان سے یہ کام لے گا۔ اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ ان کے اندر ایک آہنی عزم اور بے انتہا قوت پیدا ہو گئی تھی

کسریٰ کے دربار میں جب مسلمانوں کے سفیر سے پوچھا گیا کہ مَا الَّذِیْ جَاءَ بِکُمْ ؟ یعنی آپ لوگوں کو کس چیز نے یہاں آنے پر آمادہ کیا؟ تو اس نے اسکے جواب میں کہا کہ اَللّٰہُ ابْتَعَثَنَا الخ۔ اللہ نے ہم کو اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کہ اللہ کے بندوں کو غیر اللہ کی بندگی سے نکالکر اسی ایک اللہ کی بندگی میں داخل کر دیں جو ان کا واقعی رب ہے ـــــ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام دینی دعوت اور دینی جدوجہد کا کام اپنا کام سمجھ کر اور اپنی رائے اور تجویز سے نہیں کرتے تھے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اس کے لئے اللہ کی طرف سے مامور اور مبعوث ہیں اور یہ ہمارا فریضہ اور ہماری ذمہ داری ہے۔

۲۔ دینی دعوت و تبلیغ کے متعلق بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اصل عبادات کو قائم اور جاری رکھنے کے لئے صرف ایک ذریعہ ہے یعنی یہ خود مقصود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہو بلکہ دینی دعوت بذاتہ بھی مقصود ہے اور عبودیت کا ایک جزو ہے۔ یعنی بندگی کی ایک شکل اللہ کی طرف دعوت دینا بھی ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی تکمیل دعوت سے ہوتی ہے۔ سورۃ العصر میں کامیابی پانے والوں کے اوصاف ایمان۔ نیک اعمال۔ تواصی بالحق۔ (حق کی طرف بلانا) اور تواصی بالصبر (صبر کرنے کی تلقین) بیان کئے گئے ہیں۔ بہر حال دعوت تکمیلی اوصاف میں سے ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ دعوت محض ایک انتظامی چیز ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ دعوت کو مومنین کی خاص صفت بتایا گیا ہے۔ "وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ

يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (یعنی مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور اُن کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بھلائی کی تلقین کرتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں) ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ایمان والوں کا یہ شعار ہے کہ وہ ایک دوسرے کو خیر کی دعوت دیتے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ دعوت ایمان کا خاصہ ہے۔

۳۔ قرآن شریف سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی کوششیں۔ علم۔ یقین اور ہدایت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

۴۔ دعوت کا تعلق عبادات سے بلکہ پورے دین سے ایسا ہے جیسا کہ بارش کا تعلق نباتات سے ہے۔ اگر بارش خوب ہوتی ہے تو نباتات بھی خوب اُگتی ہے اور اگر بارش نہ ہو تو زمین چٹیل میدان بن جاتی ہے۔ اسیطرح اگر دعوت ہوتی ہے تو عبادات وغیرہ دین کے سارے شعبے قائم رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انکی روح بھی قائم رہتی ہے۔ جس دور میں دعوت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے لوگوں میں دین کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ فرائض کو پورا کرنے کا احساس بیدار رہتا ہے۔ حقوق کے ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ اور جب دعوت کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے تو ان چیزوں کا نمو بھی ختم ہوجاتا ہے اور دین کی مثال ایک سوکھے درخت کی سی ہوجاتی ہے جو نہ پھلتا ہے اور نہ پھولتا ہے۔ لہٰذا امت میں دین کو باقی رکھنے اور اُسکی استعداد پیدا کرنے کے لیے بھی دعوت ضروری ہے۔ دعوت کے بغیر اعمال و عبادات پنپ نہیں سکتے اور ان میں کونپلیں نہیں نکل سکتیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک نسل کی دعوت کا فیض کئی نسلوں تک پہونچے اور ایک زمانہ کی کوشش کے اثرات بعد تک رہیں۔ جیسا کہ ریل کی لائن پر چلنے والی ٹرالی قلیوں کے ایک بار زور سے دوڑانے سے دُور تک خود بخود دوڑی چلی جاتی ہے۔ اور جب رُکنے لگتی ہے تو قلی اُتر کر اُس کو دوڑاتے ہیں (صحابۂ کرامؓ کی دعوتی اور تبلیغی کوششوں سے امت میں جو دینی استعداد پیدا ہوئی تھی اُسکا اثر بہت بعد تک رہا اور اُمت کی گاڑی چلتی رہی پھر بیچ کے دور کے مجددین و مصلحین کے برابر دھکا دیتے رہنے سے یہ گاڑی آج تک چلی جارہی ہے۔ اس سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیے کہ اس امت کی گاڑی خود بخود چل رہی ہے جس طرح کہ ٹرالی پر بیٹھے ہوئے مسافروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ ٹرالی خود بخود دوڑ رہی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قلی بار بار اُتر کر اُس کو دوڑاتے ہیں تب وہ دوڑتی ہے۔

صحابۂ کرامؓ نے اور بعد کے زمانوں کے مجددین اور مصلحین نے اپنی دعوت اور تبلیغی کوششوں سے اس امت میں ایمان کا اور ایمانی استعداد کا بڑا ذخیرہ پیدا کیا تھا۔ اس ذخیرہ کو ہم برابر استعمال کر رہے ہیں لیکن اگر آمد و صرف کا توازن برابر نہیں رہا تو یہ ذخیرہ باقی نہیں رہیگا۔ دین کی ساری چہل پہل اسی ذخیرہ سے ہے۔

اُمت میں اعمال کی کمی ہو جانا اتنی خطرناک بات نہیں ہے جتنی کہ جذبات اور استعداد کی کمی، اسلیئے کہ جذبات اور استعداد ہی قربانیوں کی طاقت پیدا کرنے والی قوتِ محرکہ اور اُمت کو حرکت میں رکھنے والی طاقت ہے۔ انکی مثال انجن کی بھاپ کی سی ہے اگر بھاپ ختم ہو جاتی ہے تو گاڑی رکنے لگتی ہے۔ اسکے مسافر تو صرف یہی سمجھتے ہیں کہ رفتار سست پڑ گئی لیکن ڈرائیور خوب جانتا ہے کہ یہ رفتار کی سستی بھاپ کی اور اس کو پیدا کرنے والی چیزوں کی کمی کا نتیجہ ہے۔ بھاپ یا اس کو پیدا کر دینے والی چیزیں اگر ختم ہو جائیں تو گاڑی نہیں چل سکتی ہے۔ حالانکہ انجن، پٹریاں اور سگنل وغیرہ سب موجود رہیں۔ لہٰذا اگر دعوت کا سلسلہ ختم ہو جائے تو مجموعۂ دین خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ دعوت کے بقا میں دین کا بقا مضمر ہے۔

۵۔ دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں بعض لوگوں کو ایک شبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان صرف اپنا مکلف ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی (کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائیگا)۔ اس بارہ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک انسان عام طور پر اپنے اعمال و فرائض کی پابندی اور اپنے ذاتی کردار کی حفاظت بھی غلط ماحول میں نہیں کر سکتا۔ اور اسکا اپنے اصول و معیار پر قائم رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لیئے کہ انسان پر ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ انفرادی زندگی کا وجود دنیا میں بہت مشکل ہے۔ اس خاکی سمندر میں علیحدہ علیحدہ جزیرے نہیں بنائے جا سکتے۔ یہ بات عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ باپ مسلمان کامل ہے۔ لیکن اس کی اولاد بالکل دوسرے رنگ میں ہے۔ حالانکہ اُسنے اپنی اولاد کی اصلاح کی پوری کوشش کی۔ یہ عام طور سے ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ماحول کے ساتھ مجبوراً صلح کرنی پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتی کی مثال دی ہے کہ ایک کشتی میں کچھ لوگ اوپر کے درجے میں ہیں اور کچھ لوگ نیچے کے درجہ میں ہیں پانی کا انتظام اوپر ہی کے درجہ میں ہے اسلیئے نیچے کے درجہ والے بھی پانی لینے کیلئے اوپر ہی آتے ہیں جس سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ ناگواری کا اظہار اور شکایت کرتے ہیں۔ آخر ایک دن تنگ آکر نیچے کے درجے والے مسافروں نے طے کیا کہ ہم کشتی کے پیندے میں سوراخ کر کے دریا سے پانی نکال لیں گے۔ تو اب اگر اوپر کے درجے والے اس فعل سے اُن کو باز نہ رکھیں گے تو وہ خود بھی ان کے ساتھ ڈوب جائیں گے"۔

بہر حال خود اپنی زندگی کو درست رکھنے کے لیئے اور اپنے اہل و عیال کی زندگی کی اصلاح کے لیئے اور اپنے آپ کو اور اپنی نسلوں کو شر سے بچانے کے لیئے بھی ضروری ہے کہ عوام میں دین پھیلانے کی جد و جہد کی جائے۔

اس کے علاوہ دعوت و تبلیغ اور ضرورت کے وقت دین کی حفاظت اور سر سبزی کے لیئے بقدر استطاعت سعی و جہد ہر مسلمان کا ذاتی فریضہ ہے جس کے متعلق اُس کو جوابدہی کرنی ہے اس لیئے یہ کام دوسرے کا بوجھ اُٹھانا نہیں ہے بلکہ اپنا ہی بوجھ اُٹھانا ہے۔

۶۔ انسان فانی ہے۔ لیکن وہ دوام پسند ہے۔ اپنے آپ کو غیر فانی بنانے کے لیئے برابر کوشش کرتا

رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس چند روزہ فانی زندگی میں اسکی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل کیسے ہوسکتی ہے؟ اس لیے ہوشمند انسان چاہتا ہے کہ اسکے اجر و ثواب کی وسعت غیر محدود ہو اور اسکے اعمال دوامی ہوں اور یہ صرف دعوت ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ اور دعوت ہی فانی اور غیر فانی کے درمیان کی خلیج کو پاٹنے والا ایک پل ہے، ساری عبادات اور اعمال انسان کی زندگی تک باقی رہتے ہیں۔ اور اسکے مرنے کے بعد اپنے اعمال کے اجر و ثواب میں اضافہ کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے، لیکن دعوت الی اللہ اور دین کی جدوجہد وہ چیز ہے کہ اس کا اجر و ثواب صدیوں تک اور اکثر قیامت تک چلتا رہے گا ——— نیز عبادات و اعمال سے انسان صرف ایک محدود اجر و ثواب حاصل کرسکتا ہے لیکن دعوت کے ذریعہ غیر محدود اجر و ثواب کا مستحق ہوجاتا ہے اس لیے کہ اسکی جدوجہد سے جتنے لوگ دین پر لگ جاتے ہیں اور نیک اعمال اختیار کرلیتے ہیں ان سب کے اجر میں یہ بھی شامل ہوتا ہے اور یہ سلسلہ نسل در نسل اور قرن بہ قرن چلتا رہتا ہے۔ اعمال اور ان کے اجر و ثواب کے اس تعدیہ کی طاقت دعوت ہی میں ہے۔ آپ اپنے سامنے دو آدمیوں کی مثال رکھیے ایک وہ شخص جس نے اپنی ستر برس کی زندگی کامل عبادت میں گذاری ہے۔ ہمیشہ قائم اللیل اور صائم النہار رہا۔ دوسری طرف ایک وہ شخص ہے کہ اُسنے خود تو زیادہ نفلی عبادات نہیں کی ہیں۔ لیکن دعوت الی اللہ کا کام خوب کیا ہے۔ اجر و ثواب کے لحاظ سے دوسرا شخص پہلے شخص سے یقیناً سبقت لے گیا۔ اسلیے کہ اول الذکر کی عبادات اور نیک اعمال اگرچہ بہت ہیں لیکن محدود ہیں لہٰذا اسکا اجر و ثواب بھی محدود ہے۔ مگر آخر الذکر کے اپنے ذاتی اعمال تو ضرور محدود تھے لیکن اسکی بلاواسطہ یا بالواسطہ کوششوں سے جتنے لوگوں کا بھی دین سے تعلق ہوگیا۔ اُن سب کے اجر و ثواب میں بھی اُس کا حصہ ہوگیا اور وہ ہزاروں لاکھوں بلکہ کبھی کبھی کروڑوں ہوسکتے ہیں اس لئے اس کی کمائی غیر محدود ہوگی اور دنیا سے اس کے جانے کے بعد بھی اُس کے اجر و ثواب میں بے حساب اضافہ برابر ہوتا رہے گا۔ بہر حال بڑی سے بڑی جفاکشی اور مستعدی کے باوجود انسان اپنی ذاتی عبادات اور نیک اعمال سے دعوت والے کا مقام حاصل نہیں کرسکتا اور اسکے برابر اجر و ثواب نہیں لے سکتا۔

دینی دعوت اور تبلیغی جدوجہد کے یہ چند عام فہم موجبات اور محرکات جو اس وقت ذہن میں تھے میں نے عرض کردیے اگر آپ غور کریں تو اس طرح کی اور بھی چیزیں سمجھ میں آسکتی ہیں۔

ہماری دینی دعوت کا مقصد

اور

اُسکے اُصول!

(سلسلۂ دعوت کی دوسری، تیسری، چوتھی تقریر کا خلاصہ)

"دعوتِ اصلاح و تبلیغ" کے سلسلہ میں تین تقریریں اس عاجز نے کی تھیں، جب اشاعت کے لئے اُن پر نظرِ ثانی کی گئی، تو مناسب معلوم ہوا کہ اُن میں کچھ تصرف کر کے ایک مسلسل مذاکرہ بنا دیا جائے ——— چنانچہ ذیل میں جو کچھ درج ہو رہا ہے یہ گویا اُن تینوں تقریروں کا خلاصہ ہے، بلکہ تکمیلِ فائدہ کیلئے بعض چیزوں کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے، اور بعض چیزیں غیر اہم سمجھ کر حذف بھی کر دی گئی ہیں" ——— محمد منظور نعمانی

مجھے اِس وقت آپ حضرات کے سامنے اِس دینی دعوت کے مقصد اور اُسکے چند خاص اصولوں کی وضاحت کرنی ہے ——— لیکن اس سے پہلے میں ایک اور بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ ہماری یہ دینی جد و جہد "تبلیغ" اور "تبلیغی تحریک" کے نام سے مشہور ہو گئی ہے، اور اس سے بعض اوقات لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہوتی ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کام کے کرنے والوں نے کبھی اس کا یہ نام اس طرح تجویز نہیں کیا تھا جس طرح کہ تحریکوں کے یا اداروں کے نام رکھے جاتے ہیں، بلکہ یہ آپ سے آپ مشہور ہو گیا، اور ایسا مشہور ہوا ہے کہ خود ہمیں بھی بہت سے موقعوں پر تعارف کے لئے اس کا یہی نام استعمال کرنا پڑتا ہے۔

آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ یہ کام اس خاص طرز پر، اور ان اصولوں کے ساتھ اس دور میں حضرت مولانا محمد الیاس (رحمۃ اللہ علیہ) نے شروع فرمایا تھا، اور اُن کے سامنے یہ تھا ہی نہیں، کہ اپنی کوئی مخصوص جماعت بنائیں،

اور اپنی اس خاص جد وجہد کو کسی خاص نام سے موسوم اور مشہور کریں، وہ تو رسم و ضابطے کی ان سب چیزوں سے بالکل بے پروا ہو کر عشق اور جنون کی کیفیت کے ساتھ اپنی ساری توجہ بس اس پر مرکوز کئے ہوئے تھے کہ مسلمانوں میں دین کی دعوت اور دین کے لئے جد وجہد اور اس کی فکر کسی طرح عام ہو جائے، اُن کے نزدیک بس یہی کام سارے کاموں سے زیادہ ضروری تھا، میرا خیال ہے کہ انھوں نے کبھی نام کے مسئلہ پر غور بھی نہیں کیا ہوگا ——

بہرحال یہ نام آپ سے آپ مشہور ہو گیا، اور بعض اوقات ہمارے اصل کام اور مقصد کے لئے یہ بڑا حجاب بن جاتا ہے، کیونکہ اس نام سے قدرتی طور پر اُن ہی کاموں کی طرف لوگوں کا ذہن جاتا ہے، جو "تبلیغ" کے نام سے مسلمانوں میں پہلے ہوتے رہے ہیں —— مثلاً بعض لوگ تبلیغ کا مطلب صرف غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ سمجھتے ہیں، بعض لوگوں کا ذہن اس لفظ سے شریعت کے تفصیلی احکام کی تبلیغ کی طرف جاتا ہے، اور بعض حضرات اس لفظ ہی کی وجہ سے ہمارے اس کام کو وعظ و تقریر کا کوئی سلسلہ خیال کر لیتے ہیں —— اس قسم کے سارے مغالطے تبلیغ کے اس مشہور نام سے ہی لگتے ہیں، لیکن اب یہ ایسا مشہور ہو گیا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں سے اس کو بھلا دینا، اور اس کی جگہ کوئی نیا نام اور عنوان چالو کر دینا شاید کسی انسان کے بس میں نہیں —— میں نے مقصد اور اصولوں کے ذکر سے پہلے اس چیز کی وضاحت آپ حضرات کے سامنے اسلئے ضروری سمجھی کہ جو واقعہ ہے وہ آپ کے علم میں آجائے، تاکہ آپ کو خود بھی مغالطہ نہ ہو اور اس بارے میں آپ دوسروں کے ذہن بھی صاف کر سکیں —— اب میں اصل بات شروع کرتا ہوں:۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمان کہلانے والی جو اُمت اور جو قوم اس وقت ایک ایک ملک میں کئی کئی کروڑ کی تعداد میں موجود ہے اُس کی غالب اکثریت اس حالت میں ہے کہ وہ اُس ایمان اور اس ایمان والی زندگی اور اس ایمانی جد وجہد سے بالکل خالی اور عاری ہے جس کا اللہ و رسولؐ نے ہم سے مطالبہ کیا ہے، اور جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور نصرت کے خاص وعدے ہیں —— پس یہ دینی دعوت اُمت کی اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کی ایک عمومی کوشش ہے، اور اس کا مقصد بس یہی ہے کہ اُمتِ محمدیہ میں وہ ایمان، وہ ایمان والی زندگی، اور وہ ایمانی جد وجہد کسی طرح عام ہو جائے جس کا اس اُمت سے مطالبہ ہے، اسکے سوا کوئی اور مقصد اور منتہا ہمارے سامنے نہیں ہے، ہمیں اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد یہ کوشش اس اُمت کے فرائض میں سے ہے، اور اخلاص کے ساتھ اس راستے میں محنت اور مشقت اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کا تقرب حاصل کرنے کا خاص ذریعہ ہے، اور یہ نبوت کی نیابت اور انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے۔

مجھے اس وقت اس موضوع پر دلائل پیش کرنے نہیں ہیں، نہ آپ حضرات اسکے ضرورت مند ہیں، لیکن اگر آپ میں سے کسی کو کبھی اسکے دلائل معلوم کرنے کی ضرورت پڑے، تو بہت پہلے کا لکھا ہوا میرا ایک رسالہ ہے

مُسلمان قوم کی حالت اور حاملانِ دین کا فریضہ" اُس کا مطالعہ انشاء اللہ کافی ہوگا۔
مقصد کے متعلق تو میں بس اتنا ہی عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں، اور اب اس کام کے چند خاص اصول بیان کرنا چاہتا ہوں ـــــ آپ حضرات اس دعوت کے خاص نمبروں کو اور اسکے طریق کار کو تو جانتے ہی ہیں، الحمدللہ برسوں سے آپ کا اس کام سے تعلق ہے، اِسلئے میں صرف چند اصولی باتیں ہی اس وقت عرض کروں گا، جن کی میری نظر میں خاص اہمیت ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پچھلے دَور میں جو دینی اور اصلاحی کوششیں مُسلمانوں میں ہوتی رہی ہیں (اور اللہ کے فضل سے اُن کا سلسلہ اُب تک بھی جاری ہے) وہ عموماً طالبین کے لئے ہی ہوتی تھیں، اور اُن سے زیادہ تر وہی لوگ مستفید ہوتے تھے جن میں دین کی فکر اور طلب ہوتی تھی، ہمارے دینی مدرسوں میں داخل ہو کر وہی بندگانِ خدا علمِ دین حاصل کرتے تھے، اور خانقاہوں میں مشائخ کرام سے استفادہ کے لئے بھی وہی حاضر ہوتے تھے جن کے اندر اُس کی طلب ہوتی تھی اسی طرح علماءِ ربانی کی مجالس اور اُن کی دینی و اصلاحی تصنیفات سے فائدہ بھی بس وہی لوگ اُٹھاتے تھے جن میں دین کی اور اپنی آخرت کی کچھ فکر ہوتی تھی ـــــ اور جن طبقوں میں دین کی فکر اور طلب ہی نہیں رہی تھی، جہاں تک ہماری معلومات ہیں اُن کو دین کی طرف لانے کی کوشش کا رواج بہت دنوں سے چھوٹا ہوا تھا، یعنی اس کا کوئی عمومی اور مستقل نظام نہیں تھا ـــــ پس ہماری اس دینی دعوت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اُن طبقوں کی خصوصیت سے فکر کی جائے جو دین کی طلب اور فکر سے خالی ہو چکے ہیں، یا جن کی دینی فکر بہت ہی مضمحل اور کمزور ہو چکی ہے، وہ اگر ہمارے پاس نہیں آتے تو ہم خود اُن کے پاس پہنچیں، اور دین سے اُن کا تعلق پھر سے جوڑنے کی، اور اُن میں دین کی فکر اور طلب پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور اس کے لئے خود اُن سے ربط و ضبط پیدا کریں۔

اِسی طرح کی ایک دوسری قابلِ ذکر اصولی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں دینی نقطۂ نظر سے جو فساد اور بگاڑ اس وقت پھیلا ہوا ہے ہمارے نزدیک اُس کی جڑ بنیاد یہ ہے کہ دلوں میں وہ ایمان و یقین باقی نہیں رہا ہے جس کے دباؤ سے آدمی کی زندگی اللہ و رسُول کے احکام کے مطابق "اِسلامی زندگی" بنا کرتی ہے، اور فضا کی عام خرابی کی وجہ سے ہمارا رجحان اور ہمارا ذوق غیر اسلامی بن گیا ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسی کو یوں کہہ لیجئے کہ ہماری خلافِ دین عادتیں اور نفسانی خواہشیں ہم پر اس قدر غالب آگئی ہیں کہ اُن کے خلاف اللہ کے احکام پر چلنا ہمارے لئے سخت مشکل ہو گیا ہے، اِسلئے ہمیں یقین ہے کہ اس وقت اصلاح کے لئے لوگوں کو یہ بتلا دینا کافی نہیں کہ تمہارے اندر فلاں فلاں باتیں غیر اسلامی ہیں، اور تم فلاں فلاں کام اللہ و رسُول کے احکام کے خلاف کر رہے ہو۔

ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے لاکھوں بھائی جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نہیں پڑھتے، جانتے ہیں کہ زکوٰۃ فرض ہے اور نہیں دیتے، جانتے ہیں کہ جھوٹ بولنا حرام ہے لیکن معمولی معمولی فائدوں کے لئے

جھوٹ بولتے ہیں، اسی طرح ہمارے لاکھوں بھائی ہیں جو جانتے ہیں کہ سینما دیکھنا گناہ ہے، لیکن پھر بھی دیکھتے ہیں،
——— الغرض اس وقت اُمتِ محمدیہ میں گناہوں کا جو بازار گرم ہے ہمیں بالکل یقین ہے کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو شریعت کے احکام معلوم نہیں، بلکہ میں نے جیسا کہ عرض کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ دل میں اللہ و رسول کے احکام کی وہ عظمت اور اندر وہ ایمان و یقین موجود نہیں ہے جس کے اثر اور دباؤ سے آدمی شریعت پر چلا کرتے ہیں، اسلئے ہمارے نزدیک اس وقت شریعت کا صرف حکم بتلا دینا کافی نہیں، بلکہ بعض حالات میں تو ان بیچاروں کے لئے یہ اور زیادہ مضر اور مہلک ہوگا، اور اس سے اُن کی بربادی میں اور اللہ سے اُن کی دوری میں اور اضافہ ہوگا۔ کیونکہ ہم اگر اُن کو بار بار شریعت کے حکم سے آگاہ کریں گے، اور وہ ہماری اس یاددہانی کے باوجود شریعت کے حکم کے خلاف ہی چلتے رہیں گے (جیسا کہ اُن کا حال ہے) تو اس سے اُن کی گناہگاری اور مغضوبیت کا نمبر اور بڑھ جائے گا ———
اِسلئے اس دینی دعوت میں یہ اصول اختیار کیا گیا ہے کہ اس کی کوشش کی جائے کہ اللہ کے بندوں میں ایمان و یقین پیدا ہو، اور اُن کی طبیعت کا رجحان اور ذوق جو غلط اور غیر اسلامی بن گیا ہے وہ کسی طرح درست ہو، اور عادات و خواہشات کے خلاف اللہ کے احکام پر چلنے کی اُن میں استعداد اور طاقت پیدا ہو، جب اندر ایمان و یقین آئے گا، اور جب طبیعت کا رُخ کچھ درست ہوگا، اور خواہشات کے خلاف احکام پر چلنے کی جب طاقت پیدا ہوگی، تو پھر پوری زندگی اسلامی بن سکے گی ——— اپنے اسی نظریے اور اسی اصول کی وجہ سے عام لوگوں کو ہم اُن کی زندگی کی جزئی کمزوریوں پر نہیں ٹوکتے ——— اس سلسلہ میں، میں آپ حضرات کو حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ کا ایک واقعہ سناؤں :-
دہلی کے ایک نوجوان جو ڈاڑھی صاف رکھتے تھے حضرتؒ کی آخری بیماری میں آیا کرتے تھے، اور حضرتؒ کے سر پر تیل کی مالش کیا کرتے تھے، حضرتؒ کا برتاؤ بھی اُن کے ساتھ اچھی خاصی شفقت کا تھا، ایک دن جبکہ وہ مالش کر رہے تھے حضرتؒ نے خاص محبت کے انداز میں اُن سے ڈاڑھی کے متعلق کچھ فرما دیا ——— اگلے دن وہ نہیں آئے، حضرتؒ نے اپنے بعض خادموں سے فرمایا کہ آج وہ نہیں آئے، دراصل مجھ سے ہی غلطی ہوگئی، میں سمجھا کہ اب یہ اس درجہ پر آچکے ہیں، لیکن معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا، اب اُن کو بلواؤ، چنانچہ دو چار دن کے بعد وہ شرماتے ہوئے آئے، حضرتؒ نے بڑی محبت اور شفقت کا اظہار فرمایا، اور فرمایا: بھئی غلطی ہماری ہی تھی ہم نے تمھیں پہچانا نہیں، تم اسی طرح آتے رہو ——— اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایسا اثر ڈالا کہ غالباً اُسی دن سے توبہ کر لی، اور وہ اب ہماری اس دینی دعوت کے ممتاز کارکنوں میں ہیں، اور اُن کی زندگی ہمارے لئے بھی قابلِ رشک ہے، اور اللہ ہی جانتا ہے کہ اُن کی کوششوں سے کتنے اللہ کے بندوں کو اب تک ایمان نصیب ہوا ہوگا، کتنوں کی نمازیں زندہ ہوئی ہوں گی، اور کتنوں نے اُن کی صحبت سے متاثر ہو کر ڈاڑھیاں رکھی ہوں گی۔
لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ گناہوں کو خدانخواستہ ہلکا سمجھا جائے، یا اُن کو خوشی سے برداشت

کیا جائے ۔ معاذ اللہ! یہ تو کفر کا ایک شعبہ ہے ـــــ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ باہر کی تبدیلی اندر کی تبدیلی پر موقوف ہے اسلئے پہلے اس کی کوشش اور فکر کی جائے، اور جب کسی شخص کے متعلق اس کا اطمینان ہو جائے کہ یہ کہنے سے اب مان لے گا، اور بھڑ نہیں جائے گا، تو پھر ہمارے لئے خاموشی ہرگز درست نہیں، حضرتؒ ہی کا ایک دوسرا واقعہ آپ کو سناؤں :-

حضرتؒ کی آخری بیماری ہی میں ایک دن دوپہر کے وقت میں خدمت میں حاضر تھا، حضرتؒ کی نگاہ دروازے کی طرف تھی، دیکھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا، فوراً حضرتؒ منھ پھیر کے لیٹ گئے، اور مجھ سے فرمایا کہ یہ شخص جو آ رہا ہے بہت عرصہ ہوا یہ مجھ سے بیعت کر کے گیا تھا، لیکن اس کی ڈاڑھی کتری ہوئی ہے، تم جاکر کہدو کہ میرے پاس ہرگز نہ آئے، میں اس سے ملنا نہیں چاہتا ـــــ میں باہر آیا، اور حضرتؒ کا پیغام ان صاحب کو پہنچا دیا، وہ زار زار رونے لگے، اور مجھ سے کہا کہ حضرتؒ سے عرض کرو، میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں، اب انشاءاللہ کبھی یہ گناہ نہ ہوگا ـ میں نے آکر عرض کیا، حضرتؒ نے فوراً بلا لیا، اور پہلے کچھ تنبیہ فرمائی، اور پھر بڑی شفقت فرمائی ـــــ پس چونکہ ان صاحب کے متعلق حضرتؒ کو اطمینان تھا کہ میری ناراضی کو یہ برداشت نہیں کر سکیں گے اور فوراً پگھل جائیں گے، اسلئے حضرتؒ نے شروع ہی میں یہ سخت رویہ اختیار فرمایا۔

بہرحال ہماری اس دینی دعوت کا ایک خاص اصول یہ ہے کہ لوگوں میں وہ ایمان اور وہ دینی ذوق اور خواہشات کے خلاف چلنے کی وہ استعداد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس کے بعد زندگی آپ سے آپ "اسلامی زندگی" بن جاتی ہے۔

اور اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے روزمرہ کے اس ماحول اور ان مشاغل سے الگ کر کے اور کاٹ کے جن میں ایمان کی نشو و نما اور دین میں ترقی کا سامان نہیں ہے، کسی ایسی فضا میں، اور ایسے مشاغل میں ان کا کچھ وقت گذروایا جائے جن سے ایمان کو غذا، اور طاقت حاصل ہو، اور دینی ذوق پیدا ہو، اور اللہ کے حکم کے مقابلے میں خواہشات کی پامالی کی مشق ہو ـــــ اور خود ان کو ایمان کا، اور ایمانی زندگی کا، اور ایمان کے لئے جد و جہد کا داعی بنایا جائے، اور وہ اس راہ میں کچھ تکلیفیں اٹھائیں، اور قربانیاں دیں ـــــ دراصل جماعتوں کی نقل و حرکت جس پر ہم زور دیتے رہتے ہیں اس کا راز بس یہی ہے، اور اس میں یہ سب کچھ ہے، اور ہمیں اپنے غور و فکر اور تجربے کی بنا پر اس کا پورا یقین ہے ـ کہ اندر اور باہر کی تبدیلی کا یہ عجیب و غریب نسخہ ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور پر کیا جائے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ خود ہم نے بھی اس کی قدر نہیں کی، اور اس کا کچھ حق ادا نہیں کیا، اسلئے لوگ ابھی تک اس کی تاثیر اور طاقت کے قائل نہیں ہو سکے، اور اس کی ذمہ داری ہم آپ ہی پر ہے جو اس سے واقف ہیں اور اس کام کو کر رہے ہیں، چاہے وہ کسی شہر اور کسی صوبہ اور کسی ملک میں کر رہے ہوں۔ اگر

جماعتوں کی نقل وحرکت اصولوں کی پوری پابندی کے ساتھ ہو تو جو شخص دو چار دن بھی کسی جماعت کے ساتھ گذارے گا انشاء اللہ وہ ضرور متأثر ہوگا، اُسکے ایمان میں ضرور تازگی آئے گی، اُس میں ضرور دینی فکر پیدا ہوگی، اُسکے دوسرے جذبات اور دوسرے شوق کمزور پڑیں گے، اور اللہ سے تعلق کا جذبہ اور اس کی رضا اور رحمت حاصل کرنے کا شوق انشاء اللہ کسی نہ کسی درجے میں ضرور بڑھے گا۔

جماعتوں کے اس نظام میں یہ چند باتیں بڑی اہم اور بڑی طاقتور ہیں :-

(۱) ایک، زندہ دینی اور دعوتی ماحول، اور اللہ کے ذکر کی، اور آخرت کے فکر کی، اور تعلیم وتعلم کی متحرک اور متعدی فضا۔

(۲) دوسرے جماعت کے ساتھ ہوکر خود دین کا داعی بننا ——— (اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس چیز کا داعی اور حامی بن جاتا ہے قدرتی طور پر اُس سے اس کا تعلق بڑھتا ہے، یہ ایک مسلّمہ نفسیاتی حقیقت ہے، آپ ہر تحریک اور ہر نظریے کے داعیوں اور حامیوں کو دیکھیں گے کہ جس نظریے کے وہ سچے اور مخلص داعی ہوں گے اس پر اُن کا یقین اور اُس سے اُن کا تعلق نہایت گہرا ہوگا، اور برابر ترقی کرتا رہے گا)۔

(۳) تیسرے، دین کی خاطر تکلیفیں اُٹھانا، اور اللہ کی راہ میں اپنے مرغوبات ومالوفات اور اپنی خواہشات اور اپنے جان ومال کی قربانی کرنا، اور اس تکلیف اور قربانی کی عادت ڈالنا ——— یہ وہ چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور ہدایت کے دروازے کھلنے کا وعدہ ہے۔ ارشاد ہے :- "وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ٥"

(۴) جماعت کے ساتھ وقت گذارنے کا اسی طرح کا ایک چوتھا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے کبھی دین سیکھنے کی فکر نہیں کی، نہ اُنھوں نے دین کا علم حاصل کیا، اور نہ دین والوں کی صحبتیں اُن کو ملیں، ایسے لوگ جماعتوں کے ساتھ رہ کر دین کی ضروری ضروری معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں، دین سیکھنے کا سب سے سہل اور فطری طریقہ یہی ہے کہ دین والوں کے ساتھ رہ کر، اُن کا طریقہ اور اُن کی روش اختیار کی جائے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ ہماری یہ جماعتیں اگر صحیح طریقے پر اپنا کام کریں تو یہ چلتے پھرتے مدرسے بھی ہیں اور ذکر وفکر اور ریاضت اور مجاہدے کی گشتی خانقاہیں بھی ہیں ——— اور ساتھ ساتھ غافلوں اور بے طلبوں کے لئے یہ دعوت اور تبلیغ بھی ہے، یعنی جو بندے اللہ سے بے تعلق اور آخرت سے بے فکر ہو کر زندگی گذار رہے ہیں، جماعتوں کی یہ نقل وحرکت اُن میں فکر اور طلب پیدا کرنے کی کوشش بھی ہے ——— اور دین کی فکر اور کوشش کا جو عمومی نظام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قائم فرمایا تھا اُس کو پھر سے زندہ کرنے اور رواج میں لانے کی یہ جد وجہد بھی ہے ——— الغرض اس کام میں اور اسکے طریق کار میں ان سب باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور وہ ان تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔

پس ہمارا اصول اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ ایمان اور ایمانی زندگی کے طالب اور داعی بن کر ایمانی فکر اور ایمان والی جدوجہد کو دنیا میں پھر سے زندہ اور عام کرنے کے لئے اس طرح کی جماعتیں بنا بنا کر اپنے وطنوں اور اپنے گھروں سے نکلیں، اور جماعتی ماحول میں وقت گذار کے اور اس راہ میں تکلیفیں اٹھا کے ایمان اور ایمان والی زندگی خود بھی حاصل کریں، اور اس دینی جدوجہد کو دنیا میں پھیلائیں، بہرحال ہماری اصل دعوت گھر سے نکل کے کام کرنے کی ہے لیکن جو لوگ ہماری دعوت اور ہمارے مطالبہ پر وقت دینے کے لئے تیار نہ ہوں اُن کو بھی ہمیں چھوڑنا نہیں ہے۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ ہم سو سے وقت لینے کی کوشش کریں تو دس مشکل سے تیار ہوتے ہیں، ایسی حالت میں باقی ۹۰ کو یوں ہی اُن کے حال پر چھوڑ دینا بڑی غلطی اور بڑی بے رحمی ہوگی، اُن کے واسطے ضروری ہے کہ ہم اُن سے اُن کے گھروں ہی پر بار بار ملتے رہیں، اور اُن کو دین کی طرف توجہ دلاتے رہیں، اور مقامی اجتماعات ہی میں لانے کی کوششیں کرتے رہیں، جب وہ اتنا کرنے لگیں گے تو انشاء اللہ کبھی وہ آگے بڑھنے کے لئے بھی تیار ہو جائیں گے بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب ایسے ملیں جو نہ جماعت کے ساتھ نکلنے پر تیار ہوں نہ وہ مقامی اجتماعات میں آنے کے لئے آمادہ ہوں تو اُن سے ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ ہی رکھا جائے، اور ان کو پڑھنے کیلئے کتابیں ہی دیجائیں۔

اصل مقصد تو اللہ سے اور دین سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا ہے، اور باقی تو سب وسائل اور ذرائع ہیں ہاں! چونکہ ہمیں تجربے سے اس کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ سب سے زیادہ مؤثر چیز الحمد للہ ہمارا یہ جماعتی اور دعوتی نظام ہے، اور اس کا اثر متعدی ہے، اس واسطے ہماری خاص جدوجہد اسی کے لئے ہونی چاہئے۔

جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں ایک اصول ہمارا یہ بھی ہے کہ ہم اپنے اس کام کے سلسلہ میں عام دعوت دین کی صرف چند اصولی اور متفق علیہ باتوں کی دیتے ہیں، اور یہ وہ باتیں ہیں جن کے متعلق ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی زندگی کی اصلاح ان ہی بنیادوں پر ہو سکتی ہے، یعنی ہماری ان باتوں کو اپنانے کے بعد وہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ وہ دین کی اُن باتوں کو بھی قبول کریں جن کو وہ آج اپنی جہالت اور دین سے بیگانگی کی وجہ سے ہمارے کہنے سے بھی قبول نہیں کر سکتے، اور دین کے لئے اپنی خواہشات کی، اور اپنے جان و مال کی وہ قربانیاں کر سکیں جن کے لئے وہ آج کسی طرح بھی تیار نہیں ہو سکتے۔

ہم اپنے اس اصول ہی کی وجہ سے بیچارے عوام کی بہت سی اعتقادی اور عملی غلطیوں کے بارے میں بسا اوقات کچھ نہیں کہتے، کیونکہ ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اگر ہم کچھ کہیں گے تو ماننے کے بجائے یہ لوگ ہماری بات سننا بھی چھوڑ دیں گے، اور ہم برابر دیکھتے ہیں کہ یہی لوگ جب ہماری ابتدائی اور بنیادی باتوں کو مان لیتے ہیں، اور دین کی طرف چلنے لگتے ہیں، اور اپنی نفسانی خواہشات اور رسم و رواج کے خلاف چلنے کی اُن میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے

تو پھر اُن باتوں کی بھی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔

الحمد للہ ہم اپنے اس اصول اور اس طرز کار پر بالکل مطمئن ہیں، اور اس کو حکمت شریعت کے بھی عین مطابق سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ہمارا ایک خاص اصول یہ ہے کہ ہم اس کام کو عمومی دعوت کے اصول پر کر رہے ہیں، تنظیم جماعت کے اصول پر نہیں ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کل جس طرح مختلف مقاصد کے لئے جماعتیں اور پارٹیاں بنانے کا رواج ہے، اُن کے کچھ ممبران یا ارکین ہوتے ہیں جنھیں کچھ خاص شرطیں اور پابندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں، اور پھر جماعتی معاملات میں اُن کے کچھ خاص حقوق ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں کے نہیں ہوتے، اور اسی طرح کچھ عہدے دار ہوتے ہیں، اور مختلف مقامات پر اُن کی شاخیں ہوتی ہیں، اور یہ شاخیں اپنے مرکز کے ماتحت ہوتی ہیں، اور اس ماتحتی ہی کی وجہ سے مرکز کو اپنی شاخوں سے محاسبہ کا، اور باز پرس کا حق ہوتا ہے۔

تو اگرچہ آج کل کی تمام منظم جماعتوں اور پارٹیوں کا یہی طریقہ ہے، اور اس کا رواج اتنا عام ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ اس طرح کی تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام ہو ہی نہیں سکتا، لیکن ہم یہ کام اس قسم کی کسی تنظیم کے بغیر ہی کر رہے ہیں۔

آپ حضرات جیسا کہ خود جانتے ہیں لوگوں کو ہم کسی خاص تنظیم میں شامل ہونے کی یا کسی جماعت یا پارٹی کا ممبر یا رکن بننے کی دعوت نہیں دیتے، ہم نے ایسی کوئی جماعت یا پارٹی بنائی ہی نہیں، ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ کام جو ہم مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں یہ کرنے کا ہے ہم بھی اس کو کر رہے ہیں آپ بھی کیجئے، اس میں کسی افسری ماتحتی کا کوئی سوال نہیں، نہ اس کیلئے کوئی آل انڈیا، یا آل ورلڈ دینی جماعت یا پارٹی بنانے کی ضرورت ہے، آپ اس کو یوں سمجھئے کہ مثلاً مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس حال میں ہے کہ ان کی زندگی ایمان والی اور اسلام والی زندگی نہیں ہے، یا تو وہ اسلام کے تمام احکام سے بے تعلق ہیں، یا زیادہ تر احکام سے بے تعلق ہیں، تو ان کی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے کے لئے ہمارے نزدیک اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ ہم ایک اسلام کمیٹی یا ایمان کمیٹی قائم کریں، اور اُن مسلمانوں کو اس کا رکن یا ممبر بننے کی دعوت دیں، اور اس کی رکنیت یا ممبری کے لئے یہ شرط لگائیں کہ اسکے ہر ممبر کو اسلامی احکام پر عمل کرنا ہوگا، بلکہ اس کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو براہِ راست اسلامی زندگی کی دعوت دیں، اور اس کے لئے جو طریقۂ کار اس زمانے میں ہم بہتر سمجھتے ہیں اُس کو اختیار کرنے کا ان کو مشورہ دیں ———

اسی طرح ہمارے نزدیک اس کی بھی ضرورت نہیں کہ اس کوشش کے لئے کوئی خاص پارٹی منظم کی جائے، اور لوگوں کو اُس کا ممبر یا رکن بنایا جائے ——— بلکہ ہم صاف کہتے ہیں کہ دوسرے کاموں کے لئے یہ طریقہ موزوں ہوگا، لیکن اس دینی اصلاحی جدوجہد کے لئے یہ مناسب نہیں ——— بلکہ ہمارے نزدیک تو اس میں مفاسد اور نقصانات ہیں۔

اس وقت امت میں اتنا انتشار ہے کہ کسی خاص شخصیت یا جماعت پر اُس کا بہت تھوڑا حصہ مجتمع ہو سکتا ہے، اور

بہت کم لوگ کسی خاص جماعت اور حلقہ سے وابستہ ہوسکتے ہیں، ایسی صورت میں خالص دینی اور اصلاحی کام (جو زیادہ سے زیادہ وسیع اور عام ہونا چاہئے) اگر تنظیمی طریقے پر کیا جائے گا، اور لوگوں کو اُس تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی، یا کسی امیر یا کسی شیخ کی بیعت کی طرف انھیں بلایا جائے گا، تو نئے نئے سوالات اور اختلافات اٹھیں گے، اور امت میں اختلاف اور انتشار اور زیادہ بڑھے گا، جیساکہ تجربہ ہو رہا ہے۔

اسکے علاوہ اس وقت اکثر طبیعتوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ دین کے نام پر کسی خاص جماعت اور پارٹی میں داخل ہوجاتے ہیں، تو اُن میں ایک خاص قسم کی حزبیت اور جماعتی عصبیت آجاتی ہے، پھر وہ اپنی جماعت کے آدمیوں کو اور نظر سے دیکھتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کو اور نظر سے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پھر انھیں اپنے چھوٹے سے دائرے سے باہر یا تو خیر بالکل نظر نہیں آتا، یا بہت ہی کم شاذ و نادر نظر آتا ہے، اور اس وقت امت میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے دائروں اور حلقوں کا بننا سخت مضر، بلکہ مہلک ہے۔

ایک خطرہ ہمارے نزدیک اس طریقے میں یہ بھی ہے کہ اس وقت امت میں غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہے کہ کسی جماعت کا رکن یا ممبر بن کر کام کرنے کی صورت میں اُن کے لئے کام کا محرک بجائے اللہ کے حکم اور دین کے تعلق کے جماعت کا نظام اور جماعت کا تعلق ہوگا، یعنی اُن کی محنتیں اور سرگرمیاں براہِ راست اللہ کے لئے اور دین کے لئے ہونے کے بجائے جماعت کے لئے اور پارٹی کے لئے ہوں گی، اور یہ دین کی رُوح اور انبیاء علیہم السلام کے اصول کے بالکل خلاف ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں، اور یہ وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں یہ دینی کام ایک عام دعوت کے طرز پر کرنا ہے ——— اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ پر بڑا خاص فضل فرمایا کہ انھوں نے اس زمانے کے عام رواج کے بالکل خلاف یہ طرز اختیار کیا، اُن کا ذہن اس مسئلہ میں بالکل صاف اور یکسو تھا، اور وہ اس پر پورا یقین رکھتے تھے کہ امت اس وقت اس حالت میں نہیں ہے کہ اس کی دینی اصلاح کے لئے تنظیمی جماعتوں کے طرز پر کام کیا جائے، اور کسی خاص شخص یا جماعت کی طرف اس کو دعوت دی جائے۔

اس سلسلہ میں ایک چیز اور بھی قابلِ ذکر ہے، اور ایک دو بار اپنے بعض خاص ساتھیوں نے خود مجھ سے اس کے متعلق سوال بھی کیا ہے ——— اور وہ یہ کہ بعض حدیثوں میں اس کی تاکید ہے کہ مسلمان جماعتی نظام کے ساتھ اور جماعت سے وابستہ ہوکر رہیں ——— اور کسی کو اپنا امیر ضرور بنائیں۔

ایک زمانہ تک میں بھی ان حدیثوں کے مقصد اور منشا کے بارے میں کچھ غلط فہمی میں تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اُس سے نکالدیا، دراصل اس بارے میں جو روایات نقل کی جاتی ہیں اُن میں سے جن میں التزام جماعت اور امام کی بیعت کی تاکید ہے اُن کا منشا صرف یہ ہے کہ جب مسلمانوں میں جماعتی نظام موجود ہو اور اُمت کا عموم اُس سے وابستہ ہو، اور اس کا کوئی امام ہو، تو ہر مسلمان کو اُس سے

وابستہ رہنا چاہئے، اور کسی کو بھی اُس سے الگ رہ کر اختلاف اور تفرقہ کا باعث نہیں بننا چاہئے ـــــــ اور ظاہر ہے کہ اس وقت یہ صورت نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی اس وقت امکان نہیں ہے کہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو کوشش کر کے کسی ایک جماعت پر اور ایک امیر پر متفق کیا جا سکے ـــــــ ایسی حالت میں اگر اپنی اپنی جماعتیں بنائی جائیں گی تو ایک ایک ملک بلکہ ایک ایک شہر میں مختلف الخیال مسلمانوں کی بیس بیس جماعتیں ہوں گی، اور اُن کے بیس بیس امیر ہوں گے، تو حدیث پر اس طرح عمل کرنے سے بجائے وحدت اور اجتماعیت کے تفرق اور تشتت بڑھے گا۔

چنانچہ جن لوگوں نے ان روایات کی بنیاد پر ہمارے اس زمانہ میں دینی جماعتیں بنائیں، اور مسلمانوں کو کسی امیر کی بیعت کی دعوت دی، وہ بہت تھوڑے لوگوں کو اپنے ساتھ لے سکے، دہلی کے ایک اہلِ حدیث بزرگ نے اپنی جماعت اسی بنیاد پر بنائی تھی، اور وہ اُسکے امام اور امیر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہلحدیث حضرات میں سے بھی بہت تھوڑے سے اُن کے ساتھ ہوئے، اور وہ چند آدمیوں کی ایک الگ ٹولی بن کر رہ گئی، اور باقی ساری جماعت اُن کے خلاف ہو گئی، اور اس اختلاف نے بہت طول کھینچا، ممکن ہے وہ بزرگ مطمئن ہوں کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہی حدیث کا منشا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اُن کی غلط فہمی تھی، دین میں جماعت اور امارت کا حکم تو اُمت میں اجتماعیت اور وحدتِ مرکز پیدا کرنے کے لئے ہے، نہ کہ اپنی اپنی ٹولیاں بنانے کے لئے۔

اور بعض حدیثیں وہ ہیں جن میں کسی خاص حالت میں وقتی اور عارضی امیر بنانے کے لئے فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے، کہ:-

"جب تین مسلمان بھی سفر میں نکلیں، تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں"

ان حدیثوں کو بھی مستقل پارٹیاں بنانے کے لئے اور بیعت لینے والے مستقل امیر بنانے کے لئے استعمال کرنا صحیح نہیں۔ ان حدیثوں پر عمل کی صورت وہی ہے جو خود رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ سے معلوم ہوتی ہے کہ آپ جب دعوتی وفود یا فوجی دستے یا لشکر روانہ فرماتے تھے تو ایک کو اُن کا امیر بنا دیتے تھے، اور یہی آپ حضرات کا طریقہ ہے، کہ جب آپ کی جماعت نکلتی ہے تو ایک امیر بنا لیا جاتا ہے، یا آپ کو کوئی اجتماع کرنا ہوتا ہے، یا مشورے کے لئے بیٹھتے ہیں، تو ایک کو امیر بنا لیتے ہیں، یا چند آدمی مل جُل کر کوئی خاص کام کرنا چاہتے ہیں تو اجتماعی نظم کے لئے اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لیتے ہیں ـــــــ الغرض آج کل جس قسم کی پارٹیاں اور جماعتیں بنانے کا رواج ہے، اُن کے لئے ان حدیثوں سے استدلال کرنا صحیح نہیں[1]۔

---

[1] دراصل اس سلسلہ میں ایک بنیادی غلطی بہت سے لوگوں سے یہ ہوتی ہے کہ احادیث میں "جماعت" اور "امام" جیسے جو الفاظ آتے ہیں اُن سے ان کا ذہن اُسی قسم کی جماعتوں اور ان کے اس طرح کے لیڈروں اور امیروں کی طرف چلا جاتا ہے جن کا آج کل رواج ہے، حالات کے اور رواج کے بدل جانے سے اس قسم کی غلط فہمیاں لوگوں کو بہت ہوتی ہیں۔ ۱۲۔

اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تنظیمی پارٹیاں یا جماعتیں بنانا ناجائز ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ ناجائز ہرگز نہیں ہے یہ تو انتظامی تدابیر ہیں، اگر کسی اجتماعی کام کے کرنے والے، اور کسی تحریک کے چلانے والے اپنے مقصد اور اپنے کام کیلئے اسی طریقے کو بہتر سمجھیں، تو شریعت میں اس قسم کی تنظیمی جماعت بنانے کی ہرگز ممانعت نہیں ہے، اس طرح کی ساری چیزیں مباح الاصل ہیں ——— میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس کو شریعت کا حکم قرار دینا اور جماعت و امارت سے متعلق حدیثوں سے اس کے لئے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، اُن حدیثوں کا محمل اور مطلب وہی ہے، جو میں نے ابھی بتلایا۔

خیر، یہ تو ایک علمی بات تھی، چونکہ بعض دوستوں نے ایک بار مجھ سے اس کے متعلق سوال کیا تھا، اسلئے میں نے اس کی ذرا تفصیل کردی، ورنہ مجھے صرف یہ بتلانا تھا کہ ہمارا اصول یہ ہے کہ ہم نے اس کام کے لئے کوئی جماعت منظم نہیں کی ہے اور ہم اس کو عمومی دعوت کے طور پر چلا رہے ہیں، اور اسی کو ہم صحیح سمجھتے ہیں ——— لیکن یہ طریقہ اب اتنا نامانوس اور غیر مروج ہو چکا ہے کہ خود مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے، کہ بعض اوقات ہزار سمجھانے سے بھی بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، کہ کسی منظم پارٹی کے بغیر کوئی بڑا اجتماعی کام ہو سکتا ہے، اور کوئی تحریک چلائی جا سکتی ہے۔

ایک دفعہ سی، آئی، ڈی کے ایک غیر مسلم افسر ہمارے اس کام ہی کے بارے میں کچھ تحقیق کرنے کے لئے میرے پاس آئے، آدمی بہت سمجھدار اور معقول تھے، اُن کے پاس ایک لمبا سوال نامہ تھا جس میں قریباً ۳۰۔ ۴۰ سوال تھے، انھوں نے وہ سوال نامہ نکال کر جب مجھ سے سوالات شروع کئے، تو میں نے اُن سے کہا، کہ آپ کی آسانی کے لئے میں پہلے اس کام کی مختصر تاریخ اور نوعیت بیان کردوں، اسکے بعد میرا جواب سمجھنا آپ کے لئے آسان ہو جائے گا، بلکہ شاید پھر آپ کو زیادہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی، چنانچہ میں نے اس کام کی تاریخ اور اسکے اصول اور طریقِ کار پر اُن کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی، اللہ تعالیٰ نے اُس وقت بڑی خاص مدد فرمائی، مجھے یاد نہیں کہ اتنے تھوڑے وقت میں اس کام کے بارے میں کبھی میں نے ایسی جامع اور صاف سلجھی ہوئی تقریر کی ہو۔

اُن صاحب نے بڑی توجہ سے میری ساری بات سُنی، اور میں نے اُن کے چہرے سے بھی محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل کو بہت متأثر اور مطمئن کیا ——— اسکے بعد میں نے اُن سے کہا کہ اب آپ سوال نامہ دیکھئے اور جو دریافت کرنا ہو وہ دریافت کیجئے۔

انھوں نے سوال نامہ کھولا، اور اکثر سوالوں کا جواب خود ہی لکھ لیا، اور چند سوالات اسکے بعد بھی کئے، اور میں نے جو جواب دیا وہی اُنھوں نے لکھ لیا۔ آخر میں انھوں نے کہا (اور میرا خیال ہے کہ بالکل سچے دل سے کہا) کہ جو کچھ آپنے اسوقت کہا میں نے اس کو سمجھ بھی لیا، اور مجھے بالکل یقین ہے کہ آپ نے بالکل صحیح بتلایا ہے، لیکن ایک بات ایسی ہے کہ میں کسی اور کو نہیں سمجھا سکتا، اور کوئی دوسرا اُس کا یقین نہیں کر سکتا، اور وہ یہ کہ آپ کی کوئی منظم پارٹی نہیں ہے، اور اس کا کوئی ممبر نہیں ہے، اور کوئی دفتر نہیں ہے، اور کوئی فنڈ نہیں ہے، اور کوئی ایسا رجسٹر تک نہیں ہے جس میں اس تحریک کے کارکنوں اور ہمدردوں کے

نام ہوں، اور کہیں اس کا سنٹر اور مرکز نہیں ہے، اور پھر بھی کام اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ہم کو اپنے ذرائع سے بھی معلوم ہے، اور آپ نے بھی ابھی بتلایا، کہ سارے ملک میں ہو رہا ہے، اور ہندوستان سے باہر عرب اور مصر اور شام تک میں ہو رہا ہے —— میں نے تو اسلئے یقین کرلیا کہ آپ نے بتلایا، اور میرے دل کو اس کا بالکل اطمینان ہے کہ آپ نے جو کچھ بتلایا ہے وہ صحیح ہی بتلایا ہے، لیکن اس زمانہ میں اس بات کا بالکل یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اتنا بڑا کام بغیر کسی پارٹی کے، اور بغیر کسی فنڈ کے بھی ہو سکتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ایک بات ذہن میں ڈالی میں نے کہا کہ اچھا یہ بتائیے کہ ہندو مذہب کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا کہ سارے ملک میں ہے، میں نے کہا کہ بدھ مذہب کہاں کہاں ہے؟ انھوں نے کہا کہ ایشیا کے بہت بڑے حصے میں ہے، میں نے کہا کہ اسلام کہاں کہاں ہے؟ انھوں نے کہا کہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں ہے —— میں نے کہا، کیا ان مذہبوں کو کسی منظم پارٹی نے پھیلایا تھا؟ انھوں نے کہا، نہیں! —— میں نے کہا، اصل بات یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اجتماعی کام عام طور سے چونکہ صرف مادی اور سیاسی ہوتے ہیں، اور وہ منظم پارٹیاں ہی کرتی ہیں اسلئے لوگوں کا یہ خیال ہو گیا ہے کہ کوئی بڑا اور اجتماعی کام ممبروں اور رکنوں والی پارٹی بنائے بغیر نہیں ہو سکتا، حالانکہ روحانیت اور خدا پرستی پھیلانے کے لئے اس کی بالکل ضرورت نہیں، اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ یہی ہے، در اصل قصور ہمارا اور ہمارے کام کا نہیں، بلکہ لوگوں کے ذہن کا ہے، ان کے ذہن آج کل کے مادہ پرست سیاستکاروں کے طور طریقوں سے اتنے مانوس، اور نبیوں اور رشیوں منیوں اور مذہبی اور روحانی مصلحین کے طرز سے اتنے نامانوس ہو گئے ہیں کہ اسی کا سمجھنا اور یقین کرنا ان کے لئے مشکل ہے، حالانکہ دنیا میں روحانیت اور خدا پرستی کی تبلیغ اور کوشش ہمیشہ اسی طرح ہوئی ہے۔

میری یہ بات سن کر انھوں نے کہا، کہ:- میں بالکل سمجھ گیا، اور اب میں یہ بات اپنے افسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا سکوں گا۔

میں نے اس واقعہ کا اسلئے ذکر کر دیا کہ اگر کبھی کسی کو سمجھانے کی آپ کو بھی ضرورت پڑے، تو آسانی سے آپ سمجھا سکیں۔

•

بہر حال ہم اپنے اس اصول اور طریقے پر بالکل مطمئن ہیں، اور اپنے کام کے لئے اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔

ایک اصول ہمارا یہ ہے کہ اس کام کے سوا اہلِ حق کے جو دوسرے دینی کام اور دینی تحریکیں اور دینی ادارے ہیں ان کو رقیب اور حریف نہ سمجھا جائے، بلکہ ان سب کی قدر کی جائے، اور ان کے اور زیادہ مفید ہونے اور پھولنے پھلنے کی، اور غلطیوں سے محفوظ رہنے کی اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی جائیں —— دین کو در اصل سب کاموں کی ضرورت ہے اس زمانے میں دین کی ضرورتیں اتنی بڑھ گئی ہیں، اور اتنی پھیلی ہوئی ہیں کہ کوئی ایک ادارہ، اور کوئی سلسلہ، اور کوئی جماعت، اور کوئی تحریک ان سب ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی —— ذرا سوچئے تو ہمارے ہزاروں دینی مدرسے

جو تعلیمی کام کر رہے ہیں، اور حضراتِ مشائخِ حق کے ذریعہ اللہ کے ذکر و فکر کی جو گرمی ہے، اور اہلِ حق کے جو مختلف دینی ادارے، اور دینی جماعتیں دین کے لئے اور مسلمانوں کے لئے جو کچھ کر رہی ہیں، اگر یہ سب کرنا چھوڑ دیں تو کتنی بڑی کمی ہو جائے گی، اور کیسا اندھیرا ہو جائے گا، اور پھر کیا کوئی بھی جماعت ان سب کاموں کو سنبھال سکے گی؟ ——— دوسری جماعتوں اور دوسرے اداروں کی خدمات کی قدر اور اعتراف نہ کرنا، اور کسی اختلاف کی وجہ سے بس ان کو تنقید کا نشانہ بنائے جانا، یہ اس وقت کی بہت ہی بڑی مہلک بیماری ہے، اور شیطان کو اس معاملے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے کہ اس نے جماعتوں اور پارٹیوں کا یہی مزاج بنا کر امت کے کارکن طبقوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ اب ایک کے ذریعہ دوسروں کی برائیاں اور غلطیاں تو منظرِ عام پر آرہی ہیں، لیکن خوبیوں کا کہیں چرچا نہیں۔

بہرحال ہماری اس دینی دعوت کا اصول یہ ہے کہ ہم سب دینی کاموں کی قدر کریں، اور اگر اپنی اس مشغولیت کی وجہ سے دوسرے بہت سے دینی کام ہم خود نہیں کر سکتے، تو اُن کے کرنے والوں کا احسان مانیں، اور اُن کے لئے دعائیں کریں۔

آج کل کے عام رواج کے خلاف اسی طرح کا ایک اصول ہمارا یہ بھی ہے کہ امت کے ہر طبقے میں خوبی اور خیر کے پہلو دیکھنے کی کوشش کریں اور اس کی قدر کریں، اور جس طبقے میں دینی لحاظ سے جو غلطیاں اور کمزوریاں نظر آئیں اُن کی تشہیر کرنے اور تنقید و اعتراض کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے کے ساتھ اُن سے قرب اور تعلق پیدا کر کے اُن غلطیوں اور کمزوریوں سے نکلنے میں اُن کی مدد کریں ——— امت اس وقت اس حال میں ہے کہ اس کا کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں ہے جو غلطیوں اور کمزوریوں سے خالی ہو، اسلئے غلطیوں اور کمزوریوں کو اچھالنے اور اصلاح کے لئے تنقید کا طریقہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہر طبقہ اپنی اصلاح کی فکر کے بجائے جوابدہی اور جوابی حملوں ہی میں لگا رہے گا، اس سے امت میں اختلاف اور بُعد اور ایک دوسرے کی توہین و تذلیل کا رواج تو بڑھے گا، اور سوائے حظِ نفس کے فائدہ کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔

میں اپنے ذاتی معلومات اور ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں کے بعض طبقوں کا اور ان کے بہت سے افراد کا حال یہ ہے کہ کسی ایک پہلو سے اُن میں اتنا خیر ہے اور ان کا مقام اس میں اتنا بلند ہے کہ ہم اپنے کو اُن کے سامنے بہت پستی میں دیکھتے ہیں، اور اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بعض ایسی غلطیوں میں بھی مبتلا ہیں جن کا غلطی ہونا ہمارے لئے بالکل ظاہر ہے، لیکن وہ اس کو غلطی نہیں سمجھتے ——— اسلئے ان حالات میں ہم اسی طرزِ عمل کو صحیح اور مفید سمجھتے ہیں کہ ہر ایک کی خوبیوں کی قدر کی جائے، اور غلطیوں کی تشہیر اور اعتراض و تنقید سے بچا جائے، اور تعلق اور اختلاط کے ذریعہ اُن کو اُن غلطیوں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔[1]

---

[1] لیکن ملحوظ رہے کہ ہم صرف اُن طبقات کے ساتھ اس طرزِ عمل کو صحیح سمجھتے ہیں جو کسی ایسی سخت اور اسلام سوز متعدی گمراہی میں مبتلا نہیں ہیں جس سے مسلمانوں کو بچانا ضروری ہے۔ ۱۲

ایک اصول ہمارے اس کام کا یہ بھی ہے کہ اللہ کے ایسے غریب اور کم حیثیت اور بے لکھے پڑھے بندوں کی بھی پوری فکر اور قدر کی جائے، جن کی اس دنیا میں کوئی قدر اور قیمت نہیں سمجھی جاتی، اور جن میں کوئی علمی اور عملی صلاحیت لوگوں کو نظر نہیں آتی ــــــ دنیوی اور مادی تحریکوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اُن میں ایسے لوگوں کو بیکار اور نکما سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے، وہ اُن کا ووٹ تو لینا چاہتے ہیں، اور اپنے مقاصد کے لئے انھیں آلۂ کار بھی بنانا چاہتے ہیں، لیکن اُن کی نظر میں انکی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اسلئے وہ صرف ہوشیار اور خاص صلاحیتیں رکھنے والوں لوگوں ہی کے طالب ہوتے ہیں جن سے وہ یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ تحریک کے اچھے کارکن ثابت ہوں گے ــــــ لیکن انبیاء علیہم السلام کے سامنے چونکہ اصل مسئلہ لوگوں کو دوزخ سے نکالنے کا اور اللہ سے ملانے کا ہوتا ہے اسلئے وہ امیر اور غریب اور تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ سب کی ایک طرح فکر کرتے ہیں، اور چونکہ ان کو اس حقیقت پر کامل یقین ہوتا ہے کہ سب کچھ کرنے والے صرف اللہ ہیں، کسی مخلوق کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے، اسلئے یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی رفاقت کے لئے خاص صلاحیتیں رکھنے والوں ہی کو اپنے ساتھ لینے کی فکر کریں، اور باقی لوگوں کو نکما سمجھ کر اُن کی ناقدری کریں۔ یہ ذہنیت جیسا کہ میں نے عرض کیا مادہ پرستوں کی، اور دنیوی لیڈروں کی ہوتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام اسکے برعکس یہ بتلاتے ہیں کہ ان کو حقیر مت سمجھو، ان ہی کی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ کی خاص مدد آتی ہے، حدیث شریف میں ہے حضورؐ نے فرمایا:۔

"ھل تنصرون الا بضعفاءکم" تم میں جو کمزور اور گرے پڑے بندے ہیں انکی وجہ سے تمہاری مدد ہوتی ہے۔

اور ایک روایت میں ہے، کہ:۔

"مہاجرین میں جو بیچارے بالکل فقیر اور خستہ حال تھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے) ان کی برکت سے فتح کی دُعا فرمایا کرتے تھے، یعنی عرض کرتے تھے کہ اے اللہ! اپنے ان خستہ حال بندوں کی برکت سے دشمنوں پر ہم کو فتح دے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

"کان یستفتح بصعالیک المہاجرین"

الغرض یہ ذہنیت انبیاء علیہم السلام کے طریقے کے بالکل خلاف اور سراسر مادہ پرستانہ ہے، کہ صرف لکھے پڑھوں کی، اور خاص صلاحیتیں رکھنے والوں کی قدر کی جائے، اور اُن ہی کو کارآمد سمجھا جائے، اور بیچارے غریبوں خستہ حالوں، اور ان پڑھوں کی فکر اور قدر نہ کی جائے، اور ان کو نکما سمجھا جائے ــــــ ہمیں آپ کو اس سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہئے، اور بہت بچنا چاہئے۔

ہاں! اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس عالم کو دین کے بارے میں بھی عالم اسباب سمجھتے ہوئے ہم اللہ کے ایسے بندوں کے اپنے ساتھ آنے کی، اور دین کے کام میں لگنے کی زیادہ حرص کریں جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیتیں

بخشی ہیں۔

رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے عمر بن ہشام (ابوجہل) اور عمر بن الخطاب (یعنی حضرت فاروق اعظمؓ) میں سے کم از کم ایک کے مسلمان ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ سے خاص طور سے دُعا اسی واسطے کی تھی کہ ان دونوں میں کچھ خاص فطری صلاحیتیں تھیں۔ اسلئے خاص صلاحیتیں رکھنے والوں کی زیادہ حرص کرنا تو بالکل درست ہے، لیکن اللہ کے جن بندوں میں ایسی صلاحیتیں نہیں ہیں اُن کی فکر نہ کرنا، اور اُن کو نکمّا اور بے قیمت سمجھنا یہ سراسر مادہ پرستانہ طرزِ عمل ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، ایسے لوگوں کو کبھی اللہ کی مدد نصیب نہیں ہوسکتی ——— بہرحال ہمیں آپ کو اس سے بہت بچنا چاہئے، یہ آج کل کی عام بیماری ہے۔

ایک خاص قابلِ ذکر اصول یہ ہے کہ جو کچھ اس دینی دعوت کے سلسلہ میں کیا جائے، اور دوسروں کو جو کچھ کرنے کی دعوت دی جائے اُس کی غرض اور اُس کا محرک اللہ کے حکم کی تعمیل کے جذبے اور اس کی رضا اور آخرت کے ثواب کی اُمید کے سوا کچھ نہ ہو۔

یہ بات کہنے میں تو بڑی آسان اور بہت مختصر ہے، لیکن دنیا میں چونکہ اس کا رواج بالکل نہیں رہا ہے اسلئے اسکے مطابق عمل کرنا اور اس کو عادت بنانا بہت مشکل ہے، مگر یہ ہمارے اس کام کی رُوح اور جان ہے، اسکے بغیر اگر کام ہوگا تو بالکل ہی بے رُوح اور سراسر مادی ہوگا، اور وہ ہرگز انبیاء علیہم السلام والا کام نہ ہوگا، اگرچہ صورت کے اور نام کے لحاظ سے وہ کیسا ہی دینی، اور کتنا ہی مقدس ہو۔

سب سے آخر میں اس دینی دعوت کا ایک اہم اصول اور بیان کرتا ہوں، اور وہ بھی اس زمانہ کے عام رواج کے خلاف ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس راستے میں ہم جو کوشش اور جدوجہد کریں وہ اس یقین کے ساتھ کریں کہ ہماری کوششوں سے کچھ نہ ہوگا، جو کچھ ہوگا اللہ کے کرنے سے ہوگا، ہم یہ کوشش اور جدوجہد صرف اسلئے کرتے ہیں کہ اللہ کا امر اور حکم ہے، اور اس کی سنت اور اس کا قانون اس عالم اسباب میں یہ ہے کہ بندے جس چیز کے لئے صحیح اصولوں پر جدوجہد کریں وہ اس کو وجود میں لے آتا ہے، یعنی ہمارا یقین اور اعتماد، اپنی کوشش اور اپنی جدوجہد پر نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہو، اور اسلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کا اہتمام، تدبیر اور کوشش سے کم نہ ہو، لیکن تدبیر اور جدوجہد میں بھی اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

میں کبھی کبھی کہا کرتا ہوں کہ ہماری تدبیر اور جدوجہد تو ایسی ہو کہ جو اس کو دیکھے وہ سمجھے کہ ہم شاید مادہ پرستوں کی طرح سب کچھ اپنی تدبیر اور اپنی محنت ہی کو سمجھتے ہیں ——— اور اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور بے بسی کے اظہار کے ساتھ ہماری دُعا کی کیفیت یہ ہو کہ اگر کوئی ہمیں اُس حال میں دیکھے تو سمجھے کہ یہ لوگ تدبیر اور جدوجہد کے شاید قائل ہی نہیں ہیں، اور صرف خدا ہی پر یقین اور اعتماد رکھتے ہیں۔ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:۔

"ما النصر من عند الله إلا بثقة بالله وحسن التدبير" اللہ کی مدد جب ہی ہو گی جبکہ اصل اعتماد اللہ ہی پر ہو، اور تدبیر کا بھی پورا حق ادا کیا جائے "

دوستو! یہ ہیں وہ اصول جن کی پابندی کے ساتھ ہم یہ کام کر رہے ہیں، اور کرنا چاہتے ہیں ——— آخر میں ایک ضروری بات اور کہنی ہے :-

کام کی حقیقت اور اُسکے اصول کے متعلق ایک اہم بات :-

اپنی اس دینی دعوت کے مقصد اور اصول کے متعلق جو کچھ ان صحبتوں میں بیان کرنا ضروری سمجھا وہ سب تو میں نے بیان کر دیا، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات آپ ہمیشہ ملحوظ رکھیں اور یاد رکھیں کہ ہمارا یہ کام اس زمانہ کے دوسرے رواجی کاموں سے اس بارے میں بھی مختلف ہے کہ اس کا کوئی مرتب دستور اور ضابطہ نہیں ہے جس کو کسی کمیٹی نے وضع کیا ہو، اور اس میں اغراض و مقاصد اور اصول اور قواعد و ضوابط خاص ترتیب سے بیان کئے گئے ہوں ——— بلکہ نفس الامری واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ کو اس کام کے لئے کچھ اس طرح فکر مند اور بے چین کیا تھا جس طرح کہ وہ اپنے کسی بندے سے جب کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کو فکر مند اور بے چین کر دیتا ہے، اور اسی کے ساتھ ان کو اس کام کی خاص حکمت اور تفقہ سے بھی نوازا تھا ——— ہم نے درحقیقت اُن ہی کے طرزِ عمل اور اُن کی باتوں سے اس کام کو اور اسکے اصولوں کو سمجھا، اور اپنے غور و فکر سے بھی بالکل صحیح پایا ——— پھر تجربے نے ہمیں اُن پر اور زیادہ مضبوط کر دیا، ہم اُن ہی کی باتوں کو بس اپنی زبان میں بیان کر دیتے ہیں ——— ابتک بھی ہمارا یہ حال ہے کہ حضرت مولانا کے سوانح حیات اور ملفوظات اور مکتوبات[1] کے مطالعے سے اس کام میں ہماری بصیرت اور ہمارے اطمینان میں الحمدللہ اور اضافہ ہوتا ہے۔

اور مولانا مرحوم کے صاحبزادے اور جانشین مولانا محمد یوسف صاحب کی ذات دراصل اس سلسلہ کی سب سے اہم زندہ کتاب ہے، اس سلسلہ میں اُن پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے ــ اس کام کے نقطۂ نظر سے یہ بات بے تکلف ظاہر کر دینا ہمارے لئے ضروری ہے، کہ اس دعوت کی رُوح و حقیقت اور اسکے اصول اور امتیازات کو سمجھنے کا سب سے بڑا ذریعہ مولانا موصوف کی باتیں سُننا ہے ــ ہم بغیر کسی انکسار اور تکلف کے کہتے ہیں کہ مولانا کی باتیں سُننے سے دعوت کے بارے میں بھی خود ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

---

[1] حضرت مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ جس کو مولانا سید ابوالحسن علی نے مرتب فرمایا ہے، ابھی حال میں شائع ہوا ہے، شروع میں مولانا ہی کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے ۱۲

دوسرے دینی اداروں اور تحریکوں کے بارے میں

ہمارا طرزِ عمل!

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

صورت حال یہ ہے کہ جہاں ہمارے رفقاء کار دعوت اصلاح و تبلیغ کا کام کرتے ہیں وہاں پہلے سے کچھ دینی ادارے موجود ہوتے ہیں اور اکثر جگہ کوئی دینی تحریک بھی ہوتی ہے لہٰذا ہمارے لیے غور و فکر کرنے اور ایک اصول طے کر لینے کی ضرورت ہے، کہ ہمارا رویہ عام دینی اداروں اور تحریکوں کے ساتھ کیا ہو۔

سب سے پہلے ایک اصول بیان کیا جاتا ہے جس سے ایسے مواقع پر ہمیں رہنمائی حاصل ہوگی اور وہ ایک مستقل معیار کا کام دے گا جس سے ہم اپنا طرز عمل اور رویہ معین کر سکیں گے۔

دین کا جو حصہ ہم تک پہونچا ہے اس کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں، ایک تو وہ حصہ ہے جو اپنی خاص ہیئت و شکل کے ساتھ ہم تک پہونچا ہے اور اسکی ہیئت و شکل مطلوب ہے، اس کو ہم "منصوص بالوضع" کہہ سکتے ہیں دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ دینی امور ہیں جو اپنی خاص ہیئت و صورت کے ساتھ (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے) امت سے مطلوب ہیں۔ مثلاً ارکان دین اور بہت سے ایسے فرائض جن کو نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے بتایا بلکہ آپ نے ان کی شکلیں زبانی بھی بتائیں اور خود کر کے بھی دکھلا دیں، مثلاً نماز حج، وضو وغیرہ۔

دین کا دوسرا حصہ وہ ہے کہ اس میں نفس شئ مطلوب ہے لیکن بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر (زمانہ کے تغیرات اور امت کے لیے وسعت اور سہولت کا خیال کر کے) آپ نے ان کی شکلیں متعین نہیں کیں، صرف شئ تبلا دی کہ یہ مقصود ہے۔ یہ وہ چیزیں جو خود منصوص ہیں لیکن ان کی کوئی خاص وضع منصوص نہیں۔ مثلاً جہاد فی سبیل اللہ،

دعوت الی اللہ، علم دین کے سلسلہ کا چلانا اور احکام شرعیہ کا اُمت تک پہونچانا، یہ سب اُمت سے مطلوب ہیں، اگر اُمت ان کو چھوڑ دے اور بالکل ترک کر دے تو وہ گناہ گار ہوگی۔

صرف یہ اعمال مقصود ہیں ان کی کوئی خاص شکل اور طریقہ معین نہیں کیا گیا بلکہ اس بارے میں امت کی عقل پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان فرائض کی ادائیگی کو اُس کی صلاحیتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مثلاً دعوت منصوص ہے لیکن اس کی کوئی خاص ہیئت منصوص نہیں۔

غیر منصوص بالوضع کی واضح مثال لباس کا مسئلہ ہے، لباس ساتر ہو، ٹخنوں سے اونچا ہو، گھٹنوں سے نیچا ہو، تفاخر اور تکبر کا لباس نہ ہو، کوئی حرام و ناجائز (مثلاً مردوں کے لیے ریشم) نہ ہو۔ پس لباس بھی منصوص ہے اور اسکے یہ شرائط بھی منصوص ہیں، لیکن لباس کی شکل، لباس کا رنگ اور اس کی قطع وغیرہ غیر منصوص ہیں، اس میں امت کے لیے بہت سہولتیں ہیں۔ اس کو امت کی تمیز اور عقل عام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

دوسری مثال مساجد کی ہے، مساجد بھی مطلوب ہیں، مساجد کی نظافت بھی مطلوب ہے، یہ بھی مطلوب ہے کہ انمیں ذکر اللہ ہو اور وہ دوسرے مقامات سے ممتاز ہوں۔ مگر ان کا کوئی خاص طرز تعمیر مطلوب نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں مساجد مختلف وضع کی پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ منارے بھی مساجد کے لیے شرط نہیں ہیں، ہندوستان کی مسجدوں میں دو میناروں کا رواج ہے۔ الجزائر و مراکش کی مساجد میں ایک مینار ہوتا ہے اور دنیا کی سب سے بڑی اور پہلی مسجد (بیت اللہ) کا کوئی منارہ نہیں۔

اب دعوت الی اللہ کی مثال لیجئے، اللہ کی طرف بندوں کو بلانا فرض ہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، تقریری ہو یا تحریری، علانیہ ہو یا خلوت میں، ان میں سے کوئی شکل معین نہیں۔ نوح علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ دعوت کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔

قال رب انی دعوت قومی لیلاً و نہاراً	حضرت نوح نے (حق تعالیٰ کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ اے میرے رب میں نے اپنی قوم کے سامنے اتنی بھی دین کی اور توحید کی دعوت رکھی اور دن میں بھی۔
ثم انی دعوتہم جہاراً	پھر میں نے خوب پکار کر اور چیخ کر بھی ان کو بلایا۔
ثم انی اعلنت لہم	پھر میں نے بالاعلان بھی آپ کا پیام ان کو پہنچایا۔
واسررت لہم اسراراً	اور چھپ چھپ کر تنہائیوں میں بھی ان سے آپ کی بات کہی۔

لہذا دعوت دین کا کام کرنے والے ہر فرد یا جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لیے جو طریقۂ دعوت صحیح جانے وہ

مقرر کرے اور اپنی تحریک کا جو طرز کار مناسب سمجھے وہ اختیار کرے، اس میں کسی کو جائز یا ناجائز کہنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس وقت عام طور پر دین کے ان دونوں حصوں کو خلط ملط کیا جاتا ہے، منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دیا جاتا ہے اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پر پہونچا دیا جاتا ہے اس کے نتیجہ میں مشکلات پیدا ہو گئی ہیں اور مختلف اداروں اور تحریکوں میں اکثر تنازعہ کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ اگر ہم ان دونوں چیزوں میں فرق سمجھ لیں تو بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی، سیکڑوں تنازعوں کا سدباب ہو جائے گا اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہو جائینگی۔ چیزوں کی اصل ہیئت سمجھنے اور ان کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا یہ پیمانہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ اس کے بعد صحیح اصول پر چلنے والی اور مخلصانہ دینی تحریکوں، دینی اداروں کے درمیان تقابل، تصادم اور اختلاف کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ فرق جو رہ جاتا ہے وہ صرف اپنے اپنے تجربوں اور حالات کے مطالعہ کا ہے کہ کام کی کون سی شکل اور طریقہ زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہے اور کس سے وہ نتائج و مقاصد ظاہر ہوتے ہیں جو اس کام سے مطلوب ہیں۔ دعوت الی اللہ کی شکل اور طرز میں ہر جماعت اور ادارہ آزاد ہے اس کو کسی خاص شکل یا طرز پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے، جیسے کسی کو اپنے تجربہ اور مطالعہ کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی جماعت اگر کسی خاص طریقہ کار کو اختیار کرتی ہے (بشرطیکہ وہ دین کے اصول و آداب کے مخالف نہ ہو) تو وہ اپنے فیصلہ میں حق بجانب ہو، ہم اپنے مخصوص طرز کار کو بہتر اور احیاء دین کے لیے مفید سمجھتے ہیں تو یہ اپنی جگہ ٹھیک ہے، ہم اپنے طرز کار کو دوسری تحریکوں اور اداروں کے داعیوں کے سامنے بہترین طریقہ سے پیش تو کر سکتے ہیں لیکن اگر صرف طرز کار کے فرق کی وجہ سے ہم ان کو غلط کار اور کسی گناہ کا مرتکب سمجھیں تو ہم غلطی پر ہیں۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ ان سے دوبارہ غور کرنے اور نتائج کو دیکھنے اور ان کا موازنہ کرنے کی درخواست کریں لیکن ان کے ساتھ ایک گمراہ فرقہ کا سا معاملہ کرنا، ان کو جاہل اور گمراہ سمجھنا غلط اور غلو ہے۔

ہماری اس دینی تحریک "دعوتِ اصلاح و تبلیغ" کا ایک خاص طرز ہے، اس میں تبلیغی گشت ہے، اجتماعات ہیں، ذکر اللہ پر، اکرام مسلم پر اور ترک مالا یعنی پر زور ہے اور دین کے لیے گھر سے نکلنے اور وقت اور عادات و مالوفات کی قربانی کی ترغیب ہے، وغیرہ وغیرہ، ان میں بعض چیزیں وہ ہیں جن کی ہمیں شریعت نے سختی کے ساتھ تاکید کی ہے مثلاً اکرام مسلم، ذکر اللہ کی کثرت، ترک مالا یعنی وغیرہ، لیکن بعض چیزیں مثلاً گشت، اجتماعات وغیرہ وہ ہیں جو انتظامی امور ہیں، یہ حدیث و قرآن سے استنباط کیے جا سکتے ہیں۔ وہ اصولی طور سے صحابہ کرامؓ کی زندگی میں ملیں گے لیکن اس خاص ہیئت میں نہیں ملیں گے۔ یہ سب چیزیں اجتہادی اور تجربی ہیں، ان چیزوں پر یا ان کی ان خاص شکلوں پر ہر جگہ اور ہر شخص سے منصوص چیزوں کی طرح اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

سب سے مشکل چیز اعتدال ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں اعتدال بدرجۂ اتم ہوتا ہے، ہم صاف کہتے ہیں کہ یہ بالکل امکان ہے کہ پچیس برس کے بعد اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوں جو صاحب نظر بھی ہوں اور اللہ کے ساتھ ان کا تعلق ہو اور وہ ہمارے اس طریقہ میں زمانہ کی ضرورت اور تقاضے کے لحاظ سے کچھ تبدیلیاں کریں۔ اس وقت اگر ایک جامد طبقہ ان کی مخالفت ہمارا نام لے کر محض اس بناء پر کرے کہ ہمارے بزرگ ایسا کرتے تھے تو اس کا یہ رویہ غلط ہوگا اور اس کا اصرار ہٹ دھرمی ہوگا۔ کبھی کبھی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اس تحریک میں بھی ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی طریقۂ کار اور یہی طرز دین کی خدمت اور احیاء کے لیے ہمیشہ کے واسطے اور ہر جگہ کے لیے ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب غلط ہے۔ جب تک اس مخصوص طریقہ پر تقریر نہ ہو، اسی خاص ڈھنگ پر اور ان ہی ساری پابندیوں کے ساتھ گشت نہ ہو، اور اجتماعات میں مقررہ طریقہ سے دعوت نہ دی جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ساری جد وجہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا، یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے اس لیے کہ اسی طرز عمل کی وجہ سے مختلف مذاہب اور فرقے امت میں پیدا ہوئے ہیں۔ اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تک کے غور اور تجربوں نے ہمیں یہاں تک پہونچایا ہے کہ ہر تقریر کے بعد جد وجہد عمل کی کچھ دعوت ضرور دی جائے، ہر بستی میں ایک مرکزی اجتماع ضرور ہو، رات کو مساجد میں قیام ہو وغیرہ وغیرہ، پس جب تک یہ چیزیں فائدہ مند معلوم ہوتی ہیں ہمیں اس وقت تک ان کو جاری رکھنا چاہیئے لیکن اگر ہفتہ کا اجتماع ہمارے شہر لکھنؤ کی نوچندی جمعرات کی طرح ایک رسم بن جائے، رات کا قیام رت جگا کی طرح رسمی ہوجائے اور دین کے کام کے لیے چلّے دینا رسم بن جائے تو یہ ایک مذہب بن جائے گا اور ایک بدعت قائم ہوجائے گی، اس وقت کے ربانی مصلحین کا فرض ہوگا کہ ان کے خلاف جد وجہد کریں اور ان رسومات کو مٹائیں۔ بہت سی چیزیں صحیح مقاصد اور دینی مصلحتوں کے ساتھ شروع ہوتی ہیں لیکن آگے چل کر غلط صورت اختیار کرلیتی ہیں، ایسے موقع پر حقیقت ورسم، سنت وبدعت، فرض ومباح میں تمیز کرنا تفقّہ فی الدین ہے، اور کہنے والے نے کہا ہے ؎ گرحفظ مراتب نہ کنی زندیقی

اگر ہماری تحریک کی ہمعصر دینی تحریکیں یا ادارے منصوص چیزوں کو مقصد بنائے ہوئے ہیں اور اپنی مخلصانہ صوابدید کے مطابق کسی طرز پر کام کر رہے ہیں تو ہمارا ان سے کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہمیں ان کے کام کا اعتراف کرنا چاہیئے ان کو کامیابی کی دعائیں دینا چاہئیں اور ان سے تعلقات بڑھانا چاہئیں اس لیے کہ وہ دین کے بعض اہم شعبوں کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اس طرح انھوں نے ہم کو یہ موقع دیا ہے کہ ہم ان دوسرے کاموں سے مطمئن اور یکسو ہو کر اپنا کام کریں۔ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ مدارس کے لیے دعائیں کرتے تھے اور اپنے خاص محبین کو ان کی اعانت کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ بہت سو مدارس کی آمدنیاں اس تبلیغی تحریک کی وجہ سے بڑھ گئی تھیں۔ مولانا رح نے اہل تعلق کو اس کی طرف بھی متوجہ کرتے تھے کہ علماء کی ملاقات کے لیے جایا جائے، ان سے تعلقات بڑھائے جائیں

اور ان کے حقوق (اکرام ومحبت اور تعاون) ادا کیے جائیں۔

یہاں ایک بار یک بات سمجھ لینا چاہیئے وہ یہ کہ ایک نبی ہوتا ہے، اور ایک مجدّد اور مصلح ہوتا ہے۔ نبی کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے اتباع کے بغیر نجات ہی نہیں ہو سکتی اور اس کی ہدایت حاصل کیے بغیر اللہ کی رضا اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، اس میں کسی قسم کی مدارات یا تساہل کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن مجددین اور مصلحین کا معاملہ یہ نہیں ہے، ہر مجدد اور ہر ربانی مصلح کے طریقہ کی پیروی سے دین کو اور دین کے طالبوں کو نفع پہنچتا ہے۔

مثلاً کسی مجدد کے طریقہ سے قربانی کے جذبات بڑھتے ہیں، لہٰذا اس کے طریقہ کی پیروی سے قربانی کے جذبات بڑھیں گے، ایک دوسرے مجدد کے طریقہ سے انفاق فی سبیل اللہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لہٰذا اس کے اثر سے انفاق وایثار کے جذبات پیدا ہوں گے، ایک تیسرے مجدد کے طریقہ سے مثلاً صفائی معاملات میں پختگی آتی ہو تو صفائی معاملات کے سلسلہ میں اس سے تعلق اور استفادہ خاص طور پر موثر ہوگا، بہر حال نبی کے طریقہ پر تو نجات کا انحصار ہوتا ہے اور بالکل اسی طریقہ پر چلنا لازم ہوتا ہے۔ لیکن کسی مجدد اور مصلح کا معاملہ یہ نہیں ہے، خاص خاص ترقیاں تو ان کے اتباع اور ان کے ساتھ وابستگی سے ہوتی ہیں لیکن نجات اس پر منحصر نہیں ہوتی۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ امت میں طبقات کا اتنا اختلاف ہو، اذہان کا اتنا تفاوت ہو اور حالات ایسے مختلف ہیں کہ کوئی تحریک یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ تمام طبقات کو متاثر کر سکتی ہے اور ان کی تسکین کا سامان کر سکتی ہے اور ان کی استعداد کے مطابق دینی غذا فراہم کر سکتی ہے۔ کوئی ذہن تقریر سے متاثر ہوتا ہے، کسی پر لٹریچر اثر انداز ہوتا ہے اور کوئی کسی دوسرے ذریعہ سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک واحد طریقۂ کار سے ہر جگہ، ہر ماحول میں اور ہر حالت میں کامیابی مشکل ہے اس حقیقت کے سمجھنے اور اس کے مطابق چلنے میں لوگوں سے بڑی غلطیاں ہوتی ہیں، بہت سے لوگ قابل قدر، اور بڑے مخلص ہیں، لیکن ان لوگوں کا اس وقت تک دل خوش نہیں ہوتا جب تک کہ ہر شخص انھیں کے مخصوص طرز پر کام نہ کرے اور سب ایک ہی کام نہ کرنے لگیں، حالاں کہ عمومی وانقلابی تحریکوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا وہاں ہر چیز اُس کے صحیح مقام پر رکھی جاتی ہے اور ٹھیک چوکھٹے میں بٹھائی جاتی ہے، ہر شخص سے وہی کام لیا جاتا ہے جس کا وہ زیادہ اہل ہے اور اس میں وہ دوسروں سے ممتاز ہے اور جس کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے۔

ہم کو تو دوسری دینی کوششوں اور ان کے ذمہ داروں کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے

بہت سے لوگوں کو سنبھال رکھا ہے جو ہماری گرفت میں نہیں آسکتے تھے، یہ اللہ کی طرف سے انتظام سمجھنا چاہیئے کہ کچھ لوگ اس راستہ سے دین تک آجائیں اور کچھ اُس راستہ سے آجائیں۔ اپنے طریقۂ کار کو مناسب طریقہ سے ان کے سامنے اکثر و بیشتر پیش کرتے رہنا چاہیئے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ ہمارے درپے ہیں اور ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے ہی پڑ گیے ہیں، نہ ان کے سامنے آپ اپنی دینداری کا اظہار کریں، اس طرح آپس کے تنازعات ختم ہو جائیں گے، ایک دوسرے کی طرف سے دل صاف ہو جائیں گے اور امت کے مختلف طبقات اور جماعتوں میں تعاون علی البر والتقوی (نیکی اور خدا ترسی پر ایک دوسرے کی امداد) کی استعداد پیدا ہو جائے گی جو عرصہ سے مفقود ہو چکی ہے اور جس کی اس زمانہ میں جب کہ باطل مختلف شکلوں اور حربوں کے ساتھ حملہ آور ہے اور اہل باطل من کل حدب ینسلون (ہر ٹیلے اور ٹاپوسے اُبلے چلے آرہے ہیں) کا مصداق ہیں۔ سخت ضرورت ہے۔

دعوت و اصلاح و تبلیغ کی راہ میں

موجودہ دور کی اہم مشکلات و موانع اور انکا حل

(از، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

تحریک کے داعیوں کو اس جگہ اور ماحول کا جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیئے جہاں ان کو اپنی کوششیں صرف کرنا ہیں تاکہ صحیح حالات معلوم رہیں اور اُن کے مطابق جدوجہد کی راہیں سوچی جائیں۔ بعض دفعہ انسان حقیقتوں سے آنکھیں بند کرکے ایک خیالی دنیا اپنے ذہن میں بنا لیتا ہے اور اسی کے مطابق تمنائیں اور امیدیں قائم کرتا ہے۔ بعد میں جب اس کی امیدوں کے خلاف اصل واقعات ظہور میں آتے ہیں تو وہ ناامید ہوتا ہے اور ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ داعی کو سب سے زیادہ حقیقت پسند ہونا چاہیئے۔ انبیاء علیہم السّلام نے حقائق اور واقعات کو نظرانداز نہیں فرمایا، جنگ بدر کے موقع پر میدانِ جنگ کے انتخاب میں آپ نے صحابۂ کرام کے مشورہ کو قبول فرمایا پھر جب کافروں کی طرف سے تین سورما میدان میں آئے تو آپ نے یوں ہی اُن کے مقابلہ کے لیے کسی کو روانہ نہیں کر دیا بلکہ تین بہترین شخصوں کو ان کے مقابلہ کے لیے منتخب فرمایا۔ دین کا کام کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے جیسا کہ اکثر جذباتی لوگ سمجھتے ہیں کہ دنیا اور عالم اسباب سے آنکھیں بند کرلی جائیں، ماحول کا جائزہ نہ لیا جائے، قوم کے امراض کی چھان بین نہ کی جائے اور راستہ میں آنے والی رکاوٹوں کا اندازہ نہ کیا جاوے، دنیا کا صحیح جائزہ لیتے رہنا اور چیزوں کو ان کی حقیقی جگہ دینا دین کے حقوق اور ضروری تدابیر میں سے ہے۔

اس صحبت میں موجودہ دور کی نمایاں مشکلات اور موانع بیان کیے جائیں گے۔ یہ رکاوٹیں اسلام کے راستہ کی رکاوٹیں ہیں اور جب اسلام کے احیاء اور دین کی تجدید کی کوشش کی جائے گی تو یہ رکاوٹیں دعوت کی راہ

میں حائل رہوں گی۔

(۱) **مادہ پرستی:-** مادہ پرستی ہر زمانہ میں اسلام کی حریف رہی ہو' یہ شیطان کا بڑا کارگر حربہ ہو اس لیے کہ اس میں انسان کے لیے قدرتی کشش ہے، مختلف اسباب کی بنا پر اس زمانہ میں مادہ پرستی نے بحران کی شکل اختیار کر رکھی ہے' وہ اس وقت عوام کا مذہب بن گئی ہے، اس کی عبادت گاہ میں تمام عبادت گاہوں سے زیادہ چہل پہل ہے' یہ نئی عبادت گاہ تمام عبادت گاہوں کے ملبے پر تعمیر ہوتی ہے۔

اس وقت کا سب سے بڑا بت انسان کا پیٹ اور اس کی نفسانی خواہشات ہیں، اس وقت کا کلمہ ہے "لا الٰہ الا البطن" (نہیں ہے کوئی معبود سوائے پیٹ کے) یہ نہ صرف اشتراکیت (سوشلزم) اور اشتمالیت (کمیونزم) کا نعرہ ہو بلکہ تمام کیمپوں میں یہ نعرہ گونج رہا ہو اور اس پر تمام محاذ متفق ہو گیے ہیں۔

دینی دعوت کا اس وقت سب سے بڑا حریف مادہ پرستی ہے اور یہ دین کی جد وجہد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہو اس لیے کہ یہ اس دور کی چلتی ہوئی چیز ہے' ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا مقابلہ ایک رائج الوقت مذہب سے ہو اگرچہ مادہ پرستی تمام مذاہب کی حریف ہو مگر دوسرے تمام مذاہب میدان چھوڑ چکے ہیں اور انسانوں کی رہنمائی سے دست کش ہو چکے ہیں۔ مذہب و دعوت کی حیثیت سے اس وقت صرف اسلام ہی میدان میں ہو اس کے سوا کوئی دوسرا مذہب خم ٹھوک کر مادہ پرستی کے مقابلہ میں نہیں آتا۔ اسلیے کہ صرف اسلام ہی پوری دنیا اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرنے کا دعویدار ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ وہی تنہا دنیا کا متولی اور انسانیت کا نگراں ہے۔

یہ مسئلہ کسی ایک جماعت کا نہیں ہو، بلکہ تمام مسلمانوں کے سوچنے کا ہو اس لیے کہ مادہ پرستی کے ساتھ موجودہ دور کی تمام طاقتیں ہیں اور دنیا کا یہ دستور ہمیشہ سے رہا ہو کہ اس کا فیصلہ مانا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ اس وقت وہ کیفیت ہو جو موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ میں تھی کہ باوجود تمام دلیلوں اور معجزات کے فرعون اور اس کی قوم حقیقت سے انکار کرتی رہی اس لیے کہ وہاں سوال یہ تھا کہ دولت کس کے ہاتھ میں ہے اور قوت وجاہ کس کے پاس ہے۔ اس حالت سے تنگ آکر موسیٰ علیہ السّلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ "رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ" (اے ہمارے رب آپنے فرعون کو اور اس کی قوم کو دنیا کی دولت وزینت عطا کی ہو اس سے وہ لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کرتے ہیں اے ہمارے رب اُن کے مالوں کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے اور جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں اس وقت تک ایمان نہ لائیں۔)

پس واقعی بات تو یہ ہے کہ اس فتنہ کا صحیح حل اسی وقت ہوگا جب کہ ایسے لوگ برسراقتدار آئیں جن کے دل میں خدا کا خوف اور تقویٰ ہو، ان کی سب سے بڑی فکر آخرت کی فکر ہو اور ان کی صفت یہ ہو کہ "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" (وہ بندے (جن کی تربیت ایسی ہو چکی ہو) کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکن اور غلبہ دیں (یعنی وہی اس دنیا کے والی اور حاکم بنا دیے جائیں) تو وہ نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکیوں کے احکام جاری کریں اور برائیوں سے لوگوں کو روک دیں)

بہرحال مادہ پرستی کا یہ دھارا جس کی رو میں لوگ اس وقت بہے چلے جا رہے ہیں پورے طور پر اسی وقت رکے گا جب کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اس دنیا کا اقتدار آجائے اس وقت دین اور ایمان عوام کا معیار زندگی بن جائے گا، اور اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ اسی وقت کرے گا جب کہ دین کی دعوت عام ہو، داعی بے دریغ قربانیاں دیں اور اس راہ کے مجاہدہ کا حق ادا کر دیں اور اپنے آپ کو دین کی راہ میں مٹا دیں۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا۔ (اللہ کا وعدہ ہو ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالحہ کیے کہ اللہ ضرور ان کو خلافتِ ارضی دے گا (یعنی دنیا کا انتظام ان کے سپرد کر دے گا) جیسا کہ اس نے ان سے پہلے والوں کو یہ خلافت دی، اور ان کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے دنیا میں تمکن دے گا اور ان کے خوف کو بے خوفی اور امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی (یعنی اللہ کی) عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرے ساتھ شریک نہیں کریں گے۔)

بہرحال مادہ پرستی کی مشکل کا پورا پورا حل تو اسی وقت ہوگا جب دنیا کی باگ ان ہاتھوں میں ہوگی جو مادہ پرست ہونے کے بجائے مادہ شکن اور خدا پرست ہوں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ منزل قریب نہیں ہے اب سوال یہ ہو کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے؟ تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگرچہ مادہ پرستی عام ہو گئی ہے اور زمانہ میں اس کا سکہ چل رہا ہے، لیکن مادہ پرستی کا مقابلہ کرنے والے اور اس کا انکار کرنے والے کچھ مردانِ حق میدان میں آجائیں تو مادہ پرستی کو ان ان لیے راستہ چھوڑنا پڑے گا اور ان کے سامنے جھکنا پڑے گا، اگر کچھ لوگ اس طرح کی زندگی پیش کریں کہ معلوم ہو کہ ان کو قیمتی سے قیمتی کسی مادی چیز کی پرواہ نہیں ہے، ان کے سامنے دنیا کے عیش و آرام اور جاہ و دولت کی کچھ حقیقت نہیں ہے، تو مادہ پرستی پر ضرب کاری لگے گی۔ مکہ میں مادہ پرستی پر جو چوٹ پڑی تھی وہ اس وقت پڑی تھی جب کہ ایسے کچھ لوگ میدان میں آگئے تھے جو لوگوں کے جانے پہچانے تھے اور جن کی سابقہ خوش حال زندگی سب کے سامنے تھی مثلاً ابوبکر صدیقؓ، عثمان غنیؓ، مصعب بن عمیرؓ وغیرہ ان لوگوں نے دنیا کے سارے عیش و آرام کو آخرت کی خاطر چھوڑ دیا تھا اور ان کو دین کے مقابلہ میں مال و دولت، جاہ و حشمت کسی چیز کی پرواہ نہیں رہی تھی، ان کے اس طرز زندگی سے لوگ خود بخود متاثر ہوتے تھے اور بڑے بڑے مادہ پرستوں کی نگاہ ان کے سامنے جھک جاتی تھی

آج بھی اس چیز کی گنجائش ہے، اگر کچھ ایسے لوگ ایمانی زندگی اختیار کریں جن سے اس حقیقت کا اظہار ہو کہ یہ ترک الدنیا نہیں ہیں ان کی یہ زندگی اضطراری نہیں، بلکہ اختیاری ہے، انھوں نے دنیا کے عیش و آرام کو سوچ سمجھ کر آخرت کے لیے قربان کیا ہے، اور دین کے مقابلے میں ان کو کسی چیز کی پرواہ نہیں ہو تو مادہ پرستی ان کے سامنے موم کے مانند پگھل جائے گی اور ایمان و یقین کی اس گرمی کی تاب نہ لا سکے گی۔ مادہ پرستی کا اصل جواب یہی ہو کہ ایک عقیدہ کے ساتھ اس کا انکار ہو اور اپنی زندگی کے ذریعہ یہ اعلان ہو کہ ہم مادہ پرستی کے سامنے سپر ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ ہم اس سے باغی اور اس کی بندگی کے منکر ہیں، ہم خدائے واحد کے پرستار ہیں اور ہمارا عقیدہ ہو کہ :۔

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃ اے اللہ زندگی تو درحقیقت آخرت ہی کی زندگی ہے۔

مادہ پرستوں کو جو چیز چونکانے والی اور غور کرنے پر مجبور کرنے والی ہے وہ یہ کہ کوئی آدمی کسی بن دیکھی حقیقت کسی غیر حسی لذت، اور کسی غیبی یقین سے اس طرح سرشار اور متوالا ہو کہ حسی لذتوں پر بھی اس طرح دیکھنے میں نہیں آتا۔ جابر بن سلمیٰ کے ایمان کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مسلمان کو اس نے نیزہ مارا وہ جب تڑپ کر زمین پر گرا تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلا کہ "فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃ" رب کعبہ کی قسم میں تو کامیاب ہو گیا، اس کو کرید پیدا ہوئی کہ موت (جو سب سے بڑی محرومی ہے) اس شخص کے نزدیک کامیابی کی چیز کیوں ہے، اس تجسس نے بالآخر اس کو اسلام تک پہونچا دیا۔

---

(۲)

آخرت کی بے وقعتی، آخرت سے غفلت اور دل میں اس کی بے وقعتی بیٹھ جانا سینکڑوں فتنوں کو دعوت دیتا ہے، یہ مادہ پرستی کی سب سے زیادہ موثر شاخ ہو۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تمام قوموں اور اُمتوں کا عقیدۂ آخرت کمزور ہو گیا تھا چنانچہ وہ باطل کے ہر فتنہ کا شکار ہو چکی تھیں اور حق کے قبول کرنے کی صلاحیتیں بالکل مردہ ہو چکی تھیں، ہمارے اس زمانہ کا سب سے خطرناک روگ آخرت کی بے وقعتی ہو اس لیے کہ آخرت کے عقیدہ پر ہی دین و اخلاق کی عمارت قائم ہوتی ہو، اگر یہ بنیاد ہی سرے سے موجود نہیں تو عمارت کس طرح قائم رہ سکتی ہو اور دین و اصلاح کی دعوت کس بنیاد پر دی جا سکتی ہو۔ جب آخرت کی فلاح و نجات کا سوال ہی سامنے سے ہٹ گیا ہو تو اپنے نقد فوائد، اپنی خواہشات اور لذتوں سے دست بردار ہونا اور کسی بن دیکھی حقیقت کے لیے اپنے وقت، مال و جان اور مرغوبات کی قربانی کرنا، ایک غیر قدرتی اور خلاف فطرت بات معلوم ہوتی ہے، قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کی ہو کہ آخرت پر ایمان نہ ہونے سے قلبی انکار اور تکبر پیدا ہوتا ہے۔

فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ قُلُوْبُھُمْ مُّنْکِرَۃٌ وَّھُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ (النحل) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ متکبر ہیں۔

آخرت کا یقین ایک ایسی ذہنی کیفیت اور قلبی حالت ہو جس کا اثر پوری زندگی پر پڑتا ہے یہ یقین زندہ ہوتا ہے تو زندگی میں ایمان کی روح ہوتی ہے اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، لیکن جب اس یقین میں کمی آجاتی ہے تو زندگی ایمان کی روح سے خالی ہو جاتی ہے اور سنجیدہ بات سننے تک کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے، امت کی اس بیماری کی طرف فوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ پوری امت کے لیے دینی زوال اور ایک بڑے ذہنی انقلاب کا سخت خطرہ ہے، اس بیماری کا علاج صرف یہ ہو کہ انبیا علیہم السلام کے طریقہ پر پوری وضاحت اور قوت کے ساتھ آخرت کی دعوت دی جائے اور اسی کو اصل زندگی تبلایا جائے، آخرت کے یقین کو زندہ اور بیدار کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے تذکرہ سے گریز اور اس کے ذکر سے شرمایا نہ جائے (جیسا کہ اس وقت ہماری دینی ادبیات میں نظر آتا ہے) بلکہ اس کا برملا ذکر کیا جائے، جنت کا شوق دلایا جائے اور دوزخ سے ڈرایا جائے، پھر آخرت کا تذکرہ ایک اخلاقی ضرورت اور دینی سیاست کے طور پر نہ ہو بلکہ ایک زندہ حقیقت اور بدیہی واقعہ کے طور پر اور ذوق وشوق اور یقین کی کیفیت کے ساتھ ہو، جیسا کہ قرآن مجید کی آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات ومواعظ اور صحابہ کرام کی تقریروں اور گفتگوؤں سے معلوم ہوتا ہے (کانھم رای عین) گویا کہ وہ آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بیان کر رہے ہیں) اس سلسلہ میں صحابہ کرام اور بعد کی صدیوں کے اہل یقین ومومنین صادقین کے واقعات، ان کے آخرت کے استحضار، شوق شہادت اور موت کے ذوق کے قصے اور ان کی عاشقانہ کیفیات کا بیان بھی مفید ہوگا، پچھلی صدیوں کے تمام اصلاحی وتجدیدی کارناموں میں اسی یقین کی روح نظر آتی ہے۔ ان کے قائد ورفقا اس یقین سے لبریز اور اس ذوق سے سرشار نظر آتے ہیں، نصف صدی کے اندر اندر اس بارہ میں بڑا انحطاط اور انقلاب ہو گیا ہو، دین کے بعض شعبے ضرور زیادہ روشن اور واضح ہو گئے ہیں، اور بہت سے دینی حقائق نظر کے سامنے آگیے ہیں، دین پر بہت اچھا لٹریچر تیار ہو گیا ہے مگر ایمان بالآخرۃ اور فکر آخرت میں عمومی انحطاط نظر آتا ہے، یہ بنیادی شعبہ اس وقت تجدید وتقویت کا محتاج ہے اور دین کے داعیوں کو اس کی طرف سے غفلت نہیں کرنی چاہیئے۔

---

(۳)

<u>مصروفیت</u>، دنیا کے مشاغل میں مشغولیت اس وقت کا بڑا فتنہ ہے اس زمانہ میں مادہ پرستی کی وجہ سے معاش اور معیار زندگی کی بلندی کی حقیقی فکر پیدا ہو گئی ہو اور اس کی وجہ سے انسان کی حقیقی مشغولیت بڑھ گئی ہو ویسی کبھی نہیں تھی، اس وقت صرف زندگی کے نقد مسائل کو سوچا جاتا ہو اور صرف ان کے لیے جد وجہد کی جاتی ہے، ان مسائل نے ہماری زندگی کے چاروں طرف ایک خول منڈھ دیا ہے جس کے باہر آدمی نکلنا نہیں چاہتا اور ان مسائل کے علاوہ کوئی بات سننا تک گوارا نہیں کرتا ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ لوگوں کو زندگی کے اہم تر

مسائل کی طرف متوجہ کیا جائے اور ان کو حکمت و تدبیر کے ساتھ بتایا جائے کہ معاشی مسائل کی اہمیت سے ہمیں انکار نہیں ہے لیکن ان کے علاوہ زندگی کے کچھ ایسے مسائل ہیں جو بنیادی ہیں اور ان کی اہمیت ان سے زائد ہے، آپنے ان مسائل کو اپنی زندگی سے کیوں خارج کر دیا ہے، زندگی کے موجودہ مسائل کی فکر نہ کرنے سے اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ مستقبل کے مسائل کی فکر نہ کرنے سے۔ مرنے کی تیاری کی اگر فرصت نہیں نکالی تو ہمیشہ حسرت کرنا پڑے گی۔

ہمیں بعض دفعہ ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہو جو واقعی مشغول ہیں اور اپنے مشاغل کو کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے، ہمیں ان لوگوں کے مشاغل کی رعایت کرنی چاہیئے اور حکمت و تدبیر کے ساتھ ان کے مشاغل میں سے ایسا وقت نکالنا چاہیئے کہ وہ آخرت کے مسئلہ کی طرف توجہ کریں، ان کے مشاغل کی رعایت کے ساتھ دینی مشغولیت کا پروگرام ان کے لیے بنانا چاہیئے۔ امت کے حالات ایسے مختلف ہیں اور ذہنی سطح میں ایسا نشیب و فراز ہو کہ ہر ایک طبقہ کے لیے علیحدہ علیحدہ علاج سوچنا پڑے گا، کچھ لوگ ایسے ملیں گے جو کسی طرح اجتماعات میں آنے اور سفروں میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے ان کو ایسی کتابیں دینا چاہئیں جو دقیق اور محنت طلب نہ ہوں، موجودہ زبان میں لکھی گئی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ جاذب نظر ہوں، مطالعہ اور علمی زندگی یا دماغی محنت کی وجہ سے بعض لوگوں کے دماغ کی ساخت ایسی بن جاتی ہے کہ وہ تقریروں اور خطابت سے اتنا متاثر نہیں ہوتے جتنا کہ سنجیدہ کتابوں اور علمی مضامین سے ہمیں ہر ایک کو اس کی مناسب غذا فراہم کرنی چاہیئے اور دین سے تعلق و قرب اور محبت اس طبقہ میں جس درجہ کی پیدا ہو سکے اسکو غنیمت سمجھنا چاہیئے، اس طبقہ میں دین کی بے وقعتی اور بے اعتمادی اور اسکی طرف سے بے نیازی عام مرض ہے اور یہی اس کے تمام امراض کی جڑ، دین داہل دین سے بُعد اور عملی کوتاہیوں کا سبب ہے۔ اس طبقہ کی سب سے بڑی خدمت اور اس کے لیے سب سے کامیاب دعوت یہ ہو کہ دین کی بے وقعتی اس سے دور ہو اور اس کی عظمت و صداقت اس کے دل میں پیدا ہو، اگر کتابوں یا مجلسی گفتگو سے یہ تبدیلی پیدا کی جاسکے تو یہ بڑی کامیابی ہے، ہمیں اس کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔

(۴) اہل دین کی کمزوری اور پستی عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ دین کی دعوت کو قبول کرنے والے اور دینی جد و جہد میں حصہ لینے والے کمزور اور مالی حالت سے پست ہوتے ہیں اس لیے لوگ اس بات کا بہانہ بنا لیتے ہیں اور بالکل قوم نوحؑ کے لہجہ میں کہنے لگتے ہیں کہ:-

أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ۔ — کیا ہم آپ پر ایمان لائیں حالاں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی پیروی کرنے والے پست درجہ کے لوگ ہیں!

کبھی کہنے لگتے ہیں:-

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ — اگر یہ کوئی اچھی چیز ہوتی تو پہلے ہم کو نصیب ہوتی۔

اس وقت زمانہ کا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ وہ اصحاب اقتدار کا اثر قبول کرتا ہے، یورپ کو اقتدار ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہی دنیا کی قیادت حاصل ہے، یہ جاہلیت کا خاصہ ہے اور دماغ کی ایک مخصوص بناوٹ ہے کہ ایسے لوگ صرف طاقت کی دلیل مانتے ہیں اور کوئی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔

اس بیماری کا علاج یہ ہے کہ یہ ذہن نشین کیا جائے کہ حق خود معیار شرافت ہے اور دولت و قوت سے زیادہ اس میں معنویت ہے، اس کے ساتھ اس سے بھی غفلت نہ برتی جائے کہ بااثر لوگ دین کی طرف متوجہ ہوں اور دینی دعوت کو قبول کریں تاکہ ان کی پیروی عوام بھی کریں۔

(۵) دینی تحریکوں کی ناکامیابی اور داعیوں کے تلخ تجربات

ہمارے ماضی قریب کی اکثر دینی تحریکیں مختلف اسباب کی بنا پر ناکامیاب ہوئی ہیں، اس کی وجہ سے عوام دینی تحریکوں کی طرف سے بد دل ہو گئے ہیں، اکثر لوگ کہتے ہیں کہ سیکڑوں تحریکیں ہم نے ناکامیاب ہوتے دیکھی ہیں، آپ کیا تیر مار لیں گے، یہ دماغ کی کمزوری ہے اور کوئی معقول و علمی بات نہیں ہے اس کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

داعیوں کے تلخ تجربات البتہ قابل غور ہیں۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اب تک اتفاقاً برابر یہ ہوتا رہا ہے کہ تحریکوں کی بنا مال کی بنیاد پر رکھی گئی اور اس وجہ سے غیر معتبر متمول لوگوں کو اپنے کام میں شامل کیا گیا، اس کا نتیجہ جو ہونا چاہیئے وہی ہوا یعنی یہ کہ تحریک کو ناکامیابی ہوئی تو داعیوں پر قوم کا روپیہ کھا جانے وغیرہ کے الزامات لگائے گئے، یہ ان تحریکوں کے داعیوں کی بنیادی غلطی تھی کہ انھوں نے ناتربیت یافتہ قوم سے روپیہ فراہم کیا، انبیاء علیہم السّلام کا طریقۂ کار یہ نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے دنیا کے متمول لوگوں سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تم سے اپنے اجر کے طالب نہیں ہیں ہمارا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔

لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْراً اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ	میں تم سے کسی معاوضہ کا طالب نہیں ہوں! معاوضہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

مال کا معاملہ ہمیشہ سے کمزور ترین رہا ہے اور اکثر دینی تحریکوں کی ناکامیابی کی یہی وجہ رہی ہے کہ ان کی بنیادیں روپیہ کی فراہمی پر رکھی گئی تھیں۔

ہمارے پیچھے وعظ کہنے اور اس کا حق محنت وصول کرنے کی جو تاریخ ہے وہ بھی بہت افسوس ناک ہے۔ ہمیں اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے، اس وقت دینی تحریکات کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ عام چندہ بازی سے بچا جائے اور ضیافت کی پیش کش کے قبول کرنے میں بھی احتیاط کی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ضیافت کا قبول کرنا اشعار تھا، طبیعتیں سادہ و پُر خلوص اور حوصلے بلند تھے، بدگمانی کا مرض بہت کم تھا، اب صورت حال مختلف ہے

اس لیے احتیاط، موقع شناسی اور استغناء کی ضرورت ہو۔ حضرت سلیمانؑ نے بلقیس کا تحفہ نامنظور کر کے اس کی خودی پر ایک ضرب کاری لگائی اور اس پر اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کردیا اور یہ بجائے اس کے دور ہونے کے قریب ہونے کا ذریعہ بنا۔

(۷)
مسلمانوں کی افسردگی اور شکستہ دلی پچھلی غلطیوں اور ان کے نتیجہ میں اس ملک میں جو واقعات پیش آئے ان کی بنا پر عام طور سے مسلمانوں میں افسردگی چھائی ہوئی ہو اور زندگی کے ہر شعبہ میں مردہ دلی اور یاس نظر آتی ہے۔ اس وجہ سے مسلمان کسی تعمیری اور ٹھوس کام کے لیے تیار نہیں ہوتے اور کسی فتنہ کے مقابلہ کے لیے کمر ہمت نہیں باندھتے۔

اس کا حل صرف یہ ہو کہ اول تو مسلمانوں کو ایمانی اور دعوتی زندگی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے جو ان کی اصل قدر و قیمت ہو ان کو یقین دلایا جائے کہ اس کے بعد (جب وہ اسلام کے پیغام کے حامل اور اس کی حقیقت سے متصف ہوں) ان کا وجود ہر ملک کے لیے ضروری اور ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے، اس کے لیے قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہو، اور اس کے بالکل ختم ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے افسردگی اور شکستہ دلی بالکل بے معنی چیز ہے اور اس کا کوئی موقع نہیں۔ ہم کو اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا چاہیئے کہ وہ ہم کو برباد نہیں کرے گا اور سمجھنا چاہیئے کہ اس ملک میں ہمارا وجود دینی ضرورتوں کے لحاظ سے ضروری ہے، ہندوستان میں رہنے کا ہمیں سب سے زیادہ حق حاصل ہے۔ اگر مسلمان دین کے خاطر یہاں رہنے کا عزم کریں اور وہ صحیح اسلامی سیرت اختیار کریں اور اپنی وہ سیرت بنائیں جس پر اللہ کی رحمت و نصرت کا وعدہ ہے تو ان کو اس ملک سے نکالا جانا تو درکنار رہا اگر وہ خود جائیں گے تو لوگ ان کو منا کر لائیں گے اور دوبارہ بسائیں گے۔ ان کا مستقبل اس ملک میں سب سے زیادہ روشن ہے، اور ان کا پایہ مضبوط ہو اسلیئے ان کو ملک میں رہنے والوں کی طرح اپنی زندگی کی تنظیم کرنی چاہیئے، اور تعمیری و تعلیمی کاموں میں پورے جوش و نشاط کے ساتھ مشغول رہنا چاہیئے۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین

پست ہمت نہ پڑو نہ غمگین ہو تمہیں سب سے سر بلند ہو اگر تم صاحب ایمان ہو۔

عقائد کا اختلاف اور بدگمانیاں جن لوگوں نے دین کو بطور پیشہ کے اختیار کیا ہے اور جو اس کو مستقل کاروبار کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہمارے کام سے ان کے اس کاروبار پر اثر پڑتا ہے اس لیے کہ بیچارے جاہل عوام جو رسوم وغیرہ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اس جہالت سے نکلتے ہیں اور صحیح راستہ پر پڑتے ہیں۔ بے غرضی اور خلوص سے کام کرنے کا ذوق عام ہوتا ہو اور اس کے نمونے سامنے آتے ہیں جن کی وجہ سے لوگ ان پیشہ وروں سے بددل ہوتے ہیں اور ان سے بھی ایثار اور لوجہ اللہ کام کرنے کا

مطالبہ کرنے لگتے ہیں، اور اس طرح سے ان کے سکون اور عظمت میں فرق آتا ہے، اسکی وجہ سے ہماری تحریک کو روکنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں اور ہمارے متعلق وہ الفاظ مشہور کیے جاتے ہیں جو کہ عوام کے لیے اشتعال انگیز ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ یہ چیز دیرپا نہیں ہے۔

وَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا — جو جھاگ اور کوڑا کرکٹ ہوتا ہے وہ چلا جاتا ہے

يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ — اور جس چیز میں انسانوں کا نفع ہوتا ہے وہ زمین میں رہ جاتی ہے اور جگہ پکڑ لیتی ہے۔

انسان نفع پسند واقع ہوا ہے لہٰذا اس کام میں نفع کی مقدار بڑھائی جائے اور عوام کو محسوس کرایا جائے کہ یہ ان کے نفع کی چیز ہے اور ہم ان سے کسی اجر کے طالب نہیں ہیں۔ آخر ایک دن وہ آئے گا کہ لوگ سمجھ لیں گے کہ یہ لوگ فاسد العقیدہ نہیں ہیں بلکہ اصل دین اور حقیقت دین کی دعوت دیتے ہیں اور اسکی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور کسی اجر کے طالب نہیں ہیں اور ان کو بدنام کرنے والے دین کو کاروبار کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

خاصکر پچھلے چند مہینوں سے مختلف علاقوں سے ہمیں اس کی اطلاعیں مل رہی ہیں کہ اسی قماش کے کچھ لوگوں نے اب ہماری اس دینی دعوت اور اس تبلیغی جدوجہد کے خلاف اسی طرح کی بہتان تراشی کی مہم جاری کر رکھی ہے —— ان لوگوں میں سے ہم جن جن کو جانتے ہیں ان کے متعلق ذاتی معلومات کی بنا پر آپ دوستوں کو یہ بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ہرگز کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں اس لیے ان کو کچھ سمجھانے کی فکر بالکل فضول ہے، بلکہ یہ ان کا گویا پیشہ اور کاروبار ہے، اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے بالکل نہ الجھیں بلکہ —— اللہ تعالیٰ سے پورے الحاح کے ساتھ یہ دعا کرتے ہوئے کہ وہ ان کو ہدایت اور نیک توفیق دے اور اگر یہ مقدر نہیں ہے تو ہم کو اور ساری امت محمدیہ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے —— آپ پورے انہماک اور اخلاص کے ساتھ اور دعاؤں کی کثرت کے ساتھ کام میں لگے رہیں۔ سارے فتنوں کا علاج انشاء اللہ اسی کام میں ہے۔ بشرطیکہ اصول کی پابندی کے ساتھ ہو۔

آپ جب اپنے تبلیغی دوروں میں ایسے مقامات پر پہنچیں جہاں اس قسم کے ناخدا ترسوں نے اس تبلیغی کام اور اس کے کرنے والوں کے متعلق جھوٹی باتیں بتا بتا کر مسلمانوں کو بدگمان کیا ہو، تو اپنے کو نہایت عاجز اور بے بس بندہ یقین کرتے ہوئے دعاؤں کی کثرت کریں اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں اور وہاں کے ان مسلمانوں سے آپ صاف صاف کہیں کہ آپ سے ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین مٹا جا رہا ہے، ہم آپ جس طرح اپنے بچوں کی اور اپنے کاروبار کی فکر کرتے ہیں اس طرح اس کی بھی فکر کریں، اس سے اپنا تعلق بڑھائیں اور اللہ کے بندوں کا تعلق بڑھانے کے لیے جدوجہد اور محنت کریں، دین کے لیے قربانی کا رواج مٹ گیا ہے آپ خود دین کے لیے قربانی دے کر اس رواج کو زندہ کریں، ہم بس اس کام کے لیے پھرتے ہیں، آپ اگر اپنے علاقوں میں یہ کام خود کرنے لگیں تو ہمیں آپ کے یہاں آنے کی ضرورت نہ ہوگی —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

لائے ہوئے دین سے اپنا اور اللہ کے دوسرے بندوں کا تعلق بڑھانے کے لیے اور دنیا میں اس کو چمکانے کے لیے ہم آپ سے دین کی صرف وہ چند بنیادی باتیں کہتے ہیں جن سے کسی مسلمان کو اختلاف اور انکار نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمیں برا سمجھیں یا بھلا، لیکن اللہ و رسول کی بتلائی ہوئی ان دینی باتوں کو مان لیں اور چند روز اس کام میں ہمارے ساتھ رہ کر دیکھیں کہ ہم کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں، اگر آپ یہ دیکھیں کہ ہم اللہ کے بندوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی طرف بلاتے ہیں اور خود بھی اس پر چلنا چاہتے ہیں تو آپ اس کام میں ہمارے مددگار ہو جائیں اور اگر آپ دیکھیں کہ ہم کسی اور راستہ کی طرف بلاتے ہیں تو ہماری پوری مخالفت کریں، آپ ہماری یا کسی کی صرف باتوں کا اعتبار مت کیجئے، بلکہ خود دیکھئے اور پھر فیصلہ کیجیئے ـــــــــــ

بہرحال ہمارے احباب ایسے مقامات پر خصوصیت کے ساتھ اسکی انتہائی کوشش کریں کہ ان ہی میں سے اللہ کے کچھ بندے کچھ وقت کے لیے آپکے ساتھ ہو جائیں، اس مقصد کے لیے آپ ان سے وہ سب باتیں کریں جو آپکے نزدیک ان کو آمادہ کرنے والی ہوں، بلکہ آپ ضرورت سمجھیں تو اس کے لیے ان کو قسم دیں۔ اگر کسی بستی کے صرف دو چار آدمی بھی آپکے ساتھ کچھ وقت کے لیے ہو جائیں گے تو انشاء اللہ وہی دوسروں کو بھی بتا دینگے کہ اصل حقیقت کیا ہے ـــــــــ الغرض آپ صرف اپنے اصل کام پر توجہ رکھیں، بس یہی اس کا علاج اور ہر بہتان کا جواب ہے، اس قسم کے ابتلاآت سے بددل نہیں ہونا چاہیئے ان باتوں سے تو درجے بڑھتے ہیں اور اجر میں اضافہ ہوتا ہے، یہ تو انبیاء علیہم السلام اور انکے سچے تابعین کی وراثت ہے۔

صـ۹۶ کا بقیہ مضمون

دل دُکھے، اور وہ آزردہ ہو) بلکہ جب کوئی چوتھا آجائے جو اُسکے پاس بیٹھا رہ سکے تو یہ الگ ہو کر اپنی باتیں کرلیں "۔

لیکن آج ہمارا حال یہ ہے کہ دوسروں کی دل آزاری میں ہمیں لذت آتی ہے، اللہ تعالیٰ ہماری اس بیماری کی اصلاح فرمائے، شاید ہم لوگ سب سے زیادہ اِسکے مریض ہیں۔

دوستو! ایمان کامل نہیں ہوسکتا، اور ہماری زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی، جبتک کہ ہم اپنی زندگی کے ان سب پہلوؤں کو درست نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ حکیم الامت حضرت مولٰنا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی قبر پرانوار کی بارشیں برسائے، ہمارے اس زمانہ میں حضرتؒ نے خصوصیت سے ان شعبوں کو زندہ کرنے کی طرف خاص توجہ فرمائی۔

یوں تو حضرتؒ کے مواعظ اور ملفوظات میں اور اکثر تصانیف میں ان شعبوں کی اہمیت کا ذکر بلا مبالغہ سیکڑوں جگہ ملے گا اور صرف اسی مضمون کے صفحات الگ کئے جائیں تو کئی سو ہوں گے، لیکن حضرتؒ کے دو مستقل رسالے بھی ہیں جن کا مطالعہ ہم لوگوں کو کبھی کبھی ضرور کرنا چاہئے، ایک "صفائی معاملات" اور دوسرا "آداب معاشرت"۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ اپنی زندگیوں کو ایمان والی اور اسلام والی زندگی بنانے کی فکر کو ہم اپنی سب سے بڑی فکر بنالیں۔

اللّٰھُمَّ اِنَّ قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدک لم تملکنا منھا شیئاً فاذا فعلت ذالک بنا فکن انت ولینا واھدنا الیٰ سواء السبیل ہ۔

تربیتی پروگرام کے چھ دنوں میں دین و شریعت کے موضوع پر معاملات اور معاشرت تک ہی بیان ہوسکا تھا، ساتویں دن دین کی دعوت و نصرت اور سیاست و حکومت کے موضوع پر کہنے کا ارادہ تھا، لیکن طبیعت کے خراب ہوجانے کی وجہ سے وہ بیان نہ ہوسکا، انشاء اللہ کتابی اشاعت میں اُس کو بھی قلمبند کر کے شامل کر دیا جائے گا۔

تاریخ اسلام میں اصلاح و انقلاب کی جدوجہد اور اس کی اہم شخصیتیں

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تربیتی ہفتہ میں (جس کی اکثر تقریریں اس نمبر میں شائع ہو رہی ہیں) ایک طویل اور مسلسل عنوان تھا "اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں" یہ عنوان اس راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا، اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا، اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی، جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، احباب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے، بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اطمینان سے کرنے کا ہے اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے جس کو جلد پر ہونا چاہیے، اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے، اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں جنھوں نے حالات سے کشمکش کی اور جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں جو فکری اور علمی حیثیت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی و عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی، صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد دس سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں جن کو بمشکل "مجدد" کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و عزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے۔ اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک احساس کمتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن یہ نتیجہ بے سبب نہیں، بدقسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں جن کو واقعات کی کھتونی کہنا صحیح ہے اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہے یا چند نمایاں شخصیتوں کی سوانح حیات (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں جس میں ان تمام شخصیتوں اور تحریکوں کا مفصل تعارف ہو جنھوں نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہو اور اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہو۔ غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سدباب کیا ہو اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہو، درحقیقت اسلام کے

سلسلۂ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پُر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے۔ لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اسکے لیے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا اور اسکو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا۔ اسکے لیے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق، علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے وہ اس پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کمیاب ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور طبیعت کی آزادی سرسری طور پر گزرنے سے مانع ہوئی، اور کم فرصتی اور طویل و کثیر وقفوں کے باوجود ایک اچھا خاصہ حصہ تیار ہو گیا، قلم کا مسافر چھٹی صدی ہجری تک کا سفر طے کر چکا ہے اور اس وقت سیدنا عبدالقادر جیلانی اور آپ کے نامور معاصرین کی مجلس میں باریاب ہے۔

لیکن الفرقان کا یہ نمبر اس سے زیادہ کا متحمل نہیں جو اس صحبت میں ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔

مقالہ نگار کے سامنے کام کا جو خاکہ ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و امداد سے پورا ہو گیا تو نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی بلکہ فکری و علمی ارتقاء و انحطاط کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی۔ یہ بات ناظرین کرام کے پیش نظر رہے کہ اس مضمون میں ہمیں اصطلاحی منصب تجدید سے بحث کرنا نہیں ہے، نہ اشخاص کا تعین کرنا ہے جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کر دیا اور تجدید کے شرائط پورے کیے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے اور ان ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے، جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء و تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس مضمون میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جا سکتے مگر دین کی تجدید و احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔]

ابوالحسن علی — ۷ فروری ۱۹۵۳ء

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ کا آخری پیغام ہے، اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا اور اعلان کیا جا چکا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ع)

آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لیے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہو، دوسری طرف یہ حقیقت ہو کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہو اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہو۔

جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہو اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہو مگر وہ زندگی سے پُر ہو اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہو، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہو کہ وہ ہر ماحول میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہو جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہو جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا بہترین نمونہ ہو۔

ذالك تقدير العزيز العليم	یہ ہو اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا،
صُنع اللهِ الذى اتقن كل شيئ	کاریگری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

امت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہو اور یہ امت آخری اور عالمگیر اُمت ہو اسلیے یہ بالکل قدرتی بات ہو کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس اُمت کا واسطہ رہے گا اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری اُمت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس اُمت کو جو زمانہ دیا گیا ہو وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہو اور اس کے حالات میں جتنا تنوّع ہو وہ تاریخ کے کسی گزشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کی بقا اور تسلسل کے لیے خدائی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور مکان و زمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہو، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہو (اور اس وقت تک کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہو) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہو اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ اُمت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہو دنیا کی قوموں اور اُمتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہو، بلکہ انتظام خداوندی ہو کہ جس دور

میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس "تریاق" کی حاجت تھی وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام کے قلب و جگر پر حملے

شروع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لاسکتا تھا، دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کرلی تھی اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہار نہ سکے اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کردیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا، ایک طرف باطنیت، اور اس کی شاخیں، اسلامی روح اور اس کے نظام عقائد کے لیے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کرلے گیا اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد و لادینیت، اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لا سکے اور ان کے سامنے سپر ڈال دے لیکن امت مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کردیا اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے تحریفات و تاویلات کا پردہ چاک کردیا اور حقیقت اسلام اور "دین خالص" کو اجاگر کیا۔ بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پرزور حمایت کی، عقائد باطلہ کی بیباکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانہ کے مترفین کی سخت مذمت کی اور جابر سلاطین کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کردی، یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، اور طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لیے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "ید بیضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کردیا، اور حق روشن ہوگیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہو اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہو، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہو جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کردیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا جو اس

دین کو تحریفات و بدعات کے نرغہ سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقت ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پر زور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لیے کمربستہ ہو کر میدان میں آجائے اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

ایک عیسائیت ہی کو لیجیے، قسطنطین اور سینٹ پال کے اثر سے مسیحیت میں جو مشرکانہ روح اور کھلی ہوئی بت پرستی داخل ہو گئی تھی اور مسیحیت کو جس بری طرح مسخ کیا گیا تھا، ہزار برس تک اس قاتلانہ کارروائی کے خلاف مؤثر طریقہ پر احتجاج کرنے والا نظر نہیں آتا، نہ مارٹن لوتھر سے پہلے کوئی دعوتِ اصلاح اور صدائے احتجاج سننے میں آتی تھی، گویا مسیحیت کی مذہبی تاریخ میں ایک ہزار سال سے زیادہ زمانہ[1] "دعوت اصلاح و احتجاج" سے بالکل خالی گزرا ہے، خود لوتھر بھی مسیحیت کی کوئی بڑی اصلاح نہ کر سکا اور اس کو اس شکل پر بھی نہ لا سکا جو کم سے کم تیسری صدی عیسوی میں تھی، لوتھر کے بعد پھر کوئی "نیا احتجاج" عیسائی دنیا میں پیدا نہیں ہوا، عیسائیت جس روش پر سیکڑوں برس سے چل رہی ہے اسی پر چلی جا رہی ہے اب مادہ پرستی کے خلاف جو عیسائیت کی اصل حریف اور یورپ میں اس کی "جانشین" ہے کوئی مؤثر اور وسیع دینی دعوت اور صدائے احتجاج سننے میں نہیں آتی پوری مسیحی دنیا صدیوں سے طاقتور مسیحی شخصیت اور داعی، اور دین عیسوی کے مجدد و مصلح سے محروم ہے، عیسائیت روز بروز اپنا اثر اور اقتدار کھوتی جا رہی ہے، اور اس کے بازگشت کی کوئی امید نہیں ہے، یورپ کے مفکرین و مصنفین عیسائیت کی نشأت ثانیہ سے بالکل مایوس ہیں۔

دوسرے مذاہب کا حال اس سے بہتر نہیں، بودھ مذہب نے ایک زمانہ میں تقریباً سارے ایشیا کو فتح کر لیا تھا لیکن جو مذہب محض روحانی تجرد، صفائی نفس اور اخلاقی تربیت کا نام تھا اور جو بگڑے ہوئے مذاہب اور رسم پرستی کے خلاف وجود میں آیا تھا وہ رفتہ رفتہ خود بت پرستی اور ظاہر پرستی کے رنگ میں ڈوب گیا، اس پر بانی مذہب کے مجسموں اور بتوں کا، اور اس کی خانقاہوں اور عبادت گاہوں پر تعیشات اور بد اخلاقی کا سخت حملہ ہوا، زمانہ قریب ہی میں مذہب کی روح نکل گئی اور ظاہر بینی اور رسم پرستی چھا گئی[2] لیکن بدھ مذہب اور اس کے کروڑوں ماننے والوں میں کوئی ایسی عظیم شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس مذہب کی تجدید کرتی اور اس میں از سر نو صحیح روحانیت اور

---

[1] قسطنطین کا سنہ جلوس ۳۰۵ء ہے، اور لوتھر کی تحریک اصلاح ۱۵۲۰ھ میں شروع ہوئی ہے، گویا درمیان میں ۱۱۰۰ سال کا فصل ہے۔ [2] ملاحظہ ہو تاریخ ہند قدیم از پروفیسر ایشوری پرشاد، اور تلاش ہند از پنڈت جواہر لال نہرو صد ۲۰۱ صد ۲۰۲۔

اخلاقی بلندی پیدا کرتی، اور اس کو غلط رجحانات دوسرے مذاہب کی نقالی اور مادیت کے حملوں سے بچاتی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہندستان کے قدیم مذاہب نے بالکل خود اس کے وطن سے بے دخل کر دیا۔ یہی انجام ہندستان کے دوسرے مذاہب کا ہوا جو بہت جلد بدل گئے، اور پھر اپنی اصلی شکل پر کبھی واپس نہ آسکے۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت۔

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، اور اپنی خصوصیات زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک کہ وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی وایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جوان ہیں، مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریکات اور اسکے مذہب کو حقیقتاً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پرجوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنھوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔

اگرچہ پیر ہو مومن جواں ہیں لات ومنات

اس کا مقابل جب تک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی، تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرہ کے لیے نئی شخصیت طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی اس طویل اور پرآشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت بھی ایسی نہیں آئی جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی ہو حقیقت اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلامیہ کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لیے کوئی فتنہ نمودار ہوا اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، یا مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں جو "قدریت" "جہمیت" "اعتزال" "خلق قرآن" "وحدۃ الوجود" اور اکبر کے "دین الٰہی" کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ

اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور "سرکاری مذہب" علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جد و جہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہو جتنی اسلام کی تاریخ، اور ویسا ہی مسلسل ہو جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات

خلافت راشدہ کے اختتام اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کر دی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت اور خلافت راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا کتاب و سنت نہیں ہا بلکہ عربی سیاست اور "مصالح ملکی" بن گیا، تفاخر اور عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کر دیا تھا اور جو بادیۂ عرب میں پناہ گزیں تھی پھر واپس آگئی، قبائلی غرور، خاندانی جنبہ داری، اعزہ پروری، جو خلافت راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہنر اور محاسن بن گئے، اعمال و اخلاق کے محرکات (بجائے اجر و ثواب کے) جاہلی ناموری، مدح و تعریف اور تفوق ہو گئے[۵]، بیت المال (جو

---

[۵] اس سلسلہ میں جاہلیت کا جذبۂ مسابقت اور شہرت و عزت پورے طور پر زندہ اور بیدار ہو گیا تھا، اس ذہنیت کا اندازہ اس دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہو جو ابو الفرج الاصبہانی نے اغانی میں نقل کیا ہو کہ عہد اموی کے دو عرب سرداروں حوشب اور عکرمہ کے درمیان عرصہ سے اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ تیار ہوتا ہو، اور مہمان زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں حوشب کا پلڑا اکثر بھاری رہتا، ایک مرتبہ عکرمہ نے اپنے حریف کو زک دینے کے لیے یہ تدبیر کی کہ صدہا بوریاں آٹے کی خرید لیں اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کر دیں کہ آٹا گوندھ لیا جائے، اس گندھے ہوئے آٹے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھر دیا، اور اوپر سے گھاس ڈال دی، اور اس کا انتظام کیا کہ حوشب کا گھوڑا اس گڑھے میں گر جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ گھوڑا گندھے ہوئے آٹے کی اس خندق میں جا پڑا اور آٹے میں لت پت ہو گیا، اور دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں اس مقدار میں آٹا گندھتا ہو کہ گھوڑا اس میں گر گیا۔ لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے دیکھا تو گھوڑے کا سر اور گردن باہر تھی اور سارا جسم ڈوبا ہوا تھا، رسیوں اور بلیوں سے اس کو بڑی مشکل سے نکالا گیا۔ عام طور پر اس واقعہ کی شہرت ہوئی اور شعراء نے اشعار کہے، اس طرح عکرمہ نے اپنے حریف کے مقابلہ میں فتح حاصل کر لی اور اپنا تفوق تسلیم کرا لیا۔ (زہرات لثالث ج ۱ صـ ۱۳۹-۱۴۰)

مسلمانوں کے پیسہ پیسہ سے جمع ہوتا تھا، خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا، پیشہ ور شعراء، خوشامدی درباریوں، اور آبرو باختہ مصاحبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا، جس پر مسلمانوں کی دولت بے دریغ صرف ہوتی تھی اور ان کی بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی[1] گانا سننے کا ذوق اور موسیقی کا انہماک حد کو پہونچ گیا تھا،[2] حکومت کی غلط روی اور اہل حکومت کی بے دینی زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی اور "مترفین" کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہو اور چالیس برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی ہو۔

عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

بنی امیہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا جو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، اور اپنی للّٰہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی، اور علم و تفقہ میں مشہور و معروف تھے حکومت و انتظامات کے دائرہ سے باہر انھیں حضرات کا اثر و اقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے، اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے با اثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ وعلیٰ آبائہ السلام) کی تھی جو عبادت و تقویٰ اور زہد و ورع میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہو کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک اپنی ولیعہدی کے زمانہ میں طواف کے لیے آیا، شدت ہجوم کی وجہ سے وہ حجر اسود تک نہیں پہونچ سکا اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام[3] کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا اور انھوں نے بآسانی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے تھے لوگ احتراماً راستہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہد اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ

---

[1] اموی عہد کا مشہور عیسائی شاعر اخطل (م ۹۵ھ) خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آتا کہ گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوتی اور داڑھی کے بالوں سے شراب کے قطرے ٹپکتے اور کوئی اس کو ٹوکنے والا نہ ہوتا (اغانی ج ۸ صـ ۲۹۰)

[2] اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک مرتبہ عراق کا مشہور مغنی حنین اپنے ہم پیشہ لوگوں کی دعوت پر مدینۂ منورہ آیا، ایک مکان میں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ چھت بیٹھ گئی اور خود حنین دب کر مر گیا۔ (اغانی ج ۲ صـ ۱۲۲-۱۲۳)

[3] حجر اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا۔

اشعار میں اس کے تجاہل عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایان شان تعارف کرایا۔[۱]

اسی طرح دوسرے فضلاء اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ المحض، نیز دوسرے فضلاء تابعین حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروۃ بن الزبیر[۲] مسلمانوں کے لیے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی و بیباکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمت دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا اور کبھی کبھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاح حال کا جذبہ ابھرتا تھا۔

انقلابِ حکومت کی ضرورت اور اس کی مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہوتے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی جو اسلام کے اصلی اخلاق و اوصاف کی محافظ اور قرن اول کی یادگار تھیں، حکومت کا دائرۂ اثر وسیع اور مستحکم ہو گیا، اب اخلاقی و دینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جا سکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی جو اس کو میدان جنگ میں شکست دے سکے، ماضی قریب میں دو بڑی کوششیں ایک سیدنا حضرت حسینؓ کا مخلصانہ و سرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا دلیرانہ و منظم مقابلہ ناکام ہو چکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات اور آثار نہ تھے، شخصی اور موروثی حکومت نے اصلاح و تبدیلی کے دروازے بند کر دیے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لیے مسلمانوں کی قسمت پر مہر لگ چکی ہو، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لیے ایک معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

---

[۱] یہ قصیدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته   والبیت یعرفه والحِلّ والحرمُ

محققین کا خیال ہے کہ اس قصیدہ میں بعد میں بہت سے اشعار اضافہ ہوئے ہیں۔ ۱۲

[۲] مفصل حالات و تراجم کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی ذات ہے جو خود بانی خاندان (مروان) کے پوتے اور ان کی ماں (ام عاصم) فاروق اعظم کی پوتی تھیں، فاروقیت اور اموریت کا یہ سنجوگ[1] اسی لیے ہوا تھا کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفۂ راشد پیدا ہو جو حالات میں انقلاب برپا کر دے۔

عمر بن عبدالعزیز ۶۱ھ میں پیدا ہوئے وہ خلیفۂ وقت سلیمان بن عبدالملک کے چچازاد بھائی تھے اور اس کے پیشرو ولید بن عبدالملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے علاقہ کے حاکم دگورنر تھے ان کی جوانی اور عہد امارت کو ان کی خلافت کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحب ذوق، امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس راستہ سے گزرتے تھے دیر تک اس کی مہک بتلاتی تھی کہ ادھر سے عمر گزرے ہیں، ان کی چال مشہور اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سوائے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دینے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سراپا اسلام کا اعجاز تھی اور وہ جس طرح منصب خلافت پر آئے وہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، موروثی نظام حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبدالملک بیمار ہوا، اس کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اس نے ان کو لانبی لانبی قبائیں پہنائیں اور ہتھیار باندھے کہ وہ کچھ بڑے معلوم ہوں مگر وہ آنکھوں میں نہ جچے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے، جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں، رجاء بن حیوۃ نے جو اسی انتظار میں تھے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی کا مشورہ دیا جو منظور ہوا، رجاء کا یہ کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور برسہا برس کی عبادت پر بھاری ہے۔

خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبدالعزیز نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمال حکومت کو

---

[1] اس رشتہ کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت عمر نے منادی کرادی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی کہ کوئی عورت کہہ رہی ہے کہ بیٹی صبح ہو رہی ہے دودھ میں پانی ملا دے، لڑکی نے جواب دیا کہ اماں آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے اس کی ممانعت کی ہے، عورت نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت کہاں ہیں، ان کو کیا خبر؟ لڑکی نے جواب دیا کہ اگر امیر المومنین کو خبر نہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے۔ حضرت عمر نے اس گھر کو نظر میں رکھ لیا اور اپنے صاحبزادہ عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی کو پیام دو، مجھے امید ہے کہ اس کے بطن سے ایسا ہونہار فرد پیدا ہوگا جو سارے عرب پر حکومت کرے گا، عاصم نے اس سے نکاح کر لیا عمر بن عبدالعزیز اسی کے نواسے ہیں۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص۱۷-۱۸)

معزول کیا جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا اس کو بیت المال میں داخل کیا اور اسی گھڑی سے ان کی سیرت یکسر بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے بلکہ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جواری اور باندیوں کو تحقیق کے بعد ان کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسریٰ و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سُنّت بنایا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے ایسی زاہدانہ زندگی اختیار کی جس کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقراء میں بھی ملنی مشکل ہے، لباس میں ایسی کمی کی کہ بعض اوقات کرتا سوکھنے کے انتظار میں جمعہ میں تاخیر سے پہونچنا ہوتا، بنی اُمیہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے، اب اپنا نپا تُلا حصہ پاتے، خود ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے وہ منھ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمھارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سُن کر وہ بھی رو پڑیں[1]، اس وقت جب کہ وہ روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمراں تھے ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر سے جو ان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمھارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار، کہا اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اسکے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارکباد دی، اور کہا کہ حج کا سامان آگیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دن فائدہ اٹھایا، اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا، ان کے دو وقت کھانے کا حساب ۲ درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی اور کوئی ان کی خیریت دریافت کرنے لگتا یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنی ذاتی شمع منگواتے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کیے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی ان کو احتراز تھا، بیت المال کے مُشک کو سونگھنا بھی گوارا نہ تھا[2]۔

ان کی احتیاط تنہا اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے، اور اُن سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے معاملے میں اتنی قدر محتاط اور جزرس ہوں گے، والیِ مدینہ ابوبکر بن حزم نے سلیمان بن عبد الملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو سرکاری موم

---

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز محمد بن عبد الحکم ص ۵۵ [2] سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۴۴

بتیاں اور قندیلیں ملنی چاہئیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ پرچہ عمر بن عبدالعزیز کے ملاحظہ میں آیا، آپ نے لکھا کہ ابوبکر تمھیں یاد ہو کہ تم اس عہدہ سے پہلے جاڑے کی اندھیری راتوں میں بے شمع و موم بتی کے نکلتے تھے، تمھاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی، میرے خیال میں تمھارے گھر کی بتیاں اور قندیلیں کافی ہیں، انھیں سے تمھیں کام لینا چاہیے[1]۔ اسی طرح کی ایک درخواست پر جس میں سرکاری کام کے لیے کاغذ طلب کیا گیا تھا لکھا کہ "قلم باریک کرو اور گھٹا ہوا لکھو، اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لیے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواہ مخواہ بیت المال پر بار پڑے[2]"

ان کی انقلابی اصلاحات

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انھوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کا نقطۂ نظر بدلا، اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، تربیت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انھوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرہ سے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے[3]"، حکومت کا مزاج اور نقطۂ نظر ہی تبدیل کر دیا اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا۔

ان کی ساری مدت خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انھوں نے ملکی مصالح و منافع کے مقابلہ میں ہمیشہ دین، اصول و اخلاق کو ترجیح دی اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پرواہ نہیں کی، ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، اہلکاران سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی اور تشویش کا اظہار کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا عین مقصد ہی، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ کی آمدنی بند ہو جانے کی وجہ سے) ہم تم دونوں کھیتی کر کے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں[4]۔ یمن میں خراج کی ایک متعین مقدار مقرر تھی، خواہ فصل اچھی ہو یا بری، حاکم نے اطلاع دی، آپ نے فرمایا کہ فصل کے مطابق رقم وصول ہونی چاہیے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارے یمن سے ایک مٹھی غلہ وصول ہو، یمن اس پر

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز صہ ۶۴ ، [2] ایضاً صہ ۶۵ [3] کتاب الخراج امام ابو یوسف صہ ۷۵ [4] مناقب عمر بن عبدالعزیز (طبع یورپ) صہ ۹۳

راضی ہوں[1]، چنگی ساری مملکت سے معاف کر دی اور عمال کو لکھا کہ وہ بخس ہو اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے
ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔ (اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو، اور زمین
پر فساد پھیلاتے نہ پھرو) لوگوں نے اس کا نام بدل کر اس کو جائز بنا لیا ہے[2]، چند شرعی محاصل کے علاوہ
ہر طرح کے ناجائز محاصل اور بیسیوں ٹیکس جو سابق فرمانرواؤں اور عمال حکومت نے ایجاد کیے تھے، یکسر
معاف کر دیے[3]، خشکی اور سمندر کے راستوں کے کھولنے کی ہدایت کی اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں[4]۔

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں جن کے نتائج بہت دور رس تھے، ساری مملکت کے لیے یکساں پیمانے مقرر
کیے جس میں فرق نہیں ہو سکتا تھا[5]۔ حکام و عمال سلطنت کو تجارت کی ممانعت کی[6]، بیگار کو قانوناً ممنوع قرار
دیا[7]، سلطنت کی زمین کا خاصا رقبہ امراء، شاہی خاندان کے افراد اور حکام نے اپنی شکارگاہ یا چراگاہ کے
لیے گھیر کر بیکار بنا رکھا تھا حکم دیا کہ وہ عوام کی ملکیت ہے[8]، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کی
اور فرمایا کہ اگر کبھی وہ تحفہ تھا تو اب وہ رشوت کے سوا کچھ نہیں ہے[9]، حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے
تک پہونچنے اور شکایات پہونچانے کے پورے مواقع اور سہولتیں مہیا کریں[10]۔ حج کے موقع پر اعلان ہوتا تھا کہ
جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی نیک مشورہ دے گا اس کو سو سے لے کر تین سو دینار تک انعام ملے گا[11]۔

اعمال و اخلاق کی طرف توجہ

اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف
توجہ کرنے کی نہ فرصت تھی نہ اہلیت، نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے
دے، ان کے اخلاق و رجحانات کی نگرانی کرے، اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء و
محدثین کا سمجھا جاتا تھا، عمر بن عبدالعزیز نے اس دوئی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنیٰ میں "خلیفہ" ثابت کیا،
انھوں نے زمام خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عمال حکومت اور امراء اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خطوط و فرمان لکھے جو
انتظامی سے زیادہ دینی و اخلاقی ہیں، اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ و نصیحت کی روح ہے، ایک
خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی، (عہد نبوت و خلافت)، اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے اور
اسلامی نظام مالیات اور طرز حکومت کی تشریح کی ہے[12]، ان خطوط میں وہ امراء اجناد (فوجی افسروں) کو وقت
پر نمازیں پڑھنے اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں[13]، عمال کو تقویٰ و اتباع شریعت
کی وصیت فرماتے ہیں[14]، اپنے اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں اور اسی کو

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۱۲۶ [2] ایضاً ص۹۹ [3] ایضاً ص۹۹ و ص۱۲۶ [4] ایضاً ص۹۸ [5] ایضاً ص۹۹، [6] ایضاً ص۹۹،
[7] ایضاً ص۱۰۰ [8] ایضاً ص۹۷، [9] ایضاً ص۱۳۲ [10] ایضاً ص [11] ایضاً ص۱۲۱، [12] ایضاً ص۹۹، [13]
ایضاً ص۹۹ [14] ایضاً ص۹۲۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں[1] ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہو جانے کے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا وبال پڑتا ہے؟[2] عمال سلطنت کو سزا و عقوبت میں اعتدال و احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اسلام کے قانون تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں،[3] پھر سلطنت کی عمومی شہری خرابیوں اور بد اخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، نوحہ گری اور جنازہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں[4] قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی ممانعت کرتے ہیں[5] نبیذ کے استعمال میں بڑی بے احتیاطی شروع ہو گئی تھی اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور شراب تک پہونچ گئے تھے جس سے مختلف قسم کی بد اخلاقیاں پیدا ہو رہی تھیں اس کی تحدید و تشریح کرتے ہیں۔[6]

تدوین علوم اور احیائے سنن

اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم کی تدوین اور سنتوں کے احیاء کی طرف بھی توجہ کی، ابوبکر بن حزم جو ایک بڑے عالم تھے اُن کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا۔

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب العلماء	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس لیے کہ مجھے اندیشہ ہو کہ علماء رخصت ہو جائیں اور علم مٹ جائے۔

انھوں نے تعیین کے ساتھ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ، اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرۂ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ جلد انکو قلمبند کر لیا جائے پھر صرف ابوبکر بن حزم پر اکتفا نہیں کی بلکہ عمال سلطنت اور مشاہیر علماء کو بالعموم اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ انظروا الی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ[7] (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرو) اسی کے ساتھ علماء کے وظائف مقرر کیے کہ وہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کر سکیں۔[8]

وہ خود بڑے عالم تھے، انھوں نے بنفس نفیس فرائض و سنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا جس میں فرماتے ہیں کہ "اسلام کے کچھ حدود و قوانین و سنن ہیں جو ان پر عمل کرے گا اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی اور جو عمل نہیں کرے گا اُس کا ایمان ناکمل رہ جائے گا، اگر زندگی نے وفا کی تو میں تمھیں اس کی تعلیم دوں گا، اور تمھیں ان پر چلاؤں گا، اگر اس سے پہلے میرا وقت آگیا تو میں تمھارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا حریص بھی نہیں ہوں"[9]

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز صفحہ ۱۳۵، [2] صفحہ ۱۹۷، [3] صفحہ ۸، [4] ایضاً .... صفحہ ۱۰۸ [5] ایضاً صفحہ ۱۰۲

[6] ایضاً صفحہ ۱۰۲ [7] تاریخ اصبہان ابونعیم، [8] سیرت عمر بن عبدالعزیز صفحہ ۱۶۷، [9] صحیح بخاری کتاب الایمان باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس۔

ان کی اصلاحات کے اثرات اور ردعمل

عمر بن عبدالعزیز کی مالی اصلاحات اور بندشوں اور نظام حکومت میں شرعی و اخلاقی پابندیوں سے بجائے اس کے کہ حکومت کو مالی خسارہ اور شہریوں کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ملک میں خوش حالی عام ہوگئی اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا، یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز نے افریقیہ میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کیے جن کو وہ رقم دی جائے، تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا جس کو زکوٰۃ دی جا سکے، عمر بن عبدالعزیز نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کیے اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا[1]، ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدت خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لے کر آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دیدیا جائے لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا، عمر کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہوگئے اور زکوٰۃ کا مستحق نہیں رہا[2]۔

ان ظاہری برکات کے علاوہ (جو صحیح اسلامی حکومت کا ثانوی نتیجہ ہیں) بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے رجحانات بدلنے لگے اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی، ان کے معاصر کہتے ہیں کہ ہم جب ولید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے تو عمارتوں اور طرز تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لیے کہ ولید کا یہی اصلی ذوق تھا، اور اس کا تمام اہل مملکت پر اثر پڑ رہا تھا، سلیمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوع سخن یہی تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں نوافل و طاعات کا ذکر و مذاکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے، تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے، تم قرآن کب ختم کروگے، اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو[3]۔

ان کی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جد و جہد کی روح اور قوت محرکہ، ان کا قوی ایمان آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انھوں نے جو کچھ کیا خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقت ور حکمراں کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر اس طرز عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا تو وہ ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۵۹ [2] ایضاً ص۱۲۸ [3] تاریخ طبری واقعات سنہ ۹۶ھ

انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم (الانعام ع ۲)

اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انھوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی، کہ اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے، جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی، اب میں اس مقام پر پہونچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشتاق و متمنی ہے۔[۱]

ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی، اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمھیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی اور تمھیں اللہ نے جنت نصیب کی تو تمھارا کیا نقصان ہوا؟ یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگیٹھی رکھی تھی وہ بجھ گئی،[۲] یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبد العزیز اور حسن بصری کے لیے پیدا کی گئی ہیں[۳]

عمر بن عبد العزیز کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبد العزیز کو اپنے کسی پیشرو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی امیہ جن کو اپنے اس فرد خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمر کے گھرانہ میں رشتہ کرنے پر بہت پچھتاتے رہتے تھے، زیادہ دن اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیۂ خداوندی سے محروم کر دیا، سیدنا عمر بن عبد العزیز کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے دنیا سے رخصت ہوئے،[۴] اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے اُن کو زہر دیا،

اُمت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

عمر بن عبد العزیز کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا جیسا اُن سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے پنجے مضبوطی کے ساتھ گاڑ لیے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنا گیا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس "ناپسندیدہ دفعہ" کی تلافی کی پوری کوشش کی اور حکومت کو اُسی ڈگر پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "مترفین سابقین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق

---

[۱] سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۶۱ [۲] ایضاً ص ۱۰۹ [۳] صفۃ الصفوہ (ابن جوزی) ج ۳ ص ۱۵۶ [۴] ابن سعد، ابن الاثیر، ابن الجوزی

داعمال پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا، ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ، اس کی قوت کا راز، اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا، اس وقت خطرہ میں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہو جائے، قلوب میں سردی و افسردگی، ایمان میں کمزوری، اور تعلق باللہ میں اضمحلال بڑی شدت و سرعت سے پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا، اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل و بے تعلق تھی، بلکہ اس کا وجود اور اس کے نمائندے اس مقصد کے لیے حقیقی خطرہ بنے ہوئے تھے، اور اپنی ذاتی سیرت و کردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک و داعی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان، اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق، اور انابت و عبودیت کی جو کیفیات پیدا کی تھیں اور جو ایک نبی ہی پیدا کر سکتا ہے۔ وہ روبتنزل تھیں، یہ وہ کمی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جا سکتی تھی، اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد (پچھلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے) بڑی مشکل سے واپس لائی جا سکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی و سیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دیدی جاتی تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور، آخرت فراموش، اور خالص مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو ہضم نہ کر لے اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھارے میں پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں، آپ نے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف صاف کہا تھا

ما الفقر اخشی علیکم، ولکن اخشی علیکم ان تُبسطَ الدنیا علیکم کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا وتُھلککم کما اھلکتھم [1]	مجھے تمہارے بارہ میں فقر و افلاس کا خطرہ نہیں مجھے جو کچھ خطرہ ہو وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر ایسی کشائش و فراخی ہو جیسی تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی اور تم بھی انہیں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دو اور تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کرنے جیسے اگلوں کو ہلاک کیا۔

تابعین کی قوت ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبان نبوت نے اظہار کیا تھا جلد پیش آ گیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ کے کچھ مخلص و سرفروش بندے میدان میں آئے جنھوں نے اپنی قوت ایمانی، سوز دروں، صحبت و تربیت، وعظ و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان

---

[1] صحیح مسلم کتاب الزہد ص۴۰۷ج۲ (مطبع علیمی)

میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا اور خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کر دیا، انھوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا جو اس کے نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا جس میں وہ محض ایک بے سیرت، بے روح، اور بے یقین قوم بن کر رہ جائے۔ اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے فضلاء تابعین کی ایک سر برآوردہ جماعت تھی جن میں سعید بن جبیر، محمد بن سیرین اور شعبی خاص طور سے ممتاز تھے۔

حسن بصریؒ

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصری ہیں جو ۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد یسار مشہور صحابی حضرت زید بن ثابت کے آزاد کردہ غلام تھے اور خود انھوں نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

حسن بصری کی شخصیت اور انکی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصری میں اللہ تعالےٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرما دی تھیں جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لیے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پا سکتی تھی، صحابۂ کرام کا انھوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرت سے وہ پورے طور پر باخبر تھے اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے، وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے، وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، جب آخرت کا بیان کرتے تھے یا صحابۂ کرام کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں، حجاج بن یوسف کا سا زبان آور اور قادر الکلام اس آخیر دور میں نہیں گزرا، لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے، مشہور امام لغت و نحو ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا، اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے[1]، وسعت علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا جو اس سے پہلے نہیں سنی[2]، ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا

کان من دراری النجوم علما وتقوی	وہ اپنے علم و تقویٰ، زہد و ورع، استغنا و عالی ہمتی
وزھدا و ورعا، وعفۃ ورقۃ، وفقہا	لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درخشاں

---

[1] دائرۃ المعارف للبستانی ج ۷، ص ۴۴ [2] ایضاً ج ۷، ص ۴۴

ومعرفة، يجمع مجلسه ضروبا من الناس هذا يأخذ عنه الحديث، وهذا يلقن منه التاويل، وهذا يسمع منه الحلال والحرام، وهذا يحكي له الفتيا، وهذا يتعلم الحكم والقضاء، وهذا يسمع الوعظ وهو في جميع ذلك كالبحر العجاج تدفقا وكالسراج الوهاج تالقا، ولا تنس مواقفه ومشاهده في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر عند الامراء واشباه الأمراء، بالكلام الفصل واللفظ الجزل ؎

تارہ تھے، ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے تھے اور ہر ایک فیض پاتا تھا، ایک شخص حدیث حاصل کر رہا ہو ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہو، ایک فقہ کا درس لے رہا ہو، ایک فتویٰ پوچھ رہا ہو، کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا ہو، کوئی وعظ سن رہا ہو، اور وہ ایک بحر زخار ہیں جو موجیں لے رہا ہو اور ایک روشن چراغ ہیں جو مجلس کو پر نور کر رہا ہو، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں ان کے کارنامے، اور حکام وامراء کے روبرو پوری فصاحت اور پرشکوہ الفاظ میں اظہار حق کے واقعات بھلانے کی چیز نہیں۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحب قال اور صاحب کمال نہ تھے بلکہ صاحب دل اور صاحب حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لیے دل پر اثر کرتا تھا جس وقت وہ تقریر کرتے تھے خود سراپا درد واثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بصرہ وکوفہ میں بڑے بڑے صاحب علم اور صاحب درس تھے مگر ان کے حلقۂ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ وبیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو "کلام نبوت" سے بڑی مناسبت تھی، امام غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہو کہ "اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرز کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی۔ اسی طرح ان کا طرز زندگی صحابۂ کرام کے طرز زندگی سے بہت مشابہ تھا۔ ؎

اُن کے ان خصوصیات وجامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے، اور ان کو اُمت محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ اُمت محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہیئے ان میں حسن بصری بھی ہیں۔

مکہ معظمہ ہمیشہ سے عالم اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحب کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہل مکہ بھی حسن بصری کا علم دیکھ کر اور ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے اور کہنے لگے کہ ہم نے اس جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ ؎

انکی حق گوئی وبیباکی

اُن کے کمالات، فصاحت وبلاغت تبحر علمی اور تقریر وتاثیر ہی تک محدود نہ تھے،

؎ ابوحیان التوحیدی نے اس کو ثابت بن قرہ سے نقل کیا ہو ؎ احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۹۶ ؎ دائرۃ المعارف للبستانی ج ۷ ص ۲۲۴

بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفۂ وقت یزید بن عبد الملک پر برملا تنقید کی، ایک موقع پر بر سر درس کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (یزید بن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہو؟ انھوں نے کہا کہ "اس کا ساتھ دو نہ اس کا ساتھ دو" ایک شامی نے کہا، اور نہ امیر المومنین کا؟ یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا کہ ہاں نہ امیر المومنین کا! ہاں نہ امیر المومنین کا![1] حجاج کی تلوار اور سفاکی مشہور ہو مگر حسن کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے ضمیر اور عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کو سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہو سکے تھے اور ان میں حقیقی ایمان اور ادخلوا فی السلم کافۃ (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی شان پیدا نہیں ہوئی تھی خود مسلمانوں کی نئی نسل میں (جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی) بکثرت ایسے افراد تھے جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکام الٰہی کے سامنے "انقیاد و تسلیم" کی خو نہیں پیدا ہوئی تھی، ان میں سے خاصی تعداد میں (بالخصوص حکومت کے طبقہ اور امراء و اغنیاء میں) ایسے لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و اعمال اور ان کے ذہن و مزاج کا پرتو نظر آتا تھا یہی لوگ بالعموم زندگی پر حاوی تھے، درباروں میں، حکومت میں، کلیدی جگہوں پر، فوج میں، بازاروں میں انھیں کا غلبہ تھا، انھیں کا طرز زندگی سوسائٹی میں "فیشن" کی حیثیت رکھتا تھا۔

ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ نفاق ایک وقتی و مقامی بیماری تھی جو عہد رسالت میں مدینۂ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی، اس لیے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی، اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لیے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا کوئی موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد مذبذب رہے اور کسی ایک کا وفادار اور مخلص رفیق نہ بن سکے؛ اب یا تو کھلا ہوا کفر ہے، یا علانیہ اسلام، ان دونوں کے درمیان تذبذب کی کوئی وجہ نہیں، یہ غلط فہمی اچھے خاصے سنجیدہ طبقہ میں بھی پھیل گئی تھی تفسیر و تاریخ میں اس کے اثرات ملتے ہیں۔

ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے، اس بیماری کے پیدا ہونے کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور

---

[1] طبقات ابن سعد جز ۷، ص ۱۱۹۔

ہوں، اور ان میں کشمکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہو جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا، لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے، یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دستبردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں، اس لیے وہ ساری عمر اس دوعملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے، اسکی نفسی کیفیات، اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیاوی انہماک آخرت فراموشی اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی، اور کمزوروں اور غریبوں پر دست درازی "منافقین اولین" کی یاد تازہ کرتی ہے۔

"نفاق" و منافقین کی نشاندہی

حضرت حسن بصری کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے، اور منافقین نہ صرف موجود ہیں بلکہ زندگی پر اثر انداز اور سلطنت میں دخیل ہیں[1] اور انھیں سے شہروں کی چہل پہل ہے، کسی نے ان سے کہا کہ کیا اس زمانہ میں بھی "نفاق" پایا جاتا ہے؟ فرمایا لو خرجوا من ازقۃ البصرۃ لاستوحشتم فیہا[2] اگر منافقین بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو تمھارا شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے، یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے اور اسلام نے ان کے دل میں گھر نہیں کیا ہے یا وہ اپنے اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت سے آراستہ نہیں، ایک دوسرے موقع پر انھوں نے فرمایا، یا سبحان اللہ ما لقیت ھذہ الامۃ من منافق قھرھا واستاثر علیھا[3] خدا کی شان ہے اس امت پر کیسے کیسے منافق غالب آگئے ہیں جو پرلے درجہ کے خود غرض ہیں یعنی حکومت میں وہ عنصر موجود ہے جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں اور جس کو صرف اپنے اغراض اور منافع سے دلچسپی ہے۔

حسن بصری کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا

---

[1] متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود رہا ہے اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، ان کے نزدیک نفاق کی دو قسمیں ہیں، نفاق اعتقادی اور نفاق عمل و اخلاق، نفاق اعتقادی کا قطعی علم زمانہ رسالت کے بعد انقطاع وحی کی وجہ سے دشوار ہے، لیکن نفاق عمل اور نفاق اخلاق کثیر الوقوع ہے وہ اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس وقت نفاق بکثرت موجود ہے۔ فوز الکبیر میں ارشاد فرماتے ہیں، ——— "اگر خواہی کہ از منافقان نمونہ بہ بینی رو در مجلس امرا و مصاحبان ایشاں ببین کہ مرضی ایشاں را بر مرضی شارع ترجیح می دہند در انصاف ہیچ فرق نیست درمیان آنانکہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بواسطہ شنیدہ نفاق ورزیدند، و درمیان آنانکہ امحال پیدا شدہ اند و بطریق یقین حکم شارع معلوم کردہ اند بعد ازاں برانیا رخلاف آں اقدام می نمایند و علی ہذا القیاس جماعۃ از معقولیان کہ شکوک و شبہات بسیار بخاطر دارند و معاد را نسیا منسیا ساختہ اند نمونہ آں گروہ اند" صد ۱۲ (مطبع محمدی)

[2] "صفۃ النفاق وذم المنافقین" مؤلفہ محدث ابوبکر فریابی صد ۲ [3] ایضاً صد ۵

اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح حسن بصری کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لیے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں سے اس بگڑے ہوئے معاشرہ پر زد پڑتی تھی، وہ "نفاق" کی حقیقت بیان کرتے تھے اور نفاق ایک مرض تھا جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان کرتے تھے اور یہ اوصاف و اخلاق بہت سے ان لوگوں میں پائے جاتے تھے جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے، اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کی بجران کی مذمت کرتے تھے اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے اور ان حقیقتوں کو مستحضر کراتے تھے اور مترفین و غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی، غرض ان کی دعوت، ان کے مواعظ اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لیے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے، وہ اپنی تقریروں اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے اور اپنی صحبت و عمل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ۶۰ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت و اصلاح میں گزاری، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو انکی وجہ سے حلاوت ایمان اور حقیقت اسلام نصیب ہوئی، عوام بن حوشب کہتے ہیں کہ حسن نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے[۱]

حسن بصری کی وفات اور اُن کی مقبولیت اس خلوص، دینی انہماک، اور علمی و روحانی کمالات کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کا گرویدہ تھا، ۱۱۰ھ میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے[۲] ان کے جنازہ کی مشایعت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی[۳]

حسن بصری کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے، "دعوت الی اللہ" دعوت آخرت، اور دعوت ایمان و عمل کے تسلسل کو جاری رکھا، اور درمیان میں کوئی خلا آنے نہیں دیا، حسن بصری کی وفات کے بائیس۲۲ برس بعد خلافت امویہ کا خاتمہ اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بجائے بغداد دار الخلافہ اور پورے مشرق کا مرکز توجہ بن گیا۔

۱؎ دائرۃ المعارف للبستانی ج ۶، ص ۷۴۴ ۲؎ بصرہ اس وقت عراق کا سب سے بڑا شہر تھا اور خلافت کے پایہ تخت دمشق کے بعد اسلامی ملک میں دوسرے درجہ کا شہر شمار ہوتا تھا۔
۳؎ ابن خلکان (حسن بصری)

انقلاب حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت وتذکیر کے تسلسل کے ساتھ تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوشش بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے اور اس اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے جو امویوں اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم کر رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہوگئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آوازاور کوئی تحریک اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اس کو شرافت نسب اور علو خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت وحمایت نہ ہو، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافت اموی اور خلافت عباسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا ان کا تعلق اہل بیت سے تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا، لیکن وہ اُمت کے دینی رجحان کے نمائندہ تھے اور ان کو مسلمانوں کے دینی عنصر اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور تائید حاصل تھی۔

واقعۂ کربلا کے بعد بھی خاندان نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی، سیدنا حسین (علیہ وعلیٰ آبائہ السلام) کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن الحسین نے ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا اور ۱۲۲ھ میں شہید ومصلوب ہوئے، ان کے بعد بنی حسنؓ میں سے حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ (بن عبداللہ المحض بن الحسن المثنیٰ بن سیدنا حسن بن علیؓ) نے مدینۂ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا، امام ابوحنیفہ اور امام مالک[1] ان کی تائید وحمایت میں تھے، امام ابوحنیفہ نے برملا ان کی تائید کی اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی[2] اول الذکر رمضان ۱۴۵ھ میں مدینۂ طیبہ میں اور آخرالذکر ذوالقعدہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے، بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انھوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلان حق کی ایک نظیر قائم کر دی، اگرچہ عملاً وہ کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن ان کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر، قربانی اور جد وجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، اسلامی تاریخ کی آبرو انھیں جواں مردوں سے قائم ہو جنھوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور صحیح مقصد کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا،

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ،

خلافت عباسیہ اور اس کے اثرات

خلافت عباسیہ، خلافت امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی

---

[1] امام مالک نے اہل مدینہ کو محمد ذوالنفس الزکیہ کی رفاقت واطاعت کا فتویٰ دیا اگرچہ وہ منصور کی بیعت کر چکے ہوں (تاریخ الکامل ج ۵ صفحہ ۲۱۳)

[2] مورخین کا خیال ہو کہ امام ابوحنیفہ کے خلاف منصور نے جو سخت کارروائی کی اسکی وجہ ان کا عہدۂ قضا سے انکار نہ تھا بلکہ دراصل محمد وابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا۔

دنیاداری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین اور وہی اس کی خرابیاں اور بُرے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں عربی روح کارفرما تھی، اس کی خرابیاں اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہوگئی تھی اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و عیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہوگیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا، اُمطری حیث شئت فسیأتینی خراجک جہاں تیرا جی میں آئے جاکر برس جا، تیری پیداوار کا خراج بہرحال میرے ہی پاس آئے گا، ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنت عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں سات ہزار پانچ سو قنطار (سات کرور ڈیڑھ لاکھ ۷۰۱۵۰۰۰۰ دینار سے زیادہ تھی[1] یعنی اکتیس کرور پچاس لاکھ روپیہ (۳۱۵۰۰۰۰۰۰) سالانہ سے زائد، جو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی مالیت تھی، مامون کے زمانہ میں اس میں کافی اضافہ ہوا، اس کثیر آمدنی نیز سب سے بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامان عیش و عشرت، اور ساری دنیا کے اہل کمال، صناع و مغنی، غلام باندیاں، مصاحب و شاعر اور خوش باش و خوش فکر سمٹ کر بغداد میں آگئے تھے، دولت کی فراوانی، عجمیوں کے اختلاط سے تمدن کی ساری خرابیاں اور متمدن زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دار السلام یا مرکز اسلام میں شروع ہوگئی تھیں[2]، دولت کی بہتات، مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن و تعیش کا اندازہ کرنے کے لیے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہو، مورخ لکھتا ہے۔

"مامون مع خاندان شاہی و ارکان دولت و کل فوج و تمام افسران ملکی و خدام حسن بن سہل (وزیر اعظم جس کی لڑکی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی) کا مہمان ہوا، اور برابر انیس ۱۹ دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلے سے مہمان داری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روزوں کے لیے امیرانہ زندگی بسر کرلی، خاندان ہاشم و افسران فوج اور تمام عہدہ داران سلطنت پر مشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، املاک، خلعت، اسپ خاصہ، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا کہ جس کے حصہ میں جو گولی آئے اس میں جو کچھ لکھا ہو اسی وقت وکیل المخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر مشک و عنبر کی گولیاں اور درہم و دینار نثار

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۵۱　[2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کتاب الحیوان (جاحظ) ج ۳ ص ۹۱ و ج ۵ ص ۱۱۵ و مجلدات الاغانی

کیے گیے۔ مامون کے لیے ایک نہایت مکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بُنا گیا تھا، اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے قدم پر نثار کیے گیے جو زریں فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے[1]

بغداد کے داعی الی اللہ لیکن اسی پرعیش وعشرت بغداد میں کچھ نفوس قدسیہ تھے جو دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس، علوم دینیہ کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم میں ہمہ تن منہمک تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی ساری دلچسپیوں سے اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا، وہ اس امت کی روح اور تعلق باللہ کے سرمایہ اور اسلامی زندگی کے سرچشمہ (قرآن و حدیث) کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکی، مادیت کے اس پر تلاطم سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے جہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے، انھوں نے بغداد میں مادی و پرعشرت زندگی کے پہلو بہ پہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کر رکھی تھی جو اپنی طاقت اور وسعت میں مادی و سیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفاء اور امراء و وزراء کا قبضہ جسموں پر تھا تو ان کی حکومت لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر تھی، اور جہاں کہیں ان دونوں میں مقابلہ پیش آتا تو اکثر اوقات انھیں کا غلبہ ثابت ہوتا، سلطان وقت ہارون رشید اپنے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ رقہ میں مقیم تھا کہ مشہور امام حدیث اور مرد صالح حضرت عبداللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لیے نکل پڑی خلیفہ تنہا رہ گیا، ازدحام کا یہ حال تھا کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کنیز بالاخانہ سے دیکھ رہی تھی، اس نے پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے، اس نے کہا کہ یہ ہے بادشاہی، نہ کہ ہارون کی بادشاہی کہ بغیر پولیس اور اہل کاروں کے لوگ جمع ہی نہیں ہوتے[2]

یہ ایمانی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش و عشرت اور مال و دولت کا گہوارہ تھا اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمٹ کر یہاں جمع ہو گیے تھے، اسی طرح علم و عمل، صلاح و تقوی اور دعوت و اصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں اس فن کے امام، اور اس فن کے طالب پورے عالم اسلام سے آکر جمع ہو گیے تھے، طبقات و تراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صلحاء و علماء کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا اور قال اللہ و قال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، یہ دینی رونق اور عین مرکز حکومت

---

[1] المامون (مولانا شبلی نعمانی مرحوم) ص۸۶ بحوالۂ ابن خلدون، ابو الفداء، ابن الاثیر، ابن خلکان

[2] ابن خلکان (عبداللہ بن مبارک)

میں دین و اصلاح کی یہ دعوت انھیں مجاہد بندوں کے دم سے تھی جنھوں نے اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اس سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، جنید بغدادی، معروف کرخی اور بشر حافی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، ان حضرات کے اعمال و اخلاق، سچی خدا ترسی، بے لوث زاہدانہ زندگی، مخلوق سے استغناء، ایثار و بے نفسی، بے غرض خدمت خلق، اور ایمانی کیفیات غیر مسلم آبادی تک پر اثر ڈالتی تھیں، ان کی ذات سے اسلام کا اخلاقی وقار قائم تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سُن کر اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بکثرت یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابی مسلمان ہوتے تھے۔[1]

اُمّت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی رُوح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت، اور معاملات و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اُصول و آئین کے مطابق ہوں گے، اس وقت دو براعظم (ایشیا و افریقہ) اسلام کی نگرانی و تولیت میں تھے، اسلام کی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی وسیع اور سب سے طویل و عریض سلطنت تھی جو دنیا کے متمدن ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت جزیہ و خراج، محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جا سکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گزرا جا سکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جا سکتا تھا، اگر قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی جس کا نتیجہ وہ ہوتا جو اس وقت کی نام نہاد "اسلامی سلطنتوں" کا ہوا، علماء کی ذرا سی غفلت اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی، اس امت کو ہزار دل برس کے لیے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی۔

یک لحظہ غافل بودہ ام صد سالہ راہم دور شد

اسوقت دو مسئلوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کر لیا جائے جو محدثین کے سینوں اور منتشر سفینوں میں تھا،[2] یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا

[1] ملاحظہ ہو تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) حلیۃ الاولیاء (ابو نعیم) اور تاریخ ابن خلکان۔ [2] حدیث کے جمع و تدوین کا کام عہد تابعین سے شروع ہو چکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی توجہ و دلچسپی کا حال گزر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (م ۱۲۴) ابن جریج مکی (۱۵۰) ابن اسحٰق (۱۵۱) سعید بن ابی عروبہ مدنی (۱۵۶) معمر یمنی (۱۵۳) ربیع بن صبیح (۱۶۰) وغیرہ کے مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اسکو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل پر انجام دیا جائے۔

ماخذ تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچہ کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے، وہ زمانۂ نبوت کے تیئیس برسوں کا ایک طرح کا روزنامچہ ہے جو کسی پیغمبر کی امت کو حاصل نہیں، اس کا ضائع ہوجانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال، صحیح روحانیت، زہد و تقویٰ، اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہل دعوت و اہل عزیمت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہوسکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اُصول و کلیات موجود ہیں، اور اُن سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بے حد متنوع، ان اُصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے کے لیے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لیے ان کی ترجمانی و تشریح کے لیے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی،

تدوین حدیث

پہلی ضرورت کے لیے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہور اسلام کے لیے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا جو اپنی راست گفتاری امانت اور قوت حفظ میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابۂ کرام نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ سنا اس کو محفوظ کرلیا اور بے کم و کاست دوسری نسل کو پہونچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے بُت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں اسلام میں بت تراشی اور صورت گری حرام ہے، مگر صحابۂ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و عادات کا ایسا جیتا جاگتا مرقع پیش کردیا جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت و اشاعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے صدہا کی تعداد میں ایسے بلند حوصلہ، تازہ دم، پُرجوش طالب علم مہیا کردیئے جو قوت حافظہ اور ذکاوت میں بے نظیر تھے ان کا سیلاب عجم کے ملکوں سے اُمنڈ آیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا تھا کہ ان کے لیے چین سے بیٹھنا مشکل ہوگیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کے حاصل کرنے اور اپنے سینے اور سفینے میں محفوظ کرنے کی دھن تھی، علوم کی تاریخ اور پیغمبروں کی امتوں میں اس عشق اور دھن اور پھر اس احتیاط و امانت کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لیے اسلامی دنیا کا کونہ کونہ چھان ڈالا اس بادیہ پیمائی کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہو کہ امام بخاریؒ نے ۱۴ برس کے سن میں سیاحت شروع کردی تھی، بخارا سے لیکر مصر تک سارے ممالک انھوں نے کھنگال ڈالے، امام ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ مسافت پیادہ پا طے کی پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا ـــــ

محدث اندلس ابن حیون نے حدیث اندلس، عراق، حجاز اور یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی، گویا طنجہ سے لے کر سویز تک سارا براعظم افریقہ اور پھر بحر احمر طے کیا، بہت سے محدثین کا سفرنامہ تین تین براعظموں ایشیا افریقہ یورپ (اسپین) پر مشتمل ہو۔[1] اس وقت کی متمدن و معروف دنیا کے مغرب بعید (اندلس) سے مشرق بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر پھرنا تو معمولی بات تھی۔

فن اسماء الرجال ان مخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کی بلکہ درمیانی وسائط کی بھی تحقیق کی اور ان تمام راویوں کے نام و نشان، تاریخ زندگی، اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا جن کے توسط سے یہ روایات ان کو پہونچی تھیں، اس طرح جس ذات گرامی کے متعلق درفعنالات ذکر کرنا کا وعدہ اور اطلاع تھی، اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آگئی، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اہمیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس ہستی کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جز کے راوی، اور اس سلسلۂ روایت کے ایک ناقل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم "اسماء الرجال" کا وجود میں آگیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق، اور احساس ذمہ داری کی روشن مثال ہے۔ اور اس امت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہو ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابہ فی احوال الصحابۃ (حافظ ابن حجرؒ) کے انگریزی مقدمہ[2] میں بالکل صحیح لکھا ہو کہ

> "کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہو جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہو۔"[3]

محدثین کی احتیاط و امانت محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات جمع و محفوظ کر دیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی اور اُن کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقویٰ، علم و حافظہ کے متعلق اُن کے معاصرین کے بیانات اور ہر قسم کے معلومات یکجا کر دیئے اور ان کے بارہ میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا خواہ وہ ان کے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

" راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانت داری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ

---

[1] یہ مثالیں "علمائے سلف" (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم) سے ماخوذ ہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب کا عنوان "سفر" [2] مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۳ء تا ۱۸۶۴ء [3] خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی

واقعات آج اسلام کے مفاخر میں ہیں، راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے جن کی تلوار کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی اور ان کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں ان کو مل سکتا تھا، امام وکیع بڑے محدث تھے لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی تھے اس بنا پر وہ خود ان سے جب روایت کرتے تو انکی تائید میں کسی دوسرے راوی کو ضرور ملا لیتے یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے[1] مسعودی ایک محدث ہیں ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی[2] یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے صرف اس معاوضہ میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (عدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں یعنی اسکے متعلق خاموش رہیں، انھوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا[3] کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہو؟[4]

قوت حافظہ اور استحضار محدثین کی یہ جماعت ایران و ترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ، علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوت حفظ کے محیر العقول نمونے پیش کرتا تھا جو ضعف و کمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں، لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں بہم پہونچاتی ہو اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرتِ کار، مناسبت تام اور اپنے موضوع سے عشق و شغف ایسا ملکہ پیدا کر دیتا ہو اور انتقال ذہنی کے ایسے نمونے ظاہر ہوتے ہیں جو غیر متعلق اشخاص کے لیے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علماء بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے امام بخاری جب مجلس میں آئے تو ایک

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۱۳۰ [2] ایضاً ج ۶ صفحہ ۲۱۱ [3] ایضاً ج ۶ صفحہ ۲۳۱ [4] خطبات مدراس صفحہ ۵۹، ۶۰

ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں اور ان کی رائے دریافت کی وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں اہل علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنالیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے اور انکی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کردی، اور جس سند کا جو متن تھا اور جس متن کی جو سند تھی وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعت نظر، حاضر دماغی، اور حافظہ پر انگشت بدنداں رہ گیے۔[۱]

مجالس درس میں سامعین کا ہجوم

اس ذہین طبقہ کی توجہ وانہماک اور حدیث کی ضرورت کے احساس نے حدیث کا ایسا عام ذوق، اسکے درس وروایت کی مجلسوں میں شرکت کا شوق، اور آئمۂ فن سے تلمذ واستفادہ کی حرص پیدا کردی تھی کہ محدثین کی مجالس درس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی، اور بادشاہوں کے دربار سے زیادہ ان میں سکون اور نظام ہوتا" یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درسِ حدیث دیا تو اس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا، امام عاصم بن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چبوترے پر بیٹھتے تھے، خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنا ایک معتمد اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لیے بھیجا، تو ایک لاکھ چوبیس ہزار حاضرین کی تعداد کا اندازہ تھا، احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رحبۂ غسان نامی مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا، سات مستملی کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہونچاتا تھا اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے، دواتوں کا شمار کیا گیا تو کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئیں، جو لوگ لکھتے نہ تھے صرف سماعاً شریک تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں۔ شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو تین سو سولہ ۳۱۶ مستملی ان کی مجلس میں حاضر تھے اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار، فریابی کی مجلس میں دس ہزار آدمی ان کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے جو دوات قلم لیکر بیٹھتے۔[۲] فربری کی روایت ہو کہ امام بخاری کی جامع صحیح کو ان سے نوے ۹۰ ہزار آدمیوں نے سنا۔[۳]

صحاح ستہ

یہ عمومی ذوق، انہماک، اور جذبۂ مسابقت خالی از حکمت نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کا ایسا محفوظ و مستند سرمایہ جمع ہوگیا جو اس امت کی بہت بڑی ثروت، اور اصلاح و تجدید کا ایک بڑا طاقتور ذریعہ ہے اس سرمایہ میں امام بخاری کی صحیح، امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہو اس کو "متفق علیہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں جو حدیث کا اعلیٰ درجہ ہے)

---

[۱] مقدمہ فتح الباری ص۴۸۶　[۲] علمائے سلف بحوالہ تذکرۃ الحفاظ و تاریخ ابن خلکان۔

[۳] مقدمہ فتح الباری ص۴۹۲

سب سے ممتاز اور بلند پایہ ہیں۔ ان دونوں کے بعد امام مالک کی مؤطا، امام ترمذی کی جامع، امام ابوداؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں، بعد کی اصلاحی کوششوں اور تجدیدی کارناموں میں محدثین کرام کی ان ابتدائی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے، آج بھی کوئی سنجیدہ اور وسیع اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس علمی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تدوین فقہ اسی طرح فقہ کی تدوین، مسائل کا استنباط و استخراج، جزئیات و فتاویٰ کی ترتیب، اسلام کی ایسی عملی ضرورت تھی جس کو بالکل مؤخر نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہونچ گیا تھا، معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لیے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے بیشتر اسلام کی تاریخ و روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمۂ اربعہ اور ان کی خصوصیات یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کار عظیم کے لیے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہو، اپنے تعلق باللہ، للہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبۂ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لیے وقف

۵ے شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں صحیحین کے متعلق لکھتے ہیں اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیھما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وانھما متواتران الی مصنفیھما وانہ کل من یھون امرھما فھو مبتدع متبع غیر سبیل المومنین (ص ۱۳۴ ج ۱) یعنی محدثین کا اس امر پر اتفاق ہو کہ ان دونوں کتابوں میں جتنی متصل مرفوع روایات ہیں وہ یقینی طور پر صحیح ہیں، اور ان دونوں کتابوں کی نسبت اپنے مصنفین کی طرف تواتر سے ثابت ہو، اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی تحقیر کرتا ہو وہ مبتدع اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر چلنے والا ہو۔

کردی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابوحنیفہ کو دو بار عہدۂ قضا پیش کیا گیا اور انھوں نے انکار کیا، یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ[1] کے اظہار میں کوڑے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا اور اپنی صحت قربان کردی، امام احمد نے تن تنہا حکومت وقت کے رجحان اور اس کے "سرکاری مسلک" کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک اور اہل سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کردیا جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کرسکتے، امام ابوحنیفہ نے تراسی ہزار ۸۳۰۰۰ مسائل اپنی زبان سے بیان کیے، جن میں سے اڑتیس ہزار ۳۸۰۰۰ عبادات سے تعلق رکھتے ہیں، اور پینتالیس ہزار ۴۵۰۰۰ معاملات سے[2] شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کیے ان کی تعداد چھ لاکھ ۶۰۰۰۰۰ ہے[3]، المدونہ میں جو امام مالک کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے چھتیس ۳۶۰۰۰ ہزار مسائل ہیں، کتاب الام جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے سات ضخیم جلدوں میں ہے، ابوبکر خلال (م ۳۱۱) نے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کیے[4]

ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے ممتاز ملے جنھوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور اس کی تنقیح و ترتیب کا کام جاری رکھا، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام ابویوسف جیسا قانونی دماغ نظر آتا ہے جس نے ہارون رشید کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاۃ کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیے۔ اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب الخراج جیسی عالمانہ تصنیف کی، اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ او مؤلف اور امام زفر جیسا صاحب قیاس نظر آتا ہے، جنھوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگائے، امام مالک کو عبداللہ بن وہب، ابن القاسم، اشہب، عبداللہ بن الحکم، یحییٰ بن یحییٰ اللیثی جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے، جن کی کوششوں سے مصر اور شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہوگیا، امام شافعی کو بویطی، مزنی اور ربیع جیسے محنتی اور ذہین شاگرد ملے، جنھوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کردیا، امام احمد کی فقہ کو ابن قدامہ جیسا مصنف اور محقق حاصل ہوا جس نے المغنی جیسی

---

[1] مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کی طلاق کا کچھ اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لیے جو بیعت لی جاتی تھی اس میں یہ کہلایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو بیوی کو طلاق ہوجائے گی۔ اگر مجبور کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس حلف نامے میں کوئی طاقت اور تاثیر باقی نہیں رہ جاتی اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی اور اسکے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا [2] فجر الاسلام بحوالۂ مناقب ابی حنیفہ للمکی صـ ۹۶ [3] سیرۃ النعمان (مولانا شبلی) بحوالۂ قلائد العقود والعقیان [4] اس کتاب کا نام الجامع لعلوم الامام احمد ہے، ابوبکر خلال کا مفصل حال شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۲ صـ ۲۶۱ میں ملاحظہ ہو۔

عظیم الشان تصنیف، کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

تدوینِ فقہ کا فائدہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمۂ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہو جانا اس دین کی زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہو گئی اور وہ اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی جس کی قومیں اپنے ابتدائی عہد ہی میں شکار ہو چکی ہیں، انھوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیے جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل و مشکلات کے حل کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے اور عام اور معتدل زندگی کو باقاعدگی اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جا سکتا ہے۔

Registered No. A 353.

Printed at:—NAMI PRESS, Lko.

دعوت، اصلاح و تبلیغ کا ترجمان

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا گر ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے اور وہ ہے

اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لاچکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں، اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

"ادارہ الفرقان"

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، در اصل یہ

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جیئں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔

"ادارہ الفرقان"

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مولانا محمد منظور نعمانی ——— اور ——— مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

کی

تبلیغی تقریریں!

جو ہندوستان و پاکستان کے مختلف شہروں کے اہم تبلیغی اجتماعات میں کی گئی تھیں

✲ ان کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہوگا ——— کہ ✲

(۱) دعوت و تبلیغ کی اس جدوجہد کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے۔

(۲) اس کا مقصد و نصب العین اور اسکے اصول کیا ہیں، اور وہ کن امتیازات کی حامل ہے۔

(۳) مسلمانوں سے اس کا کیا مطالبہ ہے، اور ان کے لئے اس کا کیا پیام ہے۔

(۴) دنیا اور آخرت میں اس تحریک سے کن نتائج کی توقع ہے۔

(۵) جو لوگ اس دینی دعوت کو صرف کلمہ و نماز کی تحریک یا جامد خانقاہیت کی دعوت کہتے ہیں وہ اصل حقیقت سے کتنے ناواقف ہیں۔

✲ اس تحریک کے کارکنوں کو ان تقریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا ——— کہ ✲

(۶) مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے سامنے اس دعوت کو کس انداز میں پیش کرنا چاہیے۔

(۷) شبہات اور غلط فہمیوں کو کس طرح صاف کرنا چاہیے۔

(۸) اس کام سے تعلق رکھنے والوں کو کن باتوں کی پابندی خاص طور سے کرنی چاہیے۔

(۹) ان میں بعض تقریریں وہ بھی ہیں جو ایسے مجمعوں میں کی گئیں جن میں غیر مسلم بھی خاصی تعداد میں تھے، ان سے معلوم ہوگا کہ غیر مسلم حضرات کیلئے ہماری دعوت اور ہمارا پیام کیا ہے؟ اور ہم اُن سے کیا کہتے ہیں۔

(۱۰) بوقتِ ضرورت، ان تقریروں کو اجتماعات میں بھی سنایا جا سکتا ہے۔

(اس میں کل ۱۳ تقریریں ہیں — پونے تین سو صفحات — مجلّد — خوشنما — مع گرد پوش — قیمت ۔/۳ (عہ)

ماہنامہ

الفرقان (لکھنؤ)

فہرست مضامین

جلد ۲۰ بابتہ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۲ھ مارچ ۱۹۵۳ء شمارہ ۶

یہاں سرخ پنسل کا نشان اس بات کی علامت ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہو، اگر آئندہ بھی تعاون جاری رکھنے کا ارادہ ہو تو چندہ ارسال فرمائیے ورنہ ایک کارڈ کے ذریعہ اپنے ارادہ سے مطلع فرما دیجئے اگر ۱۰ اپریل تک نہ آپ کا چندہ آیا اور نہ کوئی خط تو اپریل کا رسالہ وی، پی کیا جائے گا جس کو وصول کرنا آپ کی اخلاقی ذمہ داری ہو۔

پاکستان کے احباب اپنا چندہ ذیل کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

جناب شیخ محمد اقبال صاحب ہوشیارپوری، مکتبہ اصلاح ۲/۶۳ مال روڈ لاہور مغربی پاکستان۔ اور یہ یاد رکھیں کہ اب ان کو بھی پانچ روپے بھیجا ہیں۔ چندہ بھیجنے اور نہ بھیجنے کی دونوں صورتوں میں اطلاعی کارڈ براہ راست لکھنؤ ارسال فرمائیں۔ لاہور بھیجنے سے کوئی حاصل نہیں۔ وہ ازیں کوئی شکایت ہو تب بھی ہمیں کو لکھنا چاہیے۔ اگر رسالہ جاری رکھنے کا ارادہ ہو تو جہاں تک ہو سکے چندہ منی آرڈر سے بھیجئے۔ وی پی کرنے میں سخت دقتیں پیش آنے لگی ہیں اور رسالہ پہنچنے میں دیر لگ جاتی ہے۔

ناظم الفرقان لکھنؤ

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

یہ بالکل حقیقت ہے کہ ہدایت محض اللہ کی توفیق پر منحصر ہے، انسان کیسا ہی ذی عقل اور روشن دماغ ہو مگر اللہ اگر توفیق نہ دے تو ہدایت حاصل کرلینا اس کے بس کا کام نہیں، اسکی مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں اور اس حقیقت کے ماننے والوں کے یقین کو نکھارتی رہتی ہیں۔ ہدایت کا مکمل ترین صحیفہ (قرآن پاک) دنیا کے گوشہ گوشہ میں کھلا ہوا ہے اور آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھانے کا کام بھی اللہ کی طرف سے برابر جاری ہے مگر فیضان ہدایت پھر بھی عام نہیں۔

ابھی گذشتہ مہینے میں ہالینڈ اور برطانیہ کے ساحلوں پر طوفان نے جو ہولناک تباہیاں مچائی ہیں انکی تفصیلات سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، مگر کتنے خدا فراموش ہیں جن کی آنکھوں سے پردہ اٹھا ہو اور وہ محسوس کرنے لگے ہوں کہ کائنات میں کسی صاحب اقتدار و اختیار ہستی کا دست قدرت کارفرما ہے، اسکی مشیت جس وقت جو چاہتی ہے وہ ہوتا ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس کے ارادوں پر روک ٹوک کرسکے، اور کوئی نہیں ہے جو ایک لمحہ بھی اسکے مقابلہ میں ٹھہر سکے ———

کائنات کا ایک ایک ذرہ بلا چوں و چرا اس شہنشاہ مطلق کی فرمانبرداری میں سرگرم عمل ہے، مگر ایک اور صرف ایک مخلوق ایسی ہے جو اس کائنات کے تشریعی نظام ہی سے نہیں، تکوینی نظام تک سے بے دخل کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اسی کے دیے ہوئے علم و عقل کو اسی کے خلاف نبرد آزمائی میں پورے زور و شور سے صرف کر رہی ہے۔ شکست پر شکست کھا رہی ہے مگر باز نہ آنے کی گویا قسم کھا رکھی ہے۔ اللہ کی قدرت کا دست بے پناہ جوتے پر جوتے مار رہا ہے مگر اینٹھ ہے کہ گویا ہر جوتے پر دو چند ہوتی چلی جا رہی ہے ——— یہ نادان مخلوق حضرت انسان ہیں جنکو اپنے علم و خرد پر بڑا ناز ہے اور بلا شبہ کائنات میں انسان کا یہ طرۂ امتیاز قابل صد ناز ہے مگر جس کریم کے در سے انسان کو یہ نعمت ارزانی ہوئی تھی اسکی غیرت نے اسی نعمت کو ایک بلائے بے درماں میں تبدیل کرکے رکھ دیا۔ اب یہ علم و عقل ایک وبال ہے جسے سرکش انسانوں کا قافلہ سر پر لیے ہوئے گھوم رہا ہے اور استکبار کا خناس اسکے دماغ میں شدت سے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ قافلہ اب ہر منزل تک پہونچ سکتا ہے مگر نہیں پہونچ سکتا تو اس منزل تک جس تک پہونچانا اس علم و عقل کا اصل مقصود تھا وہ منزل ہے خالق کی معرفت اور اپنی حقیقت کا ادراک اور اس معرفت و ادراک کے نتیجے میں اپنی بندگی کے ذریعہ خالق کی خوشنودی کا حصول!

متکبرین کا یہ قافلہ بایں استکبار و پندار کبھی اس منزل سے ہمکنار نہیں ہوسکتا، ہمکنار ہونا تو درکنار اسکو اپنی منزل سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اسکی اپنی منزل تسخیر کائنات ہے۔ یہی اس کی ساری تگ و دو کا مرکز ہے اور یہی اسکے علم و عقل کا مصرف ہے۔ ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا ہوا

وہ اپنی اسی دھن میں مگن ہو۔ وہ اپنی ناکامیوں کو "مادہ" کی سخت جانی یا تدبیر کی خامی کا نتیجہ سمجھتا ہے اور کچھ سنبھلتا ہوا پھر کھڑا ہوجاتا ہے۔ حالانکہ اگر اسکی سرکشی کی پاداش میں اسکے قوائے عبرت و بصیرت معطل نہ کردیئے گئے ہوتے تو اسے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اگر اس جنگ میں اس کا مدمقابل ایک بے حس، بے ارادہ اور بے شعور مادہ اور نیچر ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک عقل و شعور اور حکمت و ارادہ سے بہرہ ور حریف اتنی طویل مدت میں بھی اس پر قابو نہ پاسکتا ——— مگر ان کے پاس دیدہ عبرت نگاہ ہے کہاں! لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ (ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ نہیں سمجھتے۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھ نہیں سکتے اور ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سن نہیں سکتے)۔ ہالینڈ اور برطانیہ کے اس ہولناک طوفان کے چند ہی روز بعد جس نے وہاں کے "مسخرین" کے تسخیری کارناموں کو چشم زدن میں مٹی میں ملا کر رکھ دیا تھا ہم نے اپنے ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے (ہندستان کے ایک عظیم الشان بند کا افتتاح کرنے کے بعد) یہ خطبہ سنا کہ "یہ بند اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کس طرح اپنی محنت اور اپنی عقل سے قدرت کے خلاف فتح پاسکتا ہے" ——— کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ انسان کے متعلق علیم و خبیر کے ارشاد اِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا میں ذرا بھی مبالغہ ہے۔ ایک طرف قدرت کی ایک ٹھوکر سے "ائمہ تسخیر" کی دنیا زیر و زبر ہوئی جارہی ہے اور انکے بڑے بڑے بند پانی کے ایک ریلے میں ریت کے گھروندوں کی طرح لاپتہ ہو رہے ہیں اور دوسری طرف ان ائمہ کے مقلدین اپنی تسخیری فتوحات پر دین نفلیں بجا رہے ہیں حالانکہ جب اصل کی یہ حقیقت نکلی اسکی نقل کا حشر معلوم!۔

کاش ان اہل خرد کی سمجھ میں یہ بات آسکتی کہ وہ جس "قدرت" سے بزعم خود نبرد آزما ہیں اسکی حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سمجھے ہوئے ہیں بلکہ وہ ایک دانا و بینا اور قادر و مختار ذات ہے جو بلا شرکت غیرے اس اقلیم کائنات کی خالق و فرمانروا ہے اس سے جنگ کرکے اس کی سلطنت پر قبضہ نہ آجتک کوئی کرسکا ہے نہ کرسکے گا، ہاں اس سے صلح کرکے اور اس کے تشریعی نظام کا قلادہ گردن میں ڈال کر اس کائنات پر حکم چلایا جاسکتا ہے پانی سے کہا جاسکتا ہے کہ اپنی حد کے اندر رہ! ہوا سے کہا جاسکتا ہے کہ دھیرے دھیرے چل، سمندر سے کہا جاسکتا ہے کہ راستہ دے! اور زمین سے کہا جاسکتا ہے کہ اپنے خزانے اگل! ——— مگر ایک خود مختار اور باغی کی حیثیت سے نہیں! اطاعت گذار بندے اور خلیفہ کی حیثیت سے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ان غلاموں کی تاریخ پڑھیے جن کی زندگی بندگی اور خلافت کا بہترین نمونہ تھی۔ ان میں سے ایک نے حکم دیا تو دریائے نیل کو اپنی سالانہ طغیانی کے معمول کو ترک کرنا پڑا ہاں کی ایک فوجی جمعیت نے ارادہ کیا تو دجلہ کی سرکش لہروں کو انھیں دوسرے کنارہ تک پہونچانے کے لیے کشتیوں کی خدمت انجام دینا پڑی۔ بلا کسی سائنس کی امداد کے! اس لیے کہ یہ سب چیزیں انسان کی خدمت گذاری ہی کے لیے پیدا کی گئی ہیں بشرطیکہ وہ اپنے پروردگار کا اطاعت گذار بنے۔

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا

قرآنی دعوت

(۳)

خدا کی صفات :-

(صفات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے علم کلی اور قدرت کاملہ کا قرآنی بیان تو ناظرین کرام اس سے پہلی قسط میں پڑھ چکے اب اس سے آگے ملاحظہ ہو۔ سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابت ماہ صفر سنہ ۷۰ھ)

وہی سب کا خالق و رزاق اور پروردگار و کارساز ہے اور وہی اپنے حکم سے اس کارخانۂ ہستی کو چلا رہا ہے

قرآن مجید بڑے زور کے ساتھ اور بڑی تفصیل سے یہ بھی بتلاتا ہے اور دلوں میں اس کا یقین پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ساری کائنات کو پیدا اور نیست سے ہست بھی خدا نے کیا ہے اور وہی اس کارخانۂ عالم کے سارے نظام کو بلا شرکت غیرے چلا رہا ہے۔ زندگی اور رزق وغیرہ زندگی کے جو سامان جسکو مل رہے ہیں وہ اللہ ہی دے رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں نہ زندگی ہے نہ زندگی کی ضروریات اور اسکے سامان ہیں۔ بلکہ وہی جس کو جب تک اور جتنا دینا چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کو دینا نہیں چاہتا نہیں دیتا —— قرآن مجید کا کافی حصہ اسی مضمون سے متعلق ہے۔ چند آیتیں اس سلسلہ کی بھی یہاں پڑھ لیجیے۔ سورۂ اعراف میں فرمایا۔

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (اعراف ع ۷)

سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم چلانا، با برکت ہے اللہ جو پروردگار ہے ساری کائنات کا۔

اور سورۂ زمر میں فرمایا۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی

وَكِيْلٌ ۝ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝

(زمر ع ۶)

ہر چیز کا ذمہ دار ہے، زمین و آسمان کے خزانے اور ان کی کنجیاں اسی کے قبضہ اور تصرف میں ہیں۔

اور سورۂ روم میں مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

(الروم ع ۴)

اللہ ہی وہ ہے جس نے تمکو پیدا کیا ہے اور وہی تمہارا رازق ہے۔ پھر (وقت آنے پر) وہی تم کو موت دے گا اور پھر تم کو وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ان شریکوں میں (جنکو تم عباد میں خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو) کوئی ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے۔ پاک ہے وہ اللہ اور برتر ہے اُن کے شرک سے اور شریکوں سے۔

اور سورۂ شوریٰ میں فرمایا۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

(الشوریٰ ع ۲)

وہ اللہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے اسی نے تم میں سے تمہارے واسطے جوڑے بنائے، اور چوپایوں میں سے جوڑے بنائے۔ وہی تمہیں زمین میں پھیلا اور بڑھا رہا ہے۔ نہیں ہے اسکی مثال کوئی وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے (سب کی سنتا اور سب کو دیکھتا ہے) زمین و آسمان (کے خزانے اور ان) کی کنجیاں اس کے پاس ہیں، جسے چاہتا ہے روزی میں وسعت دیتا ہے اور جسکے لیے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے۔ وہ سب کچھ خوب جانتا ہے۔

اور سورۂ ابراہیم میں فرمایا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ

(ابراہیم ع ۵)

اللہ ہی وہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور اتارا آسمان سے پانی پھر پیدا کیے اس کے ذریعہ غلے اور میوے تمہاری روزی کیلئے اور تمہارے قابو میں کیا کشتیوں کو کہ اسکے حکم سے (تمہارے کاموں میں) سمندر میں رواں دواں رہتی ہیں، اور اسنے تمہارے کام کا بنایا نہروں ندیوں کو (جنمیں تم اپنی کشتیاں دوڑاتے ہو اور انکے پانی سے اپنے بہت سے کام کرتے ہو) اور اسنے تمہارے کام میں لگایا ہو سورج اور چاند کو جو برابر ایک نظام کے مطابق چلتے رہتے ہیں (اور جن سے تمہارے بہت سے منافع وابستہ ہیں)، اور اسی نے تمہارے کام کا بنایا ہو دن اور رات کو (یعنی اسنے دن اور رات کا نظام ایسا قائم کیا جیسا کہ تمہارے ضروریات اور مصالح کا تقاضا تھا، اور صرف یہی چیزیں تمہاری ضرورت کی اس نے نہیں بنائی ہیں) بلکہ ان کے علاوہ بھی جو تمہاری زندگی کی ضروریات تھیں اور زبان حال یا زبان قال سے جو کچھ تم نے اس سے مانگا اس میں سے تم کو اس نے دیا (اور اس کے اسی فضل و کرم سے تمہاری زندگی کا نظام چل رہا ہے اور تم پر اس کے اتنے احسانات ہیں کہ) اگر تم شمار کرو تو نہ کر سکو گے، واقعہ یہ ہو کہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

اور سورۂ مومنون میں فرمایا۔

وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ

وہی اللہ ہے جس نے تمہارے (سننے کے لیے) کان

والابصار والافئدۃ قلیلاً
ماتشکرون ۝ وھوالذی
ذرأکم فی الارض والیہ
تحشرون ۝ وھوالذی یحیی
ویمیت ولہ اختلاف اللیل
والنہار افلا تعقلون ۝

(المؤمنون ع ۵)

(دیکھنے کے لیے) آنکھیں اور (سوچنے سمجھنے کے لیے) دل پیدا کیے ۔ مگر تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو ۔ اور وہی ہو جس نے تم کو (اس زندگی میں) زمین میں پھیلایا اور بڑھایا ہو اور یہاں سے جانے کے بعد تم سب اسی کی طرف لے جائے جاؤ گے ۔ اور وہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہو (یعنی اس کے ہاتھ میں زندگی اور موت کا نظام ہو) اور اس کا کام ہو رات دن کا الٹ پھیر اور یکے بعد دیگرے ان کی آمد و رفت تو کیا تم عقل و خرد سے بالکل کام نہیں لیتے (اور نہیں سوچتے کہ تمہارا رویہ اس خالق و مالک اور محسن کے ساتھ کیا ہونا چاہیے)

اور سورۂ مومن میں ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(مومن ع ۷)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے واسطے زمین کو مستقر بنایا اور آسمان کو چھت کی طرح بلند کیا اور اسی نے تمہاری صورت گری کی اور ایسی اچھی صورتیں بنائیں ، اور نفیس نفیس غذاؤں سے تمھیں رزق دیا ، وہی اللہ تمہارا رب ہو ، بڑی برکت اور عظمت والا ہو اللہ جو ساری کائنات کا پروردگار ہو ۔

اور سورۂ اعراف میں فرمایا :-

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ

(اعراف ع ۲۰)

کہو ! کیا اللہ کے سوا کسی اور کو میں اپنا رب بناؤں ، حالاں کہ وہی ہر چیز کا رب ہو اور اسی کی طرف سے سب کی پروردگاری ہو رہی ہو ۔

اور سورۂ جاثیہ میں ارشاد فرمایا:۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

(جاثیہ ع ۴)

پس ساری حمد و ستائش صرف اللہ ہی کے لیے ہے (اور اس کے سوا کسی کے لیے حمد سزاوار نہیں کیونکہ تنہا وہی ہے) جو زمین و آسمان اور ساری کائنات کا رب ہے اور سب اسی کی پرورش سے فیضیاب ہیں۔ — آسمان و زمین میں عظمت و کبریائی بھی صرف اسی کے لیے ہے اور وہ زبردست اور حکمتوں والا ہے۔

وہی ساری کائنات کا بادشاہ اور حاکم ہے۔
سب کچھ صرف اُسی کے اختیار میں ہے

یہ بھی قرآن مجید کے ان مضامین میں سے ہے جن کو اتنی کثرت سے بیان کیا گیا ہے کہ شمار بھی نہیں بتلائی جا سکتی — صرف نمونہ کے طور پر ذیل کی چند آیتیں پڑھ لیجئے! — ارشاد ہے:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(آل عمران ع ۳)

کہو! اے اللہ سارے ملک اور ساری کائنات کے مالک! تو ہی ہے جس کو چاہے حکومت و بادشاہت دے، اور جس سے چاہے چھین لے، جسے تو چاہے عزت دے اور جسے چاہے رسوائی اور ذلت دے، ہر خیر اور ہر قسم کی بھلائی تیرے ہی قبضہ اور اختیار میں ہے (اور صرف خیر اور بھلائی ہی نہیں بلکہ ہر چیز بھلی ہو یا بری) تیری قدرت میں ہے۔

اور سورۂ توبہ میں فرمایا گیا

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ؕ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ۞ (توبہ ع ۱۴)	کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ اور صرف اللہ ہی کی فرمانروائی اور بادشاہت ہو آسمان و زمین میں وہی زندگی دیتا ہو وہی مارتا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی تمہارا حمایتی اور مددگار نہیں ہو۔

اور سورۂ مائدہ میں ارشاد فرمایا

لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا فِيۡهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۞ (مائدہ ع ۱۶)	آسمان و زمین اور ان کے اندر کی ہر چیز کی بادشاہت اور حکومت اللہ ہی کے لیے ہو، سب پر اُسی کی فرمانروائی ہے اور ہر چیز پر اُس کی قدرت ہے۔

اور سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ کی اسی ہمہ گیر بادشاہت اور قدرت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔

لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنۡ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنۡ يَّشَآءُ الذُّكُوۡرَ ۞ اَوۡ يُزَوِّجُهُمۡ ذُكۡرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجۡعَلُ مَنۡ يَّشَآءُ عَقِيۡمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌ قَدِيۡرٌ ۞ (شوریٰ ع ۵)	اللہ ہی کی حکومت اور اسی کا راج ہو آسمانوں میں اور زمین میں، پیدا کرتا ہے جو وہ چاہتا ہو، جسے چاہتا ہو بیٹیاں دیتا ہو اور جسے چاہتا ہو بیٹے عطا کرتا ہو یا ان دونوں صنفوں ذکور و اناث کو جمع کر دیتا ہے اور رکھتا ہو جس کو چاہتا ہو بے اولاد وہ سب کچھ جاننے والا اور پوری قدرت والا ہو۔

اور سورۂ مؤمنون میں فرمایا

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَـقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِيۡمِ ۞ (مؤمنون ع ۶)	پس عالیشان اور برتر ہو وہ ہستی جو حقیقی بادشاہ ہو اسکے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں، عرش عظیم کا مالک ہے۔

اور سورۂ فاطر میں اللہ تعالیٰ کی شان اور بندوں پر اس کے انعامات تفصیل سے بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا:۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۚ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۞ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۞ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۞ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۞ (فاطر ع ۲)

یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار، صرف اسی کی بادشاہی اور اسی کا اختیار ہے، اور اس کے سوا تم جن سے دعائیں کرتے ہو اور اپنی حاجتوں میں جن کو پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے جیسی کسی حقیر سے حقیر چیز کے بھی مالک اور مختار نہیں، اگر تم ان سے دعا کرو تو وہ تمہاری دعا نہ سنیں اور اگر سن بھی لیں تو قبول نہ کر سکیں (یعنی تمہاری کاربراری نہ کر سکیں) اور قیامت کے دن وہ انکار کرینگے تمہارے اس شرک سے اور یہ باتیں نہیں بتلائے گا تم کو کوئی علیم وخبیر کی طرح اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور صرف اللہ ہی ہو جو غنی اور سب سے مستغنی ہے اور وہی لائق حمد ہے (اسے سب کچھ اختیار ہے) اگر چاہے تو تمہیں ایک دم فنا کر دے اور نئی مخلوق لے آئے، اور اللہ کے لیے یہ کچھ مشکل بات نہیں۔

اور سورۂ فرقان میں اللہ کی لاشریک حکومت و بادشاہی اور اولاد سے بھی اس کی پاکی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ

وہ اللہ جس کی بادشاہی اور جس کا راج ہے آسمان و زمین میں اور اس نے کسی

وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (فرقان ع ۱)

کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور کوئی نہیں ہو اُس کا شریک حکومت اور بادشاہت میں۔

کسی اور کے اختیار میں کچھ بھی نہیں

اور کہیں کہیں اللہ تعالیٰ کی اسی شان اور صفت کے بیان میں یہ منفی عنوان اختیار کیا گیا ہو کہ اس کی خدائی میں اس کے سوا کسی کو کچھ بھی اختیار نہیں اور کوئی بھی ہستی اس کے سوا ایسی نہیں جس کے قبضہ اور اختیار میں کچھ ہو اور جو کسی کو کچھ دے سکے یا اس سے کچھ چھین سکے ——— مثلاً سورہ احزاب میں فرمایا گیا:-

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (احزاب ع ۲)

اے نبی آپ ان مشرکوں سے کہیئے، بتاؤ وہ کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکے اگر وہ کسی بری حالت میں تمہیں مبتلا کرنا چاہے یا تمھارے ساتھ کچھ مہربانی کا ارادہ کرے، اور نہیں پا سکتے وہ اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور مددگار۔

اور سورہ فاطر میں فرمایا:-

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (فاطر ع ۱)

اللہ اپنے بندوں کے لیے جس رحمت کا دروازہ کھولے اسکو کوئی روک سکنے والا نہیں اور وہ جو کچھ روک لے اُس کو کوئی جاری کر سکنے والا نہیں سوا اس کے اور وہ زبردست اور حکمت والا ہو۔

اور سورہ انعام میں فرمایا:-

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ

اے نبی! آپ اُن سے کہئے بتلاؤ اگر اللہ

سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ
(انعام ع ۵)

تمھاری شنوائی کی طاقت اور تمھاری بینائیاں چھین لے اور تمھیں اندھا بہرا بنا دے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے (یعنی فکر و فہم کی صلاحیت سلب کر لے اور تمھاری عقلیں مسخ کر دے) تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو یہ چیزیں تمھیں دے سکے۔

اور سورۂ ملک میں فرمایا:۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ

اگر اللہ اپنا رزق روک لے اور بند کر دے تو وہ کون ہو جو تمھیں رزق دے سکے۔

پھر اسی سورۂ میں چند آیتوں کے بعد فرمایا:۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ
(ملک ع ۲)

اے نبی! ان سے کہیے بتلاؤ کہ تمھارا پانی (جو کنوؤں کی تہ سے نکلتا ہو) اگر غائب ہو جائے (یعنی اللہ اسے بالکل غائب اور معدوم کر دے) تو کون تمھارے لیے زمین کے سوتے کا پانی لا سکتا ہے۔

بحرِ ولایت کے دو آبدار موتی

خواجہ کلاںؒ خواجہ خردؒ صاحبزادگان خواجہ باقی باللہ دہلویؒ

(از، مولانا نسیم احمد فریدی فاروقی، امروہی)

مجھے تاریخ اسراریہ مولفہ سید محمد کمال سنبھلیؒ کا اقتباس ۸۰ صفحات سے زیادہ کا مورخ امروہہ مولوی محمود احمد صاحب عباسی سے دستیاب ہوا تھا ـــــ اصل کتاب تو ساڑھے پانچ سو صفحات سے زیادہ ہے ـــــ یہ کتاب گیارہویں صدی ہجری کی ایک بہترین تاریخ ہو مگر افسوس ہنوز طباعت سے آشنا نہیں ہوسکی ہے ـــــ سُنا ہے کہ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ رامپور میں ہے۔ دوسرا سنبھل میں کسی صاحب کے پاس ہے۔ تیسرا نسخہ امروہہ میں تھا جو غالباً مؤلف ہی کے زمانے کا بلکہ ان کے قلم کا لکھا ہوا تھا لیکن وہ بھی اس وقت امروہہ میں موجود نہیں ہے۔

سید محمد کمال سنبھلیؒ نسباً سادات واسطیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولایت امروہہ کی اولاد سے ہیں، ان کے آباؤ اجداد سنبھل میں سکونت پذیر ہوگئے تھے ـــــ مؤلف نے اسراریہ کے آخر میں اپنے آباؤ اجداد کے مفصل حالات بھی تحریر کیے ہیں۔

سید محمد کمالؒ ایک اچھے ادیب اور مصنف معلوم ہوتے ہیں۔ اسراریہ کے مطالعہ سے ان کی ایک اور کتاب جمع الجمیع کا پتہ چلتا ہے جو معارف و حقائق میں ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی

اور بھی تصنیفات ہوں اور وہ اسراریہ کی طرح پردۂ اسرار میں ہوں۔

صاحب اسراریہ کا طرز نگارش بڑا عجیب اور دلکش ہے بات میں سے بات نکالتے ہیں اگر اس زمانے کے کسی صاحب قلم سے ان کو تشبیہ دینا چاہوں تو وہ مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہٗ ہو سکتے ہیں۔ مولانا گیلانی کے یہاں بھی یہ لطف ہے کہ ایک بات کہہ رہے ہیں اور دوسری ضروری بات یاد آگئی اس کا ساتھ ہی ساتھ ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ اس طرح مفید معلومات کا ایک ذخیرہ ناظرین کے ہاتھ لگ جاتا ہے ــــــ اگر اسراریہ شایع ہوجاتی تو گیارہویں صدی ہجری کے رجال کی بڑی کافی معلومات مورخین زمانہ کو میسّر آجاتیں ــــــ خیر، مجھے اس وقت اس کے متعلق کچھ لکھنا نہیں ہے بات طویل ہو جائے گی ــــــ اس وقت تو حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کے صاحبزادوں کا تذکرہ کرنا مقصود ہے ــــــ اسراریہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ ہر دو صاحبزادگان کا تذکرہ درج ہو مؤلف خواجہ خرد کا براہ راست مرید اور سفر و حضر کا رفیق ہے ــــــ اسی بنا پر اس نے خصوصیت کے ساتھ خواجہ خرد کی زندگی کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے ــــــ جگہ جگہ شیخ من گفت کہہ کر اُن کے ملفوظات پیش کیے ہیں۔ ان کی دستی تحریروں کو جن میں معارف وحقائق ہیں اپنی کتاب میں بکثرت نقل کیا ہے۔ ان کے اخلاق وعادات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ ان کی چشم دید کرامات کو بیان کیا ہو۔ اپنے شیخ کی شوریدگی وجوشِ عشق کے واقعات کو بے تکلفانہ لکھا ہے ــــــ خواجہ خرد کا غلبہ عشق کے زمانے میں امروہہ میں مدتوں قیام کرنا اسی کتاب سے معلوم ہوا ــــــ وفات سے ایک سال قبل خواجہ خردؒ کی سنبھل میں تشریف آوری کا بھی اس میں ذکر ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد کمال اپنے شیخ کا صرف مرید ہی نہیں ہے، بلکہ ان کا ایک خاص مصاحب و دوست بھی ہے ــــــ ان کے دیگر حالات کے علاوہ تاریخ پیدائش، عمر، تاریخ وفات مع تفصیل ماہ و یوم اور مرض وفات کے واقعات اگر اسراریہ میں درج نہ ہوتے ــــــ تو شاید وہ کسی دوسرے ذریعہ آج معلوم نہ ہوسکتے ــــــ مجھے خوشی ہے کہ میں صاحبزادگان خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کے ضروری و اہم حالات تاریخ اسراریہ سے اخذ کرکے ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں وما توفیقی الا باللہ

میں نے خواجہ خرد کے تذکرے میں بمقابلہ اسراریہ کے اختصار سے کام لیا ہے تاکہ مضمون طویل نہ ہو جائے، البتہ خواجہ کلاں کا تذکرہ خود ہی مختصر تھا اس لیے اس میں اختصار کی ضرورت پیش نہیں آتی اس تذکرہ سے میرا مقصد اور میری امیدیں یہ ہیں:-

(۱) خواجہ خرد و خواجہ کلاں رحمہا اللہ کی تاریخی، علمی اور روحانی حیثیت بندگان خدا کے علم میں آئے۔

(۲) مورخین نے عام طور پر ان دونوں کے ناموں تک میں تغیر و تبدل کر دیا ہے بعض نے ان کے حالات بہم پہنچانے میں بے توجہی سے کام لیا ہے اور بعض سے سہواً غلطیاں ہو گئی ہیں۔ انشاء اللہ اس تذکرہ سے ان کے صحیح نام اور حالات سامنے آجائیں گے۔

(۳) مکتوبات امام ربانیؒ کے مکتوب الیہما ہونے کی حیثیت سے بھی ان دونوں صاحبزادوں کو اہمیت حاصل ہے ــــ اس وجہ سے بھی میں نے چاہا کہ ان کے حالات کو اسراریہ کی روشنی میں مرتب کر دوں تاکہ اگر کوئی آئندہ رجال مکتوبات پر کام کرنا چاہے تو اسے آسانی ہو ــــ بنا بریں اس مضمون کے بعد شیخ تاج الدین سنبھلیؒ، مرزا حسام الدینؒ اور شیخ الہدادؒ کے حالات بھی اسراریہ اور دیگر کتب کی مدد سے انشاء اللہ لکھوں گا جس کو ناظرین الفرقان خدا نے چاہا تو کسی دوسرے وقت ملاحظہ فرمائیں گے۔

اب میں اسراریہ کے پیش کردہ سوانح سے پہلے مختصراً یہ عرض کر دوں کہ ان دو برادروں کے بارے میں دیگر مورخین نے کیا لکھا ہو اور کیا کیا غلطیاں انھوں نے کی ہیں یا ہو گئی ہیں ــــ پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ سید کمال سنبھلیؒ نے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے بڑے صاحبزادے کا نام عبداللہ بتلایا ہے خواجہ کلاں ان کا لقب ہے، اور چھوٹے صاحبزادے کا نام عبید اللہ لکھا ہے یہ خواجہ خرد کے لقب سے ملقب تھے اور یہی نام صحیح ہیں اس لیے کہ ان ناموں کو خواجہ خرد کا ایک رازدار اور طویل صحبت یافتہ مورخ بتلا رہا ہے ــــ آگے آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ دوسرے مورخین نے ان دونوں کے ناموں تک میں تغیر و تبدل کر دیا ہے، یہ بھی معلوم رہے کہ یہ دونوں بھائی دو ماؤں سے ہیں مکتوبات امام ربانیؒ

زبدۃ المقامات اور ماثر الکرام سے یہ بات معلوم ہوئی تعجب ہو کہ مؤلف اسرار یہ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اسرار یہ ۱۰۶۹ھ میں تمام ہوئی اس سے پہلے ۱۰۳۷ھ میں مولانا محمد ہاشم کشمی (خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ) نے زبدۃ المقامات لکھی ہے اس کتاب میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا تذکرہ کرنے کے بعد اُن کے "فرزندان" (خلفاء) کا ذکر بھی کیا گیا ہو ـــــ فرزندوں میں پہلے خواجہ عبید اللہؒ کا ذکر کیا ہو اور لکھا ہے ـــــ نخستین فرزند دلبند حضرت خواجہ ما اند (زبدۃ المقامات صـ۶۱) یعنی خواجہ صاحبؒ کے بڑے فرزند خواجہ عبید اللہ ہیں ـــــ پھر پیدائش کی تاریخ مثنوی خواجہ باقی باللہؒ سے اخذ کر کے لکھی ہے وہ بڑے ہی بیٹے کی ہے (یعنی ربیع الاول ۱۰۱۰ھ) لیکن عنوان تذکرہ میں نام بڑے بیٹے کا نہیں چھوٹے صاحبزادے کا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کتابت کی غلطی ہو گی مگر اس کا کیا علاج کہ مولانا محمد ہاشمؒ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ خواب میں خواجہ صاحبؒ نے دیکھا تھا کہ ایک درویش کہہ رہے ہیں کہ ایک پسر حمیدہ سیر پیدا ہو گا اس کا نام خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے نام پر عبید اللہ رکھنا ـــــ یہ بھی لکھا ہے کہ مثنوی میں خواجہ صاحبؒ نے اسکا ذکر کیا ہو پھر مثنوی کے اشعار جو پیش کیے ہیں ان سے کہیں یہ بات معلوم نہیں ہوتی۔

میرے سامنے مثنوی خواجہ باقی باللہؒ (مطبوعہ محمودی پریس دکن) کا جو نسخہ ہو اس میں ان اشعار کے اوپر یہ عنوان ہے ـــــ تاریخ تولد برخوردار خواجہ محمد عبد اللہ و خواجہ عبید اللہ کہ در یکسال تولد شدند" ـــــ اس میں ترتیب اسماء صاف بتلا رہی ہو کہ بڑے صاحبزادے خواجہ عبد اللہ ہیں نہ کہ خواجہ عبید اللہ ـــــ پھر عبید اللہ کی تصغیر بھی اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ عبید اللہ پسر دوم ہیں نہ کہ پسر نخستین۔

زبدۃ المقامات میں آگے چل کر دوسرے صاحبزادے کا تذکرہ ہے اس کا عنوان ہے "خواجہ عبد اللہ سلمہ" اس کے ماتحت لکھا ہے ـــــ فرزند دوم حضرت خواجہ ما اند ـــــ وہی مقلوب دبر عکس بات ـــــ اسی پر اکتفا نہیں (ورنہ کاتب بیچارے کے ذمے بات آتی) آگے فرماتے ہیں:۔

برادر بزرگ از ما در دیگر اند و ایشاں از والدہ دیگر ـــــ عبد اللہ کو وہ برادر خرد مان کر

پہلے جن صاحبزادہ کا ذکر کیا ہے اور جن کا نام عبیداللہ بتلایا ہے ان کو برادر بزرگ قرار دے رہے ہیں۔
اور یہ بھی آپ پڑھ چکے کہ مولانا کشمی ؒ کے نزدیک فرزند اول وہ ہیں جو خواجہ احرار کے ہم نام ہیں، اب کوئی اشتباہ یا کاتب کے سر دھرنے والی بات نہیں رہی ـــــ مولانا کشمی ؒ نے خود ہی سوچ سمجھ کر ایک بات لکھی ہے جو ظاہر ہو چکی ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں کی عمروں میں کم تفاوتی کے باعث مولانا کشمی ؒ اسم و مسمّٰی میں مطابقت نہیں کر سکے ہیں ـــــ ایک صاحبزادے کی ملاقات کا ذکر تو مولانا کشمی ؒ نے کیا ہے، دوسرے صاحبزادے سے بھی ایک آدھ بار ملاقات ممکن ہو کہ ہوئی ہو۔

صاحب زبدۃ المقامات ۱۰۳۱ھ میں درگاہ مجدد الف ثانی ؒ میں باریاب ہوئے ہیں اور عتبہ عالیہ پر دونوں صاحبزادوں کے قیام پذیر رہنے کا زمانہ ۱۰۳۱ھ سے کچھ پہلے ہی ہو ـــ ایسی صورت میں ناموں میں تغیر و تبدل ہونا کچھ بعید نہیں ہے۔ البتہ دونوں بھائیوں کا جو کچھ تذکرہ کیا ہے وہ مجموعی حیثیت سے پُر از معلومات ہے۔ اور اس میں چند باتیں وہ ہیں جو اسراریہ میں نہیں ہیں۔ لیکن چوں کہ وہ اسم کو مسمّٰی سے مطابق نہیں کر رہے ہیں اس لیے ہر واحد کے تذکرے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے جو معلومات عبداللہ کے ضمن میں لکھی ہیں وہ عبیداللہ کی ہوں اور جو عبیداللہ کے بارے میں لکھی ہیں وہ عبداللہ کی ہوں۔
چنانچہ خواجہ عبداللہ ؒ کو صاحبزادۂ دوم قرار دیتے ہوئے ان کی ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے جو خواجہ عبیداللہ کی ہے اور جس کو تفصیل سے اسراریہ میں دیکھا جا سکتا ہے وہ خصوصیت "شوریدہ حالی و نسبت توحید وجود" ہے ـــــ مولانا کشمی ؒ نے لکھا ہے کہ اشعار پرسوز میخوانند و آہ گرم و سرد از دل پر درد می آرند و خود اشعار زیبا می فرمایند ـــــ (ملاحظہ انتساب خود بحضرت ایشاں (حضرت مجدد الف ثانی ؒ) تخلص در آں احمدی می نمائند ـــ یہ بات صاحب اسراریہ نے کبھی نہیں تبلائی کہ اُن کے پیر و مرشد کا تخلص احمدی تھا۔
صاحب زبدۃ المقامات فرماتے ہیں کہ ان چھوٹے صاحبزادے نے (جن کو وہ عبداللہ ؒ سمجھے ہوئے ہیں اور در اصل ہیں وہ عبیداللہ ؒ) مجھے یہ شعر فی البدیہہ سُنایا:۔

گشتِ گلستاں بہانہ ایست نگار را
بوئے تو آوارہ کردہ بادِ صبا را

اور پھر میری طرف اشارہ کیا کہ تم بھی اس زمین میں کچھ کہو چنانچہ میں نے دو شعر کہے، مولانا کشمیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی مرتبہ زبان مبارک سے ان مخدوم زادہ عالی شان کی تعریف فرمائی ہے ایک مرتبہ فرمایا —— "کہ او از محمدی المشربان است و از مجوبان است و از مغلوبان نسبت توحید و از خنداوندان آزادگی و تفرید"۔

مولانا کشمیؒ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مجدد صاحبؒ نے فرمایا کہ ان خواجہ زادہ میں (خواجہ عبید اللہؒ جن کو مولانا کشمیؒ خواجہ عبد اللہ لکھتے ہیں) اگر کمالِ وسعت مشرب و شورید حالی اور بے تقیدی نہ ہوتی تو —— "ایشانرا اجازت تعلیم طریقت میدادیم تا بر سجادہ والد بزرگوار خود نشستہ بافادہ و افاضۂ طلاب پرداختند"۔

یعنی میں اُن کو اجازت[1] تعلیمِ طریقت دیدیتا تاکہ یہ اپنے والد ماجد کے سجادہ نشین ہو کر افادہ طالبین میں مشغول ہوتے۔

مجھے یہاں پر زبدۃ المقامات میں صرف اتنا ہی لکھنا تھا کہ صاحب زبدہ نے دونوں صاحبزادوں کے نام متعین کرنے میں غلطی کی ہے اور ایک کے حالات کو دوسرے سے ملا دیا ہو کل واقعات کا نہ احاطہ مقصود تھا نہ اس مضمون میں اس کی گنجائش ——

---

[1] صاحب اسراریہ نے لکھا ہو کہ خواجہ عبید اللہؒ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے دوسری حاضری کے بعد اپنے دست مبارک سے اجازت نامہ لکھ کر دیا ہے —— اسراریہ کے الفاظ یہ ہیں۔ پس از صحبت دوم اجازت ارشاد طریقہ نقشبندیہ بدست خود نوشتہ بوے داد —— اس کی تائید الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ خرد —— حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دادا پیر ہیں۔ خود شاہ صاحبؒ سلسلہ طریقت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ عن خواجہ خرد عن الشیخ احمد السرہندی (الانتباہ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی ص۲۰) مولانا کشمیؒ نے حضرت مجددؒ کا جو ارشاد نقل فرمایا ہو وہ اس اجازت سے پہلے کا ہوگا۔

اب میں مکتوبات امام ربانیؒ کی جانب ناظرین کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں تاکہ وہ صاحبزادگان کے نام کے مکاتیب سے اُن کے صحیح مقام و رفعت شان اور خصوصیات کا پتہ چلا سکیں ــــ مکتوبات کی ہر سہ جلد میں دونوں صاحبزادوں کے نام حسب ذیل مکتوبات ہیں:۔

(۱) مکتوب ۲۶۶ بنام خواجہ عبد اللہ و عبید اللہ در بیان بعضے از عقائد کلامیہ — جلد اوّل
(۲) مکتوب ۲۳ بنام خواجہ محمد عبد اللہ در بیان اتباع سنت — جلد ثانی
(۳) مکتوب ۲۵ بنام پیرزادہ محمد عبد اللہ در جواب استفتاء — " "
(۴) مکتوب ۵۹ " " " " — " "
(۵) مکتوب ۵۶ بخواجہ محمد عبد اللہ در تاسف بر صحبت گزشتہ — جلد ثالث
(۶) مکتوب ۶۰ " " — " "
(۷) مکتوب ۷۱ بہ محمد عبید اللہ — " "

وہ مکتوبات جن میں صاحبزادگان کا ذکر آیا ہے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جلد اوّل مکتوب ۲۲۹ بنام مرزا حسام الدینؒ
(۲) " " مکتوب ۲۶۷ " " "
(۳) " " مکتوب ۲۷۳ " " "
(۴) جلد ثانی مکتوب ۲۶ " " "
(۵) جلد ثالث مکتوب ۱۱۵ " " "

میں نے جہاں تک تفحص کیا ہے مندرجہ بالا مکتوبات میں خواجہ زادگان کا ذکر پایا ہے ممکن ہے ان کے علاوہ کسی اور مکتوب میں بھی کہیں ضمنی ذکر ہو۔

ان مکتوبات میں جو خواجہ زادگان سے متعلق ہیں کیا کیا مضامین ہیں یہ چیز ایک علیحدہ مضمون چاہتی ہے، حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باکمال خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ "ہمارے لڑکوں کا خیال رکھنا اور اُن سے باخبر رہنا" ــــ یہ دونوں صاحبزادے

ابھی شیر خوار ہی تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کا وصال ہو گیا ـــــ پیرزادگان کی حیثیت سے اور بالخصوص وصیت مرشد کے پیش نظر حضرت مجدد صاحبؒ نے تمام عمر ان دونوں صاحبزادوں کا خیال رکھا ـــــ اپنے یہاں ان دونوں صاحبزادوں کو رکھا ـــــ جب یہ صاحبزادے دہلی چلے گیے تو وہاں ان کی تربیت مرزا حسام الدینؒ کی زیر نگرانی ہوئی ـــ حضرت مجدد صاحبؒ جہاں صاحبزادگان کو ضروری ضروری ہدایات تحریر فرماتے ہیں وہاں مرزا حسام الدینؒ کو بھی نگہداشت کی تاکید فرماتے ہیں ـــ سرہند میں بیٹھے ہوئے ہیں اور صاحبزادگان کو صحت عقائد و اعمال صالحہ اور اتباع سنت کی برابر تلقین فرما رہے ہیں ـــ کوئی بات خلاف سنت یا خلاف مسلک خواجہ باقی باللہؒ سُن پاتے ہیں تو اس پر زوردار تنبیہ فرماتے ہیں ـــ پیرزادگان کو کس تعظیم اور کیسی محبت اور شفقت سے خطاب فرماتے ہیں اس کا اندازہ ان مکتوبات کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے ـــ بعض مکتوبات میں صحبت گزشتہ پر تاسف فرمایا ہے ـــ یہ بھی ظاہر فرمایا ہے کہ جب تم دونوں دودھ پیتے تھے اس وقت میں نے تم پر توجہ باطنی ڈالی ہے ـــــ مرزا حسام الدین کا شکریہ ادا فرماتے ہیں کہ آپ نے صاحبزادگان کی تربیت کا کام اپنے ذمہ لے کر ایک گونہ اطمینانی صورت پیدا کر دی ہے ـــ اور مرزا حسام الدین کو اس امر کی جانب بھی متوجہ فرماتے ہیں کہ وہ بعض خلاف مسلک امور کی روک تھام سختی سے کریں۔

جلد اوّل میں مکتوب ۲۶۶ بنام صاحبزادگان گویا ایک مستقل رسالہ ہے اس کو عقائد نامہ کے ساتھ موسوم کیا جائے تو بہتر ہے، یہ مکتوب چھبیس صفحات پر مشتمل ہے ـــ اس مکتوب کے آخر میں تحریر فرمایا ہے "چونکہ فقیر کو دہلی آنے میں توقف ہوا اسلیے یہ تحریر بھیجدی ہے۔ اس مکتوب کو بطور سبق مرزا حسام الدین صاحب کے سامنے از اوّل تا آخر پڑھ لینا والسلامؒ مرزا حسام الدین صاحبؒ کو علیحدہ ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں۔

"وہ خط جو خواجہ زادگان کو لکھا گیا ہے نظر اشرف سے گزرے گا"

اس موقع پر اتنی بات اور عرض کر دوں کہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے

اپنی مشہور فقہی کتاب مالا بدمنہ کے شروع میں عقائد کی جو بحث کی ہے اس کا زیادہ تر حصہ اسی مکتوب سے ماخوذ ہے ـــــ قاضی صاحب عبارتیں کی عبارتیں اختصار وخلاصہ کے ساتھ اس مکتوب کی لائے ہیں ـــــ مالا بدمنہ کا یہ حصہ اس مکتوب کی روشنی ہی میں پوری طرح سمجھ میں آسکتا ہے اسی مکتوب کے بارے میں حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ نے فرمایا ہو کہ:۔

"ایں مکتوب فائدہ کثیر در علم عقائد دارد ایں را علحدہ نوشتہ بمردماں دادہ شود"

(درالمعارف ص۲۰۱)

یعنی یہ مکتوب علم عقائد میں فائدہ کثیر رکھتا ہے اس کی نقلیں کراکے لوگوں میں تقسیم کیجائیں"۔

صاحب زادگان کے ناموں میں مطبوعہ مکتوبات کے اندر ایک دو جگہ جو اور غلطیاں کاتبوں سے ہوگئی ہیں اُن کو اور ظاہر کردوں ـــــ مکتوبات مطبوعہ مطبع احمدی دہلی جلد ثالث کی فہرست میں "مکتوب ہفتاد و دوم بہ محمد عبداللہ" لکھا ہے اور ص۱۱ پر جہاں یہ مکتوب درج ہو اس کے سرنامے پر لکھا ہے "بجناب پیرزادہ خواجہ محمد عبید اللہ" ـــــ اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ خواجہ خرد (خواجہ عبید اللہؒ) کی طبیعت کا جو انداز ہو اس کے پیش نظر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کا سوال حضرت مجددؒ سے وہی کرسکتے ہیں۔

مکتوبات مطبوعہ امرتسر میں مکتوب ۲۵ جلد ثانی ص۶۰ پر خواجہ محمد عبداللہ کے نام پر جو حاشیہ ہے اس کی عبارت یہ ہو ـــــ "فرزند دلبند دوم حضرت خواجہ باقی باللہؒ" یہ وہی غلطی ہو جو اوپر سے ہوتی چلی آرہی ہے۔

اب ذرا مآثر الکرام مصنفہ علامہ آزاد بلگرامیؒ کی سیر اور کرلیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"خواجہ عبید اللہ المشہور بہ خواجہ کلاں قدس سرہٗ" ـــــ "خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خرد قدس سرہٗ" ـــــ یہاں پر بھی اسماء میں عکس ہوگیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ماقبل کے بعض مورخین نے ان کے اسماء میں ایسا کیا ہے ـــــ علاوہ ازیں علامہ آزاد بلگرامی جن صاحبزادے کو خواجہ کلاںؒ بتلا رہے ہیں ان کی تاریخ وفات ۱۰ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۰۷۴ھ لکھی ہے حالانکہ سنہ ۱۰۷۴ھ خواجہ خردؒ

کی تاریخ وصال ہے، خواجۂ کلاں کا انتقال سنہ ۱۰۴۳ھ میں ایک سال پہلے ہوا ہے جیسا کہ آگے اسرار یہ سے معلوم ہوگا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مآثر الکرام میں خواجہ خُردؒ کی پیدائش رجب سنہ ۱۰۱۰ھ میں بتلائی ہے (جو صحیح ہے) اور سن وفات سنہ ۹۷۵ھ لکھا ہے پھر لفظوں میں بھی خمس وسبعین وتسعمأۃ لکھ دیا ہے، جس کے بعد کاتب کی غلطی قرار نہیں دی جا سکتی ــــــ علامہ آزاد نے خواجہ خُرد کے تذکرہ میں لکھا ہے در ماہ وتاریخ انتقال پدر بزرگوار یعنی بست وپنجم جمادی الآخرہ روز چہار شنبہ...... برحمت الٰہی پیوست ــــــ اس میں دن تو وہی ہے جو سیّد کمال سنبھلیؒ نے بتلایا ہے لیکن ماہ وتاریخ ۲۵ جمادی الاولیٰ ہے نہ کہ ۲۵ جمادی الثانیہ ــــــ سیّد کمالؒ نے اپنے پیر ومرشد کی عمر کا حساب لگا کر سال، ماہ کے ساتھ ساتھ دن بھی بتلا دیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن سے زیادہ معتبر کسی دوسرے مورخ کا قول اس بارے میں نہیں ہو سکتا۔

صاحب مآثر الکرام نے بلگرام کے ایک محدث سیّد محمد مبارک بلگرامی کے تذکرے کے ضمن میں بھی خواجہ خرد کا تذکرہ کیا ہے جس سے خواجہ خُرد کے شغلہ درس اور علمی بلند پاگی کا پتہ چلتا ہے وہ لکھتے ہیں ــــــ کہ یہ میر سید محمد مبارک سنہ ۱۰۱۱ھ میں اکتساب علم کے ارادہ سے دہلی تشریف لے گیے وہاں مطول تفتازانی ــــــ خواجہ عبداللہ المشہور بخواجہ خُرد بن خواجہ باقی باللہ نقشبندی قدس اللہ اسرارہما سے پڑھی" ــــــ یہاں بھی نام صحیح نہیں بتلایا لیکن انہوں نے متعین کر دیا کہ سید محمد مبارک محدث بلگرامیؒ کے استاذ خواجہ عبید اللہ عرف خواجہ خُردؒ تھے ــــ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں تحریر فرمایا ہے "اس فقیر کو صحبت، بیعت، تلقین اشغال واجازت وخرقہ کی جہت سے ارتباط اپنے والد سے ہے جن کا نام نامی شیخ عبد الرحیم قدس سرہ ہے اور حضرت والد کو مشائخ طریق میں سے چار اشخاص سے یہ ارتباط ہے۔

(۱) سیّد عبد اللہ (۲) میر ابو القاسم اکبر آبادی (۳) خواجہ خُرد (۴) میر نور العلی خلف میر ابو العلیٰ یہ

اس مقام پر حضرت شاہ صاحب نے خواجہ خرد کے لقب پر اکتفا فرمایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو صاحبزادگان اپنے القاب کے ساتھ شہرت رکھتے تھے اس لیے علامہ بلگرامیؒ نے جن صاحبزادہ کو سید محمد مبارک محدثؒ کا اُستاد تبلایا ہے ان کے لقب خواجہ خُرد کو صراحۃً ذکر کر دیا ہے ــــ نام میں غلطی ہے سوزہ اوروں سے بھی ہوئی ہے۔

اب آپ کے سامنے انوار العارفین مولفہ صوفی محمد حسین مرادآبادیؒ کو پیش کرتا ہوں۔ وہ خواجہ باقی باللہ کے بن خواجہ محمد عبد اللہ کا ذکر کرتے ہیں بایں الفاظ ــــ ذکر خواجہ محمد عبد اللہ کہ بخواجہ کلاں اشتہار دارند ــــ آگے فرماتے ہیں کہ ــــ در رشحات است فرزند نخستین حضرت خواجہ عبید اللہ احرار بودند ــــ دیکھئے صاحب انوار العارفین نے کیا کمال کیا ہے کہ حضرت باقی باللہ کے ذکر سے متصل خواجہ کلاں کا ذکر لاتے ہیں اور رشحات کے حوالہ سے نقل کر جاتے ہیں کہ یہ خواجہ عبید اللہ احرار کے صاحبزادے تھے ــــ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو سرے یہ علم ہی نہیں ہے کہ خواجہ کلاں حضرت خواجہ باقی باللہ کے بھی کوئی صاحبزادے تھے ــ

مزارات اولیاء دہلی کے مولف کی "تحقیق" ان صاحبزادگان کے بارے میں اور ملاحظہ فرمایئے۔ خواجہ کلاں کے متعلق لکھتے ہیں ــــ "آپ فرزند اکبر خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں آپ کے علم باطنی و حصول خلافت کے حالات ہم کو کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوئے بہرحال بزرگ و بزرگ زادہ تھے، سن وفات آپ کا معلوم نہیں ہوا۔" (ص۱۰۶)

خواجہ خُرد کے متعلق لکھتے ہیں ــــ "آپ فرزند اصغر خواجہ محمد باقی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں آپ دونوں صغیر سن تھے جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا .... آپ نے ۱۰۷۲ھ میں عہد شاہجہاں بادشاہ انتقال فرمایا۔" ص ۱۰۷ اور ۱۰۸

سبحان اللہ کیا داد تحقیق دی ہے ــــ خواجہ کلاں و خواجہ خُرد کے نام تک نہیں تبلائے۔ بڑے صاحبزادے کے نہ حصول خلافت کا حال معلوم، نہ سن وفات کا پتہ اور چھوٹے صاحبزادہ کا سن وفات معلوم بھی ہوا تو وہ بجائے ۱۰۷۴ھ کے ۱۰۴۲ھ۔

آخر میں "ہند و پاکستان کے اولیاء" مولفہ شوکت فہمی کی "اعلیٰ تحقیقات" اور ملاحظہ فرمایئے

اس کے بعد اسرار یہ کو پیش کیا جائے گا۔

حضرت کی روحانی اولاد یعنی خلفاء کے علاوہ حضرت کی جسمانی اولاد میں حضرت کے دو صاحبزادے تھے جن میں بڑے صاحبزادے خواجہ عبید اللہ تھے جو علوم باطنی اور ظاہری دونوں سے مالا مال تھے آپکے دوسرے صاحبزادے محمد عبد اللہ تھے جو خواجہ عبید اللہ سے چار ماہ چھوٹے تھے اور حضرت کی دوسری حرم محترم کے بطن سے تھے آپ بہت بڑے عالم ہوئے ہیں اور غیر معمولی ذوق تصوف رکھتے تھے ——

صاحبزادہ محمد عبد اللہ زمانۂ دراز تک حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پاس رہ کر روحانی کمالات سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں اور آپ کو راہ سلوک میں ایک خاص درجہ حاصل تھا۔ (ص ۱۰۶ ذکر خواجہ باقی باللہ)

آپ نے دیکھا یہاں بھی وہی ایک بات کہی گئی ہے —— اور اتنی اہم شخصیتوں کا ذکر چھیڑ کر سوائے لفظوں کے کسی قسم کی زحمت برداشت نہیں فرمائی گئی ——

آئیے اب اسرار یہ کی روشنی میں ان دونوں صاحبزادوں کے حالات کا مطالعہ کیجئے:۔

ذکر خواجہ عبد اللہ المعروف خواجہ کلاں

آپ خواجہ باقی باللہؒ کے صاحبزادے ہیں آپنے خواجہ حسام الدینؒ کی صحبت پائی تھی علوم ظاہری و باطنی کے عالم تھے اُن کے اخلاق بہت اونچے اور فضائل و کمالات بیش از حوصلۂ بیان ہیں —— آپکے قلم سے تصانیف عالیہ نکلی ہیں —— منجملہ تصنیفات کے ایک تصنیف طبقات حسامی ہے جو کہ اپنے شیخ (شیخ حسام الدینؒ) کے نام سے موسوم کی ہے اور تھوڑی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہونچائی ہے —— اس میں بہت سے اسرار و حقائق اور مختلف مشائخ سلاسل کے حالات شرح و بسط سے لکھے ہیں اگر اس کتاب میں سے فقط مشائخ جمیع سلاسل کے حالات جدا کر لیے جائیں تو چند جلدیں ظہور میں آ جائیں۔ یہ کتاب تمام سلسلہ والوں کو کافی ہے (صاحب اسرار یہ کہتے ہیں) ایک دن خواجہ کلاں نے مجھ کو اپنے پاس بلایا اور از راہ لطف و کرم اس کتاب کو دکھلایا اس کی ضخامت[1] دیکھ کر عقل حیران

---

[1] غالباً اسی کتاب کے متعلق علامہ بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے۔ "تذکرہ مشائخ متقدمین یک لک بیت تالیف کردہ" (مآثر الکرام ص ۵۸ ذکر خواجہ کلاں) خدا معلوم یہ کتاب اب بھی کسی جگہ محفوظ ہے یا نہیں؟

ہوتی تھی میں اُس کو دیکھ کر بیحد خوش ہوا۔

وہ ہمیشہ زاویۂ ہمت و استقامت میں ثابت قدم رہے۔ کرم و سخاوت اُن کی ذاتی صفت ہے اور طریق غربت و شکستگی اُن کا اعلیٰ شیوہ۔

میرے شیخ (خواجہ خُرد) نے فرمایا کہ خواجہ بزرگ کے وصال (۲۵ رجمادی الثانیہ سنہ ۱۰۱۲ھ) کے وقت اُن کی عمر دو سال چار ماہ کی تھی۔[۲]

شیخ محمد ہاشم کشمی نے ذکر کیا کہ خواجہ بزرگ (خواجہ باقی باللہ) فرمایا کرتے تھے کہ اس لڑکے کو ہم سے ایک چیز پہونچی ہے — (از ما چیزے بوے رسیدہ است)

بعد اتمام اسرار یہ ۱۰ رجمادی الثانیہ سنہ ۱۰۴۳ھ کو خواجہ کلاںؒ دنیا سے سدھار گیے۔ اُن کی قبر اُن کے شیخ خواجہ حسام الدین احمد کی قبر کے قریب ہے۔

میرے شیخ (خواجہ خُرد) اس سال (سنہ ۱۰۴۳ھ) میں سنبھل تشریف لائے تھے ایک ماہ اور ایک روز غریب خانے پر قیام فرمایا —— سنبھل سے واپسی پر دہلی میں شیخ منوّر بن شیخ عنایت اللہ (جو کہ جوان صالح اور شیخ الہدیہ کے پوتوں میں سے ہیں) کے گھر میں رات کو فروکش ہوئے اتفاقاً اس رات کو زینے کی کمی کی بنا پر اُن کے پاؤں کو صدمہ پہونچا اور اسی رات کو خواجہ کلاںؒ چل بسے۔

بنا بریں میرے شیخ نے مجھ کو ایک مکتوب گرامی میں یہ جملہ تحریر فرمایا —— سبحان اللہ ہم پائے ما شکست و ہم بازوئے ما —— یعنی قضا و قدر نے میری ٹانگ بھی توڑ دی اور میرا بازو بھی توڑ دیا۔

---

[۲] علامہ بلگرامیؒ نے ان کی تاریخ پیدائش غرہ ربیع الاوّل سنہ ۱۰۱۰ھ لکھی ہے اور یہی تاریخ مثنوی باقی باللہؒ سے معلوم ہوتی ہے۔

نے خواجہ کلاں کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ لکھا ہے:۔

چو رفت خواجہ عبد اللہ از سرائے فنا　　　کدام دیدہ ز مژگاں کہ دُرّ اشک نُسفت

ہزار جاں بفراقش چو گل گریباں چاک　　　ہزار دل ز جدائیش ہمچو زلف آشفت

کمال از پے سالِ وصال آں خواجہ　　　چوں فکر کرد ـــــ بشد آں خواجہ کلاں بگفت

۱۰۲۳ھ

باقی آئندہ

قادیانی فتنہ

سنہ رواں کے پہلے اور دوسرے شمارہ میں ایک بالکل اتفاقی ضرورت سے قادیانیت کے متعلق کچھ لکھنا پڑا تھا، اور واقعہ یہ ہے اس وقت جو تھوڑا سا وقت اس پر صرف ہوا تھا اور الفرقان کے جو چند صفحات اسکے لیے استعمال ہو گئے تھے اس سے طبیعت پر ایک گونہ گرانی تھی، بہرحال صرف احساس ضرورت کے ماتحت اپنا وہ وقت اور الفرقان کے وہ صفحات بادل ناخواستہ اس مصرف میں صرف کر دیئے گئے تھے اور آئندہ اس موضوع پر کچھ اور کہنے کا بالکل ارادہ نہ تھا — یہاں تک کہ ان دونوں مضمونوں کو پڑھ کر پاکستان کے ایک مشہور اور محترم ذی علم دوست نے جب اس عاجز کو لکھا کہ ان مضمونوں سے یہاں بہت فائدہ ہوا اس لیے الفرقان میں یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہنا چاہیئے تو میں نے ان کو جواب میں لکھ دیا کہ چونکہ بفضلہ تعالیٰ یہاں سے (ہندوستان سے) یہ فتنہ بالکل ختم ہو چکا ہو اسلیئے اب اس موضوع پر لکھنے کے لیے دل میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی، یہ جو کچھ لکھا گیا یہ بھی خاص ضرورت کے ماتحت طبیعت پر جبر کر کے لکھ سکا ہوں — بہرحال ان دوست کو اس وقت یہی جواب لکھ دیا اور ان کی فرمائش کی تعمیل سے معذرت کر دی۔

لیکن چند ہی روز کے بعد یہ چیز علم میں آئی کہ چند مہینے سے قادیانیت کی تبلیغ کا کام ہندستان میں پھر از سر نو شروع ہو گیا ہو اور قادیانی مبلغین مختلف علاقوں میں پھر رہے ہیں — غالباً اس کی وجہ یہ ہو گی کہ پاکستان میں قادیانیت کے خلاف عام مسلمانوں کی جو تحریک چل رہی ہو اس کی رفتار نے پاکستان میں قادیانیت کے مستقبل کو تاریک کر دیا ہے ....

...... اور جن امیدوں کے ساتھ قادیانیت کا مرکز ہندستان سے پاکستان منتقل کیا گیا تھا اس تحریک نے بظاہر ان کے امکانات بالکل ختم کر دیئے ہیں۔

اور یہاں کا حال یہ ہو کہ چونکہ گزشتہ قریباً ۱۰-۱۲ سال سے اس سلسلہ میں خاموشی رہی ہے اس لیے

بہت سے پڑھے لکھوں کو خاص کر نوجوانوں کو بالکل معلوم نہیں ہے کہ قادیانیت کیا بلا ہے اور اس کے بارے میں غور کرنے کا طریقہ کیا ہے — حتیٰ کہ اس دور میں دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر جو فضلا نکلے ہیں اپنا اندازہ ہے کہ ان میں سے بھی اکثر قادیانیت سے اس درجہ کی واقفیت نہیں رکھتے ہوں گے جتنی کہ مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے — اور قادیانی مبلغین کا طریقہ کار اسی قدر پر فریب ہوتا ہے کہ ناواقف آدمی خاص کر کالجوں سے نکلے ہوئے نوجوان بڑی آسانی سے ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اتفاق سے جنوری میں اس عاجز کو کانپور میں ایک نجی مجلس میں قادیانیت پر ایک گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا جس میں میں نے صرف یہی بتلایا تھا کہ مرزا غلام احمد صاحب کو جانچنے کا اور قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا اور آسان راستہ کیا ہے؟ جس سے ہر عامی سے عامی بھی ان کو جانچ پرکھ سکے۔ بعد میں اس گفتگو کو قلمبند کر کے شایع کر دینا بھی مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوا اور الفرقان کے اسی شمارہ میں اس کو شایع بھی کیا جا رہا ہے — اگرچہ اس قسم کے کسی موضوع سے بھی اب کوئی دلچسپی نہیں ہے اور غالباً الفرقان کے بہت سے ناظرین کا حال بھی یہی ہو گا لیکن دین کی راہ میں بسا اوقات بہت سے ایسے غیر دلچسپ اور ذوق و طبیعت کے لیے ناخوش گوار کام بھی کرنے پڑتے ہیں اور یہ بھی مجاہدہ کی ایک قسم ہے۔ وانما الاعمال بالنیات ولکل امرئ ما نوی

اس گفتگو کے لب و لہجہ میں بھی ناظرین کو بعض مقامات پر شاید کچھ غیر متوقع قسم کی سختی محسوس ہو لیکن اس کے لیے یہ عاجز کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا جو شخص مرزا غلام احمد اور ان کی امت کے بارہ میں وہ جانتا ہو جو یہ عاجز جانتا ہے اس کی گفتگو میں اگر ان لوگوں کے بارہ میں کچھ سختی ہو جائے تو دوسروں کو اس کو معذور سمجھنا چاہیے۔

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

محمد منظور نعمانی

جنوری کے دوسرے ہفتہ میں کانپور سے ایک نوجوان اس عاجز کے پاس آئے اور انھوں نے بتلایا کہ اُن کے بعض عزیز قادیانی ہیں ۔۔۔ اور وہ دوسرے عزیزوں اور قرابتداروں سے بھی اس سلسلہ میں باتیں کرتے ہیں جس کی وجہ سے اور لوگوں کے بھی گمراہ ہونے کا خطرہ ہے ۔۔۔ انھوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اُن کے ساتھ چل کر انھیں سمجھانے کی کوشش کروں ۔۔۔ میں نے ان سے کہا کہ جب آدمی کسی عقیدہ اور مذہب کو اختیار کر لیتا ہے اور لوگوں کو عام طور سے اس کے متعلق یہ بات معلوم ہو جاتی ہے تو میرا عام تجربہ اور اندازہ یہ ہے کہ پھر وہ ایک طالب اور متلاشیٔ حق کی طرح سوچنے پر تیار نہیں ہوتا اور کسی بات پر انصاف اور سچائی کے ساتھ غور نہیں کرتا بلکہ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اس کے عقیدہ اور مذہب کے خلاف خواہ کیسی ہی روشن دلیلیں پیش کر دی جائیں لیکن وہ ان سے اثر نہیں لیتا اور اپنی بات پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے آپ کے جو عزیز قادیانیت اختیار کر چکے ہیں ان سے تو مجھے کوئی خاص امید نہیں لیکن جو لوگ ابھی قادیانی ہوئے نہیں ہیں اور وہ غور کرنا چاہتے ہیں انشاء اللہ ان کے لیے میرا بات کرنا مفید ہوگا ۔۔۔ بہرحال میں اُن صاحب کے ساتھ کانپور چلا گیا۔ اور ایک مختصر سی مجلس میں جس میں غالباً ۱۰ ــ ۱۲ حضرات ہوں گے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا میں نے مناسب سمجھا تھا کہ اس موقع پر قادیانیت کے متعلق ایک اُصولی گفتگو کر دوں اور اس تحریک

کے بارہ میں غور کرنے کا میرے نزدیک جو صحیح، سیدھا اور آسان راستہ ہے بس اسی کو اس موقع پر پیش کروں ——— اس مقصد کے لیے میں نے خود مرزا غلام احمد قادیانی کی دو چار کتابوں کا ساتھ رکھ لینا کافی سمجھا تھا اور وہ میرے ساتھ تھیں۔

جو گفتگو اس عاجز نے اس مجلس میں کی وہ بحث و مناظرہ کے طرز کی نہ تھی اور اس کی نوعیت وعظ و تقریر کی بھی نہ تھی بلکہ ایک مجلسی گفتگو تھی جس کا مقصد جیسا کہ عرض کیا صرف یہی تھا کہ جو لوگ قادیانیت کے بارہ میں غور کرنا چاہیں ان کے سامنے صحیح طریقہ اور سیدھا راستہ آجائے ——— اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا فضل ہے کہ اس نے قادیانیت کی حقیقت اور قادیانیوں کی گمراہی کو سمجھنا ہر اس شخص کے لیے بڑا آسان کر دیا ہے جو نیک نیتی اور ایمان داری سے سمجھنا چاہے اور اس کے لیے صحیح اور سیدھا راستہ بھی اختیار کرے، نہ اس کے لیے بڑے علم کی ضرورت ہو اور نہ بڑی ذہانت کی، بلکہ معمولی سے معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی اگر سمجھنا چاہے تو بفضلہ تعالیٰ خوب سمجھ سکتا ہو۔

چونکہ مختلف مقامات سے اس کی اطلاعات مل رہی ہیں کہ قادیانی تحریک جو ملک کی تقسیم کے بعد سے ہندستان میں ختم سی ہو چکی تھی اب پھر اُس کو زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہو اور ادھر چند مہینوں سے قادیانی مبلغین کچھ سرگرمی دکھا رہے ہیں اس لیے یہ مناسب معلوم ہوا کہ جو کچھ اس عاجز نے اس مجلس میں کہا تھا اس کو الفرقان میں بھی شایع کر دیا جائے تاکہ قادیانیت کے بارہ میں غور کرنے کا یہ صحیح اور سیدھا اور مختصر طریقہ زیادہ سے زیادہ عام مسلمانوں کے علم میں آجائے اور اس نئے مذہب کی حقیقت کو سمجھنا سمجھانا لوگوں کے لیے آسان ہو جائے۔

جیسا کہ پہلے بھی الفرقان کی ایک قریبی ہی اشاعت میں لکھا جا چکا ہے، پروفیسر الیاس برنی نے (اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے) "قادیانی مذہب" لکھ کر قادیانیت کے سلسلہ میں کچھ لکھنے کی ضرورت کو میرے نزدیک ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے اور یہ عاجز اب اس سلسلہ میں کسی تحریر یا تصنیف کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتا ——— لیکن یہ گفتگو چونکہ بہت مختصر ہونے کے ساتھ اپنے مقصد کے لیے انشاء اللہ

بالکل کافی وافی ہے، اس لیے اس کو شایع کر دینا مفید معلوم ہوا ——— امید ہو کہ اس کی روشنی میں غور کر کے ہر شخص یہ جان سکے گا کہ قادیانیت کتنی غلط اور مہمل چیز ہے اور کسی شخص کا قادیانی ہونا اور مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مسیح موعود وغیرہ مان دینی اور اعتقادی گمراہی کے علاوہ اپنی عقل اور انسانی شرافت پر بھی کیسا ظلم ہے۔

اس گفتگو میں اس عاجز نے پہلے تکمیل دین اور ختم نبوت کے مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالی تھی ——— لیکن چونکہ الفرقان کی گزشتہ سے پیوستہ ہی اشاعت میں (یعنی ماہ صفر کے شمارہ کے اس مضمون میں جو بعنوان "ختم نبوت اور قادیانی فتنہ" اس میں شایع ہوا ہے) اتفاق سے وہ سب چیزیں ناظرین الفرقان پڑھ چکے ہیں جو اس موضوع پر میں نے اس مجلس میں کہی تھیں اسلئے یہاں ان کو پھر تفصیل سے دوہرانے کی ضرورت نہیں ——— تاہم کم از کم اجمالاً اور اشارۃً اتنا یہاں بھی بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی گفتگو کے اس ابتدائی حصہ میں اس عاجز نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کی تکمیل اور اس کی حفاظت کی ضمانت کے بارہ میں قرآن مجید کا بیان اور تاریخ کی شہادت ذکر کرنے کے بعد اس چیز پر روشنی ڈالی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان دونوں باتوں کا اعلان فرما کر ہمیشہ کے لیے ہر نئی نبوت کی ضرورت کے ختم ہو جانے کا اعلان فرما دیا ——— کیوں کہ جب دین "الیوم اکملت لکم دینکم" کی شہادت کے مطابق بالکل مکمل ہو چکا اور اس میں اب کبھی کسی ترمیم اور اضافہ کی ضرورت نہیں ہوگی اور "انا لہ لحافظون" کے مطابق وہ جوں کا توں قیامت تک محفوظ بھی رہے گا، تو کوئی نیا نبی اب آئے کیوں! ——— پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں صراحۃً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا اعلان بھی فرمایا، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی حدیثوں میں جن کا شمار بھی مشکل ہے اپنی اس حیثیت کو صاف صاف بیان فرمایا کہ نبوت کا سلسلہ مجھ پر ختم کر دیا گیا اور میرے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اور پھر پوری امت محمدیہ کا ہمیشہ سے یہی ایمان اور یہی عقیدہ رہا اور جس زمانہ میں کسی نے اپنے کو نبی کہا اس کے متعلق کبھی کچھ غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ جس طرح خدائی کے دعویداروں کو کذاب سمجھا گیا اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد

ہر مدعیٔ نبوت کو امت نے کذاب سمجھا۔

تکمیل دین اور ختم نبوت کے سلسلہ میں میں نے اس مجلس میں بس اِن ہی چند پہلوؤں پر کلام کیا تھا اور اس کا خلاصہ بس اتنا ہی تھا ــــــــ جو حضرات اِن چیزوں کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں وہ الفرقان بابت ماہ صفر کے محولہ بالا مضمون کی طرف رجوع فرمائیں ــ اس عاجز نے اس مجلس میں یہ سب باتیں اسی تفصیل بلکہ اسی ترتیب کے ساتھ بیان کی تھیں جس ترتیب و تفصیل سے چند ہی روز پہلے اپنے اس مضمون میں لکھ چکا تھا چونکہ ناظرین الفرقان اس کو پڑھ چکے ہیں اس لیے یہاں صرف ان ہی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں ــــ البتہ ختم نبوت کے متعلق یہ اصولی بات کہنے کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کی جانچ کے متعلق جو کچھ وہاں کہا تھا اس کو تلخیص و اختصار کی کسی کوشش کے بغیر اسی تفصیل سے درج کرتا ہوں۔ اور وہی در اصل قادیانیت کے متعلق اصل بحث ہے ــــــــ جو کچھ میں نے وہاں اس سلسلہ میں کہا تھا اس کو پہلے سے ذہن میں مرتب کر لیا تھا اور کاغذ پر بھی نوٹ کر لیا تھا اور اسی کی مدد سے اب اس کو قلمبند کر رہا ہوں۔

[اگر تکمیل افادیت کے نقطۂ نگاہ سے کوئی ایسی بات لکھنا مناسب سمجھوں گا جو اس مجلس میں نہیں کہی تھی تو انشاء اللہ موقع پر اس کو حاشیہ میں لکھ دوں گا۔]

مرزا غلام احمد قادیانی کی جانچ

مجلس کے حاضرین میں جو چند قادیانی حضرات تھے میں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

آپ حضرات کو جیسا کہ میری اب تک کی گفتگو سے معلوم ہوا' واقعہ یہ ہے کہ ختم نبوت ہمارے ایمان کا جز ہے لیکن میں تھوڑی دیر کے لیے اس سے صرف نظر کر کے کہتا ہوں کہ اگر بالفرض نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی اور انبیاء علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ جاری ہوتا تب بھی مرزا غلام احمد جیسے کسی شخص کے نبی ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا ــــــــ میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے ہم اصولی باتیں پیش کرتا ہوں اِن کی روشنی میں ہر شخص مرزا صاحب کو بڑی آسانی سے جانچ سکتا ہے اور میرے نزدیک قادیانیت پر غور کرنے کا یہی صحیح اور سیدھا اور آسان ترین راستہ ہے۔ جو ہم اصولی باتیں میں اس وقت آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ دو اور دو چار کی طرح بالکل بدیہی اصول ہیں۔

(۱) میری پہلی اصولی بات جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا یہ ہو کہ ہر سچے نبی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے سے پہلے سب نبیوں کا احترام کرے اور دوسرے لوگوں کو بھی اُن کے ادب اور احترام کی تعلیم دے، کیونکہ ہر پیغمبر اللہ کا نائب اور اس کا نمائندہ ہوتا ہے۔ کسی پیغمبر کی اہانت اور ہتک کرنا کسی ادنیٰ درجہ کے مومن کا بھی کام نہیں۔ لیکن مرزا غلام احمد کو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اللہ کے سچے اور جلیل القدر نبی سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں بڑی غیر شریفانہ باتیں کہی اور لکھی ہیں۔۔۔۔ چوں کہ یہ مجلس بحث و مناظرہ کی مجلس نہیں ہے اور میں آپ حضرات کو قادیانیت کے متعلق غور کرنے کا صرف طریقہ اور راستہ بتانا چاہتا ہوں اس لیے مرزا صاحب کی صرف ایک عبارت بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔۔۔ وہ اپنی کتاب "دافع البلاء" کے بالکل آخری صفحہ پر لکھتے ہیں:۔

"مسیح کی راستبازی اپنے زمانہ میں دوسرے راستبازوں سے بڑھ کر ثابت نہیں ہوتی، بلکہ یحییٰ نبی کو اس پر ایک فضیلت ہے کیوں کہ وہ شراب نہیں پیتا تھا اور کبھی نہیں سنا گیا کہ کسی فاحشہ عورت نے آکر اپنی کمائی کے مال سے اس کے سر پر عطر ملا تھا یا ہاتھوں اور سر کے بالوں سے اُسکے جسم کو چھوا تھا یا کوئی بے تعلق جوان عورت اس کی خدمت کرتی تھی، اسی وجہ سے خدا نے قرآن میں یحییٰ کا نام حصور رکھا مگر مسیح کا یہ نام نہ رکھا کیوں کہ ایسے قصے اس نام کے رکھنے سے مانع تھے"

اس عبارت میں مرزا غلام احمد نے حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام پر چند تہمتیں رکھی ہیں۔۔۔۔ اوّل یہ کہ۔۔۔ وہ شراب پیتے تھے۔۔۔۔ دوم یہ کہ وہ فاحشہ اور بدکار عورتوں سے اُن کی ناپاک کمائی سے حاصل کیا ہوا عطر اپنے سر پر ملواتے تھے اور ان کے ہاتھوں اور سر کے بالوں سے اپنے

بدن کو چھوواتے تھے ـــــ تیسرے یہ کہ بے تعلق جوان عورتیں ان کی خدمت کرتی تھیں۔

یہ ناپاک تہمتیں حضرت علیہ السلام جیسے پاک پیغمبر پر رکھنے کے بعد یہ شخص یہ بھی کہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلق حَصُور کا لفظ انہی قصوں کی وجہ سے نہیں فرمایا۔[1]

یہ گندی باتیں جو اس شخص نے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں کہی ہیں مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں کا احساس ان کے متعلق کیا ہو، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ نبی کا مقام تو بہت بلند ہو کسی شریف اور نیک آدمی کے متعلق بھی ایسی باتیں کرنا یقیناً اس کی سخت توہین ہو، اور جس شخص میں ایمان کا کوئی ذرہ ہو وہ اللہ کے کسی پیغمبر کے متعلق ایسی گندی اور بے حیائی کی باتیں زبان سے نہیں نکال سکتا۔

میں خود ہی آپ کو یہ بھی بتلا دوں کہ مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو ایسی غیر شریفانہ باتیں اپنی کتابوں میں لکھی ہیں، قادیانی حضرات ان کے متعلق عام طور سے یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ سب عیسائی پادریوں کے مقابلہ میں الزامی طور پر لکھا گیا ہے، لیکن یہ محض دھوکہ اور بناوٹ ہے۔ خصوصاً میں نے اس وقت جو عبارت پڑھ کر سنائی ہے وہ دافع البلاء کی ہے اور دافع البلاء کے مخاطب زیادہ تر علماء اسلام ہیں جس کا جی چاہے پوری کتاب پڑھ کر دیکھ لے، اس کے علاوہ جو گندی اور فحش باتیں انھوں نے اس عبارت میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کی ہیں وہ تو ان کے نزدیک (معاذ اللہ) ایسے سچے اور واقعی قصے ہیں کہ اللہ نے انہی کی وجہ سے قرآن میں

---

[1] جو گندی ناپاک تہمتیں اس ظالم نے سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لگائیں یہ ان کو قرآن پر اور اللہ تعالیٰ پر بھی تھوپتا ہے کہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان ہی باتوں کی وجہ سے ان کو قرآن میں حصور نہیں کہا کیونکہ حصور کے معنی ہیں اپنی خواہش نفس کو روکنے والا۔ سبحانہ وتعالیٰ عما یقولون علواً کبیراً۔ حالاں کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن پاک میں حَصُور نہ کہنے سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ معاذ اللہ یہ گندے قصے اس کا سبب ہیں تو پھر تو تمام جلیل القدر پیغمبروں حضرت نوح حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور خود سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہ ظالم یہی کہے گا کیوں کہ قرآن مجید میں ان حضرات کے لیے بھی حَصُور کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہو ـــــ یہ ہو اس شخص کی قرآن دانی کا نمونہ جس کو اس کے اُمتی اس کا سب سے بڑا معجزہ کہتے ہیں۔ ۱۲۰

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حَصُوْرٌ کے خطاب سے محروم رکھا اور وہ قرآن میں حضرت یحییٰ کا نام حَصُوْرٌ نہ رکھنے کو اِن گندی تہمتوں کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہے ہیں ـــــ پس اس کو پادریوں کے مقابلہ کا صرف الزامی جواب کیسے کہا جا سکتا۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ دافع البلاء کی اس عبارت سے یہ بات بھی واضح طور پر معلوم ہو گئی کہ اس شخص نے یعنی مرزا غلام احمد نے اگر کسی کتاب میں عیسائیوں کے مقابلہ میں بھی ایسی باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق لکھی ہیں تو وہ صرف "الزامی" نہیں ہیں بلکہ یہ اُن کے اپنے خیالات اور اپنے دعوے ہیں ـــــ میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قریب قریب یہی گندی باتیں اس سے بھی زیادہ نامہذب اور گندے الفاظ میں "ضمیمہ انجام آتھم" میں لکھی ہیں، اگرچہ اس قسم کی چیزوں کا پڑھنا اور سُننا ہر مسلمان کے لیے تکلیف دہ ہے، لیکن چونکہ آپ کو اس کی ضرورت ہے اس لیے میں اس کو بھی پڑھے دیتا ہوں۔ لکھتے ہیں:۔

آپ کا خاندان بھی نہایت پاک اور مطہر ہے تین دادیاں اور نانیاں آپ کی زناکار اور کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔ مگر شاید یہ بھی خدائی کے لیے ایک شرط ہوگی۔ آپ کا کنجریوں سے (یعنی رنڈیوں[1] سے م) میلان اور صحبت بھی شاید اسی وجہ سے ہو کہ جدی مناسبت درمیان ہو ورنہ کوئی پرہیزگار انسان ایک جوان کنجری کو یہ موقع نہیں دے سکتا کہ وہ اس کے سر پر اپنے ناپاک ہاتھ لگاوے اور زناکاری کی کمائی کا پلید عطر اس کے سر پر ملے اور اپنے بالوں کو اس کے پیروں پر ملے سمجھنے والے سمجھ لیں کہ ایسا انسان کس چلن کا آدمی ہو سکتا ہے ـــــ (ضمیمہ انجام آتھم ص۷)

[1] پنجابی حضرات رنڈی کو کنجری بولتے ہیں چونکہ یو۔ پی کے اکثر لوگ اس محاورہ کو جانتے نہیں ہیں اس لیے اس مجلس میں اس عبارت کے پڑھتے وقت یہ تشریح کر دی گئی تھی۔ ۱۲

اس عبارت میں بھی مرزا غلام احمد صاحب نے وہی باتیں کہی ہیں جو دافع البلاء سے میں ابھی آپ کو سنا چکا ہوں، بلکہ یہاں ان کا طرز بیان اور زیادہ غیر شریفانہ اور سوقیانہ ہے اور سچی بات یہ ہے کہ کتاب کو زمین پر پٹک دینے کو جی چاہتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ضمیمہ انجام آتھم کی اس عبارت کے خاص مخاطب بعض عیسائی پادری ہیں، لیکن دافع البلاء کی عبارت پڑھنے کے بعد ضمیمہ انجام آتھم کی اس عبارت کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صرف الزامی باتیں ہیں جو عیسائیوں کے "یسوع" کے حق میں کہی گئی ہیں۔ کیوں کہ دافع البلاء سے معلوم ہو چکا کہ واقعہ میں وہ عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا ہی سمجھتے ہیں، بلکہ قرآن پاک کو اور خدا کو بھی اپنی گواہی میں لاتے ہیں۔ اسی لیے میں نے اس سلسلہ میں آپ حضرات کے سامنے صرف دافع البلاء کی عبارت پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا انجام آتھم کے ضمیمہ کی یہ عبارت تو میں نے صرف اس لیے پڑھ دی کہ اس میں وہی بات زیادہ گندے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ اور دافع البلاء کی عبارت نے اس کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ صرف الزامی باتیں نہیں ہیں بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مرزا صاحب کے یہ دعوے ہیں۔

بہر حال آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ مرزا غلام احمد نے ان عبارتوں میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں کیسی گندی اور اہانت آمیز باتیں کہی ہیں۔ پس ایسا شخص نبی کیا معنی صاحب ایمان بھی نہیں ہو سکتا ہے، بلکہ شرافت و تہذیب کے عام معیار کے مطابق اس کو ایک شریف اور مہذب انسان بھی نہیں کہا جا سکتا۔

[اس موقع پر حاضرین مجلس میں سے کسی صاحب نے پوچھا کہ آپ بتلا سکتے ہیں کہ مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایسی باتیں کیوں لکھیں؟ —]

میں نے کہا — میرے نزدیک اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کا ایک اہم دعویٰ یہ ہے کہ وہ مسیح موعود ہیں یعنی حدیثوں میں آخر زمانہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد کی جو خبریں دی گئی ہیں وہ ہی ان کے مصداق ہیں، اور اپنی شان میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے بہت بڑھے ہوئے ہیں اور بعض خاص مشابہتوں اور مناسبتوں کی وجہ سے حدیثوں میں مجازاً ان ہی کو عیسیٰ اور مسیح کہا گیا ہے —
لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ان کی سیرت اور ان کا کردار گھٹیا ہو

بلکہ بلند اور بڑھیا ہو ——— تو میرا خیال ہے کہ وہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان کو اس لیے گرانا چاہتے ہیں کہ اپنے بے وقوف معتقدوں کو یہ باور کرا سکیں کہ سیرت اور کردار کے لحاظ سے مسیح ناصری کے مقابلہ میں میں بلند ہوں[1] ——— بہرحال میں یہی سمجھتا ہوں

مرزا غلام احمد صاحب کی جانچ کے لیے جو ۳ اصولی باتیں میں آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ـــ ان میں سے پہلی تو یہی تھی جو میں پیش کر چکا اور آپ سُن چکے۔ اب آگے سنیئے۔

(۲) دوسری اصولی بات یہ ہے کہ ـــ اللہ کے کسی سچے پیغمبر کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے دعوے کی سچائی اور بڑائی ثابت کرنے کے لیے بھولے بھی کبھی جھوٹ بولے۔ مگر مرزا غلام احمد اس معاملہ میں بڑے بیباک ہیں اور بہت بے تکلفی اور دیدہ دلیری سے صاف صریح جھوٹ بول جاتے ہیں اگر آپ چاہیں تو اس کی بہت سی مثالیں میں اُن کی کتابوں سے پیش کرسکتا ہوں، لیکن چوں کہ میرا مطمح نظر اس وقت صرف اتنا ہی ہے کہ مرزا صاحب کی جانچ اور قادیانیت پر غور کرنے کا ایک صحیح اور اصولی طریقہ آپ حضرات کو بتلا دوں اس لیے میں اس سلسلہ میں بھی مرزا صاحب کی غلط بیانی کی صرف ایک موٹی سی مثال آپ کے سامنے پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں ـــ اربعین ۳ میں لکھتے ہیں۔

"مولوی غلام دستگیر قصوری نے اپنی کتاب میں اور مولوی اسمٰعیل علی گڑھ والے نے میری نسبت قطعی حکم لگایا کہ اگر وہ کاذب ہے تو ہم سے پہلے مرے گا، اور ضرور ہم سے پہلے مرے گا کیوں کہ وہ کاذب ہے۔ مگر جب ان تالیفات کو دنیا میں شائع کر چکے تو پھر بہت جلد آپ ہی مر گیے۔" (اربعین ۳ صفحہ ۱۱)

اس عبارت میں مرزا صاحب نے مولوی غلام دستگیر صاحب قصوری مرحوم اور مولانا اسمٰعیل علی گڑھی مرحوم کے متعلق جو یہ بات لکھی ہے کہ "انھوں نے اپنی کتابوں میں یہ قطعی حکم لگایا تھا کہ وہ (یعنی مرزا غلام احمد) اگر کاذب ہے تو وہ ہم سے پہلے مرے گا، اور ضرور ہم سے پہلے مرے گا کیوں کہ وہ کاذب ہے، اور یہ کہ اپنی جن تالیفات میں انھوں نے یہ بات لکھی تھی وہ شائع بھی ہو چکی ہیں:" ——— یہ سب مرزا صاحب کا تراشا ہوا جھوٹ ہے ـــ ان دونوں مرحوم بزرگوں کی ایسی کوئی کتاب روئے زمین

---

[1] ان کا مشہور شعر بھی ہے ؎ ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو ٭ اس سے بہتر غلام احمد ہے (دافع البلاء صفحہ ۲)

پر موجود نہیں ہے اور کبھی شائع نہیں ہوئی جس میں انھوں نے یہ بات لکھی ہو۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے اس کی تحقیق کرلے۔ مرزا صاحب کی زندگی میں بھی ان سے یہ مطالبہ کیا گیا اور پھر انکے ماننے والوں کو ہمیشہ اس کے لیے چیلنج کیا گیا کہ ان دونوں بزرگوں کی وہ شائع شدہ کتابیں دکھاؤ جن میں یہ مضمون موجود ہو۔ لیکن آج تک کوئی نہیں دکھلا سکا اور نہ قیامت تک کوئی دکھلا سکتا ہے کیونکہ جیسا کہ میں نے آپ کو تبلایا یہ مرزا صاحب کا خالص جھوٹ اور افترا ہے۔

اور ان کی کذب بیانی کی یہی ایک مثال نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو شخص مرزا صاحب کی کتابوں کو تحقیقی اور تنقیدی نگاہ سے دیکھے گا وہ ان میں اس کی بیسوں، پچاسوں مثالیں پائے گا کہ وہ اپنی سچائی اور بڑائی ثابت کرنے کے لیے بالکل بے اصل اور بے بنیاد اور خلاف واقعہ باتیں بڑی دیدہ دلیری سے لکھ جاتے ہیں[1] ـــــــ اور ایسا شخص پیغمبر تو کیا معنی ایک دیانتدار مصنف بھی نہیں سمجھا جا سکتا ـــ میں اللہ تعالیٰ کا ایک نہایت حقیر اور گنہگار بندہ ہوں قریب ۲۱، ۲۲ سال سے تحریر و تصنیف کا کام کرتا ہوں اور اندازہ یہ ہے کہ مستقل تصانیف کی شکل میں اور الفرقان میں میرے قلم کے لکھے ہوئے ۵، ۶ ہزار صفحات ضرور شائع ہو چکے ہوں گے میں کہہ سکتا ہوں کہ الحمد للہ میں بھی اس معاملہ میں مرزا غلام احمد سے کہیں زیادہ دیانتدار ہوں۔ اور میرا کوئی مخالف میرے لکھے ہوئے ان ۵، ۶ ہزار صفحات میں اس قسم کی غلط بیانی کی ایک مثال بھی نہیں نکال سکتا۔

بہرحال مرزا صاحب کی یہ کمزوری بھی ایسی ہے جس کے ہوتے ہوئے ان کو کسی بڑے درجہ کا

---

[1] مرزا صاحب کے یہاں اس قسم کی غلط بیانیوں کی اتنی بہتات ہو کہ مناظرہ سے دلچسپی رکھنے والے بعض حضرات نے ان کی کتابوں سے اس قسم کی غلط بیانیاں چھانٹ کر مستقل کتابیں صرف اسی موضوع پر لکھی ہیں ـــ ان رسالوں میں "کذبات مرزا" مشہور رسالہ ہو ـــ پھر مرزا غلام احمد صاحب اس قسم کی غلط بیانیاں صرف انسانوں ہی کے حق میں نہیں کرتے ہیں بلکہ اللہ و رسول اور قرآن و حدیث کے متعلق بھی اس قسم کی غلط بیانی کرنے میں وہ بڑے جری اور بے باک ہیں ایک مثال اسکی بھی ہدیہ ناظرین ہو ـــ اپنی کتاب اربعین[۳] میں (جس سے مولانا قصوری مرحوم اور مولانا علی گڑھی مرحوم کے متعلق ان کی ایک غلط بیانی ابھی نقل کی گئی ہو) لکھتے ہیں ـــــــ "ضرور تھا کہ قرآن شریف اور احادیث کی وہ پیشین گوئیاں پوری ہوتیں جن میں لکھا تھا کہ مسیح موعود جب ظاہر ہوگا تو اسلامی علماء کے ہاتھ سے دکھ اٹھائے گا۔ وہ اسکو کافر قرار دینگے اور اس کے قتل کے لیے فتوے دیے جائیں گے اور اسکی سخت توہین کی جائے گی اور اسکو دائرہ اسلام سے خارج اور دین کا تباہ کرنے والا خیال کیا جائیگا۔" (اربعین[۳] صہ ۲۱) جو لوگ قرآن اور احادیث کا الحمد للہ علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن اور احادیث کے متعلق مرزا غلام احمد کی یہ بے باکانہ غلط بیانی ہو ـ ۱۲ م

انسان نہیں سمجھا جا سکتا۔

(۳) تیسری اصولی بات مرزا صاحب کی جانچ کے لیے جو آپ کے سامنے میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انھوں نے بعض اہم پیشین گوئیاں ایسی کیں جن کو خود اپنے جھوٹے یا سچے ہونے کا خاص نشان اور معیار قرار دیا اور بڑے دعووں سے کہا کہ اگر یہ پوری نہ ہوں تو میں جھوٹا ہوں اور ایسا ہوں اور ویسا ہوں۔ اور اللہ تعالےٰ نے ان کی اس قسم کی زیادہ تر پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کر کے ان کا جھوٹا اور مفتری ہونا ظاہر کر دیا، یہ محض اللہ تعالےٰ کا فضل و احسان ہے، ورنہ بہت سی پیشین گوئیاں رمالوں جفاروں کی اور علم جوتش سے واقفیت رکھنے والے پنڈتوں کی پوری ہو جاتی ہیں اس لیے اگر بالفرض مرزا صاحب کی یہ پیشین گوئیاں سو فی صدی بالکل ٹھیک ٹھیک پوری ہو جاتیں تب بھی ہم ان کو اس قسم کا استدراج سمجھتے جیسا کہ حدیثوں میں دجال کے متعلق آتا ہے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور بارش برسا کے اور مردہ کو زندہ کر کے دکھائے گا، اور اس کے باوجود دجال ہو گا — بہر حال ہمارا یہ ایمان ہے کہ قرآن مجید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا اعلان ہو جانے کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے خواہ اس کے ہاتھ پہ کیسے ہی کرشمے ظاہر ہوں اور خواہ اس کی پیشین گوئیاں سو فیصدی پوری ہوں پھر بھی وہ ہرگز سچا نبی نہیں بلکہ کذاب و دجال ہے، اس لیے اگر بالفرض مرزا صاحب کی یہ پیشین گوئیاں پوری بھی ہو جاتیں جب بھی ہمارے ایمان اور عقیدہ پر الحمد للہ کوئی اثر نہ پڑتا —— لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ان کی معرکہ کی پیشین گوئیوں کو غلط کر کے اپنے بہت سے کمزور بندوں کو اس آزمائش سے بچا لیا۔

بہرا اس سلسلہ میں ان کی صرف ۳ پیشین گوئیوں کو اس وقت آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی پیشین گوئی ڈپٹی عبد اللہ آتھم عیسائی کی موت سے متعلق ہے، مرزا صاحب نے اس کی میعاد ۵ جون سنہ ۱۸۹۳ء سے پندرہ مہینہ تک (یعنی ۵ ستمبر سنہ ۱۸۹۴ء تک) مقرر کی تھی۔ پھر انھوں نے اپنی کتاب "شہادۃ القرآن" کے صفحہ ۸۰ پر (جو ستمبر سنہ ۱۸۹۳ء کی لکھی ہوئی ہے) اپنی صداقت کے نشان اور معیار کے طور پر اپنی اس پیشین گوئی کو پھر دہرایا کہ آتھم ضرور بالضرور اس مدت کے اندر یعنی ۵ ستمبر سنہ ۹۴ء تک مر جائے گا —— (اور چوں کہ آتھم کی عمر ۷۰ برس کے قریب تھی اس لیے اس کا مر جانا کچھ مستبعد بھی نہ تھا) لیکن اللہ تعالیٰ کو مرزا صاحب کو جھوٹا ثابت کرنا تھا اس لیے بڈھا عبد اللہ آتھم اس مدت میں بھی نہیں مرا —— بلکہ اس میعاد سے قریباً دو برس گزرنے کے بعد ۲۷ جولائی سنہ ۱۸۹۶ء کو مرا — خود مرزا صاحب نے انجام آتھم میں اس کی موت کی یہ تاریخ لکھی ہے۔[1]

[1] انجام آتھم صفحہ ۱

مجھے یہ معلوم ہو کہ مرزا صاحب نے اور ان کی امت کے مناظروں نے اس پیشین گوئی کے بارہ میں بعد کو کیا کیا فضول اور مہمل تاویلیں کی ہیں — لیکن میرا خیال ہے کہ ہر صحیح الفطرت آدمی کو ان لوگوں کی اس قسم کی باتوں سے ان کی ہٹ دھرمی کا اور حق پرستی سے دوری کا اور زیادہ یقین ہوتا ہو۔ سیدھی بات ہے کوئی منطق فلسفہ کا مسئلہ نہیں ہے اور کوئی پہیلی اور کہانی نہیں ہے جس کا سمجھنا اور بوجھنا مشکل ہو۔ مرزا صاحب نے پیشین گوئی کی تھی کہ آتھم ۵ رجون ۱۸۹۳ء سے ۱۵ مہینہ تک یعنی ۵ رستمبر ۱۸۹۴ء تک ضرور مرجائے گا۔ اور اس کو انھوں نے اپنے صادق یا کاذب ہونے کا معیار قرار دیا تھا، اب اگر آتھم ۵ رستمبر ۱۸۹۴ء کی شام تک بھی مرجاتا تو مرزا صاحب اپنے اس بیان کی رو سے سچے ہوتے، لیکن جب وہ اس مدت میں نہیں مرا بلکہ قریباً دو سال بعد تک اور جیتا رہا تو اس کی اس دو سالہ زندگی کا ہر سانس اور ہر لمحہ مرزا غلام احمد کے اقرار کے مطابق ان کے کاذب اور جھوٹے ہونے کا ثبوت ہے اور اس میں تاویلیں کرنا خواہ مخواہ ایک کھلے ہوئے جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشش کرنا ہو — بہرحال غور کرنے والوں اور سمجھنے کا ارادہ رکھنے والوں کے لیے بات بالکل صاف سیدھی اور مختصر سی ہے —

اسی طرح کی دوسری پیشین گوئی جو میں آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ محمدی بیگم کے نکاح سے متعلق ان کی سب سے زیادہ مشہور اور معرکہ کی پیشین گوئی ہے جس کو انھوں نے اپنی کتابوں میں اپنی صداقت کا خاص آسمانی نشان اور معیار قرار دیا تھا۔ میں پہلے اس کا مختصر واقعہ بیان کر دوں۔

مرزا صاحب کے ایک قرابتدار مرزا احمد بیگ ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ محمدی بیگم ان کی لڑکی تھی، مرزا صاحب کے دل میں اس سے نکاح کرنے کی خواہش پیدا ہوئی، چنانچہ انھوں نے پیام دیا[1]، لیکن احمد بیگ راضی نہیں ہوئے اور انکار کر دیا[2]، مرزا صاحب نے احمد بیگ کو متاثر اور مرعوب کرنے کے لیے بڑے زور سے دو باتوں کا اعلان کیا ایک یہ کہ محمدی بیگم کا میرے نکاح میں آنا مجھے خدا کی وحی اور الہام سے معلوم ہو چکا ہو اور میں نے خدا کے حکم سے یہ پیام دیا ہے اور خدا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ نکاح ضرور ہو گا —— اور دوسری بات یہ کہ اس کے گھر والے اگر انکار کریں گے تو طرح طرح کی آفتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوں گے اور خود محمدی بیگم پر بھی مصیبتیں آئیں گی —— مرزا صاحب نے ان باتوں کو اپنے خطوط اور اپنی کتابوں اور اشتہاروں

---

[1] اور اس سلسلہ میں احمد بیگ کو کچھ زمین اور باغ دینے کا لالچ بھی دیا (آئینہ کمالات اسلام ص۵۷۳)

[2] شاید اس انکار کی وجہ یہ ہوگی کہ محمدی بیگم بالکل کم سن لڑکی تھی اور مرزا صاحب کی عمر اس وقت پچاس سے اوپر ہو چکی تھی۔ ۱۲

میں ایسے زور سے لکھا کہ احمد بیگ اگر کچا آدمی ہوتا تو ڈر کے نکاح کر ہی دیتا، لیکن اس نے اثر نہیں لیا اور وہ برابر انکار کرتا رہا اور مرزا صاحب طرح طرح سے کوششیں اور ہر قسم کی تدبیریں استعمال کرتے رہے جن کی تفصیل بہت لمبی ہے اور بڑی عبرتناک اور شرمناک ہے اور مجھے اس قسم کی باتوں سے اب طبعی انقباض ہوتا ہے اس لیے میں ان سب واہیات قصوں کو چھوڑتا ہوں اور صرف اصل معاملہ ہی آپکے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں[1]۔ مرزا صاحب کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ ایک مدت تک اسی طرح چلتا رہا کہ مرزا صاحب محمدی بیگم کے والد احمد بیگ کو رام کرنے کی کوششیں اور تدبیریں کرتے رہے، اس کو خطوط لکھتے رہے اور الہاموں کے حوالہ سے اس کو دھمکیاں بھی دیتے رہے مگر وہ انکار پر جما رہا، یہاں تک کہ پٹی ضلع لاہور کے رہنے والے ایک شخص سلطان محمد سے محمدی بیگم کی شادی کی بات چیت ہونے لگی، جب مرزا صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی عجیب عجیب تدبیریں اور بڑی کوششیں کیں، جب یہ تمام کوششیں بھی ناکام رہیں تو مرزا صاحب نے حسب عادت خدا کے الہام کے حوالہ سے پیشین گوئی شائع کی کہ اگر سلطان محمد سے محمدی بیگم کا نکاح ہوا تو سلطان محمد روز نکاح سے اڑھائی سال کے اندر اور محمدی کا باپ احمد بیگ تین سال کے اندر مر جائیں گے اور لڑکی بیوہ ہو کر پھر میرے نکاح میں ضرور آئے گی ـــــ اللہ کی شان کہ محمدی بیگم کا نکاح سلطان محمد سے ہو گیا۔ لیکن مرزا صاحب اس کے بعد بھی برابر اسی زور شور سے یہ پیشین گوئی کرتے رہے کہ سلطان محمد مرے گا اور محمدی بیگم ضرور بالضرور میرے نکاح میں آئے گی یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر مبرم ہے کوئی اسے بدل نہیں سکتا اور اگر میری یہ بات غلط ہو جائے یعنی اگر محمدی بیگم میرے نکاح میں نہ آئے اور اسی طرح سلطان محمد اگر مقررہ میعاد تک نہ مرے تو میں جھوٹا اور رسوا اور دیا۔

یہ تو میں نے آپ کو اصل قصہ بہت مختصر طور سے اپنی زبان میں سنا دیا، اب آپ مرزا صاحب کے اس سلسلہ کے دعووں اور ان کی پیشین گوئیوں کی دو ایک عبارتیں بھی سن لیجئے اور عبارتیں بھی وہ جن کو انھوں

---

[1] جو حضرات اس قصہ کی ان شرمناک تفصیلات سے بھی واقفیت حاصل کرنا چاہیں وہ "فیصلہ آسمانی" "الہامات مرزا" "مرزا اور محمدی بیگم" اور ترک مرزائیت وغیرہ رسائل دیکھیں۔ واقعہ یہ ہو کہ تنہا "محمدی بیگم" کا واقعہ ہر ایک منصف مزاج اور حق پرست کو یقین دلانے کے لیے کافی ہو کہ مرزا غلام احمد نبوت اور الہام کے دعووں میں کاذب اور مفتری ہونے کے علاوہ نہایت پست فطرت آدمی تھا اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت نے اسکو ذلیل اور جھوٹا ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ۱۲

نے خدا کے الہام کی حیثیت سے لکھا ہے۔

یہ میرے ہاتھ میں مرزا صاحب کی کتاب انجام آتھم ہے جو اس وقت کی لکھی ہوئی ہے جب کہ سلطان محمد کے ساتھ محمدی بیگم کے نکاح کو چار پانچ سال ہو چکے ہیں اس میں مرزا صاحب نے اپنے کچھ وہ الہامات لکھے ہیں جو عربی زبان میں ہیں اور خود ہی ساتھ ساتھ اردو میں ترجمہ بھی لکھ دیا ہے۔ ان میں چند سطروں کا ایک الہام ہے جس کا تعلق محمدی بیگم سے ہے جس میں (مرزا صاحب کے بیان کے مطابق) ان کے خدا نے ان کو تبلایا ہے اور بڑے زور دار الفاظ میں یقین اور اطمینان دلایا ہے کہ محمدی بیگم پھر ضرور تمہارے نکاح میں آئے گی بلکہ ہم نے اس کا نکاح تم سے کر دیا اب کوئی طاقت اس کو روک نہیں سکتی۔ الہام کے الفاظ یہ ہیں:۔

فسیکفیکھم اللہ ویردھا الیک۔ امرٌ من لدنا انا کنا فاعلین زوّجنکھا۔ الحق من ربک فلاتکونن من الممترین۔ لاتبدیل لکلمات اللہ ان ربک فعال لما یرید۔ انا رادّوھا الیک"

اب خود مرزا صاحب کا لکھا ہوا اس الہام کا ترجمہ سنیئے!

"سو خدا ان کے لیے تجھے کفایت کرے گا، اور اس عورت کو تیری طرف واپس لائے گا، یہ امر ہماری طرف سے ہے اور ہم ہی کرنے والے ہیں بعد واپسی کے ہم نے نکاح کر دیا، تیرے رب کی طرف سے سچ ہے پس تو شک کرنے والوں میں سے مت ہو، خدا کے کلمے بدلا نہیں کرتے، تیرا رب جس بات کو چاہتا ہے وہ بالضرور اس کو کر دیتا ہے کوئی نہیں جو اس کو روک سکے ہم اس کو واپس لانے والے ہیں۔" (انجام آتھم صفحہ ۶۰ و ۶۱)

گویا مرزا صاحب اپنے اس الہام کو شائع کر کے دنیا کو تبلا رہے ہیں کہ اگرچہ محمدی بیگم کا نکاح سلطان محمد سے ہو گیا اور میرے مخالف اس پر خوشیاں منا رہے ہیں لیکن میرا خدا اپنی وحی کے ذریعہ مجھے تبلا رہا ہے کہ وہ میرے ان مخالفوں سے میری طرف سے انتقام لینے کے لیے اور ان کو شکست دینے کے لیے کافی ہے اور اس کا اٹل فیصلہ ہے کہ وہ اس عورت کو یعنی محمدی بیگم کو پھر میری طرف واپس کرے گا یعنی سلطان محمد میری زندگی میں مرے گا اور محمدی بیگم بیوہ ہو کر پھر میرے نکاح میں آئے گی۔ اور میرے اللہ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس کا یہ نکاح ہم نے تم سے کر دیا (زوجناکھا)، اور یہ خدائی فیصلہ اور خدائی اطلاع ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اللہ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں ان میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کو کوئی روک نہیں

سکتا، اللہ ضرور محمدی بیگم کو میری طرف واپس کرے گا اور آخر کار وہ میرے نکاح میں ضرور بالضرور آئے گی۔
الغرض یہ ہے مرزا صاحب کا الہام اور ان کی پیشین گوئی محمدی بیگم کے نکاح میں آنے کے متعلق۔
پھر آپ کو سن کر اور زیادہ تعجب ہوگا کہ اس شخص نے اپنے اس واہیات معاملہ میں ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لپیٹ لیا، اسی انجام آتھم کے ضمیمہ کے صہ۵۳ کے حاشیہ میں محمدی بیگم کے نکاح کی اسی پیشین گوئی کے متعلق دیدہ دلیری سے لکھا کہ:۔

"اس پیشین گوئی کی تصدیق کے لیے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی پہلے سے ایک پیشین گوئی فرمائی ہے کہ یتزوج ویولد لہٗ یعنی وہ مسیح موعود بیوی کرے گا اور نیز وہ صاحب اولاد ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ تزوج اور اولاد کا ذکر کرنا عام طور پر مقصود نہیں کیوں کہ عام طور پر ہر ایک شادی کرتا ہے اور اولاد بھی ہوتی ہے اس میں کچھ خوبی نہیں بلکہ تزوج سے مراد وہ خاص تزوج ہے جو بطور نشان ہوگا۔ اور اولاد سے مراد وہ خاص اولاد ہے جس کے متعلق اس عاجز کی پیشین گوئی موجود ہے۔ گویا اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سیہ دل منکروں کو ان کے شبہات کا جواب دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ یہ باتیں ضرور پوری ہوں گی"

حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اس شخص کا محض افترا اور بہتان ہے حدیث شریف کے الفاظ "یتزوج ویولد لہ" کا اصل مطلب تو یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ جنھوں نے اپنی پہلی زندگی میں نکاح نہیں کیا تھا اور تجرد کی زندگی گزاری تھی) وہ جب آخر زمانہ میں دوبارہ آئیں گے تو حضور کی سنت کے اتباع میں نکاح بھی کریں گے اور اس سے اولاد بھی ہوگی۔ لیکن اس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا کیا اور آپ کے اس ارشاد کو محمدی بیگم کے ساتھ اپنے نکاح کی پیشین گوئی بنالیا۔
لیکن اللہ تعالیٰ نے مرزا صاحب کی اس پیشین گوئی کو غلط ثابت کرکے ساری دنیا کو اس حقیقت کا گواہ بنادیا کہ اس شخص نے خدا پر اور اس کے رسول پر یہ سب افترا کیا تھا۔
اسی سلسلہ میں ضمیمہ انجام آتھم کے اسی صفحہ ۵۳ کی ایک عبارت اور بھی سن لیجیے۔ مرزا صاحب کے جن مخالفین نے محمدی بیگم کا نکاح مرزا صاحب سے نہ ہونے اور سلطان محمد سے ہوجانے اور پھر پیشینگوئی کی مدت یعنی اڑھائی سال میں سلطان محمد کے نہ مرنے پر فاتحانہ خوشیاں منائیں ان کے متعلق مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

"سو چاہیئے تھا کہ ہمارے نادان مخالف انجام کے منتظر رہتے اور پہلے ہی سے اپنی بدگوہری ظاہر نہ کرتے۔ بھلا جس وقت یہ سب باتیں پوری ہو جائیں گی تو اس دن یہ احمق مخالف جیتے ہی رہیں گے اور کیا اس دن یہ تمام لڑنے والے سچائی کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو جائیں گے۔ ان بے وقوفوں کو کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں رہے گی اور نہایت صفائی سے ناک کٹ جائے گی اور ذلت کے سیاہ داغ ان کے منحوس چہروں کو بندروں اور سوروں کی طرح کر دیں گے۔"

(ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۵۳)

پھر چند سطر کے بعد اسی سلسلۂ بیان میں لکھتے ہیں

"یاد رکھو کہ اس پیشین گوئی کی دوسری جز (یعنی سلطان محمد کا مرزا صاحب کے سامنے مرنا اور محمدی بیگم کا بیوہ ہو کر مرزا صاحب کے نکاح میں آنا۔م) پوری نہ ہوئی تو میں ہر ایک بد سے بدتر ٹھہروں گا۔ اے احمقو! یہ انسان کا افترا نہیں یہ کسی خبیث مفتری کا کاروبار نہیں یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کا سچا وعدہ ہے۔ وہی خدا جس کی باتیں نہیں ٹلتیں۔ وہی رب ذوالجلال جس کے ارادوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔"

(ضمیمہ انجام آتھم ص۵۴)

یہ عبارتیں مرزا صاحب کی صرف ایک کتاب انجام آتھم اور اس کے ضمیمہ کی ہیں جو ۱۸۹۶ء کے آخر کی تصنیف ہے اس کے بعد مرزا صاحب قریباً ۱۱، ۱۲ برس زندہ رہے اور مئی ۱۹۰۸ء میں انتقال کر گئے اور ان پیشین گوئیوں کا یہ حشر ہوا کہ نہ سلطان محمد ان کے سامنے مرا اور نہ محمدی بیگم ان کے نکاح میں آئی ــــ اب اگر اللہ تعالیٰ نے آپ حضرات کو کچھ بھی سمجھ دی ہے تو آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مرزا صاحب کے یہ سارے اعلانات اور ان کی یہ پیشین گوئیاں کتنے روشن طریقہ پر غلط ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کا جھوٹا اور مفتری ہونا کتنی صفائی سے ثابت کر دیا۔

میں نے بیان کیا تھا کہ اس سلسلہ میں مرزا صاحب کی ایک پیشین گوئی تاریخ کے تعین کے ساتھ یہ تھی کہ سلطان محمد یوم نکاح سے ڈھائی سال تک ضرور مر جائے گا ــــ چناں چہ اسی پیشین گوئی کی بنیاد پر انھوں نے اپنی کتاب شہادۃ القرآن میں ۲۱ ستمبر ۱۸۹۳ء کو لکھا ہے کہ "آج کی تاریخ سے قریباً گیارہ مہینے باقی رہ گئے ہیں۔" (ص۸۰) ــــ اس حساب سے سلطان محمد کو ۲۱ اگست ۱۸۹۴ء تک مر جانا چاہیئے تھا ــــ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس پیشین گوئی کو جھوٹا کر دیا اور سلطان محمد کو اس تاریخ تک بھی موت نہیں آئی تو مرزا صاحب نے بڑی دیدہ دلیری اور بیباکی سے کہنا شروع کیا کہ اس کی موت فلاں وجہ سے کچھ ٹل گئی ہے

لیکن بہر حال میرے سامنے ضرور مر جائے گا یہ اللہ کی تقدیر مبرم ہے یعنی اللہ کی یہ اٹل اور قطعی تقدیر ہے اور اب اس میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں ہے۔ چناں چہ سلطان محمد کی موت کی میعاد گزرنے کے بعد انجام آتھم میں آپ نے لکھا ہے

"میں بار بار کہتا ہوں کہ نفس پیشین گوئی داماد احمد بیگ کی تقدیر مبرم ہے اس کی انتظار کرو اور اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیشین گوئی پوری نہیں ہوگی اور میری موت آجائیگی۔" (ص ۳۱)

اور اس کے متعلق اسی انجام آتھم کے عربی حصہ میں لکھا

والقدر قدر مبرم من عند الرب العظیم وسیاتی وقتہ بفضل اللہ الکریم فو الذی بعث لنا محمد المصطفیٰ وجعلہ خیر الرسل وخیر الوریٰ ان ھٰذا حق فسوف تریٰ وانی اجعل ھٰذا النبأ معیار الصدقی وکذبی۔ وما قلتُ الّا بعد ما انبئت من ربّی۔

(انجام آتھم ص ۲۲۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطان محمد کی موت اللہ تعالیٰ کی تقدیر مبرم ہے (یعنی اٹل اور قطعی تقدیر ہے) اور اللہ کے فضل سے عن قریب اس کا وقت آیا چاہتا ہے، پس قسم ہے اس خدا کی جس نے حضرت محمد کو ہمارے لیے مبعوث فرمایا اور اس کو خیر الرسل اور بہترین مخلوقات بنایا کہ یہ پیشین گوئی بالکل حق ہے اور تم عنقریب اس کو آنکھوں سے دیکھ لوگے اور میں اس پیشین گوئی کو اپنے جھوٹے اور سچے ہونے کا معیار قرار دیتا ہوں اور یہ بات میں جب کہہ رہا ہوں کہ میرے پروردگار کی طرف سے مجھے اس کی خبر دی گئی ہے۔

بہر حال مرزا صاحب نے محمدی بیگم کے نکاح اور اس کے شوہر سلطان محمد کی موت کی پیشین گوئی اتنے زور سے کی کہ کوئی زوردار اور وزن دار لفظ اٹھا نہیں رکھا، کہا کہ یہ اللہ کی تقدیر مبرم ہے، اللہ اس کو ضرور پورا کرنے والا ہے اور میں اس کو اپنے سچے اور جھوٹے ہونے کا معیار قرار دیتا ہوں، اگر یہ سب باتیں پوری نہ ہوں تو میں جھوٹا ہوں اور ہر بدے بدتر ہوں اور جب وقت یہ سب باتیں پوری ہوں گی تو میرے ان بیوقوف مخالفوں کی نہایت صفائی سے اس دن ناک کٹ جائے گی اور ذلت کے سیاہ داغ ان کے منحوس چہروں کو بندروں اور سوروں کی طرح کر دیں گے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سب تعلیوں اور دعووں کو ایسی صفائی سے جھوٹا ثابت کیا اور خاک میں

ملایا کہ کسی کے لیے دھوکہ فریب اور کسی مغالطہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ یہ سب عبارتیں مرزا صاحب کی کتابوں میں آج تک موجود ہیں اور مرزا صاحب مئی ۱۹۰۸ء میں اس دنیا سے اس حال میں چلے گئے کہ سلطان محمد زندہ تھا اور محمدی بیگم اس کی بیوی تھی اور پھر اللہ تعالیٰ نے سلطان محمد کو اتنی لمبی عمر دی کہ ابھی چند سال ہوئے اللہ کے اس بندہ کا انتقال ہوا ہے، گویا مرزا صاحب کے بعد قریباً ۳۰۔۴۰ برس وہ بندۂ خدا زندہ رہا اور اس طویل مدت کا ہر دن مرزا صاحب کے کاذب اور مفتری ہونے کی شہادت دنیا کے سامنے پیش کرتا رہا۔

اس عاجز نے مرزا صاحب کی جانچ کے لیے جو چار اصولی باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھنے کا ارادہ کیا تھا ان میں سے دو تو میں پہلے پیش کر چکا تھا اور تیسری اصولی بات ان کی ان خاص پیشین گوئیوں سے متعلق تھی جن کو خود انھوں نے اپنے سچے یا جھوٹے ہونے کا معیار قرار دیا تھا، ان میں سے میں نے صرف ان ہی دو پیشین گوئیوں کو آپ حضرات کے سامنے رکھا ہے جن کو خود مرزا صاحب نے زیادہ اہمیت دی تھی یعنی ڈپٹی آتھم والی اور محمدی بیگم والی پیشین گوئی ـــــ یہ عاجز پوری ایمانداری اور دیانتداری سے کہتا ہے کہ اگر مرزا صاحب میں کسی دوسرے پہلو سے کوئی کمی کسر نہ ہوتی تب بھی صرف ان ہی دو پیشین گوئیوں کا غلط نکل جانا اس بات کے لیے کافی دلیل ہوتا کہ مرزا صاحب ہرگز اللہ تعالیٰ کے فرستادہ اور اس کے مامور نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی اور کسی مامور کو ہرگز اس طرح ذلیل نہیں کر سکتا جس طرح کہ مرزا صاحب ان دو پیشین گوئیوں میں ذلیل ہوئے۔

میرا تو خیال ہے کہ نبوت و رسالت تو بڑی چیز ہے اگر کوئی بھی غیرت مند آدمی اتنا ذلیل ہوا ہوتا تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی اپنے کو نہ سمجھتا ـــ مگر اللہ کی شان ہو کہ ان سب باتوں کے باوجود مرزا صاحب کے دعوے بھی برابر جاری رہے اور ان کو نبی ماننے والے بھی ملتے رہے اور اب تک مل رہے ہیں، لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہمارے اس ملک میں ایک قوم کی قوم موجود ہے جو جانوروں کو پوجتی ہے درختوں کو پوجتی ہے دریاؤں کو پوجتی ہے پتھروں کو پوجتی ہے اور صرف بے پڑھے اور گنوار ہی نہیں بلکہ ان چیزوں کی پرستش کرنے والوں میں اچھے اچھے گریجویٹ اور علم و عقل والے بھی ہیں۔ اصل بات یہ ہو کہ "مَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ"

مرزا صاحب کی جانچ کے سلسلہ میں اب چوتھی اصولی بات مجھے یہ کہنی ہے کہ اللہ کے کسی پیغمبر سے ناممکن ہے کہ وہ اپنے وقت کی کسی ایسی طاقت و حکومت کی خوشامد و چاپلوسی اور اس کے ساتھ

اپنی مخلصانہ وفاداری اور محبت کا اظہار کرے جو کفر اور بے دینی کا ستون ہو اور جس کے عروج اور غلبہ سے کفر اور بے دینی کو عروج ہوتا ہو اور دنیا میں خدا فراموشی اور آخرت سے بے فکری اور مادہ پرستی اور نفس پرستی بڑھتی ہو۔

مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگ انگریزی حکومت اور اس کی تاریخ کو کچھ جانتے ہیں یا نہیں اور اس حقیقت سے آپ واقف ہیں یا نہیں کہ پچھلی چند صدیوں میں یورپین قوموں اور خاص کر انگریزوں کے حکومتی اقتدار نے دین کو اور خدا پرستی کو کتنا زبردست نقصان پہنچایا ہے اور مادہ پرستی اور نفس پرستی کو دنیا میں کتنا بڑھایا اور پھیلایا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں کافر حکومتیں پہلے بھی ہوئی ہیں، لیکن غالباً کبھی کسی حکومت کے اثر اور اقتدار نے لوگوں کو خدا سے اتنا بے تعلق اور دین اور آخرت کی طرف سے اتنا بے فکر نہیں کیا ہوگا جتنا کہ اس زمانہ میں یورپ کی حکومتوں کے اثرات نے لوگوں کو خدا اور آخرت فراموش بنایا ہے ــــ اور خصوصاً انگریزوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو دینی اور سیاسی نقصان پہنچایا ہے اور جس طرح ان کو تباہ و برباد کیا ہے اس کا تو حساب بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ جو ممالک پہلے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے ان میں سے ایک ایک کو سامنے رکھ کر سوچیے کہ کس قوم اور کس حکومت کی مکاری اور غداری نے مسلمانوں کو ان ملکوں سے بے دخل کیا اور اپنا غلام بنایا قریب قریب سب جگہ انگریزوں ہی کا ہاتھ نظر آئے گا۔

الغرض اس حقیقت میں کسی کو شبہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ اس زمانہ میں دین و ایمان اور روحانیت اور خدا پرستی کو سب سے زیادہ نقصان یورپین قوموں کے سیاسی غلبہ نے پہنچایا ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ دینی اور سیاسی نقصان خاصکر انگریزوں نے پہنچایا ہے در یہ حکومتیں اس وقت کی فرعونی اور نمرودی حکومتیں ہیں اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ اگر بالفرض نبوت ختم نہیں ہوئی ہوتی اور نبیوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغمبر اس زمانہ میں آتا تو وہ ان یورپین حکومتوں کی اور خاص کر انگریزی حکومت کی ہرگز تعریف نہ کرتا، ہرگز ان کو خدا کی نعمت اور رحمت نہ بتاتا بلکہ اس دور کی سب سے بڑی لعنت ان ہی حکومتوں کو قرار دیتا ــــ لیکن مرزا صاحب کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا رویہ اس معاملہ میں بالکل دنیا داروں اور حکومت پرست خان بہادروں کا سا بلکہ نہایت ذلیل اور گھٹیا قسم کے حکومت پرستوں کا سا ہے اور انھوں نے اپنی کتابوں میں جابجا انگریزی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری اور وابستگی اور خیر خواہی اور "دعا گوئی" کا ایسا گھنونا مظاہرہ کیا ہے کہ میں نے تو کبھی کسی ذلیل سے ذلیل "خان بہادر" کی بھی کوئی ایسی تحریر نہیں دیکھی۔ میں اس وقت ان کی اس سلسلہ کی بھی صرف ایک ہی عبارت

آپ کو سناتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں یہ ان کی کتاب "شہادۃ القرآن" ہے اسی کے ساتھ ان کا ایک مضمون چھپا ہوا ہو جس کا عنوان ہے۔ "گورنمنٹ کی توجہ کے لائق"۔۔۔ اس میں پہلے تو مرزا صاحب نے یہ لکھا ہو کہ گورنمنٹ کے (یعنی انگریزی سرکار کے) احسانات ہمارے خاندان پر ہمارے والد میرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے وقت سے برابر ہوتے رہے ہیں اور اس لیے اس گورنمنٹ کی شکرگزاری میرے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی ہو۔[1] پھر گورنمنٹ کے ساتھ اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی میرزا غلام قادر کی وفاداری اور خیرخواہی کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء میں گورنمنٹ کی کیسی کیسی مدد کی اور اس کے واسطے کیسی کیسی جانی اور مالی انھوں نے قربانیاں دیں اور اس کے صلہ میں گورنمنٹ نے کیسے کیسے احسانات کیے، اور کیا کیا صلے دیئے، یہ سب پوری تفصیل سے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

ہم اپنی معزز گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اس گورنمنٹ کے اسی طرح مخلص اور خیرخواہ ہیں جس طرح کہ ہمارے بزرگ تھے۔ ہمارے ہاتھ میں بجز دعا کے اور کیا ہے سو ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس گورنمنٹ کو ہر ایک شر سے محفوظ رکھے اور اس کے دشمن کو ذلت کے ساتھ پپا کرے۔ خدا تعالیٰ نے ہم پر محسن گورنمنٹ کا شکر ایسا ہی فرض کیا ہے جیسا کہ اس کا شکر کرنا، سو اگر ہم اس محسن گورنمنٹ کا شکر ادا نہ کریں یا کوئی شر اپنے ارادہ میں رکھیں تو ہم نے خدا تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہ کیا کیونکہ خدا تعالیٰ کا شکر اور کسی محسن گورنمنٹ کا شکر جس کو خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو بطور نعمت کے عطا کرے در حقیقت یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور ایک دوسری سے وابستہ ہیں اور ایک کے چھوڑنے سے دوسری کا چھوڑنا لازم آجاتا ہے۔ بعض احمق اور نادان سوال کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں۔ سو یاد رہے کہ یہ سوال ان کا نہایت حماقت کا ہے کیوں کہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے اس سے جہاد کیسا۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے۔ سو میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں ایک خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں ہمیں پناہ دی ہو۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔" (ص۳)

---

[1] خط کشیدہ الفاظ بعینہ مرزا صاحب کے ہیں۔

یہ مرزا صاحب کی عبارت ہے، بس یہ ان کا دین و مذہب ہے اور یہ ان کی پیغمبری ہے، آپ لوگوں کے احساسات کا حال مجھے معلوم نہیں لیکن میں تو صاف کہتا ہوں کہ اس عبارت کے پڑھنے کے بعد میں ان کو نہایت ہی ذلیل ذہنیت کا ایک سرکار پرست آدمی سمجھتا ہوں —— اور اس قسم کی ان کی یہ ایک ہی عبارت نہیں ہے، انگریزی سرکار کی خوشامد میں اس شخص نے بیسوں جگہ اس سے بھی زیادہ ذلیل قسم کی باتیں لکھی ہیں، معلوم نہیں ان کو نبی ماننے والوں نے نبوت کو کیا سمجھا ہے —— سچی بات یہ ہے کہ اگر ایسا شخص نبی ہوسکتا ہے تو شاید ہر بھلا آدمی پھر خدا ہوسکتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

خیر! چونکہ اس وقت کی میری گفتگو کا مقصد، مرزا صاحب کی جانچ اور قادیانیت پر غور کرنے کا بس ایک صحیح طریقہ اور راستہ بتانا ہے اس لیے نمونے کے طور پر گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری کے سلسلہ کی ان کی صرف یہی ایک عبارت پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

اب میں آپ حضرات سے کہتا ہوں کہ میری چاروں اصولی باتیں آپ نے سن لیں اور غالباً سمجھ بھی لی ہوں گی کیونکہ ان میں کوئی باریک علمی بات نہیں ہے، سیدھی سیدھی موٹی باتیں ہیں اور الحمد للہ دو اور دو چار کی طرح یقینی اور پکی ہیں —— آخر کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ

کسی نبی سے ہرگز یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے سے پہلے کسی پیغمبر کی اہانت اور تنقیص کرے اور اخلاقی گندگیوں کو اس کی طرف منسوب کرے

اور کون اس میں شک کرسکتا ہے کہ کسی نبی سے ہرگز یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے صاف صاف غلط بیانی کرے اور جھوٹ بولے۔

اسی طرح ہرگز یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے حکم سے اور اللہ کی وحی سے کوئی سچا نبی تعیین تاریخ کے ساتھ کوئی پیشین گوئی کرے اور اس کو اپنے صدق و کذب کا نشان اور معیار قرار دے اور اللہ اسی پیشین گوئی کے خلاف ظاہر کرکے اس کا جھوٹا اور مفتری ہونا دنیا پر ثابت کردے۔

اسی طرح کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ نبی و رسول جو اللہ کا نائب اور نمائندہ ہوتا ہے وہ ذلیل قسم کے سرکار پرست خان بہادروں اور دنیا کے کتوں کی طرح گورنمنٹ برطانیہ جیسی کسی حکومت کی ایسی ذلیل خوشامد ہرگز نہیں کرسکتا جس کا نمونہ ابھی آپ نے دیکھا، نبوت تو بہت بلند مقام ہے میرے نزدیک تو یہ کسی شریف آدمی کا بھی کام نہیں ہے —— اگر کسی شریف آدمی کی طرف یہ باتیں منسوب کی جائیں تو وہ اسکو اپنی سخت توہین اور گالی سمجھے گا۔

بہرحال یہ چار وہ سیدھی اور سچی اصولی باتیں ہیں جن سے انکار اور اختلاف کرنے کی کسی کے لیے قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اور آپ نے دیکھ لیا کہ مرزا غلام احمد ان چاروں چیزوں میں بری طرح ملوث اور آلودہ ہیں۔

اس لیے اگر بالفرض نبوت ختم نہ بھی ہوئی ہوتی اور انبیاء کی آمد کا سلسلہ جاری ہوتا تب بھی مرزا غلام احمد کے نبی ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کسی ایسے آدمی کو نبی اور رسول بنا کر نہیں بھیج سکتا جو انسانی شرافت کے معیار سے اتنا گرا ہوا ہے۔ ایسے کسی آدمی پر ہرگز خدا کی وحی نہیں آسکتی۔ ہاں ایسے لوگوں پر شیطانی وحی آیا کرتی ہے اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ[1] یعنی ہم تم کو بتلاتے ہیں کہ شیطان کن لوگوں پر اترتے ہیں وہ جھوٹ بولنے والوں اور افترا پردازوں پر اور پاپیوں پر اترتے ہیں۔۔۔۔ پس اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو جھوٹ بولتا ہو افترا کرتا ہو اور جس کی زندگی پاک اور ستھری نہ ہو اس پر خدا کی وحی نہیں آتی بلکہ شیطان آتے ہیں۔۔۔

اب آپ دیکھ لیجیے کہ مرزا صاحب میں "افاک" اور "اثیم" ہونے کی صفت کتنی نمایاں ہے۔ بہرحال اگر بالفرض نبوت جاری ہوتی جب بھی مرزا صاحب کے نبی ہونے کا ہرگز کوئی امکان نہ تھا وہ تو کھلے ہوئے افاک اور اثیم ہیں۔

اور میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں صرف فرضی طور پر کہہ رہا ہوں ورنہ میں شروع ہی میں آپ کو بتلا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین اور شریعت کو مکمل کر دیا اور پھر قیامت تک اس کی حفاظت کی بھی خود ہی ذمہ داری لے لی اور اپنی خاص قدرت سے اس کا پورا انتظام بھی فرما دیا۔

اور اس طرح نبوت کی ضرورت کو ختم فرما کر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے ختم کیے جانے کا بھی قرآن پاک میں اعلان فرما دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں میں بھی اس کا صاف صاف اعلان فرمایا اور اس لیے ساری امت کا یہی عقیدہ اور یہی ایمان رہا کہ نبوت کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا اور اب کبھی دنیا میں کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اور قیامت تک پیدا ہونے والے ہر انسان کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپ کی پیروی کرنا کافی ہے اور حضرت کی نبوت اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ کے لیے کفایت کرنے والی ہے۔۔۔۔ بہرحال اصلی عقیدہ اور ایمان تو یہ ہے اور اس بنا پر اب کسی شخص کے بھی نبی ہونے کا کوئی امکان نہیں اور جو شخص بھی اب نبوت کا دعویٰ کرے ہم اس کو کاذب اور اللہ پر افترا کرنے والا سمجھیں گے حتیٰ کہ اگر بالفرض سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسی پاک سیرت رکھنے والا کوئی بزرگ بھی نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے تو ہم اس کو بھی لیا

---

[1] (سورۂ شعراء)

ہی سمجھیں گے اور میں اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اگر بالفرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی یہ دعویٰ کرتے تو امت انکے ساتھ بھی وہی معاملہ کرتی جو خود انھوں نے مسیلمہ کذاب کے ساتھ کیا۔

بہرحال ہمارا اصل عقیدہ اور ایمان تو یہ ہے لیکن اگر بالفرض نبوت کا سلسلہ جاری بھی ہوتا تب بھی مرزا غلام احمد جیسے اخلاق اور اوصاف رکھنے والے کسی آدمی کے لیے اس مقام اور منصب کا کوئی امکان نہ تھا۔

کسی شخص کے حق میں سخت تنقید اور سخت الفاظ بولنا مجھے گراں ہوتا ہے لیکن مرزا غلام احمد کے بارہ میں میں اسکی ضرورت سمجھتا ہوں کہ اپنے دل پر جبر کر کے اپنی طبیعت اور ذوق کے خلاف صاف صاف کہوں کہ وہ شخص معمولی درجہ کے اخلاق سے بھی خالی تھا، جتنی دیانت اور سچائی اور جتنی غیرت اور شرافت اوسط درجہ کے لوگوں میں ہوتی ہے اس شخص میں اتنی بھی نہیں تھی ـــــ اور میں صاف کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مجھ جیسا گنہگار امتی بھی مرزا صاحب سے زیادہ دیانت اور صداقت الحمدللہ اپنے اندر رکھتا ہے۔

میں نے اس صحبت میں آپ حضرات کے سامنے مرزا صاحب اور ان کے دعووں کے بارہ میں غور و فکر کا یہ اصولی طریقہ رکھنے ہی کا ارادہ کیا تھا۔ اب آپ حضرات میں سے جس کو اس بارہ میں کچھ سوچنا اور غور کرنا ہو وہ بڑی آسانی سے غور کر سکتا ہے اور دو اور دو چار کی طرح ایک یقینی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے ـــــ باقی کسی کو ہدایت دینا تو اللہ کے اختیار میں ہے۔"

یہ عاجز جب اپنی یہ بات پوری کر کے خاموش ہوا تو ایک قادیانی صاحب نے بڑی شکایت اور ناگواری کے ساتھ کہا کہ ہم تو اس لیے جمع ہوئے تھے کہ حیات مسیح اور اجراء نبوت کے مسئلوں کے متعلق آپ کچھ سوال کریں گے اور آپ قرآن شریف سے ہمیں اس کا جواب دیں گے۔ لیکن آپنے ہمیں کچھ کہنے اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت کے متعلق تقریر شروع کر دی۔

میں نے کہا کہ آپ کا خیال اور ارادہ ایسا ہی ہوگا، لیکن میں تو آپکے خیال یا ارادہ کا پابند نہیں، آپ مجھے نہیں جانتے ہوں گے لیکن میں قادیانیت کو اور قادیانیوں کو خوب جانتا ہوں اور میرے نزدیک قادیانیت کے بارہ میں غور کرنے کا صحیح طریقہ اور راستہ یہی ہے جو میں نے آپکے سامنے رکھا ہے اس طرح مرزا صاحب کی حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے اور ان کی نبوت کا پردہ کھل جاتا ہے اور معمولی سے معمولی سمجھ رکھنے والوں کے لیے بھی ان کے دعووں کے بارہ میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے اور کسی

شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی ــــ لیکن ہاں میں جانتا ہوں کہ قادیانی صاحبان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوا کرتی ہے کہ مرزا صاحب کے متعلق گفتگو نہ ہو بلکہ حیات وممات مسیح جیسے مسائل پر بات ہو تاکہ ناواقف لوگ یہ سمجھیں کہ ہم مسلمانوں میں اور قادیانیوں میں اصل اختلاف بس اتنا ہی ہو کہ بعض آیتوں اور حدیثوں کے معنی ہمارے علماء کچھ اور بیان کرتے ہیں اور قادیانی کچھ اور سمجھتے ہیں اور اس طرح وہ لوگ قادیانیوں کو بھی مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ جانیں ــــ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اور قادیانیوں کے اختلاف کی نوعیت دوسرے اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات سے بالکل مختلف ہے ــــ قادیانی صاحبان ایک شخص کو نبی مانتے ہیں اور نبی کی طرح اس کی ہر بات اور ہر مسئلہ پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں اور جو شخص ان کو نہ مانے اس کو کافر سمجھتے ہیں جیسے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر ہدایت اور ہر تعلیم کا ماننا اور اس پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں اور آپ کے منکروں کو کافر جانتے ہیں تو قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی اصل بنیاد کوئی بار یک علمی مسئلہ نہیں ہے بلکہ مرزا غلام احمد کی شخصیت اور ان کا دعوائے نبوت ہے اور ہمارے نزدیک اس کی جانچ پڑتال کا یہ بھارا راستہ یہی ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے۔ اور اس لیے میرا یہ اصول ہے کہ اگر کوئی شخص قادیانیت کے بارہ میں مجھ سے کچھ بات کرنا چاہے اور میں اس سے کچھ کہنا مفید اور مناسب سمجھوں تو پہلے یہی اصولی باتیں اس کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ اگر اس میں کچھ بھی حق پرستی ہوتی ہے تو ان سیدھی سادھی اور بالکل بدیہی باتوں کے سامنے آجانے کے بعد اس کا ذہن مرزا صاحب کے بارہ میں بالکل صاف ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اس اطمینان کا اظہار کر دیتا ہے کہ اب میں مرزا صاحب کو کاذب اور مفتری سمجھتا ہوں (جیسا کہ ان باتوں کے سامنے آنے کے بعد سمجھنا چاہیئے) پھر اگر وہ حیات وممات مسیح کے بارہ میں بھی بات کرنے اور سمجھنے کا خواہش مند ہوتا ہے تو ہیں اسکو سمجھانے کی بھی کوشش کرتا ہوں ــــ اور اگر مرزا صاحب کے بارہ میں اس کا ذہن صاف نہیں ہوتا اور وہ ان سے اپنی بے زاری ظاہر نہیں کرتا تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ شخص نہایت ہٹ دھرم ہے اور اس میں قبول حق کی بالکل صلاحیت نہیں ہے پھر اس سے بات کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنا میں بالکل درست نہیں سمجھتا اور خواہ مخواہ اپنی قابلیت اور ہمہ دانی کے اظہار کے لیے وقت خراب نہیں کرتا ــــ

ہاں پہلے ایک زمانہ میں جب اپنے وقت کی اتنی قیمت نہیں سمجھتا تھا تو ایسا بھی کر لیا کرتا تھا۔ اور صرف بحث کے لیے اور دوسرے کو قائل کرنے کے لیے بھی وقت صرف کر دیا کرتا تھا، لیکن اب میں اپنا وقت صرف ضروری اور مفید کاموں ہی پر صرف کرنا چاہتا ہوں ــــ اس لیے آپ حضرات سے

بھی میں یہی کہتا ہوں کہ اگر میری اس گفتگو کے بعد مرزا صاحب کی شخصیت کے بارہ میں آپ کا ذہن صاف ہو گیا ہو اور آپ کے دل نے ان باتوں کو قبول کر لیا ہو جو میرے نزدیک بالکل قطعی اور بدیہی ہیں تو بسم اللہ میں بڑی خوشی سے حیات مسیح کا مسئلہ سمجھانے کے لیے بھی اسی طرح اور ابھی تیار ہوں اور انشاء اللہ آپ اس کے بارہ میں بھی ابھی مطمئن ہو جائیں گے لیکن اگر آپ سب کچھ سننے کے بعد بھی مرزا صاحب کو "حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام" ہی مانتے ہوں، تو پھر میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ حق کے متلاشی نہیں ہیں اور کسی بات کے ماننے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں صرف اپنی قابلیت جتانے کے لیے آپ پر مزید وقت صرف کرنا میں صحیح نہیں سمجھوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اس کی توفیق سے میرا وقت اچھے کاموں پر صرف ہوتا ہے اور جن باتوں کو میں لایعنی سمجھتا ہوں حتی الامکان ان سے بچنے کی اور اپنے وقت کو بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔[1]

اس کے بعد ان ہی قادیانی صاحب نے کہا کہ جو باتیں آپ نے "حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام" کے متعلق بیان کی ہیں ان سب کا بھی جواب ہے، لیکن وہ جواب ہم نہیں دے سکتے بلکہ ہمارے جن عالموں کا یہ کام ہے وہ آپ کو جواب دیں گے لہٰذا آپ اس کے لیے کوئی وقت مقرر کریں ہم اپنے کسی عالم کو بلانے کا انتظام کریں گے۔

میں نے کہا ـــــ یعنی آپ مناظرہ کے لیے میرا وقت چاہتے ہیں؟ ـــــ انھوں نے کہا، جی ہاں!

میں نے کہا ـــــ قادیانی مناظرین کو میں خوب جانتا ہوں۔ اپنے پرانے زمانہ میں ان کا میں نے کافی تجربہ کیا ہے ان میں قبول حق کی ادنیٰ صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ انتہائی درجہ کے ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔ جو کچھ میں نے مرزا صاحب کے متعلق آپ کو بتلایا ہے ہر قادیانی مناظر ان سب باتوں کو خوب جانتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ مرزا صاحب کا کلمہ پڑھتا ہے ان کو نبی مانتا ہے اور نبی ثابت کرنا چاہتا ہے، اس لیے ان پر اتمام حجت بھی ہمارے ذمہ نہیں رہا۔ کوئی قادیانی مناظر اب ایسا نہیں ہے جو خدا کے سامنے یہ کہہ سکے کہ میں مرزا صاحب کے ان پہلوؤں کو نہیں جانتا تھا "قد تبین الرشد من الغی" اور اس کا نمونہ خود آپ موجود ہیں ـــــ جو کچھ میں نے مرزا صاحب کے متعلق کہا وہ سب آپ نے ان کی کتابوں سے سنا۔ اور ان میں سے کسی ایک بات کا بھی آپ کے ذہن میں کوئی جواب اور کوئی معقول تاویل نہیں ہے، اس کے باوجود ابھی تک آپ بے تکلف مرزا صاحب کو "حضرت اقدس موعود" کہتے ہیں، دراصل یہی وہ کھلی ہوئی ہٹ دھرمی ہے جس کے تجربہ کے بعد ہم ایسے لوگوں پر زیادہ وقت صرف کرنا فضول سمجھتے ہیں۔ اگر آپ میں حق پرستی کا کوئی ذرہ بھی ہوتا تو آپ

---

[1] حدیث شریف میں ہے "من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ" یعنی کسی آدمی کے مسلمان ہونے کی خوبی اور اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ان کاموں میں نہ پڑے جو مفید نہ ہوں۔ ۱۲

کم از کم یہ کہتے کہ یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ اگر یہ صحیح ہیں تو مرزا صاحب ہرگز نبی یا مسیح موعود نہیں ہو سکتے لیکن ہم اس پر ذرا غور کریں گے اور تحقیق کریں گے۔ لیکن آپ کا حال یہ ہو کہ یہ سب سننے کے بعد بھی آپ ان کو نبی اور مسیح موعود ہی مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم جواب نہیں دے سکتے مگر ان باتوں کا جواب ہو ضرور، اور وہ ہمارے مناظر صاحب دے سکیں گے!

۔۔۔ دراصل یہی وہ ذہنیت ہے جس کے بعد قبول حق کی توفیق نہیں ہوتی اور آپ کے مناظرین میں یہ بات آپ سے بھی زیادہ ہوتی ہے اس لیے میں تو ان کو بالکل لائق خطاب نہیں سمجھتا اور ان کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان سے گفتگو کرنے پر منٹ بھی اپنے صرف کروں ۔۔۔ اگرچہ ایک زمانہ میں اس کام کا بھی شوق تھا لیکن اب میں اس کو اپنے وقت کی اضاعت سمجھتا ہوں ۔۔۔ اگر واقعی اللہ کا کوئی بندہ طالب تحقیق ہو تو اس کی خدمت کرنا اور اس پر وقت صرف کرنا اپنا فرض ہے اور اس کے لیے یہ عاجز ہر وقت حاضر ہے۔ اور حیات مسیح کا مسئلہ ہو یا اجراء نبوت کا الحمدللہ ان میں سے کسی مسئلہ پر بھی مجھے کسی تیاری کی بھی ضرورت نہیں لیکن آپکے مناظرین کو میں بالکل اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ ان سے گفتگو پر وقت صرف کروں۔ آپ نے جو کچھ مجھ سے سنا اللہ تعالیٰ توفیق دے تو بس اس پر غور کیجئے اور مرزا صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کی ضرور کوشش کیجئے اور ان کو سمجھنے کا سیدھا راستہ وہی ہے جو میں نے آپکے سامنے پیش کیا ہے۔ اس میں آپ کو اگر اپنے مناظرین سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو ان سے بات کیجئے! لیکن مجھے ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں میں انھیں اور ان کی باتوں کو خوب جانتا ہوں۔

نوٹ:۔ یہ گفتگو اپنے حافظہ کی مدد سے اور ان نوٹوں کی مدد سے جو اپنی عادت کے مطابق گفتگو سے چند منٹ پہلے کاغذ کے ایک پرچہ پر لکھ لیے تھے۔ کئی ہفتے کے بعد اب تحریر میں لائی گئی ہے اس لیے اس کا کافی امکان ہے کہ کوئی بات مجلس میں زیادہ تفصیل سے کہی گئی ہو اور اس تحریر میں اتنی تفصیل سے نہ آئی ہو، یا کوئی بات وہاں زیادہ تفصیل سے نہ کہی گئی ہو اور یہاں اس کا بیان زیادہ تفصیل سے ہو گیا ہو اس طرح الفاظ و طرز بیان میں بھی یقیناً بہت فرق ہو گیا ہو گا ۔۔۔ لیکن اس میں کوئی مضائقہ نہیں، خاص کر اس لیے بھی کہ مقصد اس مجلس کی روداد سنانا نہیں ہے، بلکہ قادیانیت کے متعلق غور کرنے کا جو اصولی راستہ اس مجلس میں پیش کیا گیا تھا بس اس کو قلمبند کر کے شائع کر دینا مقصود ہے تاکہ بوقت ضرورت اللہ کے بندے اس سے کام لے سکیں۔

تعارف وتبصرہ

(از۔ ع۔ س)

اساس دین کی تعمیر از، مولانا صدر الدین اصلاحی۔ شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی ہند رامپور
قیمت مجلد دو روپے ۔

دین میں بعض چیزیں دین کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں جن پر دین کی عمارت کے قیام وبقا کا انحصار ہے اصلاحی صاحب نے انھیں کو اساس دین سے تعبیر کیا ہے اور ان کی تعمیر کا طریقہ تبلایا ہے، پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تبلایا گیا ہے کہ کسی عمارت میں اساس کا کیا درجہ ہے اور اس کی پائیداری اور ناپائیداری میں اس کو کتنا دخل ہے، دین کی گرانباری اور عظمت شان کے پیش نظر اسکی اساس جتنی مستحکم اور فولادی ہونا چاہیئے ایسا استحکام اور ایسی اساسیت جن چیزوں میں پائی جاتی ہے وہ چار ہیں۔ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، نماز، صبر۔ انھیں چار چیزوں کو قرآن میں بھی اساسات دین کا درجہ دیا گیا ہے اور احادیث رسول میں بھی۔ حاملین اسلام کے اندر یہ بنیادیں جتنی گہری اور پائیدار ہوں گی ان کی زندگی اسلام سے اتنی ہی قریب ہوگی اور جتنی یہ بنیادیں کم گہری اور کمزور ہوں گی انکی زندگی اسی نسبت سے اسلام سے بیگانہ ہوگی" ـــــ اگلے چار ابواب میں انھیں چار چیزوں کی علی الترتیب الگ الگ تشریح کی گئی ہے جہاں قرآن وحدیث کی رو سے ان میں سے ہر ایک کی حقیقت، اہمیت اور اس کی اساسی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے اور خود ان اساسہائے دین کی تعمیر کے لیے جو طریقہ مصنف کے نزدیک صحیح اور استحکام بخش تھا۔ اس کی طرف بھی رہنمائی کردی گئی ہے ـــــ بات جو کچھ کہی گئی ہے۔ صاف سلجھے اور مدلل انداز میں کہی گئی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ خود ہمیں یا کسی اور کو مصنف کے بعض افکار سے اختلاف ہو (اور ایسے مواقع کتاب میں زیادہ نہیں ہیں) تنقید میں کہیں کہیں طنز ضرور شامل ہو گیا ہے جو نہ ہوتا تو بہت ہی اچھا ہوتا، مگر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ بڑے بڑے محتاطین کی تنقیدیں بھی اس سے نہیں بچ پائیں، ان کو معذور قرار دینا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس کتاب کے بارے میں تبصرہ نگار کا احساس یہ ہے کہ یہ جماعت اسلامی کے لٹریچر کے ایک بہت محسوس

ہونے والے خلا کو پر کرتی ہو اور جماعت کے اندر ایک خوش آئند تبدیلی کا پتہ دے رہی ہو جو اوپر کے طبقہ میں شروع ہو چکی ہے اگر یہ احساس صحیح ہے تو جماعت میں عام طور سے اس تبدیلی کے اثرات نمایاں ہونے کی امید رکھنی چاہیئے۔ خدا کرے یہ احساس غلط فہمی ثابت نہ ہو۔

مسلمانانِ ہند کا لائحہ عمل (از مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی امیر جماعت اسلامی ہند۔ رامپور (قیمت مجلد ہے)

گذشتہ سال ۱۹۵۱ء میں ہندیونین کے الکشن کے موقع پر امیر جماعت اسلامی ہند کا ایک رسالہ "مسئلہ انتخابات اور مسلمانان ہند" شائع ہوا تھا جس میں عقل ونقل کی روشنی میں مسلمانان ہند کو الکشن سے کنارہ کش رہنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ زیر نظر کتاب جو اس سے بہت زیادہ ضخیم ہے اسی کا دوسرا حصہ ہو جس میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ الکشن سے الگ رہ کر انھیں کسی مثبت کام پر اپنے قوائے فکر وعمل کو لگانا چاہیئے یا صرف اس منفی عمل ہی پر اکتفا کرلینا چاہیئے۔ اس حصہ میں ایک مثبت کام ان کے سامنے رکھا گیا ہو۔ وہ کام ہے شہادت حق جو اس امت کا فریضہ ہی نہیں، بلکہ مقصد وجود ہو مگر امت کا عموم ایک عرصہ سے اسکو چھوڑے ہوئے ہو لیکن اس وقت ایک نہیں متعدد ایسے موانع اور مشکلات ہیں جن کی موجودگی میں امت سے اس نصب العین کی طرف بازگشت کی توقع اس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک کہ موانع کو رفع کرنے کی تدبیر نہ بتلائی جائے یا مشکلات کو انگیز کرنے کا حوصلہ نہ پیدا کیا جائے چناں چہ کتاب کا کافی حصہ اس ضرورت کی نذر ہے ——— اللہ تعالیٰ مصنف محترم کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے ملت کی اہم ترین ضرورت پر قلم اٹھایا۔ یہ آرزو سیکڑوں دلوں کی آرزو ہو کہ پوری ملت اپنے صحیح منصب کی طرف بازگشت کرے۔ مگر یہ بات ان سے مخفی نہ ہونی چاہیئے کہ اس مقصد کے لیے جہاں یہ ضروری ہو کہ نصب العین کی اہمیت سمجھائی جائے، اس کے ساتھ ملت کی زندگی کا رشتہ درست کیا جائے، اسکی طرف پیش قدمی کے فوائد بتائے جائیں وہاں اس امر کا لحاظ بھی بہت ضروری ہو کہ بلا ضرورت کوئی اس قسم کی بات نہ چھیڑی جائے جو مناقشہ کا باعث بنے۔ ہمیں قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہو کہ کتاب میں کسی جگہ اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ہمارے خیال میں کتاب میں کوئی نقص نہ رہ جاتا اگر مولانائے محترم "شہادت حق کی حقیقت" کے ذیل میں مروجہ طریقوں کی تنقیص وتغلیط اور "غلط روی کے اسباب" کی توضیح کے بجائے صرف اتنے پر اکتفا فرماتے کہ وہ شہادت حق کے جس طریقہ کو قرآن وحدیث کی رو سے صحیح اور صواب سمجھتے ہیں اس کو ملت کے سامنے رکھ دیتے اور اپنے دلائل وشواہد بھی پیش فرما دیتے۔ یہ بحث تو نہ صرف تصنیف کے کاز کو نقصان پہنچانے والی ہو بلکہ اتفاق سے

ان کی شہرت آگہی کو کبھی بٹہ لگانے والی ہو کیونکہ اس کو پڑھنے سے تو بہت صاف طور سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بعض مروجہ طریقوں کے متعلق مولانا کی معلومات بہت ناکافی درجہ کی ہیں بلکہ (مولانا معاف فرمائیں) "غلط العوام" کے قبیل کی ہیں۔ علیٰ ہٰذا اس تصنیف میں جمعیۃ العلماء کو رگڑنے کی بھی کوئی خاص ضرورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی اس کے لیے اور بہت سے میدان ہو سکتے ہیں ——— ہمارے خیال میں ان بے ضرورت باتوں کے کتاب میں جگہ پانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہو کہ مولانا مسلمانوں کو ایک لائحہ عمل دیتے وقت اپنی ایک مخصوص جماعتی حیثیت سے الگ نہ ہو سکے حالانکہ یہ کام اپنی ہر حیثیت کو بھول کر محض ایک مسلمان کی حیثیت سے کرنے کا تھا۔ خدا کرے وہ ہماری ان معروضات پر غور فرما کر اس کتاب کو مفید تر بنانے کی کوشش فرما سکیں۔

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مترجمہ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی رامپور، قیمت (۱۲؍)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا تھا جس میں آپ نے اپنی خداداد بصیرت سے امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے اندر رونما ہونے والے دینی (خصوصاً فقہی) اختلافات کی نہایت منصفانہ اور تشفی بخش توجیہہ فرمائی ہے۔ اس کے مطالعہ سے ایک طرف اختلافات کی اصل نوعیت اور ان کے فطری اسباب کا علم ہوتا ہے اور دوسری طرف ان اختلافات کو اعتدال اور توازن کے ساتھ نباہنے کی راہ ملتی ہے۔ شاہ صاحب کے اس رسالہ کی اشاعت اگر عام ہو تو امید ہو کہ امت کے مختلف المسلک عناصر کے درمیان اختلافات کو پابند حدود نہ رکھنے اور ان کی اصل حقیقت بھول جانے کی وجہ سے، جو کشیدگی بلکہ "منافرت" پیدا ہو گئی ہیں ان کی تخفیف میں بڑی مدد ملے گی۔ مولانا صدر الدین صاحب نے اس کا صاف اور سلجھی اردو میں ترجمہ کر کے ایک اچھی خدمت انجام دی ہو اور شاہ صاحبؒ کے ان افادات کے عام ہونے کی ایک راہ کھول دی ہو۔

دین کی باتیں

از، جناب ابو سلیم محمد عبد الحیٔ صاحب، مدیر رسالہ الحسنات رامپور (قیمت ۸؍)
ملنے کا پتہ مکتبہ الحسنات رامپور (یوپی)

یہ تالیف جماعت اسلامی کے پروگرام تعلیم بالغان کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ جس میں دین کی بنیادی باتیں اور ضروری تعلیمات نہایت آسان اور سادہ زبان میں جمع کر دی گئی ہیں۔ (یہ کہنے کی

ضرورت نہیں ہے کہ مؤلف دین کی تعبیر کے معاملہ ایک خاص ذوق اور طرز فکر رکھتے ہیں جو (غلط یا صحیح) جمہور کے ذوق و طرز سے بہرحال کچھ نہ کچھ مختلف ہو) لکھنے والے نے جن باتوں کو حق سمجھا ہو انھیں زمانہ کے تیوروں سے مرعوب ہوئے بغیر کہہ ڈالا ہو۔ بلاشبہ یہ جرأت بڑی قابل قدر ہے۔

پوری کتاب دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا جستہ جستہ کچھ مقامات دیکھے جا سکے اتفاق سے ص۳۰ پر بھی نظر پڑی، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے متعلق چند سطریں جادہ اعتدال سے بہت دور جا پڑی ہیں۔ اس سے زیادہ غیر متوازن رائے اس سے پیشتر دیکھنے میں نہیں آئی یا یاد نہیں۔

خطبات موعظت جلد اوّل یعنی خطبات جمعہ

از، جناب مولوی ذاکر حسن صاحب حنفی پھلتی۔ شائع کردہ کتاب گھر لبّے مسجد کراس بنگلور ۱ قیمت عہ مجلد۔ ۳۶۰ صفحات

اس جلد میں سال کے چھ مہینوں کے لیے جمعہ کے خطبے لکھے گیے ہیں۔ ہر مہینے کے لیے پانچ خطبے ہر خطبہ کے ساتھ اس کے مناسب وعظ بھی اردو زبان میں —— ان وعظوں کے متعلق فاضل مصنف کا خیال ہے کہ اگر جمعہ میں شریک ہونے والے عوام مسلمان ان کو غور سے سنّے اور ذہن میں محفوظ رکھنے کی کوشش کریں تو بقدر کفایت دین سے واقف ہو سکیں گے —— خطبات سے پہلے تقریباً پچاس صفحوں میں امامت، تولیت اور خطبہ کی عربیت وغیرہ جیسے ضروری امور پر بھی بحث کی گئی ہے۔ توثیق کے لیے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، و مولانا عبداللطیف صاحب مظاہری مدظلہ العالی وغیرہ کی تقریظین ابتدائی صفحات میں پیش کردی گئی ہیں۔

شرق اوسط میں کیا دیکھا؟

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی عربی تقریریں۔ مترجمہ شیر الحق صاحب بحری آبادی شائع کردہ مکتبہ تعلیمات اسلام، امین آباد لکھنؤ (قیمت مجلد عہ)

اس مجموعہ میں مولانا موصوف کے چھ چھوٹے چھوٹے شگفتہ مضامین ہیں۔ سب کے سب عربی دنیا سے متعلق ہیں جس کا تقریباً ڈیڑھ سال مسلسل مولانا قریب اور دور سے مشاہدہ اور مطالعہ فرماتے رہے۔ ان میں سے چار وہ ہیں جو آل انڈیا ریڈیو دہلی کی دعوت پر تقریر کی صورت میں ریڈیو پر نشر کیے گیے تھے۔ ان میں موصوف نے اپنے اس طویل سفر کی ڈائری کے چند منتخب اوراق پیش کیے ہیں جو ہر لحاظ سے قابل دید ہیں۔ ان اوراق میں گزری ہوئی صحبتیں ہیں، لوٹ لوٹ کر آتی ہوئی یادیں ہیں، محبت ہے، خلوص ہے، اعتراف ہے اور خیر سگالی کے جذبات ہیں۔ اس میں عربی دنیا کی زندگی کی ایک جھلک ہو خاصکر ان پہلوؤں کی جن سے کسی علم، دین اور ادب کی جامع شخصیت کو خصوصی دلچسپی ہو سکتی ہے —— ترجمہ کا واسطہ بیچ میں آجانے کے باوجود مشکل ہی سے کوئی صاحب ذوق اور ادب شناس ایک بار پڑھ کر آسودگی محسوس کر سکے گا۔ یہ چیز ترجمہ کی فنّی بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔ لائق مترجم کو مبارکباد پیش کرنے کے بعد صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ص۲۲ کی آخری سطر میں اگر "پکڑ سکتے ہیں" کے بجائے کوئی دوسرا لفظ رکھا جا سکتا ہو تو آئندہ ایڈیشن میں ترمیم۔

سچّی باتیں لندن۔ ۲ فروری۔ بحر شمالی کے ہولناک طوفان اور سیلاب سے ہلاک ہونے والوں کی میزان آج صبح تک ایک ہزار سے اوپر ہو چکی ہے ان کے علاوہ بیشمار افراد اب تک "لاپتہ" ہیں چنانچہ ۵۰۰ سے اوپر کا برطانیہ میں اور ۱۰۰۰ سے اوپر کا ہالینڈ میں اب تک پتہ نہیں ہے۔ ولندیزوں نے صدیوں کی محنت سے جو بڑے بڑے قطعات آراضی حاصل کیے تھے اور بڑی صناعی سے بند باندھے تھے۔ ان پر پانی پھر گیا۔ برفیلا پانی سڑکوں ہی پر نہیں، مکانوں کی چھتوں تک پر بہہ رہا ہے۔ اور اندازہ ہے کہ تباہ شدہ لوگوں کی تعداد ۱۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ آج صبح طوفانی لہروں نے اور قیامت خیز اضافہ کر دیا۔ نئی نئی لہریں اٹھیں اور ٹوٹے ہوئے بندوں سے نیا سیلاب خشکی میں گھس آیا۔ نڈھال اور بدحواس مرد، عورت، بچے، سب ان بندوں کی مرمت کے لیے بےبسی سے ہاتھ پاؤں مارتے دکھائی دے رہے تھے ——— یہ روداد آپ حضرت نوحؑ کے زمانہ کی نہیں سن رہے ہیں۔ خبر ہے روزناموں میں ۲ فروری ۱۹۵۳ء کی پڑھ رہے ہیں، ہر انتظامی تدبیر و احتیاط اور ساری انجینئری اور سائنس کی ہنرمندیوں کے باوجود! طوفان نوحؑ اب بھی محض قصہ کہانی ہی رہا؟

"جزیرہ کانوے جو لندن والوں کے لیے تفریح گاہ تھا۔ اب جزیرۂ موت بن گیا ہے۔ سارے جزیرہ میں پانی بھر گیا ہے۔ آج دوپہر تک سو لاشیں لہروں پر تیرتی ہوئی دستیاب ہوئیں۔ ۵۰۰ مزید افراد کا پتہ نہیں ہے۔ خیال یہ ہے کہ ڈوبے ہوئے مکانات میں ان کے مکین بھی ڈوب کر رہ گئے۔ اخبار نویسوں نے دیکھا کہ بچوں کی لاشیں جھاڑیوں اور شاخوں میں پھنسی ہوئی ہیں، سیلاب نے انھیں اچھال اچھال کر درختوں میں اٹکا دیا ہے۔ جزیرہ میں لاشیں تلاش کرنے کے کسی کو حواس نہیں۔ ساری کوششیں صرف بچے کھچے زندوں کو بچانے کی کی جا رہی ہیں۔ ایک رپورٹر نے ہوائی جہاز سے دیکھا کہ کشتیاں مکانوں کی چھتوں پر چل رہی ہیں۔ اور رک رک کر زندہ افراد کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ ایک چھوٹی بچی اپنے ماں باپ اور

تین بھائیوں کے ساتھ ایک بنگلہ کی چھت پر کھڑی تھی۔ ایک امدادی کشتی ان تک پہنچی۔ جگہ صرف ایک کی تھی۔ والدین نے بچی کو بٹھادیا۔ جب کشتی دوبارہ باقی لوگوں کو لینے آئی، تو بنگلہ اور چھت سب ندارد ہوچکے تھے! لاشوں کے ڈھیر پر ڈھیر ہر گھنٹہ لگتے جارہے ہیں" ——— جو خداوند طوفان نوحؑ پر قادر تھا، کیا نعوذ باللہ اب وہ معطل یا بے قدرت ہوگیا ہے؟ اور بندہ جو ہزارہا سال قبل وبے بس تھا، کیا اب وہ "سائنس اور ترقی" و "تہذیب" کی مدد سے کچھ صاحب قدرت و اختیار ہوگیا ہو؟۔

مظلوم خاتون

"اندور ۶ فروری۔ آسٹریلیا کی جوان عمر ناکتخدا خاتون مس لوئی سیدر لینڈ جو دنیا کا سفر تنہا موٹر سائیکل پر کررہی تھیں، بمبئی آگرہ کی سڑک پر ایک موضع کے سامنے سے گزر رہی تھی اور ابھی اندور سے ۸ میل کے فاصلہ پر تھیں۔ وقت سرشام کا تھا کہ سڑک پر دو شخصوں نے ان کی سائیکل روک کر انھیں اتار لیا۔ اور ان کے ساتھ اپنا منھ کالا کرکے انھیں چھوڑ دیا۔ مس موصوفہ نے اگر اندور پولیس میں رپورٹ درج کرائی ہو اور ساتھ ہی اپنا سفر ہندوستان میں منسوخ کردیا۔

یہ خاتون یقیناً کوئی آبرو باختہ پیشہ ور نہ تھیں۔ ایک معزز وباوقار و تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اور اس معاملہ میں بالکل بے قصور۔ پھر بھی بچاری اپنی مدافعت کچھ بھی نہ کرسکیں! اور دم بھر میں اپنی عصمت گنوا بیٹھیں یا نہیں؟ ——— جو مخلوق فطرتاً اتنی کمزور پیدا کی گئی ہے کہ اپنے عزیز ترین جوہر کے بچانے پر قادر نہیں اسے زبردستی مردوں کی صف میں لے آنا۔ اس کے ساتھ کسی معنی میں بھی دوستی اخلاص ہوا خواہی ہے؟ مساوات کامل کے نعرے لگا لگا کر یہ صاف اس کے حق میں ظلم و ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟۔

آپ سچے ملیے[عہ]

ایک گرما گرم تنقید ہندوستان کی جماعت اسلامی (مودودی) پر ایک ندوی ثم دیوبندی کے قلم سے پٹنہ کے ایک جدید معاصر میں:۔

"ہم مسلمانوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے کچھ مذہبی فرقہ نہیں بلکہ کل مذہبی فرقے اس جماعت کو اسلام اور اس کی حقیقی تعلیمات کے لیے سخت مضر اور ہلاکت آفریں سمجھتے ہیں، بلا استثناء تمام علماء دین اس میں عام اتفاق رکھتے ہیں۔ وہ دیوبندی ہوں یا بریلوی اس میں وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں، عام اتفاق سے وہ اس جماعت کو گمراہ اور مسلمانوں کے دین کے لیے فتنہ سمجھتے ہیں۔ اور اس کی بربادی کے لیے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں۔ آمین"

(صدق جدید لکھنؤ)

عہ معاصر کا عنوان اس پر "بلا تبصرہ" تھا۔ "الفرقان"

Regd. No—(A 353.)

Printed at:—NAMI PRESS, Lko.

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، در اصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارہ الفرقان"

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

شرح چندہ
ہندستان و پاکستان سے
سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے
فی پرچہ آٹھ آنے

شرح چندہ
ممالک غیر سے
سالانہ ۱۲ شلنگ ششماہی ۶ شلنگ
فی کاپی ایک شلنگ

جلد ۲۰ بابتہ ماہ رجب ۱۳۷۲ھ مطابق اپریل ۱۹۵۳ء شمارہ ۷

مضامین — لکھنے والے

☐ یہاں سرخ پنسل کا نشان اس بات کی علامت ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے،
اگر آئندہ بھی تعاون جاری رکھنے کا ارادہ ہو تو چندہ ارسال فرمایئے ورنہ ایک کارڈ کے ذریعہ اپنے ارادہ سے مطلع فرمایئے
اگر ۵ مئی تک نہ آپ کا چندہ آیا اور نہ کوئی خط تو مئی کا رسالہ وی پی کیا جائے گا جس کو وصول کرنا آپ کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

پاکستان کے اصحاب اپنا چندہ ذیل کے پتہ پر ارسال فرمائیں

جناب شیخ محمد اقبال صاحب ہوشیارپوری، مکتبہ اصلاح ۲۶ مال روڈ لاہور مغربی پاکستان۔ اور یہ یاد رکھیں کہ ان کو بھی پانچ روپے بھیجنا ہیں، چندہ بھیجنے اور نہ بھیجنے کی دونوں صورتوں میں اطلاعی کارڈ براہ راست لکھنؤ ارسال فرمائیں۔ لاہور بھیجنے سے کوئی مانع نہیں علاوہ ازیں کوئی شکایت ہو تب بھی ہیں کو لکھنا چاہیے۔ اگر رسالہ جاری رکھنے کا ارادہ ہو تو جہاں تک ہو سکے چندہ منی آرڈر سے بھیج دیجئے۔ وی پی کرنے میں بہت دقتیں پیش آنے لگی ہیں اور رسالہ پہونچنے میں دیر الگ ہوتی ہے۔ (ناظم الفرقان لکھنؤ)

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن (سنبھلی)

اب سے ساڑھے پانچ سال پیشتر ہندوستان کے ایک حصہ میں پاکستان کے نام سے ایک نئی مملکت وجود میں لانے کے لیے مسلمانوں نے جو بے حساب جانی ومالی نقصان برداشت کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ تحریکِ پاکستان کے لیڈروں نے انھیں دو باتیں سمجھائی تھیں۔ ایک یہ کہ اگر پاکستان نہ بنا تو ہندو اکثریت ان کے حقوق غصب کرلے گی اور پورے دس کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بن کر رہنا پڑے گا۔ دوسری بات یہ کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہوگی۔ بس ان دو باتوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے اپنے جان ومال کو داؤں پر لگا دیا اور آناً فاناً دنیا کے نقشہ پر ایک نئی مملکت کا اضافہ کر دیا ——— مگر کسے معلوم تھا کہ اکثریت کی دستبرد سے اطمینان حاصل کرلینے کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو ایک مٹھی بھر اقلیت سے معرکہ آرا ہونا پڑے گا اور اس اقلیت سے اپنے حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے بھی اتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے گی جتنی اکثریت سے تحفظ کے لیے ادا کی گئی تھی۔ فرق یہ ہوگا کہ پہلے سودے کی قیمت غیروں نے وصول کی تھی اور دوسرے کی قیمت اپنے وصول کریں گے۔

قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے مسئلہ پر جو خونیں ہنگامہ پاکستان (مغربی پنجاب) میں ہوا ہے وہ بہر آئینہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے۔ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں باہر والوں کو نہ دخل دینے کا حق ہے اور نہ ہم دخل دینا چاہتے ہیں مگر خیر خواہی اور ہمدردی کے حق سے باہر والوں کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر اس صورت میں کہ باہر والے اندر والوں سے اسلامی اخوت کا رشتہ رکھتے ہوں ——— وہ رشتہ جو جغرافیائی حد بندیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور ایسی تمام حدود کو ایک جست میں طے کر جاتا ہے ——— ہم صرف اسی حق اور اسی رشتہ کے ماتحت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ شاید اس رشتہ کا کچھ حق ادا ہو سکے۔

پاکستان کی حالیہ تحریک جس مطالبہ کو لیکر اٹھی تھی اسکے دو جزو تھے۔ ایک یہ کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے، اور دوسرا یہ کہ سر ظفر اللہ خاں قادیانی کو وزارت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ ہم پوری غیر جانبداری اور بالکل ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ مسلمانانِ پاکستان کا یہ مطالبہ کسی طرح بھی بیجا نہیں ہے۔ تحریک کے قائدین نے اس مطالبہ کے سلسلہ میں جو دلائل پیش کیے وہ ایسے ٹھوس اور

ناقابل تردید ہیں کہ حکومت پاکستان کا کوئی بڑے سے بڑا ذمہ دار بھی ان دلائل کی تردید کی جرأت نہیں کر سکا اور صرف رٹی پٹی نصیحتوں اور حاکمانہ دھمکیوں ہی کی آڑ لیتے بنی۔ یہ مطالبہ "مولویوں کے ذوق تکفیر و تفریق کا شاخسانہ" نہیں بلکہ خود قادیانی نبی اور اس کی امت کے اس کھلے ہوئے عقیدے کا نتیجہ ہے کہ جو شخص بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے، خواہ وہ حضرت آدم سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام نبیوں پر ایمان رکھتا ہو۔ ان "نبی جی" کے خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود کا فرمانا ہے کہ:۔

"جب حضرت کی مخالفت کے باوجود انسان مسلمان کا مسلمان ہی رہتا ہے تو پھر آپ کی بعثت کا فائدہ ہی کیا ہوا۔" (تشحیذ الاذہان ص۱۲۲)

گویا مطالبہ کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ مسلمان، قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے بلکہ یہ ہے کہ قادیانی، غیر قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ تحریک کے لیڈروں نے یہ بات پوری صراحت سے بار بار کہی ہے۔

پھر یہ عقیدہ مجرد عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا طرز عمل بھی اسی عقیدے کے مطابق ہے گنتی میں بہت کم (یعنی صرف چند ہزار) ہونے کی وجہ سے اس عقیدے کی بدولت ان میں مسلمانوں کے خلاف سازشی ذہنیت پیدا ہو گئی ہے۔ سر ظفر اللہ خاں کے وزارت خارجہ جیسے اہم منصب پر فائز ہونے اور حکومت میں غیر معمولی طور پر با اثر ہونے کی وجہ سے انھیں نہایت آسانی کے ساتھ اپنے سازشی مقاصد کی تکمیل کا موقع مل رہا ہے اور اس موقع سے وہ پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس بنا پر مسلمان مجبور ہوئے کہ سر ظفر اللہ خاں کو وزارت سے ہٹانے کا مطالبہ کریں اور ایک ایسے عنصر کو اپنی صفوں سے باہر کر دیں جو بذات خود اپنی علیحدگی کا مدعی ہوتے ہوئے بھی سازشی مقاصد کے حصول کے لیے ان کی صفوں میں گھسا ہوا ہے۔

الغرض جہاں تک تحریک کے مقاصد کا تعلق ہے ہم ان کو کسی طرح بھی غلط نہیں ٹھہرا سکتے۔ مگر ان مقاصد کے حصول کے لیے جو عملی اقدام کیا گیا ہے اس کے بعض پہلو کسی طرح بھی اتفاق اور تائید کے مستحق نہیں ہیں جس طرح صحیح مقاصد کو صحیح کہنا ہمارا فرض تھا اسی طرح غلط ذرائع کو غلط کہنا بھی ہم فرض سمجھتے ہیں اور اس معاملہ میں کسی رو رعایت کے روادار نہیں ہیں۔ ۵ مارچ کو لاہور میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا جو جلسہ ہوا تھا اس کی قرار دادیں پڑھ کر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا ہے کہ بہت سی جگہ تحریک کے عملی اقدام میں حصہ لینے والوں نے جبر و تشدد کا ارتکاب کیا اور فرط غضب میں وہ دینی اور اخلاقی حدود کو بھی پھاند گیے۔ جن لوگوں نے ایسا کیا یقیناً برا کیا اور اپنے مقصد کو بھی نقصان پہونچایا۔ کاش وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی اس ہدایت کو یاد رکھتے کہ:۔

"اگر تم پر کوئی حملہ کرے تو اپنا سر جھکا دو، تمھارے مخالف تم پر حملہ کرینگے اور اس صورت میں تمھاری تحریک کامیاب ہوگی۔"

مگر اس غلطی کی ساری ذمہ داری عوام پر نہیں ڈالی جا سکتی، عوام نے غلطی ضرور کی مگر ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اس

غلطی کے اسباب تمامتر حکومت کے پیدا کردہ ہیں، ایک ایسی حکومت جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے کی دعویدار ہو اس کو کسی عوامی مطالبہ کے مقابلہ میں دو میں سے ایک راہ اختیار کرنا ضروری ہو یا تسلیم کر لینا یا مطالبہ کو غلط ثابت کر دینا مگر حکومت نے ایک تیسری راہ اختیار کی یعنی ٹال مٹول اور دھونس دھمکی۔ ایسی صورت میں عوام کا آپے سے باہر ہو جانا ایک حد تک قدرتی امر ہے۔ ممکن ہے راست اقدام سے پہلے حکومت اس غلط فہمی میں مبتلا رہی ہو کہ مطالبہ مسلمانوں کی اکثریت کی طرف سے نہیں ہے مگر راست اقدام کے بعد تو پہلے ہی دن یہ غلط فہمی رفع ہو جانی چاہیئے تھی کیونکہ اکثریت نے اپنے عمل سے مطالبہ کو عوامی ثابت کر دیا تھا۔ اس لیے حکومت کا فرض تھا کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کرتی اور اپنی غلطی کی تلافی کر کے ملک کو کشت وخون سے بچا لیتی مگر حکومت نے عوامی حکومت کے تصور کے بالکل برعکس آمریت کا ڈھنگ اختیار کیا اور نہتوں پر فوج کو مسلط کر کے وہ داد شجاعت دی کہ الامان الحفیظ! حجاج بن یوسف کو روح کو مژدہ ہو کہ اس کے نام کے ساتھ ساتھ اس کا کردار بھی زندہ ہے۔

عوام کے غیظ وغضب پر قابو پانے کی ایک راہ تو بیشک یہ تھی کہ ان پر ایک حجاج مسلط کر دیا جائے جو مسجدوں میں بھی ان کا خون حلال سمجھے اور جو گولی کی زد پر نہ آسکیں انھیں بے آب ودانہ تڑپا تڑپا کر مار دے۔ لیکن دوسری راہ یہ تھی کہ ان کا ایک سراسر جائز اور معقول مطالبہ مان لیا جاتا۔ افسوس حکومت پاکستان نے پہلی راہ اختیار کی، حالانکہ اختیار کرنے کی راہ دوسری تھی، مغربی جمہوریت کی رو سے بھی اور اسلام کی رو سے بھی ——— ! رہ رہ کر رنج ہوتا ہے کہ کتنی معمولی سی بات کو پاکستان کے ارباب حل وعقد نے کتنے ہولناک ہنگامہ میں تبدیل کر دیا۔ آخر اس مطالبہ میں ایسی کیا بات تھی جس سے حکومت کو اس قدر شدید انکار تھا۔ کوئی نہیں کہتا تھا کہ سر ظفر اللہ کو گولی مار دیجئے! کوئی نہیں کہتا تھا کہ قادیانیوں کو تہ تیغ کر دیجئے، کوئی نہیں کہتا تھا کہ ان سب کو ملک بدر کر دیجئے! نہایت سیدھی سادھی بات تھی کہ حضور! مرزا غلام احمد کی امت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے الگ امت قرار دیدیجئے کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عام امت کو (جس میں ہم آپ سب شامل ہیں) یہود ونصاریٰ کی طرح کافر سمجھتے ہیں اور خود کو اس کا جزو نہیں سمجھتے۔

خیر یہ سب کچھ تو ہو ہی تھا مگر حکومت نے تو ستم ظریفی کی حد ہی کر دی کہ ایک جائز مطالبہ کیساتھ ایسا برتاؤ کرنے کے بعد پاکستان کے علماء کے سامنے اپنا یہ ناجائز مطالبہ رکھا کہ علماء اس تحریک کے (باقی ص۵۵ پر)

قرآنی دعوت

(۴)

خدا کی صفات :-

اللہ تعالیٰ بڑی رحمت والا اور نہایت مہربان ہو گناہوں کا بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہو

جیسا کہ اس مضمون کی تمہیدی سطروں میں بیان کیا جاچکا ہو، خدا کے بارہ میں بہت سی قومیں اس غلط فہمی میں مبتلا رہی ہیں کہ انھوں نے اس کو ایک ایسا جلالی شہنشاہ سمجھا جو قہر و غضب سے بھرپور ہو، اور جس کو راضی اور خوش کرنا بڑا ہی مشکل ہو، گویا عوام کے بس کی بات ہی نہیں ہو، اور جس کے پاس گنہگار اور خطاکار بندوں کے لیے بس لعنت ہی لعنت ہو، اور غضب ہی غضب، اور عذاب ہی عذاب ہو۔

اور اگر وہ رحیم اور مہربان ہو بھی تو اس کی رحمت اور مہربانی بس کسی خاص خاندان یا خاص نسل اور قوم کے لیے محدود ہو، باقی ساری دنیا کے لیے وہ بڑا سخت گیر اور صاحب جلال حاکم ہو۔

واقعہ یہ ہو کہ خدا کے بارہ میں یہی غلط فہمی اور گمراہی بہت سی قوموں کے شرک کا سبب بنی ہو۔ انھوں نے اپنے کو دیکھا کہ ان کی زندگی گناہوں سے پاک نہیں ہو اور اس دنیا میں نیکی اور پاکی والی زندگی گزارنا گویا اُن کے بس کی بات ہی نہیں ہو، اور اپنی جہالت سے انھوں نے سمجھا کہ خدا ایسا سخت گیر اور جلالی ہو کہ خطاکاروں اور گنہگاروں پر وہ ہرگز رحم اور مہربانی نہیں کرسکتا اس لیے خدا کی طرف سے تو وہ بالکل ناامید ہوگئے، اور شیطان نے ان کے کان میں پھونکا کہ خدا کی مخلوق میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں جو

اپنی نیکی اور پاکی کی وجہ سے اللہ کی بڑی مقرب اور بڑی پیاری ہیں۔ اور اللہ نے انھیں بھی بہت کچھ اختیار دے رکھا ہے، اور ان میں خدا کا سا جلال اور غصہ بھی نہیں ہے، اور انھیں راضی کرنا خدا کی طرح زیادہ مشکل بھی نہیں ہے، اس لیے ان کے دامنوں میں ہم جیسے گنہگاروں کو بھی پناہ مل سکتی ہے، اور ان سے تعلق جوڑنے سے خدا کے عذاب اور اس کی گرفت سے بچا جا سکتا ہے۔ ـــــ بس اسی کو انھوں نے اپنے لیے آسان سمجھا اور خدا سے ناامید ہو کر شیطان کی بتلائی ہوئی ان ہستیوں کی تعظیم و عبادت اور ان کے نام کی نذر نیاز اس امید پر کرنے لگے کہ ان کی مہربانی سے ہم سرسبز رہیں گے اور ان کی توجہ اور عنایت سے ہمارے کام بنتے رہیں گے اور خدا کی گرفت اور اس کے عذاب سے بھی ان کا یہ تعلق ہمیں بچا لے گا۔

الغرض اکثر مشرک قوموں کے حالات اور خیالات پر گہری نظر ڈالنے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ شرک میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ ان کی یہی گمراہی ہوئی ہے کہ خدا کی رحمت و رافت اور توابیت و غفاریت اور جود و کرم کی صفت کو انھوں نے نہیں جانا اور اس کو صرف قہار و جبار اور نہایت سخت گیر قسم کا جلالی بادشاہ سمجھ کر اس کی طرف سے ناامید ہو گئے، اور شیطان کی بتائی ہوئی واقعی یا محض فرضی اور وہمی ہستیوں کو انھوں نے اپنی امیدوں کا قبلہ بنا لیا ـــــ اگر وہ خدا کی رحمت کی بے انتہا وسعت سے اور اس کی توابیت اور غفاریت کی شان سے واقف ہوتے تو اس شرک میں ہرگز ہرگز گرفتار نہ ہوتے ـــــ اسی لیے قرآن مجید میں، جو اس دنیا کے لیے آخری ہدایت نامہ ہے، اللہ تعالیٰ کی اس شان اور اس صفت کو بہت زیادہ اجاگر کیا گیا ہے، اور بلا مبالغہ سینکڑوں جگہ مختلف عنوانوں اور مختلف پہلوؤں میں اللہ کی شانِ رحمت و رافت اور توابیت و غفاریت اور مخلوق کے ساتھ اس کی عنایت و محبت کو بیان فرمایا گیا ہے، جن خوش بختوں کو قرآن مجید کی تلاوت کی توفیق ہوتی ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس میں کتنی جگہ اللہ تعالیٰ کو "غفورٌ رحیم"۔ "رؤفٌ رحیم"۔ "توابٌ رحیم"۔ "خیر الراحمین" اور "ارحم الراحمین" کی صفات سے یاد کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ "بسم اللہ" جو قرآن مجید کا سرنامہ ہے اس میں بھی اس کی صفت رحمت ہی کا تذکرہ کیا گیا ہے اسی طرح اس کی بالکل ابتدائی آیتوں میں سب سے پہلے اس کی صفت ربوبیت اور رحمت ہی کا تعارف کرایا گیا ہے، فرمایا گیا "الحمد للہ رب العٰلمین ؏

الرحمٰن الرحیم ہ

اس اجمالی بیان کے بعد چند آیتوں پر ذرا تفصیلی نظر بھی ڈال لیجیے۔ سورۂ بقرہ رکوع میں ارشاد ہو۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ہ (بقرہ ع ۱۰) — اور تم سب کا خدا ایک ہی خدا ہو، اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں، وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہو۔

اور سورۂ آل عمران میں ایک جگہ ——— یہ بیان فرمانے کے بعد کہ قیامت کے دن ہر شخص کے اچھے برُے اعمال کا انجام اس کے سامنے آنے والا ہو، اور اس وقت ہر آدمی اپنے اعمال کی جانچ اور اپنے نتیجۂ عمل سے سخت ہراساں ہوگا ——— ارشاد فرمایا۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ط وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ہ (آل عمران ع ۳) — اور خدا تمھیں اپنے (مواخذہ) سے ڈراتا ہو اور خدا بندوں کے ساتھ نہایت مہربان ہو۔

گویا قرآن مجید نے اس موقع پر بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو آخرت کے مواخذہ سے اور قیامت کے دن کی پکڑ سے ڈرانا بھی اس کی رحمت اور مہربانی ہی کا تقاضا ہو، جس طرح کہ شفیق ماں باپ اپنی اولاد کو برُے کاموں کی بدانجامی سے ڈراتے اور آنے والے خطرات سے ہوشیار کرتے رہتے ہیں۔ اور بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اسی مہربانی اور شفقت کی صفت کو سورۂ شوریٰ میں ایک جگہ ان لفظوں میں بیان فرمایا گیا:-

اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ ہ (شوریٰ ع ۲) — اللہ اپنے بندوں کے ساتھ نرم معاملہ کرنیوالا اور مہربان ہو۔

اور سورۂ نحل میں بندوں پر اپنے بعض ایسے انعامات اور احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد جن سے اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ متمتع ہو رہے ہیں، ارشاد فرمایا۔

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (نحل ع ۱) — یقین کرو کہ تمھارا پروردگار بڑا ہی مہربان اور نہایت رحم والا ہو، او یہ اس کی مہربانی اور رحمت ہی کا کرشمہ ہو کہ تم کو اس دنیا میں یہ آرام مل رہے ہیں۔

اور سورۂ انعام میں ایک جگہ یہ بیان فرمانے کے بعد کہ بندے جو اچھے بُرے عمل کرتے ہیں اللہ ان سے پوری طرح باخبر ہے — ارشاد فرمایا

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ (انعام ع ۱۶)

اور تمہارا پروردگار سب سے بے نیاز ہو (اسے کسی کی پروا نہیں اور کسی سے اس کی کوئی حاجت اٹکی ہوئی نہیں، ہاں) رحمت اور مہربانی اس کی خاص صفت ہو، (اور اسی رحمت کا صدقہ ہو کہ تم اپنی بدکاریوں کے باوجود زندہ ہو، ورنہ اس میں یہ قدرت ہو کہ) اگر وہ چاہے تو تمھیں فنا کر کے تمھارے بعد جسے چاہے تمھاری جگہ دنیا میں آباد کرے۔

اور سورۂ کہف میں ایک موقع پر فرمایا

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا (کہف ع ۸)

اور تیرا رب بڑا ہی بخشنے والا اور بڑی رحمت والا ہو، اور اگر وہ ان کے اعمال پر ان کو پکڑنا چاہتا تو فوراً ان کے لیے عذاب بھیج دیتا، بلکہ ان کے واسطے ایک وقت معین کر رکھا ہو، اور وہ اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں پا سکتے۔

مطلب یہ ہو کہ اس دنیا میں جو یہ دیکھا جاتا ہو کہ بہت سے شریر اور سرکش اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کو توڑتے ہیں، اس کے احکام کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں، اور اس کے باوجود وہ زندہ رہتے ہیں اور اللہ کی طرف سے ان پر کوئی عذاب نہیں آتا، نہ اُن پر آسمان سے بجلی گرتی ہو اور نہ زمین انھیں نگلتی ہو — قرآن مجید کہتا ہو کہ یہ اللہ کی صفت رحمت اور بخشش ہی کا صدقہ ہو اگر اللہ اپنے بندوں پر اتنا مہربان نہ ہوتا، تو ایسے بدکاروں نافرمانوں پر فوراً عذاب آجایا کرتا، اور انھیں کوئی مہلت نہ دی جاتی، لیکن چونکہ وہ بندوں کے ساتھ اپنی مغفرت اور رحمت کا معاملہ کرنا چاہتا ہو اس لیے اس نے سب گنہگاروں کو اس دنیا کی پوری زندگی میں مہلت

دینا طے کر دیا ہو تاکہ جو بھی ان میں سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگ کے اور اپنے رویہ کو درست کر کے کسی وقت اللہ کو راضی کرنا چاہیں وہ کر سکیں اور اس کے عذاب سے بچ سکیں، اسی واسطے اس نے مواخذہ اور جزا سزا کے لیے اس دنیوی زندگی کے خاتمہ کے بعد ایک وقت مقرر کیا ہو اور اس وقت پر سب کو وہاں حاضر ہونا ہوگا، اور کسی کے لیے اس کا کوئی امکان نہیں ہوگا کہ وہ کہیں روپوش ہو کر اس وقت اور اس مقام کی حاضری سے بچ سکے اور کسی جگہ پناہ لے سکے۔

اور اسی کو سورۂ انعام میں یوں فرمایا

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۔ (انعام ع ۲)

اللہ نے لازم کر لی ہو اپنے پر رحمت اور مہربانی (اس لیے وہ مجرموں کو یہاں سزا نہیں دیتا بلکہ اس نے اس پوری زندگی کی سب کو مہلت دے رکھی ہو تاکہ جو چاہے معافی مانگ کے اور اپنے کو درست کر کے عذاب سے بچ سکے۔ اس نے مقرر کیا ہو کہ تم سب کو انصاف اور جزا کے لیے) قیامت کے دن جوڑے گا (اور اس دن ہر ایک کو اپنے کیے کا بدلہ مل جائے گا، یہ بالکل یقینی اور اٹل بات ہو) اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو۔

سبحان اللہ! اس آیت کا پہلا جملہ "كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ" (اللہ نے رحمت کو اپنے پر لازم اور مقرر کر لیا ہو) ہم بندوں کے لیے کتنے اطمینان اور کیسی امیدوں کا سامان اپنے اندر رکھتا ہو ۔۔۔ ایسے رحمت والے پروردگار سے ناامیدی اگر کفر نہیں تو کیا ہو۔

اور پھر اسی سورۂ انعام میں ۲ رکوع کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا، اور کیسے پیارے انداز میں فرمایا گیا ہو۔

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ

اور جب تمہارے پاس ہمارے وہ بندے آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو اے پیغمبر تم شفقت اور محبت سے ان کا استقبال کرو

مِنْكُمْ سُوْءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (انعام ع ۶)

اور) کہو تم پر سلام! (اور انھیں خوشخبری سُناؤ کہ) تمھارے پروردگار نے اپنے پر رحمت و مہربانی کو لازم کر لیا ہے، (اس لیے تمھیں مطمئن رہنا چاہیے کہ) تم میں سے جس نے نادانی سے کوئی برا عمل کیا اُس کے بعد اُس نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی تو بلاشبہ تمھارا رب بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

یقیناً بڑا شقی اور بدبخت ہے وہ انسان جو ایسے رحمت والے پروردگار کی رحمت سے بھی محروم رہے جو اپنے پیغمبر رحمتِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے اپنے خطاکار اور گنہگار بندوں کو سلام کے بعد رحمت کا یہ پیام دلاتا ہو کہ "اپنے پروردگار سے مایوس نہ ہو، اور نہ بھاگو اس نے تو رحمت کو اپنے ذمہ لکھ لیا ہے، اگر نادانی سے تم سے گناہ ہو گئے ہیں تو اب توبہ کر لو اور اپنی حالت ٹھیک کر لو، میں بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہوں۔"

اور سورۂ شوریٰ میں ایک جگہ فرمایا

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (شوریٰ ع ۳)

اور وہی ہے جس کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے (گنہگار) بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور خطاؤں سے درگزر کرتا ہے، اور تم جو کچھ کرتے ہو اس سب کو پوری طرح جانتا ہے۔

اور سورۂ نساء میں زنا جیسے ناپاک اور خبیث گناہ سے آلودہ ہو جانے والے خطاکار بندوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۝ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ (نساء ع ۳)

اور جو تم میں سے اس فعل کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو، پھر اگر وہ اس فعل حرام سے تائب ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان سے تعرض نہ کرو، بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور بڑی رحمت والا ہے۔

مطلب یہ ہو کہ جن لوگوں کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ انھوں نے یہ خبیث اور حرام کام کیا ہو تو ان کو قانون کے مطابق سزا تو دی جائے، لیکن اگر وہ اس کے بعد توبہ اور اپنی اصلاح کر لیں تو پھر ان سے کچھ نہ کہا جائے، کیوں کہ انھوں نے در اصل اپنے جس مالک اور آقا کا گناہ کیا ہو وہ خود توبہ کرنے والے مجرموں کو خوشی سے معاف کر دینے والا اور پھر ان کے ساتھ رحمت اور مہربانی سے پیش آنے والا ہو۔

اور اسی سورۂ نساء میں آگے ایک جگہ فرمایا! ـ اور ہر قسم کے گناہگاروں اور خطا کاروں کو مژدہ سنایا۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًاo (نساء ع ۱۶)

اور جو کوئی کسی قسم کا گناہ کرے اور اللہ کی نافرمانی کرکے اپنی جان پر ظلم کرے پھر وہ پچھتائے اور اللہ سے معافی مانگے اور بخشش چاہے تو پائے گا وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور بڑا شفیق اور مہربان۔

اور سورۂ زمر میں اپنے کو تباہ کرنے والے خطاکار بندوں ہی کے لیے جو کچھ ارشاد فرمایا گیا اور جس ترحم اور پیار کے انداز میں انھیں پکارا گیا وہ تو اللہ کی صفت رحمت کی ایسی منادی ہو کہ بڑے سے بڑا سیہ کار اور عمر بھر کا سخت پاپی بھی اگر دل کے کانوں سے اس کو سن لے تو بے تحاشا اللہ کے در رحمت کی طرف دوڑ پڑے، اپنے رسول رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہو کہ میرے مجرم اور خطاکار بندوں کو میری طرف سے یہ پیام دو۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُo وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (زمر ع ۶)

اے میرے وہ بندو! جنھوں نے گناہ کرکر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو (اور اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہ و برباد کیا ہو) تم اللہ کی رحمت اور مہربانی سے ناامید مت ہو۔ اللہ کی یہ شان ہو کہ وہ سب گناہ بخش دیتا ہو، حق یہ ہو کہ وہ بہت بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہو ـــ اور اب بھی رجوع ہو جاؤ اور رخ کر لو

اپنے اس غفور و رحیم پروردگار کی طرف، اور اس کا حکم ماننے لگو قبل اس کے کہ تمہارے گناہوں کا وبال اور عذاب تمہیں آپکڑے اور پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے، اور کوئی تم کو نہ بچا سکے۔

اللہ کی رحمت اور مغفرت کے حقدار کون سے گنہگار ہیں؟

سورۂ زمر کی اس آیتِ رحمت سے بھی معلوم ہوا اور اس سے اوپر جو آیتیں اس مضمون کی درج کی جا چکی ہیں (جن میں خاص طور سے گنہگاروں اور خطا کاروں کے لیے اللہ کی رحمت و مغفرت میں گنجائش کا اعلان کیا گیا ہے) ان سب سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رحمت کی وسعت اور بے پایانی کا حال تو یہی ہے کہ دنیا بھر کے بڑے سے بڑے مجرموں اور سیہ کاروں کے لیے اس میں گنجائش ہے، لیکن اس کے دروازہ میں داخلہ کی یہ لازمی شرط ہے کہ بندہ اس رحمت والے آقا کی طرف رجوع ہو اور اس کے ساتھ اپنے معاملہ کو درست کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، اگرچہ اس سے پہلے اپنی ساری عمر میں باغی اور نافرمان رہا ہو۔

اللہ تعالیٰ میں رحمت کے ساتھ عدالت بھی ہے!

اسی لیے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اللہ کی رحمت اور اس کی توابیت اور غفاریت کے بیان کے ساتھ اس کی دوسری صفت عدالت اور سرکش مجرموں کی سزادہی کا بھی بیان فرمایا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ فاتحہ ہی میں "رب العلمین" اور "الرحمن الرحیم" کے ساتھ اس کی صفت "مالک یوم الدین" کا بھی ذکر فرمایا گیا۔

اس کا مقصد اور منشاء یہی ہے کہ اللہ کی رحمت و مغفرت کی وسعت کے ان قرآنی اعلانوں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ اب گناہوں کی کھلی چھٹی ہے، اور زندگی خواہ کیسی ہی گزاری جائے "اللہ کی رحمت کا دروازہ ہمارے لیے کھلا ہوا ہے" — بہرحال اسی غلط فہمی سے بچانے کے لیے قرآن مجید میں جا بجا رحمت کے ساتھ خدا کی صفت عدالت کا بھی بیان فرمایا گیا ہے — ذیل کی چند آیتیں پڑھیے!

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ

اے پیغمبر، اگر یہ لوگ (اس واضح بیان اور اتمام حجت کے بعد بھی) تمہاری تکذیب ہی کریں، تو

عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (انعام ع ۱۸)

آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تمہارا پروردگار بڑی ہی وسیع رحمت والا ہے (اور اسی رحمت کا صدقہ ہے کہ اس نے تم کو مہلت دے رکھی ہے، لیکن یاد رہے کہ مجرموں کو سزا دینا بھی اس کا قانون ہے، اس لیے اگر تم اس باغیانہ اور مجرمانہ زندگی سے باز نہ آئے تو ضرور اس کی سخت سزا پاؤگے) اور مجرموں پر سے اس کا عذاب ہٹایا نہیں جاسکتا۔

اور سورۂ حجر میں فرمایا۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝ (حجر ع ۴)

اے پیغمبر! میرے بندوں کو خبردار کردیجیے کہ بیشک میں بڑا بخشنے والا اور بہت مہربان ہوں، اور اسی طرح اس میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ (مجرموں کے لیے) میری سزا بھی بڑی دردناک سزا ہے۔

اور سورۂ مومن کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ (سورۂ مومن ع ۳)

وہ گناہ بخشنے والا ہے، اور توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے والا ہے، (اور اسی کے ساتھ سرکش مجرموں کے لیے وہ) بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔ سب کچھ قدرت رکھتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بندگی اور عبادت کے لائق نہیں ہے۔ سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

اور بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ کی اس صفت یعنی عدالت اور تعذیب مجرمین کو دوسرے عنوانوں سے بھی بیان فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ سورۂ قلم میں سوالیہ پیرایہ میں ارشاد ہے۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ (قلم ع ۲)

کیا ہم اپنے فرمانبردار بندوں کو نافرمان مجرموں کے برابر کردینگے۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو۔

(یعنی اللہ کے متعلق تم ایسی نا انصافی اور خلاف حکمت بات کا تصور کیسے کرتے ہو کہ وہ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے ساتھ یکساں سلوک اور ایک سا معاملہ کرے گا)

اور اسی کو سورۂ صٓ میں فرمایا۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ (صٓ ع ۲)

کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنیوالوں کو زمین میں فساد برپا کرنیوالوں کے برابر کر سکتے ہیں، کیا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کے برابر کر سکتے ہیں، (ہمارے عدل و انصاف سے یہ کیسے ممکن ہے)

اور اسی کو سورۂ جاثیہ میں یوں فرمایا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (جاثیہ ع ۲-۳)

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان بدکاروں کو اپنے ان بندوں کے برابر کر دیں گے جن کی زندگی ایمان اور اعمال صالحہ والی زندگی ہو، کہ یکساں ہو ان کا جینا مرنا (ایسا خیال کرنیوالے احمق بڑا غلط اور) بہت برا حکم لگاتے ہیں، (نہیں دیکھتے کہ) اللہ نے زمین و آسمان کو (اور ساری کائنات کو) بالکل حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے،

(اور وہ عالم کا سارا نظام حکمت ہی سے چلا رہا ہے، پھر اس سے ایسی خلاف حکمت اور خلاف عدل بات کی توقع کیوں رکھتے ہیں، اس عالم کی تخلیق کا تو مقصد اور منتہا ہی یہ ہے کہ (بندے یہاں عمل کریں اور) وقت پر ہر شخص کو اس کے کیے کی جزا ملے، اور (اس جزا سزا کے معاملہ میں ہرگز) کسی کے ساتھ کوئی ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔

بہر حال قرآن مجید کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا شفیق اور بڑا مہربان ہے، اور اس کی رحمت میں سب کے لیے پوری گنجائش ہے۔ (وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ) بڑے سے بڑا مجرم

اور گنہگار بھی اگر اس کی رحمت اور مغفرت کا طالب بن کر اس کی طرف بڑھے تو وہ اسے بخشنے کے لیے اور اپنے آغوشِ رحمت میں جگہ دینے کے لیے تیار ہو، لیکن اسی کے ساتھ وہ صاحبِ عدالت بھی ہو، اور سرکش مجرموں کو سزا دینا بھی اس کی عدالت اور حکمت کا تقاضہ ہو، اس لیے جو شریر اور مفسد سرکشی اور شرارت سے باز نہ آئیں گے اور تذکیر و نصیحت کے باوجود نافرمانی اور بغاوت اور کفر و شرک ہی پر جمے رہیں گے، وہ آنے والے اُس عالم میں جس میں اللہ کی اس صفتِ عدل کا پورا ظہور ہوگا، اللہ کی رحمت اور مہربانی سے ذرہ برابر بھی حصہ نہ پا سکیں گے، بلکہ اپنے کفر و شرک اور اپنی شرارت و سرکشی اور اللہ کے سامنے نہ جھکنے کی سخت سزا پائیں گے۔ سورۂ السجدہ میں ایسے ہی مجرموں کے بارہ میں ارشاد ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ۝ (السجدہ - ع ۲)

اور اُن سے زیادہ کوئی ظالم نہیں، جن کو اُن کے پروردگار کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی جائے اور پھر بھی وہ اُن سے بے رخی اور بے پروائی اختیار کریں، اور اپنے حال کو درست نہ کریں، ہم ایسے مجرموں کو سخت سزا دینے والے ہیں۔

معارف الاحادیث

[اس سلسلہ معارف الاحادیث میں اب تک ۱۲۰ حدیثوں کی تشریح الفرقان کے صفحات میں شائع ہو چکی ہیں ـــــ یہ سب حدیثیں وہ تھیں جن کو حضرات محدثین نے ایمان اور بیان آخرت کے ابواب میں اپنی مؤلفات میں درج کیا ہے ـــــ اس کے بعد اب ان احادیث کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جن کو محدثین اپنی کتابوں میں رِقاق کے زیر عنوان درج کرتے ہیں۔ یعنی وہ احادیث جن کے پڑھنے اور سننے سے قلب میں رقت پیدا ہوتی ہے، اور دل دنیا کی طرف سے سرد ہو کر آخرت کے لیے عمل کا جذبہ اور ولولہ اس میں پیدا ہوتا ہے۔

جو حدیثیں اس سلسلہ میں درج کی جا رہی ہیں وہ سب مشکوٰۃ شریف "کتاب الرقاق" سے انتخاب کی گئی ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ اس عاجز کو اور ناظرین کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے انوار و برکات سے بہرہ ور فرمائے]

(۱) عن عبد اللہ بن عمر قال اخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببعض[1] جسدی فقال کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل وعُدّ نفسک من اهل القبور (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم کا ایک حصہ

---

[1] هکذا فی المشکوٰة - وقال بعض الشارحین "لفظ البخاری عن ابن عمر قال اخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنکبی فقال کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل ولیس فی البخاری وعد نفسک من اهل القبور بل هو فی روایۃ الترمذی والبیهقی - واللہ اعلم.

دینی دعوت اور اصلاحی جد و جہد کے محرکات

دعوت و تبلیغ کے سلسلہ کی پہلی تقریر

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس وقت جو کچھ کہنا ہے اسکا تعلق کسی خاص جماعت یا گروہ کی دینی دعوت اور جد و جہد سے نہیں ہے بلکہ اس وقت کا موضوع گفتگو عام دعوت الی اللہ ہے۔ اور مجھے یہ بتلانا ہے کہ دینی دعوت و تبلیغ کا کام کیوں ہمارے لئے ضروری ہے اور اس کے کیا خاص محرکات ہیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر دعوت و تبلیغ کا کام ہم کیوں کریں، ظاہر ہے کہ دعوت کے کام میں طرح طرح کے مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے تو اور بھی بہت سی عبادتیں ہیں جو بظاہر اس کام سے زیادہ افضل ہیں۔ اور ان میں یہ دشواری بھی نہیں ہوتی۔

ہمیں اس وقت اسی سوال کا جواب دینا ہے اور یہ بتلانا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے ہمارے لئے دعوت الی اللہ کا کام کیوں ضروری ہے۔ اور وہ کونسی چیزیں ہیں جو ہم مسلمانوں کو اس کام پر مجبور کرتی ہیں؟

اسوقت ہم دعوت کے صرف چند محرکات کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اسوقت ذہن میں ہیں۔

۱۔ دنیا میں دو دَور ہیں۔ ایک وہ دور جس میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اس دَور کو دورِ نبوت کہہ لیجئے! ۔ دوسرا دَور وہ ہے جب کہ نبوت ختم ہو چکی ہے اور انبیاء علیہم السّلام کی آمد کا سلسلہ بند ہے اس دَور کو ختم نبوت کا دَور کہہ لیجئے! ۔ یہ دوسرا دور سید نا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے۔ نبوت کے دَور میں دعوت و ہدایت کے کام کی اصل ذمہ داری انبیاء علیہم السلام پر ہوتی تھی۔ اور ان کے متبعین صرف تبعاً ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن ختم نبوت کے اس دور میں پوری ذمہ داری خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر یعنی اُس قوم اور اُس جماعت پر آ گئی جو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی ہے اور اُس نے اطاعت کا عہد کیا ہے۔ اب اس

امت کو دنیا میں وہ ضرورت پوری کرنا ہے جو کہ انبیاء و رسلین کرتے تھے حالانکہ یہ امت خود نبی نہیں ہے۔

اس کو یوں سمجھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی بعثت کے ساتھ آپ کی امت بھی دعوت کے کام کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے مبعوث کی گئی ہے۔ لیکن امت کی یہ بعثت نبی والی بعثت نہیں ہے —— نبوت اور بعثت الگ الگ دو لفظ ہیں۔ نبوت کا لفظ صرف اس برگزیدہ انسان کے لئے آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کے لئے منتخب فرمایا ہو۔ اور بعثت کا لفظ قوم کے لئے بھی آسکتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ اپنی امت کے لئے بھی استعمال فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ آپ نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ (یعنی تم اس لئے نہیں مبعوث کئے گئے ہو کہ مشکلات پیدا کرو بلکہ آسانی پیدا کرنے کے لئے مبعوث کئے گئے ہو)۔ قرآن مجید میں اس مفہوم کے لئے اخراج کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ)۔ خود صحابہ کرامؓ کی زندگی کے واقعات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ اس کام کے لئے مبعوث کیے گئے ہیں۔ اور اس خیال نے ان میں یہ یقین پیدا کر دیا تھا کہ جس کام کے لئے وہ پیدا کیے گئے ہیں اسکو پورا کئے بغیر وہ ختم نہیں ہو سکتے ہیں۔ اور اللہ ضرور ان سے یہ کام لے گا۔ اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ ان کے اندر ایک آہنی عزم اور بے انتہا قوت پیدا ہو گئی تھی

کسریٰ کے دربار میں جب مسلمانوں کے سفیر سے پوچھا گیا کہ مَا الَّذِيْ جَاءَ بِكُمْ؟ یعنی آپ لوگوں کو کس چیز نے یہاں آنے پر آمادہ کیا؟ تو اس نے اسکے جواب میں کہا کہ اَللّٰهُ ابْتَعَثَنَا الخ۔ اللہ نے ہم کو اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کہ اللہ کے بندوں کو غیر اللہ کی بندگی سے نکالکر اسی ایک اللہ کی بندگی میں داخل کر دیں جو ان کا واقعی رب ہے —— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام دینی دعوت اور دینی جدوجہد کا کام اپنا کام سمجھ کر اور اپنی رائے اور تجویز سے نہیں کرتے تھے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اس کے لئے اللہ کی طرف سے مامور اور مبعوث ہیں اور یہ ہمارا فریضہ اور ہماری ذمہ داری ہے۔

۲۔ دینی دعوت و تبلیغ کے متعلق بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اصل عبادات کو قائم اور جاری رکھنے کے لئے صرف ایک ذریعہ ہے یعنی یہ خود مقصود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے بلکہ دینی دعوت بذاتہ بھی مقصود ہے اور عبودیت کا ایک جزء ہے۔ یعنی بندگی کی ایک شکل اللہ کی طرف دعوت دینا بھی ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی تکمیل دعوت سے ہوتی ہے۔ سورۃ العصر میں کامیابی پانے والوں کے اوصاف ایمان۔ نیک اعمال۔ تواصی بالحق۔ (حق کی طرف بلانا) اور تواصی بالصبر (صبر کرنے کی تلقین) بیان کئے گئے ہیں۔ بہر حال دعوت تکمیلی اوصاف میں سے ہے۔ لہذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ دعوت محض ایک انتظامی چیز ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ دعوت کو مومنین کی خاص صفت بتایا گیا ہے۔ "وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ

يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (یعنی مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور اُن کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بھلائی کی تلقین کرتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں) ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ایمان والوں کا یہ شعار ہے کہ وہ ایک دوسرے کو خیر کی دعوت دیتے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ دعوت ایمان کا خاصہ ہے ۔

۳ ۔ قرآن شریف سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی کوششیں ۔ علم ۔ یقین اور ہدایت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔

۴ ۔ دعوت کا تعلق عبادات سے بلکہ پورے دین سے ایسا ہے جیسا کہ بارش کا تعلق نباتات سے ہے ۔ اگر بارش خوب ہوتی ہے تو نباتات بھی خوب اُگتی ہے اور اگر بارش نہ ہو تو زمین چٹیل میدان بن جاتی ہے ۔ اسیطرح اگر دعوت ہوتی ہے تو عبادات وغیرہ دین کے سارے شعبے قائم رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انکی روح بھی قائم رہتی ہے ۔ جس دور میں دعوت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے لوگوں میں دین کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں ۔ فرائض کو پورا کرنے کا احساس بیدار ہوتا ہے ۔ حقوق کے ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے ۔ اور جب دعوت کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے تو ان چیزوں کا نمو بھی ختم ہوجاتا ہے اور دین کی مثال ایک سوکھے درخت کی سی ہوجاتی ہے جو نہ پھلتا ہے اور نہ پھولتا ہے ۔ لہٰذا امت میں دین کو باقی رکھنے اور اسکی استعداد پیدا کرنے کے لئے بھی دعوت ضروری ہے ۔ دعوت کے بغیر اعمال و عبادات پنپ نہیں سکتے اور ان میں کونپلیں نہیں نکل سکتیں ۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک نسل کی دعوت کا فیض کئی نسلوں تک پہونچے اور ایک زمانہ کی کوشش کے اثرات بعد تک رہیں ۔ جیسا کہ ریل کی لائن پر چلنے والی ٹرالی قلیوں کے ایک بار زور سے دوڑانے سے دُور تک خود بخود دوڑی چلی جاتی ہے ۔ اور جب رُکنے لگتی ہے تو قلی اُتر کر اُس کو دوڑاتے ہیں ۔ صحابۂ کرامؓ کی دعوتی اور تبلیغی کوششوں سے امت میں جو دینی استعداد پیدا ہوئی تھی اُسکا اثر بہت بعد تک رہا اور امت کی گاڑی چلتی رہی پھر بیچ کے دور کے مجددین و مصلحین کے برابر دھکا دیتے رہنے سے یہ گاڑی آج تک چلی جارہی ہے ۔ اس سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہئے کہ اس امت کی گاڑی خود بخود چل رہی ہے جس طرح کہ ٹرالی پر بیٹھے ہوئے مسافروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ ٹرالی خود بخود دوڑ رہی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قلی بار بار اتر کر اُس کو دوڑاتے ہیں تب وہ دوڑتی ہے ۔

صحابۂ کرامؓ نے اور بعد کے زمانوں کے مجددین اور مصلحین نے اپنی دعوت اور تبلیغی کوششوں سے اس امت میں ایمان کا اور ایمانی استعداد کا بڑا ذخیرہ پیدا کیا تھا ۔ اس ذخیرہ کو ہم برابر استعمال کر رہے ہیں لیکن اگر آمد و صرف کا توازن برابر نہیں رہا تو یہ ذخیرہ باقی نہیں رہیگا ۔ دین کی ساری چہل پہل اسی ذخیرہ سے ہے ۔

اُمت میں اعمال کی کمی ہو جانا اتنی خطرناک بات نہیں ہے جتنی کہ جذبات اور استعداد کی کمی، اسلئے کہ جذبات اور استعداد میں قربانیوں کی طاقت پیدا کرنے والی قوّت محرکہ اور اُمت کو حرکت میں رکھنے والی طاقت ہے۔ انکی مثال انجن کی بھاپ کی سی ہے اگر بھاپ ختم ہو جاتی ہے تو گاڑی رکنے لگتی ہے۔ اسکے مسافر تو صرف یہی سمجھتے ہیں کہ رفتار سست پڑ گئی لیکن ڈرائیور خوب جانتا ہے کہ یہ رفتار کی سستی بھاپ کی اور اُس کو پیدا کرنے والی چیزوں کی کمی کا نتیجہ ہے۔ بھاپ یا اس کو پیدا کر دینے والی چیزیں اگر ختم ہو جائیں تو گاڑی نہیں چل سکتی ہے۔ حالانکہ انجن پٹریاں اور سگنل وغیرہ سب موجود رہیں۔ لہٰذا اگر دعوت کا سلسلہ ختم ہو جائے تو مجموعۂ دین خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ دعوت کے بقا میں دین کا بقا مضمر ہے۔

۵۔ دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں بعض لوگوں کو ایک شبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان صرف اپنا مکلف ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائیگا)۔ اس بارہ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک انسان عام طور پر اپنے اعمال و فرائض کی پابندی اور اپنے ذاتی کردار کی حفاظت بھی غلط ماحول میں نہیں کر سکتا۔ اور اسکا اپنے اصول و معیار پر قائم رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لیئے کہ انسان پر ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ انفرادی زندگی کا وجود دنیا میں بہت مشکل ہے۔ اس خاکی سمندر میں علیحدہ علیحدہ جزیرے نہیں بنائے جا سکتے۔ یہ بات عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ باپ مسلمان کامل ہے۔ لیکن اس کی اولاد بالکل دوسرے رنگ میں ہے۔ حالانکہ اُسنے اپنی اولاد کی اصلاح کی پوری کوشش کی۔ یہ عام طور سے ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ماحول کے ساتھ مجبوراً صلح کرنی پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتی کی مثال دی ہے کہ ایک کشتی میں کچھ لوگ اوپر کے درجے میں ہیں اور کچھ لوگ نیچے کے درجہ میں ہیں پانی کا انتظام اوپر ہی کے درجہ میں ہے اسلیئے نیچے کے درجہ والے بھی پانی لینے کیلئے اوپر ہی آتے ہیں جس سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ ناگواری کا اظہار اور شکایت کرتے ہیں۔ آخر ایک دن تنگ آکر نیچے کے درجے والے مسافروں نے طے کیا کہ ہم کشتی کے پیندے میں سوراخ کر کے دریا سے پانی نکال لیں گے۔ تو اب اگر اوپر کے درجے والے اس فعل سے اُن کو باز نہ رکھیں گے تو وہ خود بھی ان کے ساتھ ڈوب جائیں گے"۔

بہر حال خود اپنی زندگی کو درست رکھنے کے لیئے اور اپنے اہل و عیال کی زندگی کی اصلاح کے لیئے اور اپنے آپ کو اور اپنی نسلوں کو شر سے بچانے کے لیئے بھی ضروری ہے کہ عوام میں دین پھیلانے کی جد و جہد کی جائے۔

اس کے علاوہ دعوت و تبلیغ اور ضرورت کے وقت دین کی حفاظت اور سرسبزی کے لیئے بقدر استطاعت سعی و جہد ہر مسلمان کا ذاتی فریضہ ہے جس کے متعلق اُس کو جوابدہی کرنی ہے، اس لیئے یہ کام دوسرے کا بوجھ اُٹھانا نہیں ہے بلکہ اپنا ہی بوجھ اُٹھانا ہے۔

۶۔ انسان فانی ہے۔ لیکن وہ دوام پسند ہے۔ اپنے آپ کو غیر فانی بنانے کے لیئے برابر کوشش کرتا

رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس چند روزہ فانی زندگی میں اسکی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل کیسے ہو سکتی ہو۔ اس لئے ہوشمند انسان چاہتا ہے کہ اسکے اجر و ثواب کی وسعت غیر محدود ہو اور اسکے اعمال دوامی ہوں اور یہ صرف دعوت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اور دعوت ہی فانی اور غیر فانی کے درمیان کی خلیج کو پاٹنے والا ایک پل ہے، ساری عبادات اور اعمال انسان کی زندگی تک باقی رہتے ہیں۔ اور اسکے مرنے کے بعد اپنے اعمال کے اجر و ثواب میں اضافہ کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے، لیکن دعوت الی اللہ اور دین کی جد و جہد وہ چیز ہے کہ اس کا اجر و ثواب صدیوں تک اور اکثر قیامت تک چلتا رہے گا ——— نیز عبادات و اعمال سے انسان صرف ایک محدود اجر و ثواب حاصل کر سکتا ہے لیکن دعوت کے ذریعہ غیر محدود اجر و ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے اس لیے کہ اسکی جد و جہد سے جتنے لوگ دین پر لگ جاتے ہیں اور نیک اعمال اختیار کر لیتے ہیں ان سب کے اجر میں یہ بھی شامل ہوتا ہے اور یہ سلسلہ نسل در نسل اور قرن بہ قرن چلتا رہتا ہے۔ اعمال اور ان کے اجر و ثواب کے اس تعدیہ کی طاقت دعوت ہی میں ہے۔ آپ اپنے سامنے دو آدمیوں کی مثال رکھئے ایک وہ شخص جس نے اپنی ستر برس کی زندگی کامل عبادت میں گذاری ہے۔ ہمیشہ قائم اللیل اور صائم النہار رہا۔ دوسری طرف ایک وہ شخص ہے کہ اُسنے خود تو زیادہ نفلی عبادات نہیں کی ہیں۔ لیکن دعوت الی اللہ کا کام خوب کیا ہے۔ اجر و ثواب کے لحاظ سے دوسرا شخص پہلے شخص سے یقیناً سبقت لے گیا۔ اسلئے کہ اول الذکر کی عبادات اور نیک اعمال اگرچہ بہت ہیں لیکن محدود ہیں لہذا اسکا اجر و ثواب بھی محدود ہے۔ مگر آخر الذکر کے اپنے ذاتی اعمال تو ضرور محدود تھے لیکن اسکی بلا واسطہ یا بالواسطہ کوششوں سے جتنے لوگوں کا بھی دین سے تعلق ہو گیا۔ اُن سب کے اجر و ثواب میں بھی اُس کا حصہ ہو گیا اور وہ ہزاروں لاکھوں بلکہ کبھی کبھی کروڑوں ہو سکتے ہیں اس لیئے اس کی کمائی غیر محدود ہو گی اور دنیا سے اس کے جانے کے بعد بھی اُس کے اجر و ثواب میں بے حساب اضافہ برابر ہوتا رہے گا۔ بہر حال بڑی سے بڑی جفاکشی اور مستعدی کے باوجود انسان اپنی ذاتی عبادات اور نیک اعمال سے دعوت والے کا مقام حاصل نہیں کر سکتا اور اسکے برابر اجر و ثواب نہیں لے سکتا۔

دینی دعوت اور تبلیغی جد و جہد کے یہ چند عام فہم موجبات اور محرکات جو اس وقت ذہن میں تھے میں نے عرض کر دیے اگر آپ غور کریں تو اس طرح کی اور بھی چیزیں سمجھ میں آ سکتی ہیں۔

ہماری دینی دعوت کا مقصد

اور

اُسکے اصُول!

(سلسلۂ دعوت کی دوسری، تیسری، چوتھی تقریر کا خلاصہ)

"دعوتِ اصلاح و تبلیغ" کے سلسلہ میں تینؔ تقریریں اس عاجز نے کی تھیں، جب اشاعت کے لئے اُن پر نظرِ ثانی کی گئی، تو مناسب معلوم ہوا کہ اُن میں کچھ تصرف کر کے ایک مسلسل مذاکرہ بنا دیا جائے ——— چنانچہ ذیل میں جو کچھ درج ہو رہا ہے یہ گویا اُن تینوں تقریروں کا خلاصہ ہے، بلکہ تکمیلِ فائدہ کیلئے بعض چیزوں کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے، اور بعض چیزیں غیر اہم سمجھ کر حذف بھی کر دی گئی ہیں" ——— محمد منظور نعمانی

مجھے اس وقت آپ حضرات کے سامنے اِس دینی دعوت کے مقصد اور اُسکے چند خاص اصولوں کی وضاحت کرنی ہے ——— لیکن اس سے پہلے میں ایک اور بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ ہماری یہ دینی جدوجہد "تبلیغ" اور "تبلیغی تحریک" کے نام سے مشہور ہو گئی ہے، اور اس سے بعض اوقات لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہوتی ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کام کے کرنے والوں نے کبھی اس کا یہ نام اس طرح تجویز نہیں کیا تھا جس طرح کہ تحریکوں کے یا اداروں کے نام رکھے جاتے ہیں، بلکہ یہ آپ سے آپ مشہور ہو گیا، اور ایسا مشہور ہوا ہے کہ خود ہمیں بھی بہت سے موقعوں پر تعارف کے لئے اس کا یہی نام استعمال کرنا پڑتا ہے۔

آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ یہ کام اس خاص طرز پر، اور ان اصولوں کے ساتھ اس دور میں حضرت مولانا محمد الیاس (رحمۃ اللہ علیہ) نے شروع فرمایا تھا، اور اُن کے سامنے یہ تھا ہی نہیں، کہ اپنی کوئی مخصوص جماعت بنائیں،

اور اپنی اس خاص جد و جہد کو کسی خاص نام سے موسوم اور مشہور کریں، وہ تو رسم و ضابطے کی ان سب چیزوں سے بالکل بے پروا ہو کر عشق اور جنون کی کیفیت کے ساتھ اپنی ساری توجہ بس اس پر مرکوز کئے ہوئے تھے کہ مسلمانوں میں دین کی دعوت اور دین کے لئے جد وجہد اور اُس کی فکر کسی طرح عام ہو جائے، اُن کے نزدیک بس یہی کام سارے کاموں سے زیادہ ضروری تھا، میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے کبھی نام کے مسئلہ پر غور بھی نہیں کیا ہوگا ——

بہرحال یہ نام آپ سے آپ مشہور ہو گیا، اور بعض اوقات ہمارے اصل کام اور مقصد کے لئے یہ بڑا حجاب بن جاتا ہے، کیونکہ اس نام سے قدرتی طور پر اُن ہی کاموں کی طرف لوگوں کا ذہن جاتا ہے، جو "تبلیغ" کے نام سے مسلمانوں میں پہلے ہوتے رہے ہیں —— مثلاً بعض لوگ تبلیغ کا مطلب صرف غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ سمجھتے ہیں، بعض لوگوں کا ذہن اس لفظ سے شریعت کے تفصیلی احکام کی تبلیغ کی طرف جاتا ہے، اور بعض حضرات اس لفظ ہی کی وجہ سے ہمارے اس کام کو وعظ و تقریر کا کوئی سلسلہ خیال کر لیتے ہیں —— اس قسم کے سارے مغالطے تبلیغ کے اس مشہور نام سے ہی لگتے ہیں، لیکن اب یہ ایسا مشہور ہو گیا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں سے اس کو بھلا دینا، اور اس کی جگہ کوئی نیا نام اور عنوان چالو کر دینا شاید کسی انسان کے بس میں نہیں —— میں نے مقصد اور اصولوں کے ذکر سے پہلے اس چیز کی وضاحت آپ حضرات کے سامنے اسلئے ضروری سمجھی کہ جو واقعہ ہے وہ آپ کے علم میں آ جائے، تاکہ آپ کو خود بھی مغالطہ نہ ہو اور اس بارے میں آپ دوسروں کے ذہن بھی صاف کر سکیں —— اب میں اصل بات شروع کرتا ہوں:-

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمان کہلانے والی جو اُمت، اور جو قوم اس وقت ایک ایک مُلک میں کئی کئی کروڑ کی تعداد میں موجود ہے اُس کی غالب اکثریت اس حالت میں ہے کہ وہ اُس ایمان اور اس ایمان والی زندگی اور اس ایمانی جد وجہد سے بالکل خالی اور عاری ہے جس کا اللہ و رسولؐ نے ہم سے مطالبہ کیا ہے، اور جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور نصرت کے خاص وعدے ہیں —— پس یہ دینی دعوت اُمت کی اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کی ایک عمومی کوشش ہے، اور اس کا مقصد بس یہی ہے کہ اُمتِ محمدیہ میں وہ ایمان، وہ ایمان والی زندگی، اور وہ ایمانی جد وجہد کسی طرح عام ہو جائے جس کا اس اُمت سے مطالبہ ہے، اسکے سوا کوئی اور مقصد اور منتہا ہمارے سامنے نہیں ہے، ہمیں اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ ختم نبوت کے بعد یہ کوشش اس اُمت کے فرائض میں سے ہے، اور اخلاص کے ساتھ اس راستے میں محنت اور مشقت اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کا تقرب حاصل کرنے کا خاص ذریعہ ہے، اور یہ نبوت کی نیابت اور انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے۔

مجھے اس وقت اس موضوع پر دلائل پیش کرنے نہیں ہیں، نہ آپ حضرات اسکے ضرورت مند ہیں، لیکن اگر آپ میں سے کسی کو کبھی اسکے دلائل معلوم کرنے کی ضرورت پڑے، تو بہت پہلے کا لکھا ہوا میرا ایک رسالہ ہے

"مسلمان قوم کی حالت اور حاملانِ دین کا فریضہ" اُس کا مطالعہ انشاءاللہ کافی ہوگا۔
مقصد کے متعلق تو میں بس اتنا ہی عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں، اور اب اس کام کے چند خاص اصول بیان کرنا چاہتا ہوں ——— آپ حضرات اس دعوت کے خاص نمبروں کو اور اسکے طریقِ کار کو تو جانتے ہی ہیں، الحمدللہ برسوں سے آپ کا اس کام سے تعلق ہے، اِسلئے میں صرف چند اصولی باتیں ہی اس وقت عرض کروں گا، جن کی میری نظر میں خاص اہمیت ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پچھلے دَور میں جو دینی اور اصلاحی کوششیں مسلمانوں میں ہوتی رہی ہیں (اور اللہ کے فضل سے اُن کا سلسلہ اَب تک بھی جاری ہے) وہ عموماً طالبین کے لئے ہی ہوتی تھیں، اور اُن سے زیادہ تر وہی لوگ مستفید ہوتے تھے جن میں دین کی فکر اور طلب ہوتی تھی، ہمارے دینی مدرسوں میں داخل ہو کر وہی بندگانِ خدا علمِ دین حاصل کرتے تھے، اور خانقاہوں میں مشائخ کرام سے استفادہ کے لئے بھی وہی حاضر ہوتے تھے جن کے اندر اُس کی طلب ہوتی تھی اسی طرح علماءِ ربانی کی مجالس اور اُن کی دینی و اصلاحی تصنیفات سے فائدہ بھی بس وہی لوگ اٹھاتے تھے جن میں دین کی، اور اپنی آخرت کی کچھ فکر ہوتی تھی ——— اور جن طبقوں میں دین کی فکر اور طلب ہی نہیں رہی تھی، جہاں تک ہماری معلومات ہیں اُن کو دین کی طرف لانے کی کوشش کا رواج بہت دنوں سے چھوٹا ہوا تھا، یعنی اس کا کوئی عمومی اور مستقل نظام نہیں تھا ——— بس ہماری اس دینی دعوت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اُن طبقوں کی خصوصیت سے فکر کی جائے جو دین کی طلب اور فکر سے خالی ہو چکے ہیں، یا جن کی دینی فکر بہت ہی مضمحل اور کمزور ہو چکی ہے، وہ اگر ہمارے پاس نہیں آتے تو ہم خود اُن کے پاس پہنچیں، اور دین سے اُن کا تعلق پھر سے جوڑنے کی، اور اُن میں دین کی فکر اور طلب پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور اس کے لئے خود اُن سے ربط و ضبط پیدا کریں۔

اسی طرح کی ایک دوسری قابلِ ذکر اصولی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں دینی نقطۂ نظر سے جو فساد اور بگاڑ اس وقت پھیلا ہوا ہے ہمارے نزدیک اُس کی جڑ بنیاد یہ ہے کہ دلوں میں وہ ایمان و یقین باقی نہیں رہا ہے جس کے دباؤ سے آدمی کی زندگی اللہ و رسول کے احکام کے مطابق "اسلامی زندگی" بنا کرتی ہے، اور فضا کی عام خرابی کی وجہ سے ہمارا رجحان اور ہمارا ذوق غیر اسلامی بن گیا ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسی کو یوں کہہ لیجئے کہ ہماری خلافِ دین عادتیں اور نفسانی خواہشیں ہم پر اس قدر غالب آگئی ہیں کہ اُن کے خلاف اللہ کے احکام پر چلنا ہمارے لئے سخت مشکل ہو گیا ہے، اِسلئے ہمیں یقین ہے کہ اس وقت اصلاح کے لئے لوگوں کو یہ بتلا دینا کافی نہیں، کہ تمہارے اندر فلاں فلاں باتیں غیر اسلامی ہیں، اور تم فلاں فلاں کام اللہ و رسول کے احکام کے خلاف کر رہے ہو۔

ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے لاکھوں بھائی جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نہیں پڑھتے، جانتے ہیں کہ زکوٰۃ فرض ہے اور نہیں دیتے، جانتے ہیں کہ جھوٹ بولنا حرام ہے، لیکن معمولی معمولی فائدوں کے لئے

جھوٹ بولتے ہیں، اسی طرح ہمارے لاکھوں بھائی ہیں جو جانتے ہیں کہ سینما دیکھنا گناہ ہے، لیکن پھر بھی دیکھتے ہیں۔

——— الغرض اس وقت اُمتِ محمدیہ میں گناہوں کا جو بازار گرم ہے، ہمیں بالکل یقین ہے کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو شریعت کے احکام معلوم نہیں، بلکہ میں نے جیسا کہ عرض کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ دل میں اللہ و رسول کے احکام کی وہ عظمت اور اندر وہ ایمان و یقین موجود نہیں ہے جس کے اثر اور دباؤ سے آدمی شریعت پر چلا کرتے ہیں، اسلئے ہمارے نزدیک اس وقت شریعت کا صرف حکم بتلا دینا کافی نہیں، بلکہ بعض حالات میں تو ان بیچاروں کے لئے یہ اور زیادہ مضر اور مہلک ہوگا، اور اس سے اُن کی بربادی میں اور اللہ سے اُن کی دوری میں اور اضافہ ہوگا۔ کیونکہ ہم اگر اُن کو بار بار شریعت کے حکم سے آگاہ کریں گے، اور وہ ہماری اس یاددہانی کے باوجود شریعت کے حکم کے خلاف ہی چلتے رہیں گے (جیسا کہ اُن کا حال ہے) تو اس سے اُن کی گناہگاری اور مغضوبیت کا نمبر اور بڑھ جائے گا ———

اسلئے اس دینی دعوت میں یہ اصول اختیار کیا گیا ہے کہ اس کی کوشش کی جائے کہ اللہ کے بندوں میں ایمان و یقین پیدا ہو، اور اُن کی طبیعت کا رجحان اور ذوق جو غلط اور غیر اسلامی بن گیا ہے وہ کسی طرح درست ہو، اور عادات اور خواہشات کے خلاف اللہ کے احکام پر چلنے کی اُن میں استعداد اور طاقت پیدا ہو، جب اندر ایمان و یقین آئے گا، اور جب طبیعت کا رُخ کچھ درست ہوگا، اور خواہشات کے خلاف احکام پر چلنے کی جب طاقت پیدا ہوگی، تو پھر پوری زندگی اسلامی بن سکے گی ——— اپنے اسی نظریے اور اسی اصول کی وجہ سے عام لوگوں کو ہم اُن کی زندگی کی جزئی کمزوریوں پر نہیں ٹوکتے ——— اس سلسلہ میں، میں آپ حضرات کو حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ کا ایک واقعہ سناؤں:-

دہلی کے ایک نوجوان جو ڈاڑھی صاف رکھتے تھے، حضرتؒ کی آخری بیماری میں آیا کرتے تھے، اور حضرتؒ کے سر پر تیل کی مالش کیا کرتے تھے، حضرتؒ کا برتاؤ بھی اُن کے ساتھ اچھی خاصی شفقت کا تھا، ایک دن جبکہ وہ مالش کر رہے تھے حضرتؒ نے خاص محبت کے انداز میں اُن سے ڈاڑھی کے متعلق کچھ فرما دیا ——— اگلے دن وہ نہیں آئے، حضرتؒ نے اپنے بعض خادموں سے فرمایا کہ آج وہ نہیں آئے، دراصل مجھ سے ہی غلطی ہوگئی، میں سمجھا کہ اب یہ اس درجہ پر آچکے ہیں، لیکن معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا، اب اُن کو بُلواؤ، چنانچہ دو چار دن کے بعد وہ شرماتے ہوئے آئے، حضرتؒ نے بڑی محبت اور شفقت کا اظہار فرمایا، اور فرمایا: بھئی! غلطی ہماری ہی تھی ہم نے تمہیں پہچانا نہیں، تم اسی طرح آتے رہو ——— اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایسا اثر ڈالا کہ غالباً اُسی دن سے توبہ کرلی، اور وہ اب ہماری اس دینی دعوت کے ممتاز کارکنوں میں ہیں، اور اُن کی زندگی ہمارے لئے بھی قابلِ رشک ہے، اور اللہ ہی جانتا ہے کہ اُن کی کوششوں سے کتنے اللہ کے بندوں کو اُب تک ایمان نصیب ہوا ہوگا، کتنوں کی نمازیں زندہ ہوئی ہوں گی، اور کتنوں نے اُن کی صحبت سے متاثر ہو کر ڈاڑھیاں رکھی ہوں گی۔

لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ گناہوں کو خدانخواستہ ہلکا سمجھا جائے، یا اُن کو خوشی سے برداشت

کیا جائے۔ معاذ اللہ یہ تو کفر کا ایک شعبہ ہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ باہر کی تبدیلی اندر کی تبدیلی پر موقوف ہے اسلئے پہلے اس کی کوشش اور فکر کی جائے، اور جب کسی شخص کے متعلق اس کا اطمینان ہو جائے کہ یہ کہنے سے اب مان لے گا، اور بھڑ نہیں جائے گا، تو پھر ہمارے لئے خاموشی ہرگز درست نہیں۔ حضرتؒ ہی کا ایک دوسرا واقعہ آپ کو سناؤں :-

حضرتؒ کی آخری بیماری ہی میں ایک دن دوپہر کے وقت میں خدمت میں حاضر تھا، حضرتؒ کی نگاہ دروازے کی طرف تھی، دیکھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا، فوراً حضرتؒ منھ پھیر کے لیٹ گئے، اور مجھ سے فرمایا کہ یہ شخص جو آرہا ہے بہت عرصہ ہوا یہ مجھ سے بیعت کرکے گیا تھا، لیکن اس کی ڈاڑھی کتری ہوئی ہے، تم جا کر کہدو کہ میرے پاس ہرگز نہ آئے، میں اس سے ملنا نہیں چاہتا —— میں باہر آیا، اور حضرتؒ کا پیغام اُن صاحب کو پہنچا دیا، وہ زار زار رونے لگے، اور مجھ سے کہا کہ حضرتؒ سے عرض کرو، میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں، اب انشاء اللہ کبھی یہ گناہ نہ ہوگا — میں نے آکر عرض کیا، حضرتؒ نے فوراً بلا لیا، اور پہلے کچھ تنبیہ فرمائی، اور پھر بڑی شفقت فرمائی —— پس چونکہ ان صاحب کے متعلق حضرتؒ کو اطمینان تھا کہ میری ناراضی کو یہ برداشت نہیں کرسکیں گے اور فوراً پگھل جائیں گے، اسلئے حضرتؒ نے شروع ہی میں یہ سخت رویہ اختیار فرمایا۔

بہرحال ہماری اس دینی دعوت کا ایک خاص اصول یہ ہے کہ لوگوں میں وہ ایمان اور وہ دینی ذوق اور خواہشات کے خلاف چلنے کی وہ استعداد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس کے بعد زندگی آپ سے آپ "اسلامی زندگی" بن جاتی ہے۔

اور اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کو اُن کے روزمرہ کے اُس ماحول اور اُن مشاغل سے الگ کرکے اور کاٹ کے جن میں ایمان کی نشو ونما اور دین میں ترقی کا سامان نہیں ہے، کسی ایسی فضا میں، اور ایسے مشاغل میں اُن کا کچھ وقت گذروایا جائے جن سے ایمان کو غذا، اور طاقت حاصل ہو، اور دینی ذوق پیدا ہو، اور اللہ کے حکم کے مقابلے میں خواہشات کی پائمالی کی مشق ہو —— اور خود ان کو ایمان کا، اور ایمان والی زندگی کا، اور ایمان کے لئے جدوجہد کا داعی بنایا جائے، اور وہ اس راہ میں کچھ تکلیفیں اُٹھائیں، اور قربانیاں دیں —— دراصل جماعتوں کی نقل وحرکت جس پر ہم زور دیتے رہتے ہیں اُس کا راز بس یہی ہے، اور اس میں یہ سب کچھ ہے، اور ہمیں اپنے غور وفکر اور تجربے کی بنا پر اس کا پورا یقین ہے — کہ اندر اور باہر کی تبدیلی کا یہ عجیب وغریب نسخہ ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور پر کیا جائے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ خود ہم نے بھی اس کی قدر نہیں کی، اور اس کا کچھ حق ادا نہیں کیا، اسلئے لوگ ابھی تک اس کی تاثیر اور طاقت کے قائل نہیں ہوسکے، اور اس کی ذمہ داری ہم آپ ہی پر ہے جو اس سے واقف ہیں اور اس کام کو کر رہے ہیں، چاہے وہ کسی شہر اور کسی صوبہ اور کسی مُلک میں کر رہے ہوں۔ اگر

جماعتوں کی نقل وحرکت اصولوں کی پوری پابندی کے ساتھ ہو تو جو شخص دو چار دن بھی کسی جماعت کے ساتھ گذارے گا انشاءاللہ وہ ضرور متاثر ہوگا، اُسکے ایمان میں ضرور تازگی آئے گی، اُس میں ضرور دینی فکر پیدا ہوگی، اُسکے دوسرے جذبات اور دوسرے شوق کمزور پڑیں گے، اور اللہ سے تعلق کا جذبہ اور اس کی رضا اور رحمت حاصل کرنے کا شوق انشاءاللہ کسی نہ کسی درجے میں ضرور بڑھے گا۔

جماعتوں کے اس نظام میں یہ چند باتیں بڑی اہم اور بڑی طاقتور ہیں:۔

(۱) ایک، زندہ دینی اور دعوتی ماحول، اور اللہ کے ذکر کی، اور آخرت کے فکر کی، اور تعلیم وتعلم کی متحرک اور متعدی فضا۔

(۲) دوسرے، جماعت کے ساتھ ہو کر خود دین کا داعی بننا ——— (اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس چیز کا داعی اور حامی بن جاتا ہے قدرتی طور پر اُس سے اس کا تعلق بڑھتا ہے، یہ ایک مسلّمہ نفسیاتی حقیقت ہے، آپ ہر تحریک اور ہر نظریے کے داعیوں اور حامیوں کو دیکھیں گے کہ جس نظریے کے وہ سچے اور مخلص داعی ہوں گے اس پر اُن کا یقین اور اُس سے اُن کا تعلق نہایت گہرا ہوگا، اور برابر ترقی کرتا رہے گا)۔

(۳) تیسرے، دین کی خاطر تکلیفیں اُٹھانا، اور اللہ کی راہ میں اپنے مرغوبات ومالوفات اور اپنی خواہشات اور اپنے جان ومال کی قربانی کرنا، اور اس تکلیف اور قربانی کی عادت ڈالنا ——— یہ وہ چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور ہدایت کے دروازے کھُلنے کا وعدہ ہے — ارشاد ہے:۔ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ہ"

(۴) جماعت کے ساتھ وقت گذارنے کا اسی طرح کا ایک چوتھا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے کبھی دین سیکھنے کی فکر نہیں کی نہ اُنھوں نے دین کا علم حاصل کیا، اور نہ دین والوں کی صحبتیں اُن کو ملیں، ایسے لوگ جماعتوں کے ساتھ رہ کر دین کی ضروری ضروری معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں، دین سیکھنے کا سب سے سہل اور فطری طریقہ یہی ہے کہ دین والوں کے ساتھ رہ کر، اُن کا طریقہ اور اُن کی روش اختیار کی جائے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ ہماری یہ جماعتیں اگر صحیح طریقے پر اپنا کام کریں تو یہ چلتے پھرتے مدرسے بھی ہیں اور ذکر وفکر اور ریاضت اور مجاہدے کی گشتی خانقاہیں بھی ہیں ——— اور ساتھ ساتھ غافلوں اور بے طلبوں کے لئے یہ دعوت اور تبلیغ بھی ہے، یعنی جو بندے اللہ سے بے تعلق اور آخرت سے بے فکر ہو کر زندگی گذار رہے ہیں، جماعتوں کی یہ نقل وحرکت اُن میں فکر اور طلب پیدا کرنے کی کوشش بھی ہے ——— اور دین کی فکر اور کوشش کا جو عمومی نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا اُس کو پھر سے زندہ کرنے اور رواج میں لانے کی یہ جد وجہد بھی ہے ——— الغرض اس کام میں اور اسکے طریقِ کار میں ان سب باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور وہ ان تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔

پس ہمارا اصول اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ ایمان اور ایمانی زندگی کے طالب اور داعی بن کر ایمانی فکر اور ایمان والی جد و جہد کو دنیا میں پھر سے زندہ اور عام کرنے کے لئے اس طرح کی جماعتیں بنا بنا کر اپنے وطنوں اور اپنے گھروں سے نکلیں، اور جماعتی ماحول میں وقت گذار کے اور اس راہ میں تکلیفیں اُٹھا کے ایمان اور ایمان والی زندگی خود بھی حاصل کریں، اور اس دینی جد و جہد کو دنیا میں پھیلائیں، بہرحال ہماری اصل دعوت گھر سے نکل کے یہ کام کرنے کی ہے لیکن جو لوگ ہماری دعوت اور ہمارے مطالبہ پر وقت دینے کے لئے تیار نہ ہوں اُن کو بھی ہمیں چھوڑنا نہیں ہے۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ ہم سو سے وقت لینے کی کوشش کریں تو دس مشکل سے تیار ہوتے ہیں، ایسی حالت میں باقی ۹۰ کو یوں ہی اُن کے حال پر چھوڑ دینا بڑی غلطی اور بڑی بے رحمی ہوگی، اُن کے واسطے ضروری ہے کہ ہم اُن سے اُن کے گھروں ہی پر بار بار ملتے رہیں، اور اُن کو دین کی طرف توجہ دلاتے رہیں، اور مقامی اجتماعات ہی میں لانے کی کوششیں کرتے رہیں، جب وہ اتنا کرنے لگیں گے تو انشاء اللہ کبھی وہ آگے بڑھنے کے لئے بھی تیار ہو جائیں گے بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب ایسے ملیں جو نہ جماعت کے ساتھ نکلنے پر تیار ہوں نہ وہ مقامی اجتماعات میں آنے کے لئے آمادہ ہوں تو اُن سے ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ ہی رکھا جائے، اور ان کو پڑھنے کیلئے کتابیں ہی پہنچائی جائیں۔
اصل مقصد تو اللہ سے اور دین سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا ہے، اور باقی تو سب وسائل اور ذرائع ہیں ہاں! چونکہ ہمیں تجربے سے اس کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ سب سے زیادہ مؤثر چیز الحمد للہ ہمارا یہ جماعتی اور دعوتی نظام ہے، اور اس کا اثر متعدی ہے، اس واسطے ہماری خاص جد و جہد اسی کے لئے ہونی چاہئے۔

جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں ایک اصول ہمارا یہ بھی ہے کہ ہم اپنے اس کام کے سلسلہ میں عام دعوت دین کی صرف چند اصولی اور متفق علیہ باتوں کی دیتے ہیں، اور یہ وہ باتیں ہیں جن کے متعلق ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی زندگی کی اصلاح ان ہی بنیادوں پر ہو سکتی ہے، یعنی ہماری ان باتوں کو اپنانے کے بعد وہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ وہ دین کی اُن باتوں کو بھی قبول کرلیں جن کو وہ آج اپنی جہالت اور دین سے بیگانگی کی وجہ سے ہمارے کہنے سے بھی قبول نہیں کر سکتے، اور دین کے لئے اپنی خواہشات کی، اور اپنے جان و مال کی وہ قربانیاں کر سکیں جن کے لئے وہ آج کسی طرح بھی تیار نہیں ہو سکتے۔

ہم اپنے اس اصول ہی کی وجہ سے بیچارے عوام کی بہت سی اعتقادی اور عملی غلطیوں کے بارے میں بسا اوقات کچھ نہیں کہتے، کیونکہ ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اگر ہم کچھ کہیں گے تو ماننے کے بجائے یہ لوگ ہماری بات سننا بھی چھوڑ دیں گے، اور ہم برابر دیکھتے ہیں کہ یہی لوگ جب ہماری ابتدائی اور بنیادی باتوں کو مان لیتے ہیں، اور دین کی طرف چلنے لگتے ہیں، اور اپنی نفسانی خواہشات اور رسم و رواج کے خلاف چلنے کی اُن میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے

تو پھر اُن باتوں کی بھی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔

الحمد للہ ہم اپنے اس اصول اور اس طرز کار پر بالکل مطمئن ہیں، اور اس کو حکمتِ شریعت کے بھی عین مطابق سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ہمارا ایک خاص اصول یہ ہے کہ ہم اس کام کو عمومی دعوت کے اصول پر کر رہے ہیں تنظیم جماعت کے اصول پر نہیں۔ —— اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کل جس طرح مختلف مقاصد کے لئے جماعتیں اور پارٹیاں بنانے کا رواج ہے، اُن کے کچھ ممبران یا ارکین ہوتے ہیں جنھیں کچھ خاص شرطیں اور پابندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں، اور پھر جماعتی معاملات میں اُن کے کچھ خاص حقوق ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں کے نہیں ہوتے، اور اسی طرح کچھ عہدے دار ہوتے ہیں، اور مختلف مقامات پر اُن کی شاخیں ہوتی ہیں، اور یہ شاخیں اپنے مرکز کے ماتحت ہوتی ہیں، اور اس ماتحتی ہی کی وجہ سے مرکز کو اپنی شاخوں سے محاسبہ کا، اور باز پرس کا حق ہوتا ہے۔

تو اگرچہ آج کل کی تمام منظم جماعتوں اور پارٹیوں کا یہی طریقہ ہے، اور اس کا رواج اتنا عام ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ اس طرح کی تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام ہو ہی نہیں سکتا، لیکن ہم یہ کام اس قسم کی کسی تنظیم کے بغیر ہی کر رہے ہیں۔

آپ حضرات جیسا کہ خود جانتے ہیں لوگوں کو ہم کسی خاص تنظیم میں شامل ہونے کی یا کسی جماعت یا پارٹی کا ممبر یا رکن بننے کی دعوت نہیں دیتے، ہم نے ایسی کوئی جماعت یا پارٹی بنائی ہی نہیں، ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ کام جو ہم مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں یہ کرنے کا ہے، ہم بھی اس کو کر رہے ہیں آپ بھی کیجئے، اس میں کسی افسری ماتحتی کا کوئی سوال نہیں، نہ اس کیلئے کوئی آل انڈیا یا آل ورلڈ دینی جماعت یا پارٹی بنانے کی ضرورت ہے، آپ اس کو یوں سمجھئے کہ مثلاً مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس حال میں ہے کہ ان کی زندگی ایمان والی اور اسلام والی زندگی نہیں ہے، یا تو وہ اسلام کے تمام احکام سے بے تعلق ہیں، یا زیادہ تر احکام سے بے تعلق ہیں، تو ان کی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے کے لئے ہمارے نزدیک اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ ہم ایک اسلام کمیٹی یا ایمان کمیٹی قائم کریں، اور اُن مسلمانوں کو اس کا رکن یا ممبر بننے کی دعوت دیں، اور اس کی رکنیت یا ممبری کے لئے یہ شرط لگائیں کہ اسکے ہر ممبر کو اسلامی احکام پر عمل کرنا ہوگا، بلکہ اس کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو براہِ راست اسلامی زندگی کی دعوت دیں، اور اس کے لئے جو طریقہ کار اس زمانے میں ہم بہتر سمجھتے ہیں اُس کو اختیار کرنے کا ان کو مشورہ دیں ——

اسی طرح ہمارے نزدیک اس کی بھی ضرورت نہیں کہ اس کوشش کے لئے کوئی خاص پارٹی منظم کی جائے، اور لوگوں کو اُس کا ممبر یا رکن بنایا جائے —— بلکہ ہم صاف کہتے ہیں کہ دوسرے کاموں کے لئے یہ طریقہ موزوں ہوگا، لیکن اس دینی اصلاحی جدوجہد کے لئے یہ مناسب نہیں —— بلکہ ہمارے نزدیک تو اس میں مفاسد اور نقصانات ہیں۔

اس وقت امت میں اتنا انتشار ہے کہ کسی خاص شخصیت یا جماعت پر اُس کا بہت تھوڑا حصہ مجتمع ہو سکتا ہے، اور

بہت کم لوگ کسی خاص جماعت اور حلقہ سے وابستہ ہوسکتے ہیں، ایسی صورت میں خالص دینی اور اصلاحی کام (جو زیادہ سے زیادہ وسیع اور عام ہونا چاہیے) اگر تنظیمی طریقے پر کیا جائے گا، اور لوگوں کو اُس تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی، یا کسی امیر یا کسی شیخ کی بیعت کی طرف انھیں بلایا جائے گا، تو نئے نئے سوالات اور اختلافات اٹھیں گے، اور امت میں اختلاف اور انتشار اور زیادہ بڑھے گا، جیسا کہ تجربہ ہو رہا ہے۔

اسکے علاوہ اس وقت اکثر طبیعتوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ دین کے نام پر کسی خاص جماعت اور پارٹی میں داخل ہوجاتے ہیں، تو اُن میں ایک خاص قسم کی حزبیت اور جماعتی عصبیت آجاتی ہے، پھر وہ اپنی جماعت کے آدمیوں کو اور نظر سے دیکھتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کو اور نظر سے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پھر انھیں اپنے چھوٹے سے دائرے سے باہر یا تو خیر بالکل نظر نہیں آتا، یا بہت ہی کم شاذ و نادر نظر آتا ہے، اور اس وقت امت میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے دائروں اور حلقوں کا بننا سخت مضر، بلکہ مہلک ہے۔

ایک خطرہ ہمارے نزدیک اس طریقے میں یہ بھی ہے کہ اس وقت امت میں غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہے کہ کسی جماعت کا رکن یا ممبر بن کر کام کرنے کی صورت میں اُن کے لئے کام کا محرک بجائے اللہ کے حکم اور دین کے تعلق کے جماعت کا نظام اور جماعت کا تعلق ہوگا، یعنی اُن کی محنتیں اور سرگرمیاں براہِ راست اللہ کے لئے اور دین کے لئے ہونے کے بجائے جماعت کے لئے اور پارٹی کے لئے ہوں گی، اور یہ دین کی رُوح اور انبیاء علیہم السّلام کے اصول کے بالکل خلاف ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں، اور یہ وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں یہ دینی کام ایک عام دعوت کے طرز پر کرنا ہے ـــــــ اِس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ پر بڑا خاص فضل فرمایا کہ انھوں نے اس زمانے کے عام رواج کے بالکل خلاف یہ طرز اختیار کیا، اُن کا ذہن اس مسئلہ میں بالکل صاف اور یکسو تھا، اور وہ اس پر پورا یقین رکھتے تھے کہ امت اس وقت اس حالت میں نہیں ہے کہ اس کی دینی اصلاح کے لئے تنظیمی جماعتوں کے طرز پر کام کیا جائے، اور کسی خاص شخص یا جماعت کی طرف اس کو دعوت دی جائے۔

اس سلسلہ میں ایک چیز اور بھی قابلِ ذکر ہے، اور ایک دوبار اپنے بعض خاص ساتھیوں نے خود مجھ سے اس کے متعلق سوال بھی کیا ہے ـــــــ اور وہ یہ کہ بعض حدیثوں میں اس کی تاکید ہے کہ مسلمان جماعتی نظام کے ساتھ اور جماعت سے وابستہ ہو کر رہیں ـــــــ اور کسی کو اپنا امیر ضرور بنائیں۔

ایک زمانہ تک میں بھی ان حدیثوں کے مقصد اور منشا کے بارے میں کچھ غلط فہمی میں تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اُس سے نکال دیا، در اصل اس بارے میں جو روایات نقل کی جاتی ہیں اُن میں سے جن میں التزام جماعت اور امام کی بیعت کی تاکید ہے اُن کا منشا صرف یہ ہے کہ جب مسلمانوں میں جماعتی نظام موجود ہو اور اُمّت کا عموم اُس سے وابستہ ہو، اور اس کا کوئی امام ہو، تو ہر مسلمان کو اُس سے

وابستہ رہنا چاہئے، اور کسی کو بھی اُس سے الگ رہ کر اختلاف اور تفرقہ کا باعث نہیں بننا چاہئے ——— اور ظاہر ہے کہ اس وقت یہ صورت نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی اس وقت امکان نہیں ہے کہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو کوشش کر کے کسی ایک جماعت پر اور ایک امیر پر متفق کیا جا سکے ——— ایسی حالت میں اگر اپنی اپنی جماعتیں بنائی جائیں گی تو ایک ایک ملک بلکہ ایک ایک شہر میں مختلف الخیال مسلمانوں کی بیس بیس جماعتیں ہوں گی، اور اُن کے بیس بیس امیر ہوں گے، تو حدیث پر اس طرح عمل کرنے سے بجائے وحدت اور اجتماعیت کے تفرق اور تشتت بڑھے گا۔

چنانچہ جن لوگوں نے ان روایات کی بنیاد پر ہمارے اس زمانہ میں دینی جماعتیں بنائیں، اور مسلمانوں کو کسی امیر کی بیعت کی دعوت دی، وہ بہت تھوڑے لوگوں کو اپنے ساتھ لے سکے، دہلی کے ایک اہلِ حدیث بزرگ نے اپنی جماعت اسی بنیاد پر بنائی تھی، اور وہ اسکے امام اور امیر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہلحدیث حضرات میں سے بھی بہت تھوڑے سے اُن کے ساتھ ہوئے، اور وہ چند آدمیوں کی ایک الگ ٹولی بن کر رہ گئی، اور باقی ساری جماعت اُن کے خلاف ہوگئی، اور اس اختلاف نے بہت طول کھینچا، ممکن ہے وہ بزرگ مطمئن ہوں کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہی حدیث کا منشا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اُن کی غلط فہمی تھی، دین میں جماعت اور امارت کا حکم تو اُمت میں اجتماعیت اور وحدتِ مرکز پیدا کرنے کے لئے ہے، نہ کہ اپنی اپنی ٹولیاں بنانے کے لئے۔

اور بعض حدیثیں وہ ہیں جن میں کسی خاص حالت میں وقتی اور عارضی امیر بنانے کے لئے فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے، کہ:-

"جب تین مسلمان بھی سفر میں نکلیں، تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں۔"

ان حدیثوں کو بھی مستقل پارٹیاں بنانے کے لئے، اور بیعت لینے والے مستقل امیر بنانے کے لئے استعمال کرنا صحیح نہیں۔ ان حدیثوں پر عمل کی صورت وہی ہے جو خود رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ سے معلوم ہوتی ہے کہ آپ جب دعوتی وفود یا فوجی دستے یا لشکر روانہ فرماتے تھے، تو ایک کو اُن کا امیر بنا دیتے تھے، اور یہی آپ حضرات کا طریقہ ہے، کہ جب آپ کی جماعت نکلتی ہے تو ایک امیر بنا لیا جاتا ہے، یا آپ کو کوئی اجتماع کرنا ہوتا ہے، یا مشورے کے لئے بیٹھتے ہیں، تو ایک کو امیر بنا لیتے ہیں، یا چند آدمی مل جل کر کوئی خاص کام کرنا چاہتے ہیں تو اجتماعی نظم کے لئے اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لیتے ہیں ——— الغرض آج کل جس قسم کی پارٹیاں اور جماعتیں بنانے کا رواج ہے، اُن کے لئے ان حدیثوں سے استدلال کرنا صحیح نہیں[1]۔

---

[1] دراصل اس سلسلہ میں ایک بنیادی غلطی بہت سے لوگوں سے یہ ہوتی ہے کہ احادیث میں "جماعت" اور "امام" جیسے جو الفاظ آتے ہیں اُن سے اُن کا ذہن اُس قسم کی جماعتوں اور ان کے اس طرح کے لیڈروں اور امیروں کی طرف چلا جاتا ہے جن کا آج کل رواج ہے، حالات کے اور رواج کے بدل جانے سے اس قسم کی غلط فہمیاں لوگوں کو بہت ہوتی ہیں۔ ۱۲

اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تنظیمی پارٹیاں یا جماعتیں بنانا ناجائز ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ ناجائز ہرگز نہیں ہے یہ تو انتظامی تدابیر ہیں، اگر کسی اجتماعی کام کے کرنے والے، اور کسی تحریک کے چلانے والے اپنے مقصد اور اپنے کام کیلئے اسی طریقے کو بہتر سمجھیں، تو شریعت میں اس قسم کی تنظیمی جماعت بنانے کی ہرگز ممانعت نہیں ہے، اس طرح کی ساری چیزیں مباح الاصل ہیں ——— میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس کو شریعت کا حکم قرار دینا اور جماعت و امارت سے متعلق حدیثوں سے اس کے لئے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، اُن حدیثوں کا محمل اور مطلب وہی ہے، جو میں نے ابھی بتلایا۔

خیر! یہ تو ایک علمی بات تھی، چونکہ بعض دوستوں نے ایک بار مجھ سے اس کے متعلق سوال کیا تھا، اسلئے میں نے اس کی ذرا تفصیل کردی، ورنہ مجھے صرف یہ بتلانا تھا کہ ہمارا اصول یہ ہے کہ ہم نے اس کام کے لئے کوئی جماعت منظم نہیں کی ہے اور ہم اس کو عمومی دعوت کے طور پر چلا رہے ہیں، اور اسی کو ہم صحیح سمجھتے ہیں ——— لیکن یہ طریقہ اب اتنا نامانوس اور غیر مروج ہو چکا ہے کہ خود مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے، کہ بعض اوقات ہزار سمجھانے سے بھی بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، کہ کسی منظم پارٹی کے بغیر کوئی بڑا اجتماعی کام ہو سکتا ہے، اور کوئی تحریک چلائی جا سکتی ہے۔

ایک دفعہ سی، آئی، ڈی کے ایک غیر مسلم افسر ہمارے اس کام ہی کے بارے میں کچھ تحقیق کرنے کے لئے میرے پاس آئے، آدمی بہت سمجھدار اور معقول تھے، اُن کے پاس ایک لمبا سوال نامہ تھا جس میں قریباً ۳۰۔۴۰ سوال تھے، انھوں نے وہ سوال نامہ نکال کر جب مجھ سے سوالات شروع کئے، تو میں نے اُن سے کہا، کہ آپ کی آسانی کے لئے میں پہلے اس کام کی مختصر تاریخ اور نوعیت بیان کردوں، اسکے بعد میرا جواب سمجھنا آپ کے لئے آسان ہو جائے گا، بلکہ شاید پھر آپ کو زیادہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی، چنانچہ میں نے اس کام کی تاریخ اور اسکے اصول اور طریقِ کار پر اُن کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی، اللہ تعالیٰ نے اُس وقت بڑی خاص مدد فرمائی، مجھے یاد نہیں کہ اتنے تھوڑے وقت میں اس کام کے بارے میں کبھی میں نے ایسی جامع اور صاف سلجھی ہوئی تقریر کی ہو۔

اُن صاحب نے بڑی توجہ سے میری ساری بات سُنی، اور میں نے اُن کے چہرے سے بھی محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل کو بہت متأثر اور مطمئن کیا ——— اسکے بعد میں نے اُن سے کہا کہ اب آپ سوال نامہ دیکھئے اور جو دریافت کرنا ہو وہ دریافت کیجئے۔

انھوں نے سوال نامہ کھولا، اور اکثر سوالوں کا جواب خود ہی لکھ لیا، اور چند سوالات اسکے بعد بھی کئے، اور میں نے جو جواب دیا وہی اُنھوں نے لکھ لیا۔ آخر میں انھوں نے کہا (اور میرا خیال ہے کہ بالکل سچے دل سے کہا) کہ جو کچھ آپنے اسوقت کہا، میں نے اس کو سمجھ بھی لیا، اور مجھے بالکل یقین ہے کہ آپ نے بالکل صحیح بتلایا ہے، لیکن ایک بات ایسی ہے کہ میں کسی اور کو نہیں سمجھا سکتا، اور کوئی دوسرا اُس کا یقین نہیں کر سکتا، اور وہ یہ کہ آپ کی کوئی منظم پارٹی نہیں ہے، اور اس کا کوئی ممبر نہیں ہے، اور کوئی دفتر نہیں ہے، اور کوئی فنڈ نہیں ہے، اور کوئی ایسا رجسٹر تک نہیں ہے جس میں اس تحریک کے کارکنوں اور ہمدردوں کے

نام ہوں، اور کہیں اس کا سنٹر اور مرکز نہیں ہے، اور پھر بھی کام اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ہم کو اپنے ذرائع سے بھی معلوم ہے، اور آپ نے بھی ابھی بتلایا، کہ سارے مُلک میں ہو رہا ہے، اور ہندوستان سے باہر عرب اور مصر اور شام تک میں ہو رہا ہے —— میں نے تو اِسلئے یقین کرلیا کہ آپ نے بتلایا، اور میرے دل کو اس کا بالکل اطمینان ہے کہ آپ نے جو کچھ بتلایا ہے وہ صحیح ہی بتلایا ہے، لیکن اس زمانہ میں اس بات کا بالکل یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اتنا بڑا کام بغیر کسی پارٹی کے، اور بغیر کسی فنڈ کے بھی ہو سکتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اُسی وقت ایک بات ذہن میں ڈالی، میں نے کہا کہ اچھا یہ بتائیے کہ ہندو مذہب کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا کہ سارے مُلک میں ہے، میں نے کہا کہ بدھ مذہب کہاں کہاں ہے؟ انھوں نے کہا کہ ایشیا کے بہت بڑے حصّے میں ہے، میں نے کہا کہ اسلام کہاں کہاں ہے؟ انھوں نے کہا کہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں ہے —— میں نے کہا، کیا ان مذہبوں کو کسی منظم پارٹی نے پھیلایا تھا؟ انھوں نے کہا، نہیں! —— میں نے کہا، اصل بات یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اجتماعی کام عام طور سے چونکہ صرف مادی اور سیاسی ہوتے ہیں، اور وہ منظم پارٹیاں ہی کرتی ہیں اِسلئے لوگوں کا یہ خیال ہو گیا ہے کہ کوئی بڑا اور اجتماعی کام ممبروں اور رکنوں والی پارٹی بنائے بغیر نہیں ہو سکتا، حالانکہ رُوحانیت اور خدا پرستی پھیلانے کے لئے اس کی بالکل ضرورت نہیں، اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ یہی ہے، در اصل قصور ہمارا اور ہمارے کام کا نہیں، بلکہ لوگوں کے ذہن کا ہے، اُن کے ذہن آج کل کے مادہ پرست سیاستکاروں کے طور طریقوں سے اتنے مانوس، اور نبیوں اور رشیوں نیوں اور مذہبی اور رُوحانی مصلحین کے طرز سے اتنے نامانوس ہو گئے ہیں کہ اسی کا سمجھنا اور یقین کرنا اُن کے لئے مشکل ہے، حالانکہ دنیا میں رُوحانیت اور خدا پرستی کی تبلیغ اور کوشش ہمیشہ اسی طرح ہوئی ہے۔

میری یہ بات سُن کر انھوں نے کہا، کہ:- میں بالکل سمجھ گیا، اور اب میں یہ بات اپنے افسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا سکوں گا۔

میں نے اس واقعہ کا اِسلئے ذکر کر دیا کہ اگر کبھی کسی کو سمجھانے کی آپ کو بھی ضرورت پڑے، تو آسانی سے آپ سمجھا سکیں۔

بہر حال ہم اپنے اس اصول اور طریقے پر بالکل مطمئن ہیں، اور اپنے کام کے لئے اسی کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔

ایک اصول ہمارا یہ ہے کہ اس کام کے سوا اہلِ حق کے جو دوسرے دینی کام اور دینی تحریکیں اور دینی ادارے ہیں اُن کو رقیب اور حریف نہ سمجھا جائے، بلکہ اُن سب کی قدر کی جائے، اور اُن کے اور زیادہ مفید ہونے اور پھولنے پھلنے کی، اور غلطیوں سے محفوظ رہنے کی اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی جائیں —— دین کو در اصل سب کاموں کی ضرورت ہے اس زمانے میں دین کی ضرورتیں اتنی بڑھ گئی ہیں، اور اتنی پھیلی ہوئی ہیں کہ کوئی ایک ادارہ، اور کوئی سلسلہ، اور کوئی جماعت، اور کوئی تحریک ان سب ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی —— ذرا سوچئے تو ہمارے ہزاروں دینی مدرسے

جو تعلیمی کام کر رہے ہیں، اور حضرات مشائخ حق کے ذریعہ اللہ کے ذکر و فکر کی جو گرمی ہے، اور اہلِ حق کے جو مختلف دینی ادارے اور دینی جماعتیں دین کے لئے اور مسلمانوں کے لئے جو کچھ کر رہی ہیں، اگر یہ سب کرنا چھوڑ دیں تو کتنی بڑی کمی ہو جائے گی، اور کیسا اندھیرا ہو جائے گا، اور پھر کیا کوئی بھی جماعت ان سب کاموں کو سنبھال سکے گی؟ ——— دوسری جماعتوں اور دوسرے اداروں کی خدمات کی قدر اور اعتراف نہ کرنا، اور کسی اختلاف کی وجہ سے بس ان کو تنقید کا نشانہ بنائے جانا یہ اس وقت کی بہت ہی بڑی مہلک بیماری ہے، اور شیطان کو اس معاملے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے کہ اُس نے جماعتوں اور پارٹیوں کا یہی مزاج بنا کر امّت کے کارکن طبقوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ اب ایک کے ذریعہ دوسروں کی برائیاں اور غلطیاں تو منظرِ عام پر آ رہی ہیں، لیکن خوبیوں کا کہیں چرچا نہیں۔

بہر حال ہماری اس دینی دعوت کا اصول یہ ہے کہ ہم سب دینی کاموں کی قدر کریں، اور اگر اپنی اس مشغولیت کی وجہ سے دوسرے بہت سے دینی کام ہم خود نہیں کر سکتے، تو اُن کے کرنے والوں کا احسان مانیں، اور اُن کے لئے دعائیں کریں۔

آج کل کے عام رواج کے خلاف اسی طرح کا ایک اصول ہمارا یہ بھی ہے کہ امّت کے ہر طبقے میں خوبی اور خیر کے پہلو دیکھنے کی کوشش کریں اور اس کی قدر کریں، اور جس طبقے میں دینی لحاظ سے جو غلطیاں اور کمزوریاں نظر آئیں اُن کی تشہیر کرنے اور تنقید و اعتراض کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے کے ساتھ اُن سے قرب اور تعلق پیدا کر کے اُن غلطیوں اور کمزوریوں سے نکلنے میں اُن کی مدد کریں۔ ——— امت اس وقت اس حال میں ہے کہ اس کا کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں ہے جو غلطیوں اور کمزوریوں سے خالی ہو، اسلئے غلطیوں اور کمزوریوں کو اچھالنے اور اصلاح کے لئے تنقید کا طریقہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر طبقہ اپنی اصلاح کی فکر کے بجائے جوابدہی اور جوابی حملوں ہی میں لگا رہے گا، اس سے امّت میں اختلاف اور بُعد اور ایک دوسرے کی توہین و تذلیل کا رواج تو بڑھے گا، اور سوائے حظِ نفس کے فائدہ کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

میں اپنے ذاتی معلومات اور ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں کے بعض طبقوں کا اور ان کے بہت سے افراد کا حال یہ ہے کہ کسی ایک پہلو سے اُن میں اتنا خیر ہے اور ان کا مقام اس میں اتنا بلند ہے کہ ہم اپنے کو اُن کے سامنے بہت پستی میں دیکھتے ہیں، اور اُسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بعض ایسی غلطیوں میں بھی مبتلا ہیں جن کا غلطی ہونا ہمارے لئے بالکل ظاہر ہے، لیکن وہ اس کو غلطی نہیں سمجھتے ——— اسلئے ان حالات میں ہم اسی طرزِ عمل کو صحیح اور مفید سمجھتے ہیں کہ ہر ایک کی خوبیوں کی قدر کی جائے، اور غلطیوں کی تشہیر اور اعتراض و تنقید سے بچا جائے، اور تعلق اور اختلاط کے ذریعہ اُن کو اُن غلطیوں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۱۔

---

۱ لیکن ملحوظ رہے کہ ہم صرف اُن طبقات کے ساتھ اس طرزِ عمل کو صحیح سمجھتے ہیں جو کسی ایسی سخت اور اسلام سوز متعدی گمراہی میں مبتلا نہیں ہیں جس سے مسلمانوں کو بچانا ضروری ہے۔ ۱۲

ایک اصول ہمارے اس کام کا یہ بھی ہے کہ اللہ کے ایسے غریب اور کم حیثیت اور بے لکھے پڑھے بندوں کی بھی پوری فکر اور قدر کی جائے، جن کی اس دنیا میں کوئی قدر اور قیمت نہیں سمجھی جاتی، اور جن میں کوئی علمی اور عملی صلاحیت لوگوں کو نظر نہیں آتی — دنیوی اور مادی تحریکوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں ایسے لوگوں کو بیکار اور نکما سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے وہ اُن کا ووٹ تو لینا چاہتے ہیں، اور اپنے مقاصد کے لئے انھیں آلۂ کار بھی بنانا چاہتے ہیں، لیکن اُن کی نظر میں انکی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اسلئے وہ صرف ہوشیار اور خاص صلاحتیں رکھنے والوں لوگوں ہی کے طالب ہوتے ہیں جن سے وہ یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ تحریک کے اچھے کارکن ثابت ہوں گے — لیکن انبیاء علیہم السلام کے سامنے چونکہ اصل مسئلہ لوگوں کو دوزخ سے نکالنے کا اور اللہ سے ملانے کا ہوتا ہے اسلئے وہ امیر اور غریب اور تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ سب کی ایک طرح فکر کرتے ہیں، اور چونکہ ان کو اس حقیقت پر کامل یقین ہوتا ہے کہ سب کچھ کرنے والے صرف اللہ ہیں، کسی مخلوق کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے، اسلئے یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی رفاقت کے لئے خاص صلاحیتیں رکھنے والوں ہی کو اپنے ساتھ لینے کی فکر کریں، اور باقی لوگوں کو نکما سمجھ کر اُن کی ناقدری کریں، یہ ذہنیت جیساکہ میں نے عرض کیا مادہ پرستوں کی، اور دنیوی لیڈروں کی ہوتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام اسکے برعکس یہ بتلاتے ہیں کہ ان کو حقیر مت سمجھو، ان ہی کی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ کی خاص مدد آتی ہے، حدیث شریف میں ہے حضورؐ نے فرمایا:-

"ھل تنصرون الا بضعفاءکم" تم میں جو کمزور اور گرے پڑے بندے ہیں، انکی وجہ سے تمہاری مدد ہوتی ہے۔

اور ایک روائیت میں ہے، کہ:-

"مہاجرین میں جو بیچارے بالکل فقیر اور خستہ حال تھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ سے ان کی برکت سے فتح کی دُعا فرمایا کرتے تھے، یعنی عرض کرتے تھے کہ اے اللہ! اپنے ان خستہ حال بندوں کی برکت سے دشمنوں پر ہم کو فتح دے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

"کان یستفتح بصعالیك المھاجرین"

الغرض یہ ذہنیت انبیاء علیہم السلام کے طریقے کے بالکل خلاف اور سراسر مادہ پرستانہ ہے، کہ صرف لکھے پڑھوں کی، اور خاص صلاحتیں رکھنے والوں کی قدر کی جائے، اور اُن ہی کو کارآمد سمجھا جائے، اور بیچارے غریبوں خستہ حالوں، اور اَن پڑھوں کی فکر اور قدر نہ کی جائے، اور ان کو نکما سمجھا جائے — ہمیں آپ کو اس سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیئے، اور بہت بچنا چاہیئے۔

ہاں! اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس عالم کو دین کے بارے میں بھی عالم اسباب سمجھتے ہوئے ہم اللہ کے ایسے بندوں کے اپنے ساتھ آنے کی، اور دین کے کام میں لگنے کی زیادہ حرص کریں جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیتیں

بخشی ہیں۔

رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے عمر بن ہشام (ابو جہل) اور عمر بن الخطاب (یعنی حضرت فاروق اعظمؓ) میں سے کم ازکم ایک کے مسلمان ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ سے خاص طور سے دُعا اسی واسطے کی تھی کہ ان دونوں میں کچھ خاص فطری صلاحیتیں تھیں۔ اسلئے خاص صلاحیتیں رکھنے والوں کی زیادہ حرص کرنا تو بالکل درست ہے، لیکن اللہ کے جن بندوں میں ایسی صلاحیتیں نہیں ہیں اُن کی فکر نہ کرنا، اور اُن کو نکما اور بے قیمت سمجھنا یہ سراسر مادہ پرستانہ طرزِ عمل ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، ایسے لوگوں کو کبھی اللہ کی مدد نصیب نہیں ہو سکتی —— بہرحال ہمیں آپ کو اس سے بہت بچنا چاہئے، یہ آج کل کی عام بیماری ہے۔

ایک خاص قابلِ ذکر اصول یہ ہے کہ جو کچھ اس دینی دعوت کے سلسلہ میں کیا جائے، اور دوسروں کو جو کچھ کرنے کی دعوت دی جائے اُس کی غرض اور اُس کا محرک اللہ کے حکم کی تعمیل کے جذبے اور اس کی رضا اور آخرت کے ثواب کی اُمید کے سوا کچھ نہ ہو۔

یہ بات کہنے میں تو بڑی آسان اور بہت مختصر ہے، لیکن دنیا میں چونکہ اس کا رواج بالکل نہیں رہا ہے اسلئے اسکے مطابق عمل کرنا اور اس کو عادت بنانا بہت مشکل ہے، مگر یہ ہمارے اس کام کی رُوح اور جان ہے، اِسکے بغیر مگر کام ہوگا تو بالکل ہی بے رُوح اور سراسر مادی ہوگا، اور وہ ہرگز انبیاء علیہم السلام والا کام نہ ہوگا، اگرچہ صورت کے اور نام کے لحاظ سے وہ کیسا ہی دینی، اور کتنا ہی مقدس ہو۔

سب سے آخر میں اس دینی دعوت کا ایک اہم اصول اور بیان کرتا ہوں، اور وہ بھی اس زمانہ کے عام رواج کے خلاف ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس راستے میں ہم جو کوشش اور جدوجہد کریں وہ اس یقین کے ساتھ کریں کہ ہماری کوششوں سے کچھ نہ ہوگا، جو کچھ ہوگا اللہ کے کرنے سے ہوگا، ہم یہ کوشش اور جدوجہد صرف اسلئے کرتے ہیں کہ اللہ کا امر اور حکم ہے، اور اس کی سنت اور اس کا قانون اس عالم اسباب میں یہ ہے کہ بندے جس چیز کے لئے صحیح اصولوں پر جدوجہد کریں وہ اس کو وجود میں لے آتا ہے، یعنی ہمارا یقین اور اعتماد اپنی کوشش اور اپنی جدوجہد پر نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہو، اور اسلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کا اہتمام، تدبیر اور کوشش سے کم نہ ہو، لیکن تدبیر اور جدوجہد میں بھی اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

میں کبھی کبھی کہا کرتا ہوں کہ ہماری تدبیر اور جدوجہد تو ایسی ہو کہ جو اس کو دیکھے وہ سمجھے کہ ہم شاید مادہ پرستوں کی طرح سب کچھ اپنی تدبیر اور اپنی محنت ہی کو سمجھتے ہیں —— اور اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور بے بسی کے اظہار کے ساتھ ہماری دُعا کی کیفیت یہ ہو کہ اگر کوئی ہمیں اُس حال میں دیکھے تو سمجھے کہ یہ لوگ تدبیر اور جدوجہد کے شاید قائل ہی نہیں ہیں، اور صرف خدا ہی پر یقین اور اعتماد رکھتے ہیں۔ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:۔

"ما النصر من عند الله الا بثقة بالله وحسن التدبير" اللہ کی مدد جب ہی ہوگی جبکہ اصل اعتماد اللہ ہی پر ہو، اور تدبیر کا بھی پورا حق ادا کیا جائے۔"

دوستو! یہ ہیں وہ اصول جن کی پابندی کے ساتھ ہم یہ کام کر رہے ہیں، اور کرنا چاہتے ہیں ——— آخر میں ایک ضروری بات اور کہنی ہے:-

کام کی حقیقت اور اسکے اصول کے متعلق ایک اہم بات:-

اپنی اس دینی دعوت کے مقصد اور اصول کے متعلق جو کچھ ان صحبتوں میں بیان کرنا ضروری سمجھا وہ سب تو میں نے بیان کر دیا، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات آپ ہمیشہ ملحوظ رکھیں اور یاد رکھیں کہ ہمارا یہ کام اس زمانہ کے دوسرے رواجی کاموں سے اس بارے میں بھی مختلف ہے کہ اس کا کوئی مرتب دستور اور ضابطہ نہیں ہے جس کو کسی کمیٹی نے وضع کیا ہو، اور اس میں اغراض و مقاصد اور اصول اور قواعد و ضوابط خاص ترتیب سے بیان کئے گئے ہوں ——— بلکہ نفس الامری واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو اس کام کے لئے کچھ اس طرح فکرمند اور بےچین کیا تھا جس طرح کہ وہ اپنے کسی بندے سے جب کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کو فکرمند اور بےچین کر دیتا ہے، اور اسی کے ساتھ ان کو اس کام کی خاص حکمت اور تفقہ سے بھی نوازا تھا ——— ہم نے درحقیقت اُن ہی کے طرزِ عمل اور اُن کی باتوں سے اس کام کو اور اسکے اصولوں کو سمجھا، اور اپنے غور و فکر سے بھی بالکل صحیح پایا ——— پھر تجربے نے ہمیں اُن پر اور زیادہ مضبوط کر دیا، ہم اُن ہی کی باتوں کو بس اپنی زبان میں بیان کر دیتے ہیں ——— ابتک بھی ہمارا یہ حال ہے کہ حضرت مولانا کے سوانحِ حیات اور ملفوظات اور مکتوبات[1] کے مطالعہ سے اس کام میں ہماری بصیرت اور ہمارے اطمینان میں الحمدللہ اور اضافہ ہوتا ہے۔

اور مولانا مرحوم کے صاحبزادے اور جانشین مولانا محمد یوسف صاحب کی ذات درحصل اس سلسلہ کی سب سے اہم زندہ کتاب ہے، اس سلسلہ میں اُن پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے ــ اس کام کے نقطۂ نظر سے یہ بات بےتکلف ظاہر کر دینا ہمارے لئے ضروری ہے، کہ اس دعوت کی رُوح و حقیقت اور اسکے اصول اور امتیازات کو سمجھنے کا سب سے بڑا ذریعہ مولانا موصوف کی باتیں سُننا ہے ــ ہم بغیر کسی انکسار اور تکلف کے کہتے ہیں کہ مولانا کی باتیں سُننے سے دعوت کے بارے میں بھی خود ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

---

[1] حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ جس کو مولانا سید ابوالحسن علی نے مرتب فرمایا ہے، ابھی حال میں شائع ہوا ہے، شروع میں مولانا ہی کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے۔ ۱۲

دوسرے دینی اداروں اور تحریکوں کے بارے میں

ہمارا طرزِ عمل!

از: مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

صورت حال یہ ہے کہ جہاں ہمارے رفقائے کار دعوت اصلاح و تبلیغ کا کام کرتے ہیں وہاں پہلے سے کچھ دینی ادارے موجود ہوتے ہیں اور اکثر جگہ کوئی دینی تحریک بھی ہوتی ہے لہذا ہمارے لیے غور و فکر کرنے اور ایک اصول طے کر لینے کی ضرورت ہے، کہ ہمارا رویہ عام دینی اداروں اور تحریکوں کے ساتھ کیا ہو۔

سب سے پہلے ایک اصول بیان کیا جاتا ہے جس سے ایسے مواقع پر ہمیں رہنمائی حاصل ہوگی اور وہ ایک مستقل معیار کا کام دے گا جس سے ہم اپنا طرز عمل اور رویہ معین کر سکیں گے۔

دین کا جو حصہ ہم تک پہونچا ہے اس کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں، ایک تو وہ حصہ ہے جو اپنی خاص ہیئت و شکل کے ساتھ ہم تک پہونچا ہے اور اس کی ہیئت و شکل مطلوب ہے، اس کو ہم "منصوص بالوضع" کہہ سکتے ہیں دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ دینی امور ہیں جو اپنی خاص ہیئت و صورت کے ساتھ (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو) امت سے مطلوب ہیں۔ مثلاً ارکان دین اور بہت سے ایسے فرائض جن کو نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے بتایا بلکہ آپ نے ان کی شکلیں زبانی بھی بتائیں اور خود کر کے بھی دکھلا دیں۔ مثلاً نماز، حج، وضو وغیرہ۔

دین کا دوسرا حصہ وہ ہے کہ اس میں نفس شئی مطلوب ہے لیکن بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر (زمانہ کے تغیرات اور امت کے لیے وسعت اور سہولت کا خیال کر کے) آپ نے ان کی شکلیں متعین نہیں کیں، صرف شئی تبلا دی کہ یہ مقصود ہے۔ یہ وہ چیزیں جو خود منصوص ہیں لیکن ان کی کوئی خاص وضع منصوص نہیں۔ مثلاً جہاد فی سبیل اللہ،

دعوت الی اللہ، علم دین کے سلسلہ کا چلانا اور احکام شرعیہ کا امت تک پہونچانا، یہ سب امت سے مطلوب ہیں، اگر امت ان کو چھوڑ دے اور بالکل ترک کر دے تو وہ گناہ گار ہوگی۔

صرف یہ اعمال مقصود ہیں ان کی کوئی خاص شکل اور طریقہ معین نہیں کیا گیا بلکہ اس بارے میں امت کی عقل پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان فرائض کی ادائیگی کو اس کی صلاحیتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مثلاً دعوت منصوص ہے لیکن اس کی کوئی خاص ہئیت منصوص نہیں۔

غیر منصوص بالوضع کی واضح مثال لباس کا مسئلہ ہے، لباس ساتر ہو، ٹخنوں سے اونچا ہو، گھٹنوں سے نیچا ہو، تفاخر اور تکبر کا لباس نہ ہو، کوئی حرام و ناجائز (مثلاً مردوں کے لیے ریشم) نہ ہو۔ پس لباس بھی منصوص ہے اور اسکے یہ شرائط بھی منصوص ہیں، لیکن لباس کی شکل، لباس کا رنگ اور اس کی قطع وغیرہ، غیر منصوص ہیں، اسمیں امت کے لیے بہت سہولتیں ہیں۔ اس کو امت کی تمیز اور عقل عام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

دوسری مثال مساجد کی ہے، مساجد بھی مطلوب ہیں، مساجد کی نظافت بھی مطلوب ہے، یہ بھی مطلوب ہے، کہ انمیں ذکر اللہ ہو اور وہ دوسرے مقامات سے ممتاز ہوں۔ مگر ان کا کوئی خاص طریقہ تعمیر مطلوب نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں مساجد مختلف وضع کی پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ مینارے بھی مساجد کے لیے شرط نہیں ہیں، ہندوستان کی مسجدوں میں دو میناروں کا رواج ہے۔ الجزائر و مراکش کی مساجد میں ایک مینار ہوتا ہے اور دنیا کی سب سے بڑی اور پہلی مسجد (بیت اللہ) کا کوئی مینارہ نہیں۔

اب دعوت الی اللہ کی مثال لیجئے۔ اللہ کی طرف بندوں کو بلانا فرض ہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، تقریرے ہو یا تحریرے، علانیہ ہو یا خلوت میں، ان میں سے کوئی شکل معین نہیں۔ نوح علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ دعوت کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔

قال رب انی دعوت قومی لیلا ونہارا	حضرت نوح نے (حق تعالیٰ کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ اے میرے رب میں اپنی قوم کے سامنے رات میں بھی دین کی اور توحید کی دعوت رکھی اور دن میں بھی۔
ثم انی دعوتہم جہارا	پھر میں نے خوب پکار کر اور چیخ کر بھی ان کو بلایا۔
ثم انی اعلنت لہم	پھر میں نے بالاعلان بھی آپ کا پیام ان کو پہنچایا۔
واسررت لہم اسرارا	اور چھپ چھپ کر تنہائیوں میں بھی ان سے آپ کی بات کہی۔

لہٰذا دعوت دین کا کام کرنے والے ہر فرد یا جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لیے جو طریقہ دعوت صحیح جانے وہ

مقرر کرے اور اپنی تحریک کا جو طرز کار مناسب سمجھے وہ اختیار کرے، اس میں کسی کو جائز یا ناجائز کہنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس وقت عام طور پر دین کے ان دونوں حصوں کو خلط ملط کیا جاتا ہے، منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دیا جاتا ہے اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پر پہونچا دیا جاتا ہے اس کے نتیجہ میں مشکلات پیدا ہوگئی ہیں اور مختلف اداروں اور تحریکوں میں اکثر تنازعہ کی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ اگر ہم ان دونوں چیزوں میں فرق سمجھ لیں تو بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی، سیکڑوں تنازعوں کا سدباب ہو جائے گا اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

چیزوں کی اصل ہیئت سمجھنے اور ان کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا یہ پیمانہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ اس کے بعد صحیح اصول پر چلنے والی اور مخلصانہ دینی تحریکوں، دینی اداروں کے درمیان تقابل، تصادم اور اختلاف کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ فرق جو رہ جاتا ہے وہ صرف اپنے اپنے تجربوں اور حالات کے مطالعہ کا ہے کہ کام کی کون سی شکل اور طریقہ زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہے اور کس سے وہ نتائج و مقاصد ظاہر ہوتے ہیں جو اس کام سے مطلوب ہیں۔ دعوت الی اللہ کی شکل اور طرز میں ہر جماعت اور ادارہ آزاد ہے اس کو کسی خاص شکل یا طرز پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے، جیسے کسی کو اپنے تجربہ اور مطالعہ کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی جماعت اگر کسی خاص طریقہ کار کو اختیار کرتی ہے (بشرطیکہ وہ دین کے اصول و آداب کے مخالف نہ ہو) تو وہ اپنے فیصلہ میں حق بجانب ہو، ہم اپنے مخصوص طرز کار کو بہتر اور احیاء دین کے لیے مفید سمجھتے ہیں تو یہ اپنی جگہ ٹھیک ہے، ہم اپنے طرز کار کو دوسری تحریکوں اور اداروں کے داعیوں کے سامنے بہترین طریقہ سے پیش تو کر سکتے ہیں لیکن اگر صرف طرز کار کے فرق کی وجہ سے ہم ان کو غلط کار اور کسی گناہ کا مرتکب سمجھیں تو ہم غلطی پر ہیں۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ ان سے دوبارہ غور کرنے اور نتائج کو دیکھنے اور ان کا موازنہ کرنے کی درخواست کریں لیکن ان کے ساتھ ایک گمراہ فرقہ کا سا معاملہ کرنا، ان کو جاہل اور گمراہ سمجھنا غلط اور غلو ہے۔

ہماری اس دینی تحریک "دعوت اصلاح و تبلیغ" کا ایک خاص طرز ہے، اس میں تبلیغی گشت ہے، اجتماعات ہیں، ذکر اللہ پر اکرام مسلم پر اور ترک مالایعنی پر زور ہے اور دین کے لیے گھر سے نکلنے اور وقت اور عادات و مالوفات کی قربانی کی ترغیب ہے، وغیرہ وغیرہ، ان میں بعض چیزیں وہ ہیں جن کی ہمیں شریعت نے سختی کے ساتھ تاکید کی ہے مثلاً اکرام مسلم، ذکر اللہ کی کثرت، ترک مالایعنی وغیرہ، لیکن بعض چیزیں مثلاً گشت، اجتماعات وغیرہ وہ ہیں جو انتظامی امور ہیں، یہ حدیث و قرآن سے استنباط کیے جا سکتے ہیں۔ وہ اصولی طور سے صحابہ کرامؓ کی زندگی میں ملیں گے لیکن اس خاص ہیئت میں نہیں ملیں گے۔ یہ سب چیزیں اجتہادی اور تجربی ہیں، ان چیزوں پر یا ان کی ان خاص شکلوں پر ہر جگہ اور ہر شخص سے منصوص چیزوں کی طرح اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

سب سے مشکل چیز اعتدال ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں اعتدال بدرجۂ اتم ہوتا ہے، ہم صاف کہتے ہیں کہ یہ بالکل امکان ہے کہ پچیس برس کے بعد اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوں جو صاحب نظر بھی ہوں اور اللہ کے ساتھ ان کا تعلق ہو اور وہ ہمارے اس طریقہ میں زمانہ کی ضرورت اور تقاضے کے لحاظ سے کچھ تبدیلیاں کریں۔ اس وقت اگر ایک جامد طبقہ اس کی مخالفت ہمارا نام لے کر محض اس بناء پر کرے کہ ہمارے بزرگ ایسا کرتے تھے تو اس کا یہ رویہ غلط ہوگا اور اس کا اصرار ہٹ دھرمی ہوگا۔ کبھی کبھی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اس تحریک میں بھی ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی طریقۂ کار اور یہی طرز دین کی خدمت اور احیاء کے لیے ہمیشہ کے واسطے اور ہر جگہ کے لیے ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب غلط ہے۔ جب تک اس مخصوص طریقہ پر تقریر نہ ہو، اسی خاص ڈھنگ پر اور ان ہی ساری پابندیوں کے ساتھ گشت نہ ہو، اور اجتماعات میں مقررہ طریقہ سے دعوت نہ دی جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ساری جد وجہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا، یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے اس لیے کہ اسی طرز عمل کی وجہ سے مختلف مذاہب اور فرقے امت میں پیدا ہوئے ہیں۔ اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تک کے غور اور تجربوں نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے کہ ہر تقریر کے بعد جد وجہد کی کچھ دعوت ضرور دی جائے، ہر بستی میں ایک مرکزی اجتماع ضرور ہو، رات کو مساجد میں قیام ہو وغیرہ وغیرہ، پس جب تک یہ چیزیں فائدہ مند معلوم ہوتی ہیں ہمیں اس وقت تک ان کو جاری رکھنا چاہیے لیکن اگر ہفتہ کا اجتماع ہمارے شہر لکھنؤ کی نوچندی جمعرات کی طرح ایک رسم بن جائے، رات کا قیام رت جگا کی طرح رسمی ہو جائے اور دین کے کام کے لیے چلّے دینا رسم بن جائے تو یہ ایک مذہب بن جائے گا اور ایک بدعت قائم ہو جائے گی، اُس وقت کے ربانی مصلحین کا فرض ہوگا کہ ان کے خلاف جد وجہد کریں اور ان رسومات کو مٹائیں۔ بہت سی چیزیں صحیح مقاصد اور دینی مصلحتوں کے ساتھ شروع ہوتی ہیں لیکن آگے چل کر غلط صورت اختیار کر لیتی ہیں، ایسے موقع پر حقیقت و رسم، سنت و بدعت، فرض و مباح میں تمیز کرنا تفقّہ فی الدین ہے، اور کہنے والے نے کہا ہے ؏ گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

اگر ہماری تحریک کی ہمعصر دینی تحریکیں یا ادارے مخصوص چیزوں کو مقصد بنائے ہوئے ہیں اور اپنی مخلصانہ صوابدید کے مطابق کسی طرز پر کام کر رہے ہیں تو ہمارا ان سے کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیے بلکہ ہمیں ان کے کام کا اعتراف کرنا چاہیے ان کو کامیابی کی دعائیں دینا چاہئیں اور ان سے تعلقات بڑھانا چاہئیں اس لیے کہ وہ دین کے بعض اہم شعبوں کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اس طرح انھوں نے ہم کو یہ موقع دیا ہے کہ ہم ان دوسرے کاموں سے مطمئن اور یکسو ہو کر اپنا کام کریں۔ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ مدارس کے لیے دعائیں کرتے تھے اور اپنے خاص محبین کو ان کی اعانت کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ بہت سے مدارس کی آمدنیاں اس تبلیغی تحریک کی وجہ سے بڑھ گئی تھیں۔ مولاناؒ اپنے اہل تعلق کو اس کی طرف بھی متوجہ کرتے تھے کہ علماء کی ملاقات کے لیے جایا جائے، ان سے تعلقات بڑھائے جائیں

اور ان کے حقوق (اکرام و محبت اور تعاون) ادا کیے جائیں۔

یہاں ایک باریک بات سمجھ لینا چاہیئے وہ یہ کہ ایک نبی ہوتا ہے، اور ایک مجدد اور مصلح ہوتا ہے۔ نبی کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے اتباع کے بغیر نجات ہی نہیں ہوسکتی اور اس کی ہدایت حاصل کیے بغیر اللہ کی رضا اور کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، اس میں کسی قسم کی مدارات یا تساہل کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن مجددین اور مصلحین کا معاملہ یہ نہیں ہے، ہر مجدد اور ہر ربانی مصلح کے طریقہ کی پیروی سے دین کو اور دین کے طالبوں کو نفع پہنچتا ہے۔

مثلاً کسی مجدد کے طریقہ سے قربانی کے جذبات بڑھتے ہیں، لہٰذا اس کے طریقہ کی پیروی سے قربانی کے جذبات بڑھیں گے، ایک دوسرے مجدد کے طریقہ سے انفاق فی سبیل اللہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لہٰذا اس کے اثر سے انفاق و ایثار کے جذبات پیدا ہوں گے، ایک تیسرے مجدد کے طریقہ سے مثلاً صفائی معاملات میں پختگی آتی ہو تو صفائی معاملات کے سلسلہ میں اس سے تعلق اور استفادہ خاص طور پر موثر ہوگا، بہر حال نبی کے طریقہ پر تو نجات کا انحصار ہوتا ہے اور بالکل اسی طریقہ پر چلنا لازم ہوتا ہے۔ لیکن کسی مجدد اور مصلح کا معاملہ یہ نہیں ہے خاص خاص ترقیاں تو ان کے اتباع اور ان کے ساتھ وابستگی سے ہوتی ہیں لیکن نجات اس پر منحصر نہیں ہوتی۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ امت میں طبقات کا اتنا اختلاف ہو، اذہان کا اتنا تفاوت ہو اور حالات ایسے مختلف ہیں کہ کوئی تحریک یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ تمام طبقات کو متاثر کرسکتی ہے اور ان کی تسکین کا سامان کرسکتی ہے اور ان کی استعداد کے مطابق دینی غذا فراہم کرسکتی ہے۔ کوئی ذہن تقریر سے متاثر ہوتا ہے، کسی پر لٹریچر اثر انداز ہوتا ہے اور کوئی کسی دوسرے ذریعہ سے متاثر کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایک واحد طریقۂ کار سے ہر جگہ، ہر ماحول میں اور ہر حالت میں کامیابی مشکل ہے اس حقیقت کے سمجھنے اور اس کے مطابق چلنے میں لوگوں سے بڑی غلطیاں ہوتی ہیں، بہت سے لوگ قابل قدر اور بڑے مخلص ہیں، لیکن ان لوگوں کا اس وقت تک دل خوش نہیں ہوتا جب تک کہ ہر شخص انھیں کے مخصوص طرز پر کام نہ کرے اور سب ایک ہی کام نہ کرنے لگیں، حالاں کہ عمومی و انقلابی تحریکوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا وہاں ہر چیز اس کے صحیح مقام پر رکھی جاتی ہے اور ٹھیک چوکھٹے میں بٹھائی جاتی ہے، ہر شخص سے وہی کام لیا جاتا ہے جس کا وہ زیادہ اہل ہے اور اس میں وہ دوسروں سے ممتاز ہے اور جس کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے۔

ہم کو تو دوسری دینی کوششوں اور ان کے ذمہ داروں کا شکرگذار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے

بہت سے لوگوں کو سنبھال رکھا ہے جو ہماری گرفت میں نہیں آسکتے تھے، یہ اللہ کی طرف سے انتظام سمجھنا چاہیئے کہ کچھ لوگ اس راستہ سے دین تک آجائیں اور کچھ اُس راستہ سے آجائیں۔ اپنے طریقۂ کار کو مناسب طریقہ سے ان کے سامنے اکثر وبیشتر پیش کرتے رہنا چاہیئے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ ہمارے درپے ہیں اور ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے ہی پڑگئے ہیں، نہ ان کے سامنے آپ اپنی دینداری کا اظہار کریں، اس طرح آپس کے تنازعات ختم ہوجائیں گے، ایک دوسرے کی طرف سے دل صاف ہوجائیں گے اور امت کے مختلف طبقات اور جماعتوں میں تعاون علی البر والتقویٰ (نیکی اور خدا ترسی پر ایک دوسرے کی امداد) کی استعداد پیدا ہوجائے گی جو عرصہ سے مفقود ہوچکی ہے اور جس کی اس زمانہ میں جب کہ باطل مختلف شکلوں اور حربوں کے ساتھ حملہ آور ہے اور اہل باطل من کل حدب ینسلون (ہر ٹیلے اور ٹاپوے اُبلے چلے آرہے ہیں) کا مصداق ہیں۔ سخت ضرورت ہے۔

دعوت واصلاح وتبلیغ کی راہ میں

موجودہ دور کی اہم مشکلات وموانع اور انکا حل

(از، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

تحریک کے داعیوں کو اس جگہ اور ماحول کا جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیئے جہاں ان کو اپنی کوششیں صرف کرنا ہیں تاکہ صحیح حالات معلوم رہیں اور اُن کے مطابق جدوجہد کی راہیں سوچی جائیں۔ بعض دفعہ انسان حقیقتوں سے آنکھیں بند کرکے ایک خیالی دنیا اپنے ذہن میں بنا لیتا ہے اور اسی کے مطابق تنائیں اور امیدیں قائم کرتا ہے۔ بعد میں جب اس کی امیدوں کے خلاف اصل واقعات ظہور میں آتے ہیں تو وہ ناامید ہوتا ہے اور ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ داعی کو سب سے زیادہ حقیقت پسند ہونا چاہیئے۔ انبیاء علیہم السّلام نے حقائق اور واقعات کو نظر انداز نہیں فرمایا، جنگ بدر کے موقع پر میدان جنگ کے انتخاب میں آپ نے صحابۂ کرام کے مشورہ کو قبول فرمایا پھر جب کافر دل کی طرف سے تین سورما میدان میں آئے تو آپؐ نے یوں ہی اُن کے مقابلہ کے لیے کسی کو روانہ نہیں کردیا بلکہ تین بہترین شخصوں کو ان کے مقابلہ کے لیے منتخب فرمایا۔ دین کا کام کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے جیسا کہ اکثر جذباتی لوگ سمجھتے ہیں کہ دنیا اور عالم اسباب سے آنکھیں بند کرلی جائیں، ماحول کا جائزہ نہ لیا جائے، قوم کے امراض کی چھان بین نہ کی جائے اور راستہ میں آنے والی رکاوٹوں کا اندازہ نہ کیا جاوے، دنیا کا صحیح جائزہ لیتے رہنا اور چیزوں کو ان کی حقیقی جگہ دینا دین کے حقوق اور ضروری تدابیر میں سے ہے۔

اس صحبت میں موجودہ دور کی نمایاں مشکلات اور موانع بیان کیے جائیں گے۔ یہ رکاوٹیں اسلام کے راستہ کی رکاوٹیں ہیں اور جب اسلام کے احیاء اور دین کی تجدید کی کوشش کی جائے گی تو یہ رکاوٹیں دعوت کی راہ

میں حائل ہوں گی۔

(۱) **مادہ پرستی:۔** مادہ پرستی ہر زمانہ میں اسلام کی حریف رہی ہو، یہ شیطان کا بڑا کارگر حربہ ہو اس لیے کہ اس میں انسان کے لیے قدرتی کشش ہے۔ مختلف اسباب کی بنا پر اس زمانہ میں مادہ پرستی نے بحران کی شکل اختیار کر رکھی ہے، وہ اس وقت عوام کا مذہب بن گئی ہے، اس کی عبادت گاہ میں تمام عبادت گاہوں سے زیادہ چہل پہل ہے، یہ نئی عبادت گاہ تمام عبادت گاہوں کے ملبے پر تعمیر ہوتی ہے۔

اس وقت کا سب سے بڑا بت انسان کا پیٹ اور اس کی نفسانی خواہشات ہیں، اس وقت کا کلمہ ہے "لا الٰہ الا البطن" (نہیں ہے کوئی معبود سوائے پیٹ کے) یہ نہ صرف اشتراکیت (سوشلزم) اور اشتمالیت (کمیونزم) کا نعرہ ہو بلکہ تمام کیمپوں میں یہ نعرہ گونج رہا ہو اور اس پر تمام محاذ متفق ہو گیے ہیں۔

دینی دعوت کا اس وقت سب سے بڑا حریف مادہ پرستی ہے اور یہ دین کی جد وجہد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہو اس لیے کہ یہ اس دور کی چلتی ہوئی چیز ہے، ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا مقابلہ ایک رائج الوقت مذہب سے ہو اگرچہ مادہ پرستی تمام مذاہب کی حریف ہو مگر دوسرے تمام مذاہب میدان چھوڑ چکے ہیں، اور انسانوں کی رہنمائی سے دست کش ہو چکے ہیں۔ مذہب و دعوت کی حیثیت سے اس وقت صرف اسلام ہی میدان میں ہو اس کے سوا کوئی دوسرا مذہب خم ٹھوک کر مادہ پرستی کے مقابلہ میں نہیں آتا۔ اسلیئے کہ صرف اسلام ہی پوری دنیا اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرنے کا دعویدار ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ وہی تنہا دنیا کا متولی اور انسانیت کا نگراں ہے۔

یہ مسئلہ کسی ایک جماعت کا نہیں ہو، بلکہ تمام مسلمانوں کے سوچنے کا ہو اس لیے کہ مادہ پرستی کے ساتھ موجودہ دور کی تمام طاقتیں ہیں اور دنیا کا یہ دستور ہمیشہ سے رہا ہو کہ اس کا فیصلہ مانا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ اس وقت وہ کیفیت ہو جو موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ میں تھی کہ باوجود تمام دلیلوں اور معجزات کے فرعون اور اس کی قوم حقیقت سے انکار کرتی رہی اس لیے کہ وہاں سوال یہ تھا کہ دولت کس کے ہاتھ میں ہے اور قوت وجاہ کس کے پاس ہے۔ اس حالت سے تنگ آکر موسیٰ علیہ السّلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ۔ (اے ہمارے رب آپنے فرعون کو اور اس کی قوم کو دنیا کی دولت وزینت عطا کی ہو اس سے وہ لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کرتے ہیں اے ہمارے رب ان کے مالوں کو برباد کردے اور ان کے دلوں کو سخت کردے اور جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں اس وقت تک ایمان نہ لائیں۔)

پس واقعی بات تو یہ ہے کہ اس فتنہ کا صحیح حل اسی وقت ہو گا جب کہ ایسے لوگ برسرِ اقتدار آئیں جن کے دل میں خدا کا خوف اور تقویٰ ہو، ان کی سب سے بڑی فکر آخرت کی فکر ہو اور ان کی صفت یہ ہو کہ "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" (وہ بندے جن کی تربیت ایسی ہو چکی ہو) کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکن اور غلبہ دیں (یعنی وہی اس دنیا کے والی اور حاکم بنا دیے جائیں) تو وہ نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکیوں کے احکام جاری کریں اور برائیوں سے لوگوں کو روک دیں)

بہر حال مادہ پرستی کا یہ دھارا جس کی رو میں لوگ اس وقت بہے چلے جا رہے ہیں پورے طور پر اسی وقت رکے گا جب کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اس دنیا کا اقتدار آ جائے اس وقت دین اور ایمان عوام کا معیارِ زندگی بن جائے گا، اور اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ اسی وقت کرے گا جب کہ دین کی دعوت عام ہو، داعی بے دریغ قربانیاں دیں اور اس راہ کے مجاہدہ کا حق ادا کر دیں اور اپنے آپ کو دین کی راہ میں مٹا دیں۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا (اللہ کا وعدہ ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صالحہ کیے کہ اللہ ضرور ان کو خلافتِ ارضی دے گا (یعنی دنیا کا انتظام ان کے سپرد کر دے گا) جیسا کہ اس نے ان سے پہلے والوں کو یہ خلافت دی، اور ان کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے دنیا میں تمکن دے گا اور ان کے خوف کو بے خوفی اور امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی (یعنی اللہ کی) عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرے ساتھ شریک نہیں کریں گے۔)

بہر حال مادہ پرستی کی مشکل کا پورا پورا حل تو اسی وقت ہو گا جب دنیا کی باگ ان ہاتھوں میں ہو گی جو مادہ پرست ہونے کے بجائے مادہ شکن اور خدا پرست ہوں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ منزل قریب نہیں ہے اب سوال یہ ہو کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے؟ تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگرچہ مادہ پرستی عام ہو گئی ہے اور زمانہ میں اسی کا سکہ چل رہا ہے لیکن مادہ پرستی کا مقابلہ کرنے والے اور اس کا انکار کرنے والے کچھ مردانِ حق میدان میں آ جائیں تو مادہ پرستی کو ان کے لیے راستہ چھوڑنا پڑے گا اور ان کے سامنے جھکنا پڑے گا، اگر کچھ لوگ اس طرح کی زندگی پیش کریں کہ معلوم ہو کہ ان کو قیمتی قیمتی کسی مادی چیز کی پرواہ نہیں ہے، ان کے سامنے دنیا کے عیش و آرام اور جاہ و دولت کی کچھ حقیقت نہیں ہے، تو مادہ پرستی پر ضرب کاری لگے گی مکہ میں مادہ پرستی پر جو چوٹ پڑی تھی وہ اس وقت پڑی تھی جب کہ ایسے کچھ لوگ میدان میں آ گئے تھے جو لوگوں کے جانے پہچانے تھے اور جن کی سابقہ خوش حال زندگی سب کے سامنے تھی مثلاً ابوبکر صدیقؓ، عثمان غنیؓ مصعب بن عمیرؓ وغیرہ ان لوگوں نے دنیا کے سارے عیش و آرام کو آخرت کی خاطر چھوڑ دیا تھا اور ان کو دین کے مقابلہ میں مال و دولت، جاہ و حشمت کسی چیز کی پرواہ نہیں رہی تھی، ان کے اس طرزِ زندگی سے لوگ خود بخود متاثر ہوتے تھے اور بڑے بڑے مادہ پرستوں کی نگاہ ان کے سامنے جھک جاتی تھی

آج بھی اس چیز کی گنجائش ہے، اگر کچھ ایسے لوگ ایمانی زندگی اختیار کریں جن سے اس حقیقت کا اظہار ہو کہ یہ تارک الدنیا نہیں ہیں ان کی یہ زندگی اضطراری نہیں، بلکہ اختیاری ہے، انھوں نے دنیا کے عیش و آرام کو سوچ سمجھ کر آخرت کے لیے قربان کیا ہے، اور دین کے مقابلے میں ان کو کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے تو مادہ پرستی ان کے سامنے موم کے مانند پگھل جائے گی اور ایمان و یقین کی اس گرمی کی تاب نہ لا سکے گی۔ مادہ پرستی کا اصل جواب یہی ہے کہ ایک عقیدہ کے ساتھ اس کا انکار ہو اور اپنی زندگی کے ذریعہ یہ اعلان ہو کہ ہم مادہ پرستی کے سامنے سپر ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ ہم اس سے باغی اور اس کی بندگی کے منکر ہیں، ہم خدائے واحد کے پرستار ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ:-

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃِ — اے اللہ زندگی تو درحقیقت آخرت ہی کی زندگی ہے۔

مادہ پرستوں کو جو چیز چونکانے والی اور غور کرنے پر مجبور کرنے والی ہے وہ یہ کہ کوئی آدمی کسی بن دیکھی حقیقت کسی غیر حسی لذت، اور کسی غیبی یقین سے اس طرح سرشار اور متوالا ہو کہ حسی لذتوں پر بھی اس طرح دیکھنے میں نہیں آتا۔ جبار بن سلمیٰ کے ایمان کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مسلمان کو اس نے نیزہ مارا وہ جب تڑپ کر زمین پر گرا تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلا کہ "فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ" رب کعبہ کی قسم میں تو کامیاب ہو گیا، اس کو کرید پیدا ہوئی کہ موت (جو سب سے بڑی محرومی ہے) اس شخص کے نزدیک کامیابی کی چیز کیوں ہے، اس تجسس نے بالآخر اس کو اسلام تک پہونچا دیا۔

(۲)

آخرت کی بے وقعتی، آخرت سے غفلت اور دل میں اس کی بے وقعتی بیٹھ جانا سینکڑوں فتنوں کو دعوت دیتا ہے، یہ مادہ پرستی کی سب سے زیادہ موثر شاخ ہے۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تمام قوموں اور امتوں کا عقیدہ آخرت کمزور ہو گیا تھا چنانچہ وہ باطل کے ہر فتنہ کا شکار ہو چکی تھیں اور حق کے قبول کرنے کی صلاحیتیں بالکل مردہ ہو چکی تھیں، ہمارے اس زمانہ کا سب سے خطرناک روگ آخرت کی بے وقعتی ہے اس لیے کہ آخرت کے عقیدہ پر ہی دین و اخلاق کی عمارت قائم ہوتی ہے، اگر یہ بنیاد ہی سرے سے موجود نہیں تو عمارت کس طرح قائم رہ سکتی ہے اور دین و اصلاح کی دعوت کس بنیاد پر دی جا سکتی ہے۔ جب آخرت کی فلاح و نجات کا سوال ہی سامنے سے ہٹ گیا ہو تو اپنے نقد فوائد، اپنی خواہشات اور لذتوں سے دست بردار ہونا اور کسی بن دیکھی حقیقت کے لیے اپنے وقت، مال و جان اور مرغوبات کی قربانی کرنا، ایک غیر قدرتی اور خلاف فطرت بات معلوم ہوتی ہے، قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ آخرت پر ایمان نہ ہونے سے قلبی انکار اور تکبر پیدا ہوتا ہے۔

فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ قُلُوْبُھُمْ مُّنْکِرَۃٌ وَّھُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ (النحل) — جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ متکبر ہیں۔

آخرت کا یقین ایک ایسی ذہنی کیفیت اور قلبی حالت ہے جس کا اثر پوری زندگی پر پڑتا ہے یہ یقین زندہ ہوتا ہے تو زندگی میں ایمان کی روح ہوتی ہے اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، لیکن جب اس یقین میں کمی آجاتی ہے تو زندگی ایمان کی روح سے خالی ہوجاتی ہے اور سنجیدہ بات سننے تک کی صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے، امت کی اس بیماری کی طرف فوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ پوری امت کے لیے دینی زوال اور ایک بڑے ذہنی انقلاب کا سخت خطرہ ہے، اس بیماری کا علاج صرف یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر پوری وضاحت اور قوت کے ساتھ آخرت کی دعوت دی جائے اور اسی کو اصل زندگی بتلایا جائے، آخرت کے یقین کو زندہ اور بیدار کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے تذکرہ سے گریز اور اس کے ذکر سے شرمایا نہ جائے (جیسا کہ اس وقت ہماری دینی ادبیات میں نظر آتا ہے) بلکہ اس کا برملا ذکر کیا جائے، جنت کا شوق دلایا جائے اور دوزخ سے ڈرایا جائے، پھر آخرت کا تذکرہ ایک اخلاقی ضرورت اور دینی سیاست کے طور پر نہ ہو بلکہ ایک زندہ حقیقت اور بدیہی واقعہ کے طور پر اور ذوق وشوق اور یقین کی کیفیت کے ساتھ ہو، جیسا کہ قرآن مجید کی آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات ومواعظ اور صحابہ کرام کی تقریروں اور گفتگوؤں سے معلوم ہوتا ہے (کاھم رای عین) گویا کہ وہ آنکھوں سے دیکھ کر بیان کر رہے ہیں) اس سلسلہ میں صحابہ کرام اور بعد کی صدیوں کے اہل یقین ومومنین صادقین کے واقعات، ان کے آخرت کے استحضار، شوق شہادت اور موت کے ذوق کے قصے اور ان کی عاشقانہ کیفیات کا بیان بھی مفید ہوگا، پچھلی صدیوں کے تمام اصلاحی وتجدیدی کارناموں میں اسی یقین کی روح نظر آتی ہے۔ ان کے قائد ورفقا اس یقین سے لبریز اور اس ذوق سے سرشار نظر آتے ہیں، نصف صدی کے اندر اندر اس بارہ میں بڑا انحطاط اور انقلاب ہوگیا ہے، دین کے بعض شعبے ضرور زیادہ روشن اور واضح ہوگئے ہیں، اور بہت سے دینی حقائق نظر کے سامنے آگئے ہیں، دین پر بہت اچھا لٹریچر تیار ہوگیا ہے مگر ایمان بالآخرۃ اور فکر آخرت میں عمومی انحطاط نظر آتا ہے، یہ بنیادی شعبہ اس وقت تجدید وتقویت کا محتاج ہے اور دین کے داعیوں کو اس کی طرف سے غفلت نہیں کرنی چاہیئے۔

---

(۳)

مصروفیت، دنیا کے مشاغل میں مشغولیت اس وقت کا بڑا فتنہ ہے اس زمانہ میں مادہ پرستی کی وجہ سے معاش اور معیار زندگی کی بلندی کی جتنی فکر پیدا ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے انسان کی جتنی مشغولیت بڑھ گئی ہے ویسی کبھی نہیں تھی، اس وقت صرف زندگی کے نقد مسائل کو سوچا جاتا ہے اور صرف ان کے لیے جد وجہد کی جاتی ہے، ان مسائل نے ہماری زندگی کے چاروں طرف ایک خول منڈھ دیا ہے جس کے باہر آدمی نکلنا نہیں چاہتا اور ان مسائل کے علاوہ کوئی بات سننا تک گوارا نہیں کرتا ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ لوگوں کو زندگی کے اہم تر

مسائل کی طرف متوجہ کیا جائے اور ان کو حکمت و تدبیر کے ساتھ بتایا جائے کہ معاشی مسائل کی اہمیت سے ہمیں انکار نہیں ہے لیکن ان کے علاوہ زندگی کے کچھ ایسے مسائل ہیں جو بنیادی ہیں اور ان کی اہمیت ان سے زائد ہے، آپ نے ان مسائل کو اپنی زندگی سے کیوں خارج کر دیا ہے؛ زندگی کے موجودہ مسائل کی فکر نہ کرنے سے اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ مستقبل کے مسائل کی فکر نہ کرنے سے۔ مرنے کی تیاری کی اگر فرصت نہیں نکالی تو ہمیشہ حسرت کرنا پڑے گی۔

ہمیں بعض دفعہ ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو واقعی مشغول ہیں اور اپنے مشاغل کو کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے، ہمیں ان لوگوں کے مشاغل کی رعایت کرنی چاہیئے اور حکمت و تدبیر کے ساتھ ان کے مشاغل میں سے ایسا وقت نکالنا چاہیئے کہ وہ آخرت کے مسئلہ کی طرف توجہ کریں؛ ان کے مشاغل کی رعایت کے ساتھ دینی مشغولیت کا پروگرام ان کے لیے بنانا چاہیئے۔ امت کے حالات ایسے مختلف ہیں، اور ذہنی سطح میں ایسا نشیب و فراز ہے کہ ہر ایک طبقہ کے لیے علیحدہ علیحدہ علاج سوچنا پڑے گا، کچھ لوگ ایسے ملیں گے جو کسی طرح اجتماعات میں آنے اور سفروں میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے ان کو ایسی کتابیں دینا چاہئیں جو دقیق اور محنت طلب نہ ہوں، موجودہ زبان میں لکھی گئی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ جاذب نظر ہوں، مطالعہ اور علمی زندگی یا دماغی محنت کی وجہ سے بعض لوگوں کے دماغ کی ساخت ایسی بن جاتی ہے کہ وہ تقریروں اور خطابت سے اتنا متاثر نہیں ہوتے جتنا کہ سنجیدہ کتابوں اور علمی مضامین سے ہمیں ہر ایک کو اس کی مناسب غذا فراہم کرنی چاہیئے اور دین سے تعلق و قرب اور محبت اس طبقہ میں جس درجہ کی پیدا ہو سکے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیئے، اس طبقہ میں دین کی بے وقعتی اور بے اعتمادی اور اسکی طرف سے بے نیازی عام مرض ہے اور یہی اس کے تمام امراض کی جڑ، دین و اہل دین سے بُعد اور عملی کوتاہیوں کا سبب ہے۔ اس طبقہ کی سب سے بڑی خدمت اور اس کے لیے سب سے کامیاب دعوت یہ ہے کہ دین کی بے وقعتی اس سے دور ہو اور اس کی عظمت و صداقت اس کے دل میں پیدا ہو؛ اگر کتابوں یا مجلسی گفتگو سے یہ تبدیلی پیدا کی جاسکے تو یہ بڑی کامیابی ہے، ہمیں اس کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔

(۴) اہل دین کی کمزوری اور پستی

عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ دین کی دعوت کو قبول کرنے والے اور دینی جد و جہد میں حصہ لینے والے کمزور اور مالی حالت سے پست ہوتے ہیں اس لیے لوگ اس بات کا بہانہ بنا لیتے ہیں اور بالکل قوم نوحؑ کے لہجہ میں کہنے لگتے ہیں کہ:-

أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ.	کیا ہم آپ پر ایمان لائیں حالاں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی پیروی کرنے والے پست درجہ کے لوگ ہیں؛

کبھی کہنے لگتے ہیں:

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ	اگر یہ کوئی اچھی چیز ہوتی تو پہلے ہم کو نصیب ہوتی۔

اس وقت زمانہ کا مزاج یہ ہوگیا ہو کہ وہ اصحاب اقتدار کا اثر قبول کرتا ہے، یورپ کو اقتدار ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہی دنیا کی قیادت حاصل ہے، یہ جاہلیت کا خاصہ ہے اور دماغ کی ایک مخصوص بناوٹ ہو کہ ایسے لوگ صرف طاقت کی دلیل مانتے ہیں اور کوئی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔

اس بیماری کا علاج یہ ہے کہ یہ ذہن نشین کیا جائے کہ حق خود معیار شرافت ہے اور دولت و قوت سے زیادہ اس میں معنویت ہے، اس کے ساتھ اس سے بھی غفلت نہ برتی جائے کہ با اثر لوگ دین کی طرف متوجہ ہوں اور دینی دعوت کو قبول کریں تاکہ ان کی پیروی عوام بھی کریں۔

(۵) دینی تحریکوں کی ناکامیابی اور داعیوں کے تلخ تجربات

ہمارے ماضی قریب کی اکثر دینی تحریکیں مختلف اسباب کی بنا پر ناکامیاب ہوئی ہیں، اس کی وجہ سے عوام دینی تحریکوں کی طرف سے بددل ہو گیے ہیں، اکثر لوگ کہتے ہیں کہ سیکڑوں تحریکیں ہم نے ناکامیاب ہوتے دیکھی ہیں، آپ کیا تیر ماریں گے، یہ دماغ کی کمزوری ہے اور کوئی معقول و علمی بات نہیں ہے اس کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

داعیوں کے تلخ تجربات البتہ قابل غور ہیں۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہو کہ اب تک اتفاقاً برابر یہ ہوتا رہا ہو کہ تحریکوں کی بنا مال کی بنیاد پر رکھی گئی اور اس وجہ سے غیر معتمد متمول لوگوں کو اپنے کام میں شامل کیا گیا، اس کا نتیجہ جو ہونا چاہیئے وہی ہوا یعنی یہ کہ تحریک کو ناکامیابی ہوئی تو داعیوں پر قوم کا روپیہ کھا جانے وغیرہ کے الزامات لگائے گیے، یہ ان تحریکوں کے داعیوں کی بنیادی غلطی تھی کہ انھوں نے ناتربیت یافتہ قوم سے روپیہ فراہم کیا، انبیاء علیہم السّلام کا طریقۂ کار یہ نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے دنیا کے متمول لوگوں سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تم سے اپنے اجر کے طالب نہیں ہیں ہمارا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللهِ

میں تم سے کسی معاوضہ کا طالب نہیں ہوں! معاوضہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو۔

مال کا معاملہ ہمیشہ سے کمزور ترین رہا ہو اور اکثر دینی تحریکوں کی ناکامیابی کی یہی وجہ رہی ہو کہ ان کی بنیادیں روپیے کی فراہمی پر رکھی گئی تھیں۔

ہمارے پیچھے وعظ کہنے اور اس کا حق محنت وصول کرنے کی جو تاریخ ہے وہ بھی بہت افسوس ناک ہو۔ ہمیں اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیے، اس وقت دینی تحریکات کی کامیابی کے لیے ضروری ہو کہ عام چندہ بازی سے بچا جائے اور ضیافت کی پیش کش کے قبول کرنے میں بھی احتیاط کی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ضیافت کا قبول کرنا ایثار تھا، طبیعتیں سادہ و پرُخلوص اور حوصلے بلند تھے، بدگمانی کا مرض بہت کم تھا، اب صورت حال مختلف ہو

اس لیے احتیاط، موقع شناسی اور استغناء کی ضرورت ہو۔ حضرت سلیمانؑ نے بلقیس کا تحفہ نامنظور کرکے اس کی خودی پر ایک ضرب کاری لگائی اور اس پر اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کردیا اور یہ بجائے اس کے دور ہونے کے قریب ہونے کا ذریعہ بنا۔

مسلمانوں کی افسردگی اور شکستہ دلی (۹) پچھلی غلطیوں اور ان کے نتیجہ میں اس ملک میں جو واقعات پیش آئے ان کی بنا پر عام طور سے مسلمانوں میں افسردگی چھائی ہوئی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں مردہ دلی اور یاس نظر آتی ہے۔ اس وجہ سے مسلمان کسی تعمیری اور ٹھوس کام کے لیے تیار نہیں ہوتے اور کسی فتنہ کے مقابلہ کے لیے کمر ہمت نہیں باندھتے۔

اس کا حل صرف یہ ہے کہ اول تو مسلمانوں کو ایمانی اور دعوتی زندگی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے جو ان کی اصل قدر و قیمت ہے ان کو یقین دلایا جائے کہ اس کے بعد (جب وہ اسلام کے پیغام کے حامل اور اس کی حقیقت سے متصف ہوں) ان کا وجود ہر ملک کے لیے ضروری اور ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے، اس کے لیے قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہے، اور اس کے بالکل ختم ہوجانے کا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے افسردگی اور شکستہ دلی بالکل بے معنی چیز ہے اور اس کا کوئی موقع نہیں۔ ہم کو اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا چاہیے کہ وہ ہم کو برباد نہیں کرے گا اور سمجھنا چاہیے کہ اس ملک میں ہمارا وجود دینی ضرورتوں کے لحاظ سے ضروری ہے، ہندوستان میں رہنے کا ہمیں سب سے زیادہ حق حاصل ہے۔ اگر مسلمان دین کے خاطر یہاں رہنے کا عزم کرلیں اور وہ صحیح اسلامی سیرت اختیار کریں اور اپنی وہ سیرت بنائیں جس پر اللہ کی رحمت و نصرت کا وعدہ ہے تو ان کو اس ملک سے نکالا جانا تو درکنار رہا اگر وہ خود جائیں گے تو لوگ ان کو منا کر لائیں گے اور دوبارہ بسائیں گے۔ ان کا مستقبل اس ملک میں سب سے زیادہ روشن ہے، اور ان کا پایہ مضبوط ہے اسلیئے ان کو ملک میں رہنے والوں کی طرح اپنی زندگی کی تنظیم کرنی چاہیئے، اور تعمیری و تعلیمی کاموں میں پورے جوش و نشاط کے ساتھ مشغول رہنا چاہیئے۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون	سست پڑو نہ غمگین ہو تمہیں سب سے سربلند ہو
ان کنتم مؤمنین	اگر تم صاحب ایمان ہو۔

عقائد کا اختلاف اور بدگمانیاں جن لوگوں نے دین کو بطور پیشہ کے اختیار کیا ہے اور جو اس کو مستقل کاروبار کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہمارے کام سے ان کے اس کاروبار پر اثر پڑتا ہے اس لیے کہ بیچارے جاہل عوام جو رسوم وغیرہ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اس جہالت سے نکلتے ہیں اور صحیح راستہ پر پڑتے ہیں۔ بے غرضی اور خلوص سے کام کرنے کا ذوق عام ہوتا ہے اور اس کے نمونے سامنے آتے ہیں جن کی وجہ سے لوگ ان پیشہ وروں سے بددل ہوتے ہیں اور ان سے بھی ایثار اور لوجہ اللہ کام کرنے کا

مطالبہ کرنے لگتے ہیں، اور اس طرح سے ان کے سکون اور عظمت میں فرق آتا ہے، اسکی وجہ سے ہماری تحریک کو روکنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں اور ہمارے متعلق وہ الفاظ مشہور کیے جاتے ہیں جو کہ عوام کے لیے اشتعال انگیز ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ یہ چیز دیرپا نہیں ہے۔

وَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ

جو جھاگ اور کوڑا کرکٹ ہوتا ہے وہ چلا جاتا ہے اور جس چیز میں انسانوں کا نفع ہوتا ہے وہ زمین میں رہ جاتی ہے اور جگہ پکڑ لیتی ہے۔

انسان نفع پسند واقع ہوا ہے لہذا اس کام میں نفع کی مقدار بڑھائی جائے اور عوام کو محسوس کرایا جائے کہ یہ اُن کے نفع کی چیز ہے اور ہم ان سے کسی اجر کے طالب نہیں ہیں۔ آخر ایک دن وہ آئے گا کہ لوگ سمجھ لیں گے کہ یہ لوگ فاسد العقیدہ نہیں ہیں بلکہ اصل دین اور حقیقت دین کی دعوت دیتے ہیں اور اسکی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور کسی اجر کے طالب نہیں ہیں اور ان کو بدنام کرنے والے دین کو کاروبار کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

خاصکر پچھلے چند مہینوں سے مختلف علاقوں سے ہمیں اس کی اطلاعیں مل رہی ہیں کہ اسی قماش کے کچھ لوگوں نے اب ہماری اس دینی دعوت اور اس تبلیغی جد وجہد کے خلاف اسی طرح کی بہتان تراشی کی مہم جاری کر رکھی ہے ـــــ ان لوگوں میں سے ہم جن جن کو جانتے ہیں ان کے متعلق ذاتی معلومات کی بنا پر آپ دوستوں کو یہ بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ہرگز کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں اس لیے ان کو کچھ سمجھانے کی فکر بالکل فضول ہے، بلکہ یہ ان کا گویا پیشہ اور کاروبار ہے، اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے بالکل نہ الجھیں بلکہ ـــــ اللہ تعالیٰ سے پورے الحاح کے ساتھ یہ دعا کرتے ہوئے کہ وہ ان کو ہدایت اور نیک توفیق دے اور اگر یہ مقدر نہیں ہے تو ہم کو اور ساری امت محمدیہ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے ـــــ آپ پورے انہماک اور اخلاص کے ساتھ اور دعاؤں کی کثرت کے ساتھ کام میں لگے رہیں۔ سارے فتنوں کا علاج انشاء اللہ اسی کام میں ہے۔ بشرطیکہ اصول کی پابندی کے ساتھ ہو۔

آپ جب اپنے تبلیغی دوروں میں ایسے مقامات پر پہنچیں جہاں اس قسم کے ناخدا ترسوں نے اس تبلیغی کام اور اس کے کرنے والوں کے متعلق جھوٹی باتیں بتا بتا کر مسلمانوں کو بدگمان کیا ہو، تو اپنے کو نہایت عاجز اور بے بس بندہ یقین کرتے ہوئے دعاؤں کی کثرت کریں اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں اور وہاں کے ان مسلمانوں سے آپ صاف صاف کہیں کہ آپ سے ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین مٹا جا رہا ہے، ہم آپ جس طرح اپنے بچوں کی اور اپنے کاروبار کی فکر کرتے ہیں اس طرح اس کی بھی فکر کریں، اس سے اپنا تعلق بڑھائیں اور اللہ کے بندوں کا تعلق بڑھانے کے لیے جد وجہد اور محنت کریں، دین کے لیے قربانی کا رواج مٹ گیا ہے آپ خود دین کے لیے قربانی دے کر اس رواج کو زندہ کریں، ہم بس اس کام کے لیے پھرتے ہیں، آپ اگر اپنے علاقوں میں یہ کام خود کرنے لگیں تو ہمیں آپکے یہاں آنے کی ضرورت نہ ہوگی ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

لائے ہوئے دین سے اپنا اور اللہ کے دوسرے بندوں کا تعلق بڑھانے کے لیے اور دنیا میں اس کو چمکانے کے لیے ہم آپ سے دین کی صرف وہ چند بنیادی باتیں کہتے ہیں جن سے کسی مسلمان کو اختلاف اور انکار نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمیں برا سمجھیں یا بھلا، لیکن اللہ و رسول کی بتلائی ہوئی ان دینی باتوں کو مان لیں اور چند روز اس کام میں ہمارے ساتھ رہ کر دیکھیں کہ ہم کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں، اگر آپ یہ دیکھیں کہ ہم اللہ کے بندوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی طرف بلاتے ہیں اور خود بھی اس پر چلنا چاہتے ہیں تو آپ اس کام میں ہمارے مددگار ہو جائیں اور اگر آپ دیکھیں کہ ہم کسی اور راستہ کی طرف بلاتے ہیں تو ہماری پوری مخالفت کریں، آپ ہماری یا کسی کی صرف باتوں کا اعتبار مت کیجئے، بلکہ خود دیکھئے اور پھر فیصلہ کیجیے ——————

بہرحال ہمارے احباب ایسے مقامات پر خصوصیت کے ساتھ اسکی انتہائی کوشش کریں کہ ان ہی میں سے اللہ کے کچھ بندے کچھ وقت کے لیے آپکے ساتھ ہو جائیں، اس مقصد کے لیے آپ ان سے وہ سب باتیں کریں جو آپکے نزدیک ان کو آمادہ کرنے والی ہوں، بلکہ آپ ضرورت سمجھیں تو اس کے لیے ان کو قسم دیں۔ اگر کسی بستی کے صرف دو چار آدمی بھی آپکے ساتھ کچھ وقت کے لیے ہو جائیں گے تو انشاء اللہ وہی دوسروں کو بھی بتا دینگے کہ اصل حقیقت کیا ہے ——————— الغرض آپ صرف اپنے اصل کام پر توجہ رکھیں، یہی اس کا علاج اور ہر بہتان کا جواب ہے، اس قسم کے ابتلاآت سے بددل نہیں ہونا چاہیے ان باتوں سے تو درجے بڑھتے ہیں اور اجر میں اضافہ ہوتا ہے، یہ تو انبیاء علیہم السلام اور انکے سچے تابعین کی وراثت ہے۔

صہ ۹۶ کا بقیہ مضمون

دل دُکھے، اور وہ آزردہ ہو) بلکہ جب کوئی چوتھا آجائے جو اُسکے پاس بیٹھا رہ سکے تو یہ الگ ہو کر اپنی باتیں کرلیں"۔

لیکن آج ہمارا حال یہ ہے کہ دوسروں کی دل آزاری میں ہمیں لذّت آتی ہے، اللہ تعالیٰ ہماری اس بیماری کی اصلاح فرمائے، شاید ہم لوگ سب سے زیادہ اِسکے مریض ہیں۔

دوستو! ایمان کامل نہیں ہوسکتا، اور ہماری زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی، جبتک کہ ہم اپنی زندگی کے ان سب پہلوؤں کو درست نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی قبر پر انوار کی بارشیں برسائے، ہمارے اس زمانہ میں حضرتؒ نے خصوصیت سے ان شعبوں کو زندہ کرنے کی طرف خاص توجہ فرمائی۔

یوں تو حضرتؒ کے مواعظ اور ملفوظات میں اور اکثر تصانیف میں ان شعبوں کی اہمیت کا ذکر بلا مبالغہ سیکڑوں جگہ ملے گا اور صرف اسی مضمون کے صفحات الگ کئے جائیں تو کئی سو ہوں گے، لیکن حضرتؒ کے دو مستقل رسالے بھی ہیں جن کا مطالعہ ہم لوگوں کو کبھی کبھی ضرور کرنا چاہئے، ایک "صفائی معاملات" اور دوسرا "آدابِ معاشرت"۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ اپنی زندگیوں کو ایمان والی اور اسلام والی زندگی بنانے کی فکر کو ہم اپنی سب سے بڑی فکر بنالیں۔

اللّٰھُمَّ اِنَّ قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدک لم تملکنا منھا شیئاً فاذا فعلت ذالک بنا فکن انت ولینا واھدنا الی سواء السبیل ۰

تربیتی پروگرام کے چھ دنوں میں دین و شریعت کے موضوع پر معاملات اور معاشرت تک ہی بیان ہوسکا تھا، ساتویں دن دین کی دعوت و نصرت اور سیاست و حکومت کے موضوع پر کہنے کا ارادہ تھا، لیکن طبیعت کے خراب ہوجانے کی وجہ سے وہ بیان نہ ہوسکا، انشاء اللہ کتابی اشاعت میں اُس کو بھی قلمبند کرکے شامل کردیا جائے گا۔

تاریخ اسلام میں اصلاح وانقلاب کی جدوجہد

اور

اس کی اہم شخصیتیں

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تربیتی ہفتہ میں (جس کی اکثر تقریریں اس نمبر میں شائع ہو رہی ہیں) ایک طویل اور مسلسل عنوان تھا "اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں" یہ عنوان اس راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا، اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا، اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، احباب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے، بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اطمینان سے کرنے کا ہے اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے جس کو جلد پُر ہونا چاہیے، اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کبھی کبھی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں جنھوں نے حالات سے کشمکش کی اور جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں جو فکری اور علمی حیثیت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں رہتے اور جن کے علمی و عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی، صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷، ۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں جن کو بمشکل "مجدد" کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ یہ بات دیکھنے میں ذرا معمولی معلوم ہوتی ہے مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و عزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے۔ اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک احساس کمتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن یہ نتیجہ بے سبب نہیں تھا بدقسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں جن کو واقعات کی کھتونی کہنا صحیح ہو اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہو یا چند نمایاں شخصیتوں کی سوانح حیات (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں جس میں ان تمام شخصیتوں اور تحریکوں کا مفصل تعارف ہو جنھوں نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہو اور اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہو۔ غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سد باب کیا ہو اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہو، درحقیقت اسلام کے

سلسلۂ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب و تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پُر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے — لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اسکے لیے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا اور اسکو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا۔ اسکے لیے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق، علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے وہ اس پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کمیاب ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور طبیعت کی رفتار سرسری طور پر گذرنے سے مانع ہوئی، اور کم فرصتی اور طویل و کثیر وقفوں کے باوجود ایک اچھا خاصہ حصہ تیار ہو گیا، قلم کا مسافر چھٹی صدی ہجری تک کا سفر طے کر چکا ہے اور اس وقت سیدنا عبدالقادر جیلانی اور آپ کے نامور معاصرین کی مجلس میں باریاب ہے۔

لیکن الفرقان کا یہ نمبر اس سے زیادہ کا متحمل نہیں جو اس صحبت میں ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔

مقالہ نگار کے سامنے کام کا جو خاکہ ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و امداد سے پورا ہو گیا تو نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی بلکہ فکری و علمی ارتقاء و انحطاط کی تاریخ بھی وجود میں آ جائے گی۔ یہ بات ناظرین کرام کے پیش نظر رہے کہ اس مضمون میں ہمیں اصطلاحی منصب تجدید سے بحث کرنا نہیں ہے، نہ اشخاص کا تعین کرنا ہے جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کر دیا اور تجدید کے شرائط پورے کیے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے اور ان ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے، جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء و تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس مضمون میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جا سکتے مگر دین کی تجدید و احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔]

ابوالحسن علی — ۷ فروری سنہ ۱۹۵۲ء

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے، اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا اور اعلان کیا جا چکا کہ :-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ (المائدہ ع)	آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لیے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہو، دوسری طرف یہ حقیقت ہو کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہو اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہو۔

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہو اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہو مگر وہ زندگی سے پُر ہو اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہو، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہو کہ وہ ہر ماحول میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہو جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہو جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا بہترین نمونہ ہو۔

ذالک تقدیر العزیز العلیم	یہ ہو اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا،
صُنع اللہِ الذی اتقن کل شیئ	کاریگری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

امت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہو اور یہ امت آخری اور عالمگیر اُمت ہو اسلیے یہ بالکل قدرتی بات ہو کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس اُمت کا واسطہ رہے گا اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہو گا جو کسی دوسری اُمت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس اُمت کو جو زمانہ دیا گیا ہو وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہو اور اس کے حالات میں جتنا تنوُّع ہو وہ تاریخ کے کسی گزشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کی بقا اور تسلسل کے لیے خدائی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور مکان و زمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہو، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہو (اور اس وقت تک کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہو) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہو اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ اُمت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہو دنیا کی قوموں اور اُمتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہو، بلکہ انتظام خداوندی ہو کہ جس دَور

میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور نہ ہر کو جس "تریاق" کی حاجت تھی وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام کے قلب جگر پر حملے

شروع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لا سکتا تھا، دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہار نہ سکے اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا، ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں، اسلامی روح اور اس کے نظام عقائد کے لیے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر لے گیا اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد و لادینیت، اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لا سکے اور ان کے سامنے سپر ڈال دے لیکن امت مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے تحریفات و تاویلات کا پردہ چاک کر دیا اور حقیقت اسلام اور "دین خالص" کو اجاگر کیا۔ بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پرزور حمایت کی، عقائد باطلہ کی بیباکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانہ کے مترفین کی سخت مذمت کی اور جابر سلاطین کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی، یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، اور طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لیے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "ید بیضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا، اور حق روشن ہو گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہو اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہو، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور اُمت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہو جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا جو اس

دین کو تحریفات و بدعات کے نرغہ سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقت ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پر زور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لیے کمربستہ ہو کر میدان میں آجائے اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیرووں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

ایک عیسائیت ہی کو لیجیے، قسطنطین اور سینٹ پال کے اثر سے مسیحیت میں جو مشرکانہ روح اور کھلی ہوئی بُت پرستی داخل ہو گئی تھی، اور مسیحیت کو جس بری طرح مسخ کیا گیا تھا ہزار برس تک اس قاتلانہ کارروائی کے خلاف مؤثر طریقہ پر احتجاج کرنے والا نظر نہیں آتا، نہ مارٹن لوتھر سے پہلے کوئی دعوتِ اصلاح اور صدائے احتجاج سننے میں آتی تھی، گویا مسیحیت کی مذہبی تاریخ میں ایک ہزار سال سے زیادہ زمانہ[۱] "دعوت اصلاح و احتجاج" سے بالکل خالی گزرا ہے، خود لوتھر بھی مسیحیت کی کوئی بڑی اصلاح نہ کر سکا اور اس کو اس شکل پر بھی نہ لا سکا جو کم سے کم تیسری صدی عیسوی میں تھی، لوتھر کے بعد پھر کوئی "نیا احتجاجی" عیسائی دنیا میں پیدا نہیں ہوا، عیسائیت جس روش پر سیکڑوں برس سے چل رہی ہے اسی پر چلی جا رہی ہے، اب مادہ پرستی کے خلاف جو عیسائیت کی اصل حریف اور یورپ میں اس کی جانشین ہے کوئی مؤثر اور وقیع دینی دعوت اور صدائے احتجاج سننے میں نہیں آتی پوری مسیحی دنیا صدیوں سے طاقتور مسیحی شخصیت اور داعی اور دینِ عیسوی کے مجدد و مصلح سے محروم ہے، عیسائیت روز بروز اپنا اثر اور اقتدار کھوتی جا رہی ہے، اور اس کے بازگشت کی کوئی امید نہیں ہے، یورپ کے مفکرین و مصنفین عیسائیت کی نشأتِ ثانیہ سے بالکل مایوس ہیں۔

دوسرے مذاہب کا حال اس سے بہتر نہیں، بودھ مذہب نے ایک زمانہ میں تقریباً سارے ایشیا کو فتح کر لیا تھا لیکن جو مذہب محض روحانی تجرد، صفائی نفس اور اخلاقی تربیت کا نام تھا اور جو بگڑے ہوئے مذاہب اور رسم پرستی کے خلاف وجود میں آیا تھا وہ رفتہ رفتہ خود بت پرستی اور مظاہر پرستی کے رنگ میں ڈوب گیا، اس پر بانی مذہب کے مجسموں اور بتوں کا، اور اس کی خانقاہوں اور عبادت گاہوں پر تعیشات اور بداخلاقی کا سخت حملہ ہوا، زمانہ قریب ہی میں مذہب کی روح نکل گئی اور ظاہر بینی اور رسم پرستی چھا گئی[۲] لیکن بدھ مذہب اور اس کے کروڑوں ماننے والوں میں کوئی ایسی عظیم شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس مذہب کی تجدید کرتی اور اس میں از سرِ نو صحیح روحانیت اور

---

[۱] قسطنطین کا سنہ جلوس ۳۰۵ء ہے، اور لوتھر کی تحریک اصلاح ۱۵۱۷ء میں شروع ہوئی ہے، گویا درمیان میں ۱۲۰۸ سال کا فصل ہے۔ [۲] ملاحظہ ہو تاریخ ہند قدیم از پروفیسر ایشوری ٹوپا، اور تلاش ہند از پنڈت جواہر لال نہرو ص ۲۰۱-۲۰۲۔

اخلاقی بلندی پیدا کرتی، اور اس کو غلط رجحانات دوسرے مذاہب کی نقالی اور مادیت کے حملوں سے بچاتی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہندستان کے قدیم مذاہب نے اسکو خود اس کے وطن سے بے دخل کر دیا۔ یہی انجام ہندستان کے دوسرے مذاہب کا ہوا جو بہت جلد بدل گئے، اور پھر اپنی اصلی شکل پر کبھی واپس نہ آسکے۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، اور اپنی خصوصیات زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک کہ وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی وایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جوان ہیں، مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اسکے مذہب کو حقیقتاً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پرجوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنھوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔

اگرچہ پیر ہو مومن جواں ہیں لات ومنات

اس کا مقابل جب تک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی، تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرہ کے لیے نئی شخصیت طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی اس طویل اور پر آشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت بھی ایسی نہیں آئی جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی ہو، حقیقت اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلامیہ کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لیے کوئی فتنہ نمودار ہوا اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، یا مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، اُن کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہو، کتنے آدمی ہیں جو "قدریت" "جہمیت" "اعتزال" "خلق قرآن" "وحدۃ الوجود" اور اکبر کے "دین الٰہی" کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ

اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور "سرکاری مذہب" علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جد و جہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی اسلام کی تاریخ، اور ویسا ہی مسلسل ہے جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات

خلافت راشدہ کے اختتام اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کر دی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت اور خلافت راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا کتاب و سنت نہیں رہا بلکہ عربی سیاست اور "مصالح ملکی" بن گیا، تفاخر اور عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کر دیا تھا اور جو بادیۂ عرب میں پناہ گزیں تھی پھر واپس آگئی، قبائلی غرور، خاندانی جنبہ داری، اعزہ پروری، جو خلافت راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہنر اور محاسن بن گئے، اعمال و اخلاق کے محرکات (بجائے اجر و ثواب کے) جاہلی ناموری، مدح و تعریف اور تفوق ہو گئے[1]، بیت المال (جو

---

[1] اس سلسلہ میں جاہلیت کا جذبۂ مسابقت اور شہرت و عزت پورے طور پر زندہ اور بیدار ہو گیا تھا، اس ذہنیت کا اندازہ اس دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے جو ابو الفرج الاصبہانی نے اغانی میں نقل کیا ہے کہ عہد اموی کے دو عرب سرداروں حوشب اور عکرمہ کے درمیان عرصہ سے اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ تیار ہوتا ہے، اور مہمان زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں حوشب کا پلہ اکثر بھاری رہتا، ایک مرتبہ عکرمہ نے اپنے حریف کو زک دینے کے لیے یہ تدبیر کی کہ صدہا بوریاں آٹے کی خرید لیں اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کر دیں کہ آٹا گوندھ لیا جائے، اس گندھے ہوئے آٹے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھر دیا، اور اوپر سے گھاس ڈال دی، اور اس کا انتظام کیا کہ حوشب کا گھوڑا اس گڑھے میں گر جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ گھوڑا گندھے ہوئے آٹے کی اس خندق میں جا پڑا اور آٹے میں لت پت ہو گیا، اور دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں اس مقدار میں آٹا گندھتا ہے کہ گھوڑا اس میں گر گیا۔ لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے دیکھا تو گھوڑے کا سر اور گردن باہر تھی اور سارا جسم ڈوبا ہوا تھا، رسیوں اور بلیوں سے اس کو بڑی مشکل سے نکالا گیا۔ عام طور پر اس واقعہ کی شہرت ہوئی اور شعراء نے اشعار کہے، اس طرح عکرمہ نے اپنے حریف کے مقابلہ میں فتح حاصل کر لی اور اپنا تفوق تسلیم کرا لیا۔ (زمانۃ الثالث ج ۱ صہ ۱۳۹ و ۱۴۰)

مسلمانوں کے پیسہ پیسہ سے جمع ہوتا تھا، خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا، پیشہ ور شعراء، خوشامدی درباریوں، اور آبرو باختہ مصاحبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا، جس پر مسلمانوں کی دولت بے دریغ صرف ہوتی تھی اور ان کی بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی[1] گانا سننے کا ذوق اور موسیقی کا انہماک حد کو پہونچ گیا تھا،[2] حکومت کی غلط روی اور اہل حکومت کی بے دین زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی اور "مترفین" کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہو اور چالیس برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی ہو۔

عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

بنی امیہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا جو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، اور اپنی للّٰہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی، اور علم و تفقہ میں مشہور و معروف تھے، حکومت و انتظامات کے دائرہ سے باہر انھیں حضرات کا اثر و اقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے، اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے با اثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ وعلیٰ آبائہ السلام) کی تھی جو عبادت و تقویٰ اور زہد و ورع میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہو کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک اپنی ولیعہدی کے زمانہ میں طواف کے لیے آیا، شدت ہجوم کی وجہ سے وہ حجر اسود تک نہیں پہونچ سکا اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام[3] کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا اور انھوں نے بآسانی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے تھے لوگ احتراماً راستہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہد اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ

---

[1] اموی عہد کا مشہور عیسائی شاعر اخطل (م ۹۵ھ) خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آتا، کہ گلے میں سونے کی صلیب ہوتی اور داڑھی کے بالوں سے شراب کے قطرے ٹپکتے اور کوئی اس کو ٹوکنے والا نہ ہوتا (اغانی ج ۷ صفحہ ۱۷۰)

[2] اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک مرتبہ عراق کا مشہور مغنی حنین اپنے ہم پیشہ لوگوں کی دعوت پر مدینہ منورہ آیا، ایک مکان میں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ چھت بیٹھ گئی اور خود حنین دب کر مر گیا۔ (اغانی ج ۲ صفحہ ۱۲۲-۱۲۳)

[3] حجر اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا۔

اشعار میں اس کے تجاہل عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایان شان تعارف کرایا[1]

اسی طرح دوسرے فضلاء اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ المحض، نیز دوسرے فضلاء تابعین حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروۃ بن الزبیر[2] مسلمانوں کے لیے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی و بیباکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمت دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا اور کبھی کبھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاح حال کا جذبہ اُبھرتا تھا۔

انقلاب حکومت کی ضرورت اور اس کے مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہوتے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی جو اسلام کے اصلی اخلاق و اوصاف کی محافظ اور قرن اول کی یادگار تھیں، حکومت کا دائرۂ اثر وسیع اور مستحکم ہو گیا، اب اخلاقی و دینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جا سکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی جو اس کو میدان جنگ میں شکست دے سکے، ماضی قریب میں دو بڑی کوششیں، ایک سیدنا حضرت حسینؓ کا مخلصانہ و سرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کا دلیرانہ و منظم مقابلہ ناکام ہو چکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات اور آثار نہ تھے، شخصی اور موروثی حکومت نے اصلاح و تبدیلی کے دروازے بند کر دیے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لیے مسلمانوں کی قسمت پر مہر لگ چکی ہو، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لیے ایک معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

---

[1] یہ قصیدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته ۔۔۔ والبیت یعرفه والحِلّ والحرمُ

محققین کا خیال ہے کہ اس قصیدہ میں بعد میں بہت سے اشعار اضافہ ہوئے ہیں۔ ۱۲

[2] مفصل حالات و تراجم کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی ذات ہو جو خود بانیٔ خاندان (مروان) کے پوتے اور ان کی ماں (ام عاصم) فاروق اعظم کی پوتی تھیں، فاروقیت اور اموییت کا یہ سنجوگ[1] اسی لیے ہوا تھا کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفۂ راشد پیدا ہو جو حالات میں انقلاب برپا کردے۔

عمر بن عبدالعزیز سنہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے وہ خلیفۂ وقت سلیمان بن عبدالملک کے چچازاد بھائی تھے، اور اس کے پیشرو ولید بن عبدالملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے علاقہ کے حاکم دگورنر تھے ان کی جوانی اور عہد امارت کو ان کی خلافت کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحب ذوق، امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس راستہ سے گزرتے تھے دیر تک اس کی مہک بتلاتی تھی کہ ادھر سے عمر گزرے ہیں، ان کی چال مشہور، اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سوائے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دینے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سراپا اسلام کا اعجاز تھی اور وہ جس طرح منصب خلافت پر آئے وہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، موروثی نظام حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبدالملک بیمار ہوا، اس کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اس نے ان کو لانبی لانبی قبائیں پہنائیں اور ہتھیار باندھے کہ وہ کچھ بڑے معلوم ہوں، مگر وہ آنکھوں میں نہ جنچے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہو، جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں، رجاء بن حیوۃ نے جو اسی انتظار میں تھے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی کا مشورہ دیا جو منظور ہوا، رجاء کا یہ کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور برسہا برس کی عبادت پر بھاری ہو۔

خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبدالعزیز نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمال حکومت کو

---

[1] اس رشتہ کی تاریخ یہ ہو کہ حضرت عمر نے منادی کروائی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی کہ کوئی عورت کہہ رہی ہو کہ بیٹی صبح ہو رہی ہو دودھ میں پانی ملادے، لڑکی نے جواب دیا کہ اماں آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے اس کی ممانعت کی ہو، عورت نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت کہاں ہیں، ان کو کیا خبر؟ لڑکی نے جواب دیا کہ اگر امیر المومنین کو خبر نہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہو۔ حضرت عمر نے اس گھر کو نظر میں رکھ لیا اور اپنے صاحبزادہ عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی کو پیام دو، مجھے امید ہو کہ اس کے بطن سے ایسا جوانمرد پیدا ہوگا جو سارے عرب پر حکومت کرے گا، عاصم نے اس سے نکاح کرلیا عمر بن عبدالعزیز اسی کے نواسے ہیں۔　　(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز صفحہ ۱۰-۱۸)

معزول کیا جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا اس کو بیت المال میں داخل کیا اور اسی گھڑی سے ان کی سیرت یکسر بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے بلکہ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جواری اور باندیوں کو تحقیق کے بعد ان کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسریٰ و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سُنّت بنایا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کردی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے ایسی زاہدانہ زندگی اختیار کی جس کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہو، درویشوں اور فقراء میں بھی مشکل ہو، لباس میں ایسی کمی کی کہ بعض اوقات کرتا سوکھنے کے انتظار میں جمعہ میں تاخیر سے پہونچنا ہوتا، بنی اُمیّہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے، اب اپنا نپا تُلا حصہ پاتے، خود ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے وہ منھ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمھارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سُن کر وہ بھی رو پڑیں[1]، اس وقت جب کہ وہ روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمراں تھے ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر سے جو ان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمھارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار، کہا اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اسکے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارکباد دی، اور کہا کہ حج کا سامان آگیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دن فائدہ اٹھایا، اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا، ان کے دو وقت کھانے کا حساب ۲ درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی اور کوئی ان کی خیریت دریافت کرنے لگتا یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنی ذاتی شمع منگواتے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کیے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی ان کو احتراز تھا، بیت المال کے مُشک کو سونگھنا بھی گوارا نہ تھا[2]

ان کی احتیاط تنہا اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے، اور ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے معاملے میں اسی قدر محتاط اور جزرس ہوں گے، والیٔ مدینہ ابو بکر بن حزم نے سلیمان بن عبد الملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو سرکاری موم

---

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز محمد بن عبد الحکم ص ۳۸ [2] سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۴۴

بتیاں اور قندیلیں ملنی چاہئیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ پرچہ عمر بن عبدالعزیز کے ملاحظہ میں آیا، آپ نے لکھا کہ ابوبکر مجھے یاد ہو کہ تم اس عہدہ سے پہلے جاڑے کی اندھیری راتوں میں بے شمع و موم بتی کے نکلتے تھے، تمھاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی، میرے خیال میں تمھارے گھر کی بتیاں اور قندیلیں کافی ہیں، انھیں سے تمھیں کام لینا چاہیے[۱]۔ اسی طرح کی ایک درخواست پر جس میں سرکاری کام کے لیے کاغذ طلب کیا گیا تھا لکھا کہ "قلم باریک کرو اور گھٹا ہوا لکھو، اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لیے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواہ مخواہ بیت المال پر بار پڑے[۲]"

ان کی انقلابی اصلاحات

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انھوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کا نقطۂ نظر بدلا، اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، تربیت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انھوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرہ سے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے[۳]" حکومت کا مزاج اور نقطۂ نظر ہی تبدیل کر دیا اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا۔

ان کی ساری مدت خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انھوں نے ملکی مصالح و منافع کے مقابلہ میں ہمیشہ دین، اصول و اخلاق کو ترجیح دی اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پرواہ نہیں کی، ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، اہلکاران سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی اور تشویش کا اظہار کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا عین مقصد ہو، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ کی آمدنی بند ہو جانے کی وجہ سے) ہم تم دونوں کھیتی کر کے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں[۴]۔ یمن میں خراج کی ایک متعین مقدار مقرر تھی، خواہ فصل اچھی ہو یا بری، حاکم نے اطلاع دی، آپ نے فرمایا کہ فصل کے مطابق رقم وصول ہونی چاہیے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارے یمن سے ایک مٹھی غلہ وصول ہو، میں اس پر

---

۱ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۶۳، ۲ ایضاً ص ۶۳ ۳ کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۴۵ ۴ مناقب عمر بن عبدالعزیز (طبع یورپ) ص ۶۹

راضی ہوں[۱] چنگی ساری مملکت سے معاف کر دی اور عمال کو لکھا کہ وہ نجس ہو، اسکے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے، ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین ہ (اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو، اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو) لوگوں نے اس کا نام بدل کر اس کو جائز بنا لیا ہو[۲]، چند شرعی محاصل کے علاوہ ہر طرح کے ناجائز محاصل اور بیسیوں ٹیکس جو سابق فرمانرواؤں اور عمال حکومت نے ایجاد کیے تھے، یکسر معاف کر دیے[۳]، خشکی اور سمندر کے راستوں کے کھولنے کی ہدایت کی اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں[۴]

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں جن کے نتائج بہت دور رس تھے، ساری مملکت کے لیے یکساں پیمانے مقرر کیے جس میں فرق نہیں ہو سکتا تھا[۵]۔ حکام و عمال سلطنت کو تجارت کی ممانعت کی[۶]، بیگار کو قانوناً ممنوع قرار دیا[۷]، سلطنت کی زمین کا خاصا رقبہ امراء، شاہی خاندان کے افراد اور حکام نے اپنی شکارگاہ یا چراگاہ کے لیے گھیر کر بیکار بنا رکھا تھا حکم دیا کہ وہ عوام کی ملکیت ہو[۸]، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کی اور فرمایا کہ اگر کبھی وہ تحفہ تھا تو اب وہ رشوت کے سوا کچھ نہیں ہو[۹]، حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے تک پہونچنے اور شکایات پہونچانے کے پورے مواقع اور سہولتیں مہیا کریں[۱۰]۔ حج کے موقع پر اعلان ہوتا تھا کہ جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی نیک مشورہ دے گا اس کو سو سے لے کر تین سو دینار تک انعام ملے گا[۱۱]۔

اعمال و اخلاق کی طرف توجہ اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کرنے کی نہ فرصت تھی نہ اہلیت، نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے، ان کے اخلاق و رجحانات کی نگرانی کرے اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء و محدثین کا سمجھا جاتا تھا، عمر بن عبدالعزیز نے اس دوئی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنی میں "خلیفہ" ثابت کیا، انھوں نے زمام خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عمال حکومت اور امراء اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خط اور فرمان لکھے جو انتظامی سے زیادہ دینی و اخلاقی ہیں، اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ و نصیحت کی روح ہو، ایک خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی، (عہد نبوت و خلافت) اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہو اور اسلامی نظام مالیات اور طرز حکومت کی تشریح کی ہو[۱۲]، ان خطوط میں وہ امراء اجناد (فوجی افسروں) کو وقت پر نمازیں پڑھنے اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں[۱۳]، عمال کو تقویٰ و اتباع شریعت کی وصیت فرماتے ہیں[۱۴]، اپنے اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں، اور اسی کو

---

۱ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۱۲۶ ۲ ایضاً ص۹۹ ۳ ایضاً ص۹۹ و ص۱۰۲ ۴ ایضاً ص۹۸ ۵ ایضاً ص۹۹، ۶ ایضاً ص۹۹، ۷ ایضاً ص۱۰۰ ۸ ایضاً ص۹۷، ۹ ایضاً ص۱۳۲ ۱۰ ایضاً ص... ۱۱ ایضاً ص۱۴۱، ۱۲ ایضاً ص۶۹، ۱۳ ایضاً ص۶۹ ۱۴ ایضاً ص۹۲۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں[۱] ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہوجانے کے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا وبال پڑتا ہو[۲] عمال سلطنت کو سزا و عقوبت میں اعتدال و احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اسلام کے قانون تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں[۳] پھر سلطنت کی عمومی شہری خرابیوں اور بداخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، نوحہ گری اور جنازہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں[۴] قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی مخالفت کرتے ہیں[۵] نبیذ کے استعمال میں بڑی بے احتیاطی شروع ہوگئی تھی اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور شراب تک پہونچ گئے تھے جس سے مختلف قسم کی بداخلاقیاں پیدا ہو رہی تھیں اس کی تحدید و تشریح کرتے ہیں[۶]

تدوین علوم اور احیائے سنن اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم کی تدوین اور سنتوں کے احیاء کی طرف بھی توجہ کی، ابوبکر بن حزم جو ایک بڑے عالم تھے اُن کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا۔

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب العلماء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس لیے کہ مجھے اندیشہ ہو کہ علماء رخصت ہوجائیں اور علم مٹ جائے۔

انھوں نے تعیین کے ساتھ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرۂ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ جلد اسکو قلمبند کرلیا جائے پھر صرف ابوبکر بن حزم پر اکتفا نہیں کی بلکہ عمال سلطنت اور مشاہیر علماء کو بالعموم اس ضرورت[۷] کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ انظروا الی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرو) اسی کے ساتھ علماء کے وظائف مقرر کیے کہ وہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کرسکیں[۸]

وہ خود بڑے عالم تھے، انھوں نے بنفس نفیس فرائض و سنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا جس میں فرماتے ہیں کہ "اسلام کے کچھ حدود و قوانین و سنن ہیں، جو ان پر عمل کرے گا اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی اور جو عمل نہیں کرے گا اُس کا ایمان نامکمل رہ جائے گا، اگر زندگی نے وفا کی تو میں تمھیں اس کی تعلیم دوں گا، اور تمھیں ان پر چلاؤں گا، اگر اس سے پہلے میرا وقت آگیا تو میں تمھارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا حریص بھی نہیں ہوں"[۹]

---

[۱] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۱۳۵، [۲] ص۱۶۰، [۳] ص۸۰، [۴] ایضاً .... [۵] ص۱۰۳، [۶] ایضاً ص۱۰۲

[۷] ایضاً ص۱۰۲، [۸] تاریخ اصبہان (ابونعیم)، [۹] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۱۶۷، [۱۰] صحیح بخاری کتاب الایمان باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس۔

ان کی اصلاحات کے اثرات اور ردعمل

عمر بن عبدالعزیز کی مالی اصلاحات اور بندشوں اور نظام حکومت میں شرعی و اخلاقی پابندیوں سے بجائے اس کے کہ حکومت کو مالی خسارہ اور شہریوں کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ملک میں خوش حالی عام ہوگئی اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈھے سے نہیں ملتا تھا، یحییٰ ابن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز نے افریقہ میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کیے جن کو وہ رقم دی جائے، تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا جس کو زکوٰۃ دی جا سکے، عمر بن عبدالعزیز نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کیے اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا[۱]، ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدت خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لے کر آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دیدیا جائے لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا، عمر کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہوگئے اور زکوٰۃ کا مستحق نہیں رہا[۲]۔

ان ظاہری برکات کے علاوہ (جو صحیح اسلامی حکومت کا ثانوی نتیجہ ہیں) بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے رجحانات بدلنے لگے اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی، ان کے معاصر کہتے ہیں کہ ہم جب ولید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے تو عمارتوں اور طرز تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لیے کہ ولید کا یہی اصلی ذوق تھا، اور اس کا تمام اہل مملکت پر اثر پڑ رہا تھا، سلیمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوع سخن یہی تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں نوافل و طاعات کا ذکر و مذاکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے، تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے، تم قرآن کب ختم کروگے، اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو[۳]۔

انکی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جد وجہد کی روح اور قوت محرکہ، ان کا قوی ایمان آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انھوں نے جو کچھ کیا خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقت ور حکمراں کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر اس طرز عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا تو وہ ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

---

[۱] سیرت عمر بن عبدالعزیز صفحہ ۵۹ [۲] ایضاً صفحہ ۱۲۱ [۳] تاریخ طبری واقعات سنہ ۹۶ھ

انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم (الانعام ع ۲)
اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انھوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی، کہ اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے، جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی، اب میں اس مقام پر پہونچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشتاق و متمنی ہے۔[۱]

ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی، اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمھیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی اور تمھیں اللہ نے جنت نصیب کی تو تمھارا کیا نقصان ہوا؟ یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگیٹھی رکھی تھی وہ بجھ گئی،[۲] یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبد العزیز اور حسن بصری کے لیے پیدا کی گئیں ہیں۔[۳]

عمر بن عبد العزیز کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبد العزیز کو اپنے کسی پیشرو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی امیہ جن کو اپنے اس فرد خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمرؓ کے گھرانہ میں رشتہ کرنے پر بہت پچھتاتے رہتے تھے، زیادہ دن اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیۂ خداوندی سے محروم کر دیا، سیدنا عمر بن عبد العزیز کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے دنیا سے رخصت ہوئے، اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے اُن کو زہر دیا،[۴]

اُمت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

عمر بن عبد العزیز کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا جیسا اُن سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے پنجے مضبوطی کے ساتھ گاڑ لیے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنا گیا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس ناپسندیدہ وقفہ" کی تلافی کی پوری کوشش کی اور حکومت کو اسی ڈگر پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک چلی تھی

اب صورت حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "مترفین سابقین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق

---

[۱] سیرت عمر بن عبد العزیز ص۶۱ [۲] ایضاً ص۱۰۹ [۳] صفۃ الصفوہ (ابن جوزی) ج ۳ ص۱۵۶ [۴] ابن سعد، ابن الاثیر، ابن الجوزی

داسماں پیدا ہونے شروع ہوگیے تھے، سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہوگیا تھا، ایمان وعمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ، اس کی قوت کا راز، اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا، اس وقت خطرہ میں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہوجائے، قلوب میں سردی وافسردگی، ایمان میں کمزوری، اور تعلق باللہ میں اضمحلال بڑی شدت وسرعت سے پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا، اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل وبے تعلق تھی، بلکہ اس کا وجود اور اس کے نمائندے اس مقصد کے لیے حقیقی خطرہ بنے ہوئے تھے، اور اپنی ذاتی سیرت وکردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک وداعی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان، اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق، اور انابت وعبودیت کی جو کیفیات پیدا کی تھیں اور جو ایک نبی ہی پیدا کرسکتا ہو. وہ روبتنزل تھیں، یہ وہ کمی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جاسکتی تھی، اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد (پچھلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہی) بڑی مشکل سے واپس لائی جاسکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی وسیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دیدی جاتی تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور، آخرت فراموش، اور خالص مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو ہضم نہ کرلے اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھارے میں پڑ کر ضائع نہ ہوجائیں، آپ نے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف صاف کہا تھا

ما الفقر اخشی علیکم، ولکن	مجھے تمہارے بارہ میں فقر وافلاس کا خطرہ نہیں
اخشی علیکم ان تُبسطَ الدنیا	مجھے جو کچھ خطرہ ہو وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر بھی
علیکم کما بسطت علی من کان	کشائش وفراخی ہو جیسی تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی
قبلکم فتنبا فسوھا کما تنا فسوھا	اور تم بھی انہیں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کردو اور
وتھلککم کما اھلکتہم [1]	تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کرنے جیسے اگلوں کو ہلاک کیا۔

تابعین کی دعوت ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبان نبوت نے اظہار کیا تھا جلد پیش آگیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ کے کچھ مخلص وسرفروش بندے میدان میں آئے جنھوں نے اپنی قوت ایمانی، سوز دروں، صحبت وتربیت، وعظ ونصیحت اور دعوت وتلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان

[1] صحیح مسلم کتاب الزہد ص ۴۰۷ (مطبع علیمی)

میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا اور خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کر دیا، انھوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا جو اس کے نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا جس میں وہ محض ایک بے سیرت، بے روح، اور بے یقین قوم بن کر رہ جائے۔ اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے فضلاء تابعین کی ایک سربرآوردہ جماعت تھی جن میں سعید بن جبیر، محمد بن سیرین اور شعبی خاص طور سے ممتاز تھے۔

حسن بصریؒ

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصریؒ ہیں جو ۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد یسار مشہور صحابی حضرت زید بن ثابت کے آزاد کردہ غلام تھے اور خود انھوں نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

حسن بصری کی شخصیت اور انکی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصریؒ میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرما دی تھیں جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لیے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے، جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابۂ کرام کا انھوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرت سے وہ پورے طور پر باخبر تھے اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے، وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے، وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، جب آخرت کا بیان کرتے تھے یا صحابۂ کرام کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں، حجاج بن یوسف کا ساز باں آور اور قادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گزرا، لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے، مشہور امام لغت ونحو ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا، اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے[1] وسعت علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا جو اس سے پہلے نہیں سنی[2] ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا

کان من دراری النجوم علما وتقوی	وہ اپنے علم و تقویٰ، زہد و ورع، استغناء و عالی ہمتی
وزھدا وورعا، وعفة ورقة، وتفقھا	لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درخشاں

[1] دائرۃ المعارف للبستانی ج، ص۲۴۴ [2] ایضاً ج، ص۲۴۴

ومعرفة، يجمع مجلسه ضروبا من الناس هذا يأخذ عنه الحديث، وهذا يلقن منه التاويل، وهذا يسمع منه الحلال والحرام، وهذا يحكي له الفتيا، وهذا يتعلم الحكم والقضاء، وهذا يسمع الوعظ وهو في جميع ذلك كالبحر العجاج تدفقا وكالسراج الوهاج تالقا، ولا تنس مواقفه ومشاهده في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر عند الامراء واشباه الأمراء، بالكلام الفصل واللفظ الجزل [1]

شارہ تھے، ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے تھے اور ہر ایک فیض پاتا تھا، ایک شخص حدیث حاصل کر رہا ہو ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہو، ایک فقہ کا درس لے رہا ہو، ایک فتویٰ پوچھ رہا ہو، کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا ہو، کوئی وعظ سن رہا ہو، اور وہ ایک بحر زخار ہیں جو موجیں لے رہا ہو اور ایک روشن چراغ ہیں جو مجلس کو پر نور کر رہا ہو، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں ان کے کارنامے، اور حکام و امراء کے روبرو پوری فصاحت اور پرشکوہ الفاظ میں اظہار حق کے واقعات بھلانے کی چیز نہیں۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحب قال اور صاحب کمال نہ تھے بلکہ صاحب دل اور صاحب حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لیے دل پر اثر کرتا تھا جس وقت وہ تقریر کرتے تھے خود سراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بصرہ و کوفہ میں بڑے بڑے صاحب علم اور صاحب درس تھے مگر ان کے حلقۂ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو "کلام نبوت" سے بڑی مناسبت تھی، امام غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہو کہ "اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرز کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی۔ اسی طرح ان کا طرز زندگی صحابہ کرام کے طرز زندگی سے بہت مشابہ تھا، [2]

اُن کے ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے، اور ان کو اُمت محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ اُمت محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہیئے ان میں حسن بصری بھی ہیں۔

مکہ معظمہ ہمیشہ سے عالم اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحب کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہل مکہ بھی حسن بصری کا علم دیکھ کر اور ان کی تقریریں سُن کر ششدر رہ گیے اور کہنے لگے کہ ہم نے اس جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ [3]

انکی حق گوئی و بیباکی | اُن کے کمالات، فصاحت و بلاغت تبحر علمی اور تقریر و تاثیر ہی تک محدود نہ تھے،

[1] ابوحیان التوحیدی نے اس کو ثابت بن قرہ سے نقل کیا ہو [2] احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۴۶ [3] دائرۃ المعارف للبستانی ج ۷ ص ۴۴

بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفۂ وقت یزید بن عبدالملک پر برملا تنقید کی، ایک موقع پر برسر درس کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (یزید بن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ "اُس کا ساتھ دو نہ اِس کا ساتھ دو" ایک شامی نے کہا، اور نہ امیرالمومنین کا؟ یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا کہ ہاں نہ امیرالمومنین کا! ہاں نہ امیرالمومنین کا![1] حجاج کی تلوار اور سفاکی مشہور ہے مگر حسن کی زبان ان کے زمانہ میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے ضمیر اور عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کے سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہو سکے تھے اور ان میں حقیقی ایمان اور ادخلوا فی السلم کافۃ (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی شان پیدا نہیں ہوئی تھی خود مسلمانوں کی نئی نسل میں (جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی) بکثرت ایسے افراد تھے جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکام الٰہی کے سامنے "انقیاد و تسلیم" کی خو نہیں پیدا ہوئی تھی، ان میں سے خاصی تعداد میں (بالخصوص حکومت کے طبقہ اور امراء و اغنیاء میں) ایسے لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و اعمال اور ان کے ذہن و مزاج کا پرتو نظر آتا تھا یہی لوگ بالعموم زندگی پر حاوی تھے، درباروں میں، حکومت میں، کلیدی جگہوں پر، فوج میں، بازاروں میں انھیں کا غلبہ تھا، انھیں کا طرز زندگی سوسائٹی میں "فیشن" کی حیثیت رکھتا تھا۔

ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ نفاق ایک وقتی و مقامی بیماری تھی جو عہد رسالت میں مدینۂ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی، اس لیے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی، اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لیے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا کوئی موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد و مذبذب رہے اور کسی ایک کا وفادار اور مخلص رفیق نہ بن سکے، اب یا تو کھلا ہوا کفر ہے، یا علانیہ اسلام، ان دونوں کے درمیان تذبذب کی کوئی وجہ نہیں، یہ غلط فہمی اچھے خاصے سنجیدہ طبقہ میں بھی پھیل گئی تھی تفسیر و تاریخ میں اس کے اثرات ملتے ہیں۔

ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے، اس بیماری کے پیدا ہونے کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور

---

[1] طبقات ابن سعد جز ۷، ص ۱۱۹ - ۱۱۹

ہوں، اور ان میں کش مکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا، لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے، یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دستبردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں، اس لیے وہ ساری عمر اس دو عملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے، اسکی نفسی کیفیات، اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیاوی انہماک آخرت فراموشی اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی، اور کمزوروں اور غریبوں پر دست درازی "منافقین اولین" کی یاد تازہ کرتی ہے۔

"نفاق" و منافقین کی نشاندہی

حضرت حسن بصری کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے، اور منافقین نہ صرف موجود ہیں بلکہ زندگی پر اثر انداز اور سلطنت میں دخیل ہیں[۱]، اور انھیں سے شہروں کی چہل پہل ہے، کسی نے ان سے کہا کہ کیا اس زمانہ میں بھی "نفاق" پایا جاتا ہے؟ فرمایا لو خرجوا من ازقة البصرة لاستوحشتم فیها[۲] اگر منافقین بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو تمھارا شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے، یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے اور اسلام نے ان کے دل میں گھر نہیں کیا ہے یا وہ اپنے اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت سے آراستہ نہیں، ایک دوسرے موقع پر انھوں نے فرمایا، یا سبحان الله ما لقيت هذه الامة من منافق قهرها واستاثر عليها[۳] (خدا کی شان ہے اس امت پر کیسے کیسے منافق غالب آگئے ہیں جو پرلے درجہ کے خود غرض ہیں) یعنی حکومت میں وہ عنصر موجود ہے جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں اور جس کو صرف اپنے اغراض اور منافع سے دلچسپی ہے۔

حسن بصری کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا

---

[۱] متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود رہا ہے اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، ان کے نزدیک نفاق کی دو قسمیں ہیں، نفاق اعتقادی اور نفاق عمل و اخلاق، نفاق اعتقادی کا قطعی علم زمانہ رسالت کے بعد انقطاع وحی کی وجہ سے دشوار ہے لیکن نفاق عمل اور نفاق اخلاق کثیر الوقوع ہے وہ اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس وقت نفاق بکثرت موجود ہے۔ فوز الکبیر میں ارشاد فرماتے ہیں، ——— "اگر خواہی کہ از منافقان نمونہ بہ بینی رو در مجلس امراء و مصاحبان ایشاں ز ا ببین کہ مرضی ایشاں را بر مرضی شارع ترجیح می دہند در انصاف ہیچ فرق نیست درمیان آنانکہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بواسطہ شنیدہ نفاق درزیدند و درمیاں آنانکہ الحال پیدا شدہ اند و بطریق یقین حکم شارع معلوم کردہ اند بعد ازاں برایثار خلاف آں اقدام می نمایند وعلی ہذا القیاس جماعۂ از معقولیاں کہ شکوک و شبہات بسیار بخاطر دارند و معاد را نسیاً منسیاً ساختہ اند نمونۂ آں گروہ اند" صفحہ ۱۲ (مطبع محمدی)

[۲] "صفۃ النفاق و ذم المنافقین" مؤلفہ محدث ابو بکر فریابی صفحہ ۶ [۳] ایضاً صفحہ ۵

اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح حسن بصری کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لیے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں سے اس بگڑے ہوئے معاشرہ پر زد پڑتی تھی، وہ "نفاق" کی حقیقت بیان کرتے تھے اور نفاق ایک مرض تھا جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان کرتے تھے اور یہ اوصاف و اخلاق بہت سے ان لوگوں میں پائے جاتے تھے جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے، اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کی بجران کی مذمت کرتے تھے اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے اور ان حقیقتوں کو مستحضر کراتے تھے اور مترفین و غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی، غرض ان کی دعوت، ان کے مواعظ اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لیے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے، وہ اپنی تقریروں اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے اور اپنی صحبت و عمل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت و اصلاح میں گزاری، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے حلاوت ایمان اور حقیقت اسلام نصیب ہوئی، عوام بن حوشب کہتے ہیں کہ حسن نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے[1]

حسن بصری کی وفات اور اُن کی مقبولیت

اس خلوص، دینی انہماک، اور علمی و روحانی کمالات، کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کا گرویدہ تھا، ۱۱۰ھ میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے[2] اُن کے جنازہ کی مشایعت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی۔[3]

حسن بصری کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے، "دعوت الی اللہ، دعوت آخرت، اور دعوت ایمان و عمل" کے تسلسل کو جاری رکھا، اور درمیان میں کوئی خلا آنے نہیں دیا، حسن بصری کی وفات کے بائیس[22] برس بعد خلافت امویہ کا خاتمہ اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بجائے بغداد دار الخلافہ اور پورے مشرق کا مرکز توجہ بن گیا۔

---

[1] دائرۃ المعارف للبستانی ج۔ ص ۴۴ [2] بصرہ اس وقت عراق کا سب سے بڑا شہر تھا اور خلافت کے پایۂ تخت دمشق کے بعد اسلامی ممالک میں دوسرے درجہ کا شہر شمار ہوتا تھا۔
[3] ابن خلکان (حسن بصری)

انقلاب حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت وتذکیر کے تسلسل کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوشش بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے اور اس اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے جو امویوں اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم کر رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہوگئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک اس وقت تک موثر نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ اس کو شرافت نسب اور علو خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت وحمایت نہ ہو اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافت اموی اور خلافت عباسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا ان کا تعلق اہل بیت سے تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا، لیکن وہ اُمّت کے دینی رجحان کے نمائندہ تھے اور ان کو مسلمانوں کے دینی عنصر اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور تائید حاصل تھی۔

واقعۂ کربلا کے بعد بھی خاندان نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی، سیدنا حسین (علیہ وعلی آبائہ السلام) کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن الحسین نے ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا اور ۱۲۲ھ میں شہید ومصلوب ہوئے، ان کے بعد بنی حسنؓ میں سے حضرت محمد ذو النفس الزکیہ (بن عبداللہ المحض بن الحسن المثنیٰ بن سیدنا حسن بن علیؓ) نے مدینۂ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا، امام ابوحنیفہ اور امام مالک[1] ان کی تائید وحمایت میں تھے، امام ابوحنیفہ نے برملا ان کی تائید کی اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی[2] اول الذکر رمضان ۱۴۵ھ میں مدینۂ طیبہ میں اور آخر الذکر ذوالقعدہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے، بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انھوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلان حق کی ایک نظیر قائم کردی، اگرچہ عملاً وہ کامیاب نہیں ہوسکے، لیکن ان کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر، قربانی اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، اسلامی تاریخ کی آبرو انھیں جواں مردوں سے قائم ہے جنھوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور صحیح مقصد کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا،

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ،

خلافت عباسیہ اور اس کے اثرات

خلافت عباسیہ، خلافت امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی

---

[1] امام مالک نے اہل مدینہ کو محمد ذو النفس الزکیہ کی رفاقت واطاعت کا فتویٰ دیا اگرچہ وہ منصور کی بیعت کرچکے ہوں (تاریخ الکامل ج ۵ صفحہ ۲۱۳) [2] مورخین کا خیال ہے کہ امام ابوحنیفہ کے خلاف منصور نے جو سخت کاروائی کی اس کی وجہ ان کا عہدۂ قضا سے انکار نہ تھا بلکہ دراصل محمد وابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا۔

دنیاداری کی روح، وہی شخصی وموروثی سلطنت کا نظام وآئین اور وہی اس کی خرابیاں اور بُرے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش وعشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں عربی روح کارفرما تھی، اس کی خرابیاں اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہوگئی تھی اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض وعیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہوگیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا، اُمطری حیث شئت فسیأتینی خراجُک جہاں تیرا جی چاہے جاکر برس جا، تیری پیداوار کا خراج بہرحال میرے ہی پاس آئے گا، ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنت عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں سات ہزار پانچ سو قنطار (سات کروڑ ڈیڑھ لاکھ ۷۰۱۵۰۰۰۰ دینار) سے زیادہ تھی،[۱] یعنی اکتیس کرور پچاس لاکھ روپیہ (۳۱۵۰۰۰۰۰۰) سالانہ سے زائد، جو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی مالیت تھی، مامون کے زمانہ میں اس میں کافی اضافہ ہوا، اس کثیر آمدنی نیز سب سے بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامان عیش وعشرت، اور ساری دنیا کے اہلِ کمال، صنّاع ومغنی، غلام باندیاں، مصاحب وشعراء اور خوش باش وخوش فکر سمٹ کر بغداد میں آگئے تھے، دولت کی فراوانی، عجمیوں کے اختلاط سے تمدن کی ساری خرابیاں اور متمدن زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دار السّلام یا مرکز اسلام میں شروع ہوگئی تھیں،[۲] دولت کی بہتات، مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن وتعیش کا اندازہ کرنے کے لیے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہو، مورخ لکھتا ہے۔

"مامون مع خاندان شاہی وارکان دولت وکل فوج وتمام افسران ملکی وخدام حسن بن سہل (وزیر اعظم جس کی لڑکی سے مامون کی شادی ہورہی تھی) کا مہمان ہوا، اور برابر انیس[19] دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلے سے مہمان داری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز وں کے لیے امیرانہ زندگی بسر کرلی، خاندان ہاشم وافسران فوج اور تمام عہدہ داران سلطنت پر مشک وعنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، املاک، خلعت، اسپ خاصہ، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا کہ جس کے حصہ میں جو گولی آئے اس میں جو کچھ لکھا ہو اسی وقت وکیل المخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر مشک وعنبر کی گولیاں اور درہم ودینار نثار

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون صد ۱۵۱ [۲] تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو کتاب الحیوان (جاحظ) ج ۳ ص ۹۱ وج ۵ ص ۱۱۵ ومجلدات الاغانی

کیے گیے۔ مامون کے لیے ایک نہایت مکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بُنا گیا تھا، اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے قدم پر نثار کیے گیے جو زریں فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے[1]

بغداد کے داعی الی اللہ لیکن اسی پرعیش وعشرت بغداد میں کچھ نفوس قدسیہ تھے جو دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس، علوم دینیہ کی نشر و اشاعت اور تعلیم وتعلم میں ہمہ تن منہمک تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی ساری دلچسپیوں سے اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا، وہ اس امت کی روح اور تعلق باللہ کے سرمایہ اور اسلامی زندگی کے سرچشمہ (قرآن وحدیث) کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکی، مادیت کے اس پرتلاطم سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے جہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے، انھوں نے بغداد میں مادی وپرعشرت زندگی کے پہلو بپہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کر رکھی تھی جو اپنی طاقت اور وسعت میں مادی وسیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفاء اور امراء و وزراء کا قبضہ جسموں پر تھا تو ان کی حکومت لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر تھی، اور جہاں کہیں ان دونوں میں مقابلہ پیش آتا تو اکثر اوقات انھیں کا غلبہ ثابت ہوتا، سلطان وقت ہارون رشید اپنے شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ رقہ میں مقیم تھا کہ مشہور امام حدیث اور مرد صالح حضرت عبداللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لیے نکل پڑی خلیفہ تنہا رہ گیا، ازدحام کا یہ حال تھا کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کنیز بالاخانہ سے دیکھ رہی تھی، اس نے پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہو؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہو، اس نے کہا کہ یہ ہو بادشاہی، نہ کہ ہارون کی بادشاہی کہ بغیر پولیس اور اہل کاروں کے لوگ جمع ہی نہیں ہوتے[2]

یہ ایمانی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش وعشرت اور مال و دولت کا گہوارہ تھا اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمٹ کر یہاں جمع ہو گیے تھے، اسی طرح علم و عمل، صلاح وتقوی اور دعوت و اصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں اس فن کے امام، اور اس فن کے طالب پورے عالم اسلام سے آکر جمع ہو گیے تھے، طبقات وتراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صلحاء و علماء کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا اور قال اللہ وقال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، یہ دینی رونق اور عین مرکز حکومت

---

[1] المامون (مولانا شبلی نعمانی مرحوم) ص۱۵ بحوالۂ ابن خلدون، ابو الفداء، ابن الاثیر، ابن خلکان

[2] ابن خلکان (عبداللہ بن مبارک)

میں دین واصلاح کی یہ دعوت انھیں مجاہد بندوں کے دم سے تھی جنھوں نے اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اس سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، جنید بغدادی، معروف کرخی اور بشر حافی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، ان حضرات کے اعمال و اخلاق، سچی خدا ترسی، بے لوث زاہدانہ زندگی، مخلوق سے استغناء، ایثار و بے نفسی، بے غرض خدمت خلق، اور ایمانی کیفیات غیر مسلم آبادی تک پر اثر ڈالتی تھیں، ان کی ذات سے اسلام کا اخلاقی وقار قائم تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سن کر اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بکثرت یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابئی مسلمان ہوتے تھے[1]

امّت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی روح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت، اور معاملات و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اصول و آئین کے مطابق ہوں گے، اس وقت دو براعظم (ایشیا و افریقہ) اسلام کی نگرانی و تولیت میں تھے، اسلام کی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی وسیع اور سب سے طویل و عریض سلطنت تھی، جو دنیا کے متمدن ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت جزیہ و خراج، محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل در پیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جاسکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گزرا جاسکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جاسکتا تھا، اگر قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی، جس کا نتیجہ وہ ہوتا جو اِس وقت کی نام نہاد "اسلامی سلطنتوں" کا ہو، علماء کی ذراسی غفلت اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی، اس امت کو ہزاروں برس کے لیے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی۔

یک لحظہ غافل بودہ ام صد سالہ راہم دور شد

اسوقت دو مسئلوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کر لیا جائے جو محدثین کے سینوں اور منتشر سفینوں میں تھا،[2] یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) حلیۃ الاولیاء (ابونعیم) اور تاریخ ابن خلکان، [2] حدیث کے جمع و تدوین کا کام عہد تابعین سے شروع ہو چکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی توجہ و دلچسپی کا حال گزر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (م ۱۲۴) ابن جریج مکی (۱۵۰) ابن اسحٰق (۱۵۱) سعید بن ابی عروبہ مدنی (۱۵۶) معمر یمنی (۱۵۳) ربیع بن صبیح (۱۶۰) وغیرہ کے مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اسکو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل پر انجام دیا جائے۔

ماخذ تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچہ کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے، وہ زمانۂ نبوت کے تیئیس برسوں کا ایک طرح کا روزنامچہ ہے جو کسی پیغمبر کی امت کو حاصل نہیں، اس کا ضائع ہوجانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال، صحیح روحانیت، زہد و تقوی، اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہل دعوت و اہل عزیمت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہوسکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اصول و کلیات موجود ہیں، اور ان سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بیحد متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے کے لیے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لیے ان کی ترجمانی و تشریح کے لیے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی،

تدوین حدیث

پہلی ضرورت کے لیے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہور اسلام کے لیے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا جو اپنی راست گفتاری امانت اور قوت حفظ میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابۂ کرام نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ سنا اس کو محفوظ کرلیا اور بے کم و کاست دوسری نسل کو پہونچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے پیغمبروں کے بت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں اسلام میں بت تراشی اور صورت گری حرام ہے، مگر صحابۂ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و عادات کا ایسا جیتا جاگتا مرقع پیش کردیا جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت و اشاعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے صدہا کی تعداد میں ایسے بلند حوصلہ، تازہ دم، پرجوش طالب علم مہیا کردیئے جو قوت حافظہ اور ذکاوت میں بے نظیر تھے ان کا سیلاب عجم کے ملکوں سے امنڈ آیا، اللہ تعالےٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا تھا کہ ان کے لیے چین سے بیٹھنا مشکل ہوگیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کے حاصل کرنے اور اپنے سینے اور سفینے میں محفوظ کرنے کی دھن تھی، علوم کی تاریخ اور پیغمبروں کی امتوں میں اس عشق اور دھن اور پھر اس احتیاط و امانت کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لیے اسلامی دنیا کا کونہ کونہ چھان ڈالا، اس بادیہ پیمائی کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے ۱۴ برس کے سن میں سیاحت شروع کردی تھی، بخارا سے لیکر مصر تک سارے ممالک انھوں نے کھنگال ڈالے، امام ابوحاتم رازی کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ مسافت پیادہ پا طے کی پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا۔

محدث اندلس ابن حیون نے حدیث اندلس، عراق، حجاز اور یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی، گویا طنجہ سے لے کر سویز تک سارا بر اعظم افریقہ اور پھر بحر احمر طے کیا، بہت سے محدثین کا سفرنامہ تین تین براعظموں ایشیا افریقہ یورپ (اسپین) پر مشتمل ہوگا[۱]۔ اس وقت کی متمدن و معروف دنیا کے مغرب بعید (اندلس) سے مشرق بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر پھرنا تو معمولی بات تھی۔

فن اسماء الرجال

ان مخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کی بلکہ درمیانی واسطوں کی بھی تحقیق کی اور ان تمام راویوں کے نام و نشان، تاریخ زندگی، اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا جن کے توسط سے یہ روایات ان کو پہونچی تھیں، اس طرح جس ذات گرامی کے متعلق در فضائل ذکر کرنے کا وعدہ اور اطلاع تھی، اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آگئی، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اہمیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس ہستی کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جز کے راوی، اور اس سلسلۂ روایت کے ایک ناقل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم "اسماء الرجال" کا وجود میں آگیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق، اور احساس ذمہ داری کی روشن مثال ہے۔ اور اس امت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابۃ فی احوال الصحابۃ (حافظ ابن حجرؒ) کے انگریزی مقدمہ[۲] میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

> "کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہو"[۳]

محدثین کی احتیاط و امانت

محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات جمع و محفوظ کر دیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی اور ان کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقوی، علم و حافظہ کے متعلق ان کے معاصرین کے بیانات اور ہر قسم کے معلومات یکجا کر دیئے اور ان کے بارہ میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا خواہ وہ ان کے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

"راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ

---

[۱] یہ مثالیں "علمائے سلف" (مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم) سے ماخوذ ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب کا عنوان "سفر"۔ [۲] مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۵۳ء تا سنہ ۱۸۶۴ء [۳] خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی

واقعات آج اسلام کے مفاخر میں ہیں، راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے جن کی تلوارون کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی اور ان کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں انکو مل سکتا تھا، امام وکیع بڑے محدث تھے لیکن اُن کے باپ سرکاری خزانچی تھے اس بنا پر وہ خود اُن سے جب روایت کرتے تو انکی تائید میں کسی دوسرے راوی کو ضرور ملا لیتے یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے[۱] مسعودی ایک محدث ہیں ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کردی[۲] یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے صرف اس معاوضہ میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (عدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں یعنی اسکے متعلق خاموش رہیں، انھوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا،[۳] کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہو؟[۴]

قوت حافظہ اور استحضار

محدثین کی یہ جماعت ایران و ترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہوجاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوت حفظ کے محیر العقول نمونے پیش کرتا تھا جو ضعف و کمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں، لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں بہم پہونچاتی ہو اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرت کار، مناسبت تام اور اپنے موضوع سے عشق و شغف ایسا ملکہ پیدا کردیتا ہو اور انتقال ذہنی کے ایسے نمونے ظاہر ہوتے ہیں جو غیر متعلق اشخاص کے لیے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علماء بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگادیا اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے امام بخاری جب مجلس میں آئے تو ایک

---

۱ تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۱۳۰ ۲ ایضاً ج ۶ ص ۲۱۱ ۳ ایضاً ج ۶ ص ۲۳۱ ۴ خطبات مدراس ص ۵۹-۶۰

ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں اور ان کی رائے دریافت کی وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں اہل علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنالیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے اور انکی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کردی، اور جس سند کا جو متن تھا اور جس متن کی جو سند تھی وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعت نظر، حاضر دماغی، اور حافظہ پر انگشت بدنداں رہ گئے[1]

مجالس درس میں سامعین کا ہجوم

اس ذہین طبقہ کی توجہ وانہماک اور حدیث کی ضرورت کے احساس نے حدیث کا ایسا عام ذوق، اسکے درس وروایت کی مجلسوں میں شرکت کا شوق، اور آئمہ فن سے تلمذ واستفادہ کی حرص پیدا کردی تھی کہ محدثین کی مجالس درس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی، اور بادشاہوں کے دربار سے زیادہ ان میں سکون اور نظام ہوتا" یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا تو اس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا، امام عاصم بن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چبوترے پر بیٹھتے تھے، خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنا ایک معتمد اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لیے بھیجا، تو ایک لاکھ چوبیس ہزار حاضرین کی تعداد کا اندازہ تھا، احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رحبہ غسان نامی مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا، سات مستملی کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہونچاتا تھا اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے، دواتوں کا شمار کیا گیا تو کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئیں، جو لوگ لکھتے نہ تھے صرف سماعاً شریک تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں۔ شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو تین سو سولہ ۳۱۶ مستملی ان کی مجلس میں حاضر تھے اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار، فریابی کی مجلس میں دس ہزار آدمی ان کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے جو دوات قلم لیکر بیٹھتے[2] فربری کی روایت ہو کہ امام بخاری کی جامع صحیح کو ان سے نوے ۹۰ ہزار آدمیوں نے سنا[3]

صحاح ستہ

یہ عمومی ذوق، انہماک، اور جذبہ مسابقت خالی از حکمت نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کا ایسا محفوظ ومستند سرمایہ جمع ہو گیا جو اس امت کی بہت بڑی ثروت، اور اصلاح وتجدید کا ایک بڑا طاقتور ذریعہ ہے اس سرمایہ میں امام بخاری کی صحیح، امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہو اس کو "متفق علیہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں جو حدیث کا اعلیٰ درجہ ہے)

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص۴۸۶ [2] علمائے سلف بحوالہ تذکرۃ الحفاظ وتاریخ ابن خلکان۔

[3] مقدمہ فتح الباری ص۴۹۲

سب سے ممتاز اور بلند پایہ ہیں، ان دونوں کے بعد امام مالکؒ کی موطا، امام ترمذی کی جامع، امام ابوداؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد، امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں، ابعد کی اصلاحی کوششوں اور تجدیدی کارناموں میں محدثین کرام کی ان ابتدائی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہو، آج بھی کوئی سنجیدہ اور وسیع اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس علمی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تدوین فقہ

اسی طرح فقہ کی تدوین، مسائل کا استنباط و استخراج، جزئیات و فتاوی کی ترتیب، اسلام کی ایسی عملی ضرورت تھی جسکو بالکل مؤخر نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہونچ گیا تھا، معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لیے بڑی اعلےٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ و روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمۂ اربعہ اور ان کی خصوصیات

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کار عظیم کے لیے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہو، اپنے تعلق باللہ، للہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبۂ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لیے وقف

۵؎ شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں صحیحین کے متعلق لکھتے ہیں اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علیٰ ان جمیع ما فیہما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وانہما متواتران الی مصنفیہما وانہ کل من یہون امرہما فہو مبتدع متبع غیر سبیل المومنین (ص ۱۰۶ ج ۱) یعنی محدثین کا اس امر پر اتفاق ہو کہ ان دونوں کتابوں میں جتنی متصل مرفوع روایات ہیں وہ یقینی طور پر صحیح ہیں، اور ان دونوں کتابوں کی نسبت اپنے مصنفین کی طرف تواتر سے ثابت ہو، اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی تحقیر کرتا ہو وہ مبتدع اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر چلنے والا ہو۔

کر دی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابوحنیفہ کو دوبار عہدۂ قضا پیش کیا گیا اور انھوں نے انکار کیا، یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ[1] کے اظہار میں کوڑے کھلئے اور ان کے شانے اُتر گئے، امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا اور اپنی صحت قربان کر دی، امام احمد نے تنِ تنہا حکومت وقت کے رجحان اور اس کے "سرکاری مسلک" کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک اور اہل سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے، امام ابوحنیفہ نے تراسی ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کیے، جن میں سے اڑتیس ہزار عبادات سے تعلق رکھتے ہیں، اور پینتالیس ہزار معاملات سے[2] شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کیے ان کی تعداد چھ لاکھ ہے[3]، المدونہ میں جو امام مالک کے فتاوی کا مجموعہ ہے چھتیس ہزار مسائل ہیں، کتاب الام جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے سات ضخیم جلدوں میں ہے، ابوبکر خلال (م ۳۱۱) نے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کیے[4]

ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے ممتاز ملے جنھوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور اس کی تنقیح و ترتیب کا کام جاری رکھا، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف جیسا قانونی دماغ نظر آتا ہے جس نے ہارون رشید کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاۃ کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیے۔ اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب الخراج جیسی عالمانہ تصنیف کی، اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ اور مؤلف اور امام زفر جیسا صاحب قیاس نظر آتا ہے، جنھوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگائے، امام مالک کو عبداللہ بن وہب، ابن القاسم، اشہب، عبداللہ بن الحکم، یحییٰ بن یحییٰ اللیثی جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے، جن کی کوششوں سے مصر اور شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہو گیا، امام شافعی کو بویطی، مزنی اور ربیع جیسے محنتی اور ذہین شاگرد ملے، جنھوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کر دیا، امام احمد کی فقہ کو ابن قدامہ جیسا مصنف اور محقق حاصل ہوا جس نے المغنی جیسی

---

[1] مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کی طلاق کا کچھ اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لیے جو بیعت لی جاتی تھی اس میں یہ کہلایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔ اگر مجبور کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس حلف نامے میں کوئی طاقت اور تاثیر باقی نہیں رہ جاتی اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی اور اسکے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا [2] ضحی الاسلام بحوالہ مناقب ابی حنیفہ للمکی ص ۹۶ [3] سیرۃ النعمان (مولانا شبلی) بحوالہ قلائد عقود العقیان [4] اس کتاب کا نام الجامع لعلوم الامام احمد ہے، ابوبکر خلال کا مفصل حال شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۲ ص ۲۶۱ میں ملاحظہ ہو۔

عظیم الشان تصنیف کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

تدوین فقہ کا فائدہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمۂ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہوجانا اس دین کی زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہوگئی اور وہ اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی جس کی قومیں اپنے ابتدائی عہد ہی میں شکار ہوچکی ہیں، انھوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کردیں اور ایسے اصول مرتب کردیے جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل و مشکلات کے حل کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے اور عام اور معتدل زندگی کو باقاعدگی اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جاسکتا ہو۔

Registered No. A 353.

قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنے

Printed at:—NAMI PRESS, Lko.

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ
ہماری دعوت
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، اور دراصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔
فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین
"ادارۃ الفرقان"
مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

ہندستان اور پاکستان سے
سالانہ ——— صہ؍
فی کاپی ——— ۸؍

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

غیر ممالک سے
سالانہ ——— ۱۲ شلنگ
یعنی ہندستانی سکہ میں ہے؍

جلد (۲۰)

بابت ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۲ھ ہجری
مطابق ماہ مئی ۱۹۵۳ء عیسوی

نمبر (۸)

سرخ پنسل کا نشان اس بات کی علامت ہو کہ جناب کی مدت خریداری اس شمارے پر ختم ہوگئی ہے، لہٰذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماکر مشکور فرمائیے اگر ۱۰ر جون ۱۹۵۳ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا اور نہ کوئی اطلاع آئی تو اگلا پرچہ وی۔ پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا —— پاکستان کے حضرات اپنا چندہ منیجر صاحب (مکتبۂ اصلاح ۲۶ مال روڈ لاہور) کے پتہ پر ارسال فرمائیں، اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دیدیں، اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں —— دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں۔ والسلام

ناظم: الفرقان۔ لکھنؤ

پاکستان کے حضرات اپنے چندہ کے متعلق رسالہ کے صفحہ ۲ کے اعلان کو ضرور بغور ملاحظہ فرمالیں۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

اسلامی سال کا مبارک ترین مہینہ رمضان المبارک ہمیشہ کی طرح خیر و برکت کے خزانے لٹاتا ہوا ہمارے سروں پر سایہ فگن ہو رہا ہے، اس مہینے کو دین میں بہت اہم مقام حاصل ہے، اس میں جو عمل اہل ایمان پر فرض کیا گیا ہے وہ اُن پانچ ستونوں میں سے ایک ستون ہے جن پر دین کی پوری عمارت قائم ہے، ستون جب تک مستحکم رہیں گے عمارت میں کوئی بڑی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن اگر ان کے استحکام اور ان کی مضبوطی میں فرق آگیا تو عمارت میں شکست و ریخت شروع ہو جانا لازمی ہے، اور انھیں کمزور ستونوں پر اسے زیادہ دنوں تک روکے نہیں رکھا جا سکتا۔ آج جو ہم اپنی زندگیوں میں دیکھ رہے ہیں کہ دین قائم نہیں ہے اور معمولی معمولی دباؤ اور ٹکراؤ سے اس مقدس عمارت کی دو چار اینٹیں روزانہ شہید ہو جاتی ہیں، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم ان ارکانِ دین کی محافظت سے غفلت برت رہے ہیں، اگر یہ بات نہ رہے اور ان ارکان کو ہم اسی طرح ادا کرنے لگیں جس طرح ان کی ادائیگی مطلوب ہے تو روح اور ماحول کے معمولی معمولی دباؤ اور خواہشات اور مصالح کے ہلکے ہلکے ٹکراؤ تو کیا سخت سے سخت طوفان بھی اگر اٹھیں تو دین محکم کے ایک انچ بھر حصہ کو بھی نقصان نہ پہونچا سکیں، ان ارکان کی محافظت سے وہ استقامت نصیب ہوتی ہے کہ آدمی بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر کے بھی دین کے اشاروں پر سر کے بل چلتا ہے اور وہ حلاوتِ ایمانی نصیب ہوتی ہے کہ ہر چوٹ میں ایک لذت اور ہر زیاں میں ایک کیف حاصل ہوتا ہے اور دین سے برگشتگی کے خیال سے بھی روحِ مومن تھرا اٹھتی ہے۔ اس لیے کہ یہ ارکان نفوسِ انسانی کا تزکیہ کر کے انھیں اُن کی فطرت کے اس اصل مقام پر لے آتے ہیں جہاں دین سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں رہتی، ہم میں سے جو شخص بھی اس محافظت میں کامیاب ہو جائے گا وہ انشاء اللہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی دین کی تابعداری کرنے میں ناکام نہیں رہے گا، بشرطیکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ محافظت صرف ارکان کو اُن کی صحیح ہیئت و صورت کے ساتھ پابندی سے ادا کر لینے کا نام ہے، بلکہ اسے اس حقیقت کا شعور ہو کہ صحیح ہیئت و صورت اور پابندی کے علاوہ چند چیزیں اور بھی ہیں جن کے بغیر محافظت کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا، وہ چیزیں یہ ہیں:-

ایمان[1] ، اخلاص[2] اور احتساب[3]

(۱) ایمان کا مطلب یہ ہے کہ جس رکن کو بھی ادا کرنے کا ارادہ کرے اس کے متعلق یہ یقین کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عائد کردہ فرض ہے جس کی بجا آوری میں اس کی خوشنودی ہے اور ترک موجبِ عتاب ہے (۲) اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل سے مقصود محض اللہ کی رضا جوئی ہو (۳) احتساب کا مطلب یہ ہے کہ عمل کرتے میں اس بات کی پوری اُمید

رکھے کہ اس سے اللہ تعالیٰ ضرور راضی ہوگا اور حسبِ وعدہ ثواب عطا کرے گا۔

ارکان کی ادائیگی میں ان سب باتوں کے جمع ہو جانے پر محافظت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور پھر ان ارکان کے وہ نتائج اور اثرات زندگی میں رونما ہوتے ہیں جنکی بدولت اللہ تعالیٰ نے انکو ارکان دین کا درجہ دیا ہے، بلکہ بعض حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پانچ اعمال کو پورے دین کا نام دے دیا ہے ــــ اسوقت ہمارے پیش نظر خاص طور پر روزہ ہے جو چند ہی دن بعد سایہ فگن ہونے والے پورے مہینہ کا فریضہ ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان ہی سے اسکی تیاری شروع فرما دیا کرتے تھے اور اپنے آل و اصحاب کو بھی اسکے پرجوش استقبال اور پوری پوری محافظت کے لیے خطبات اور ارشادات کے ذریعہ سے تیار کیا کرتے تھے، آیئے ہم آپ بھی حضورؐ کے اتباع میں کچھ اس جلیل القدر فریضہ کی باتیں کریں، تاکہ مہینہ بھر کا یہ سنہرا موقع ضائع نہ ہونے پائے۔

اُمت میں غیر معمولی دینی انحطاط پیدا ہو جانے کے باوجود روزہ رکھنے والوں کی تعداد ابھی کافی ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ روزہ رکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو صرف ظاہری "روزہ" رکھتی ہے، یعنی طلوع فجر سے غروب آفتاب تک تین کاموں سے پرہیز، حالاں کہ اس سے صرف فرض ادا ہو جاتا ہے پورا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

سوچنے کی بات ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور شانِ رحمت سے یہ بات بعید نہیں کہ وہ بلا کسی مقصد کے اپنے بندوں پر اتنا بوجھ لاد دے؟ جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اور جس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہوتا، جس میں بندوں کے لیے نتیجہ کے اعتبار سے رحمت کا کوئی پہلو نہ ہو، اور جو عبث کام کرنے سے اپنی ذات کو پاک قرار دیتا ہو! کیا اس کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مہینے تک اپنے مومن بندوں کو ایسے کام میں مبتلا رکھے گا جس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی رحمت نہ ہو اور گویا کار عبث ہو؟ اور کیا وہ ذات جو رؤفٌ بالعباد، اور لطیفٌ وودود ہو .... اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ محض اپنی کبریائی اور معبودیت کے اظہار کے لیے ایسے سخت موسم میں کہ سورج کی تپش سے ہوش اُڑے جاتے ہوں، ہواؤں سے شعلے نکل رہے ہوں، اور زمین سے لپٹیں اُٹھ رہی ہوں، اپنے بندوں سے یہ مطالبہ کرے گی کہ پورا دن بے آب و دانہ رہ کر کاٹ دیں؟ جب کہ ان میں بہت سے ایسے بندے بھی ہوں گے جو شام کو اپنے پیٹ میں کچھ ڈالنے کے لیے دن بھر چلچلاتی دھوپ میں محنت مزدوری کرنے کے لیے مجبور ہوں! ــــ حاشا! اس خیال سے ہزار بار حاشا!! اس کی شان تو اس کے رسول نے یہ بتلائی ہے کہ ساری دنیا اس کی عبادت کرنے لگے تو اس کی عظمت میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہوگا۔ اور کوئی ایک شخص بھی اس کی عبادت نہ کرے تو ذرہ برابر کمی نہ ہوگی ــــ حقیقت یہ ہے کہ روزہ کا حکم ایک بہت بلند مقصد کے پیش نظر دیا گیا ہے، یہ مقصد ہے انسان کو اس وصف سے سرفراز

کرنا جو انسانیت کا منتہائے کمال ہو کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (القرآن) (تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے اگلوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو) یہ تقویٰ ہی وہ وصف ہو جو نوع انسانی کا سب سے بڑا کمال ہو، جس کا حصول دُنیا میں نوع انسانی کے لیے امن و سکون، اور آخرت میں فلاح و بہبود کا ضامن ہے، اور جس کا فقدان انسانوں کی ہر دو زندگیوں کی خرابی کا باعث ہی ___ دُنیا کے متعلق مشاہدہ اور تجربہ ہو، اور آخرت کے متعلق یقین اور عقیدہ! ___

رمضان کے روزوں سے نفس کا جیسا تزکیہ ہوتا ہو اس کے بعد تقویٰ نہ پیدا ہونا قریب قریب محال ہے۔ لیکن تزکیہ جب ہی ہو سکتا ہو جب کہ روزہ کے صرف فقہی شرائط پورے نہ کیے جائیں، بلکہ پوری پوری محافظت کی جائے جس کی تشریح اوپر کی گئی ہو۔ علاوہ ازیں روزہ کا مقصد ہر وقت دھیان میں رکھا جائے، ورنہ کم از کم روزہ کی ابتدا اور انتہا میں تو ضرور ہی اس کا استحضار کیا جائے، روزہ یا دیگر عبادات کا معاملہ جسمانی امراض کی دواؤں جیسا نہیں ہو کہ وہ اپنا اثر کرتی ہی ہیں چاہے استعمال کرنے والے کو یہ معلوم بھی نہ ہو کہ کیا اثر ہوگا، تریاق زہر کی کاٹ کر ہی دیتا ہو، اگرچہ استعمال کرنے والے کو یہ بھی پتہ نہ ہو کہ اس کو تریاق استعمال کرایا گیا ہے۔ بیشک روزہ اور دیگر ارکان دین تزکیۂ نفس اور شفائے روح کے لیے اکسیر ہیں، لیکن جبھی جب کہ مندرجہ بالا شرائط پورے کیے جائیں ورنہ صرف ادائے فرض سے زیادہ کچھ اور حاصل نہ ہوگا نمازیں پڑھی جاتی رہیں گی، روزے رکھے جاتے رہیں گے، زکاتیں دی جاتی رہیں گی، اور حج کیے جاتے رہیں گے۔ مگر زندگیاں کامل اطاعت و تقویٰ کے نور سے یوں ہی خالی رہیں گی ___ اللہ توفیق دے کہ ہم اس بے شعوری اور بے حضوری کے مرض سے جلد نجات پانے کی کوشش کریں، اور اس رمضان ہی سے اس کوشش کا آغاز کر دیں، نیز اس مہینے کے فرائض سے لے کر مسنون اعمال تک کو نہایت بلند ہمتی اور ایک بلند ترین مقصد کے حصول کی کوشش کی ذہنیت کے ساتھ ادا کریں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کے ذریعے سے ہم میں تقوے پیدا کرنا چاہتا ہو، جو بلاشبہ کمالات انسانی کی معراج ہو، اور اس بلندی کو پست ہمت اور بوجھ اتارنے کی ذہنیت رکھنے والے انسان کبھی نہیں پا سکتے۔

اللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضَىٰ وَاجْعَلْ آخِرَتَنَا خَيْرًا مِّنَ الْأُولَىٰ۔

قرآنی دعوت

۵

خدا کی صفات:- تنزیہ و تقدیس

حق تعالیٰ کی صفات کے متعلق یہاں تک جو قرآنی بیانات نقل کیے گیے یہ سب اس کی ایجابی صفات کے متعلق تھے، اِن سے ہمیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ علیم کل ہے کوئی چھوٹی بڑی اور کھلی یا چھپی چیز اس کے علم سے باہر نہیں، وہ قادر مطلق ہے سب کچھ اس کی قدرت میں ہے، وہ سب کا خالق و رازق اور سب کا کارساز و پروردگار ہے، ساری کائنات کا وہی مالک اور حاکم ہے اور ہر چیز اس کے زیر حکومت ہے کوئی چیز بھی اس کے تصرّف اور اقتدار سے باہر نہیں، پھر وہ بڑی رحمت والا اور نہایت مہربان ہے اور اس کے ساتھ اس میں عدالت کی صفت بھی ہے، یعنی نیکو کاروں اور فرمانبرداروں کو وہ اپنے خاص فضل و انعام سے نوازنے والا ہے اور سرکش مجرموں کو اپنی شان کے مطابق سزا اور عذاب دینے والا بھی ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان اور اس کا تعارف ناقص اور نامکمل رہتا ہے جبتک کہ اُن چیزوں اور ان باتوں سے اس کا منزہ اور مبرا ہونا بھی بیان نہ کیا جائے جو اس کی شانِ قدوسیت اور عظمت و کبریائی کے خلاف ہیں اور جن کے بارہ میں جاہلوں اور خدا ناشناس لوگوں کو کبھی مغالطہ ہوا یا ہو سکتا ہے اس لیے قرآن مجید میں صرف ایجابی صفاتِ کمال کے بیان پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کی تنزیہ و تقدیس کو بھی پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے، چند آیتیں اس سلسلہ

کی بھی پڑھ لیجئے ——— سورہ بنی اسرائیل کے بالکل آخر میں ارشاد ہے۔

وقل الحمد للہ الذی لم یتخذ ولداً ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل وکبرہ تکبیراً ۰ (بنی اسرائیل ع ۱۲)	اور کہو! ساری حمد وستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو نہ کوئی اولاد رکھتا ہے اور نہ حکومت وفرمانروائی میں کوئی اس کا شریک اور ساجھی ہے اور نہ کمزوری و درماندگی کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے، اور اس کی خوب بڑائی اور کبریائی بیان کرو!

اور سورۂ انعام میں ایک موقع پر یہ بیان کرنے کے بعد کہ "جاہلوں خدا ناشناسوں نے اللہ کے لیے شریک ساجھی اور بیٹیاں اور بیٹے ٹھیرائے" ارشاد فرمایا گیا۔

سبحانہ وتعالیٰ عما یصفون ۰ بدیع السمٰوات والارض انّیٰ یکون لہ ولد ولم تکن لہ صاحبۃ وخلق کل شیٔ وھو بکل شیٔ علیم ۰ ذالکم اللہ ربکم لا الٰہ الا ھو خالق کل شیٔ فاعبدوہ وھو علیٰ کل شیٔ وکیل ۰	وہ پاک اور بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں، وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے (اور خود یہ نادان بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ شان اس کے سوا کسی کی بھی نہیں مگر یہ ظالم اس کے باوجود اس کے شریک اور بیٹیاں بیٹے ٹھیراتے ہیں) حالاں کہ کیسے اسکی کوئی اولاد ہوسکتی ہو جبکہ کوئی اس کی

شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ (بہر حال اس کی کوئی اولاد اور کوئی اس کا شریک نہیں ہو بلکہ سب اس کی مخلوقات ہیں) اس نے سب کو پیدا کیا اور اس کو ہر چیز کا پورا پورا علم ہو۔ لوگو! یہ پاک و برتر اللہ تمھارا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں وہ سب کا خالق ہے لہٰذا تم اسی کی عبادت اور بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل اور کارساز ہے۔

اس سب کے بعد تنزیہ کے سلسلہ میں آخری بات یہ فرمائی:۔

لاتدرکہ الابصار وھو	اس کی شان یہ ہے کہ نگاہیں اس کو نہیں
یدرک الابصار وھو اللطیف	پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔ اور
الخبیر (الانعام ع ۱۳)	وہ بڑا ہی باریک بیں با خبر ہے۔

ان آیتوں میں قریب قریب ان سب باتوں سے اللہ تعالیٰ کا منزہ اور مبرا ہونا بیان فرما دیا گیا ہے جو اس کی شانِ الوہیت و قدوسیت کے خلاف ہیں اور جن کے بارہ میں خدا ناشناسوں اور مشرکوں نے عام طور سے غلطی کھائی ہے ——— پھر قرآن پاک کے اس تنزیہی بیان کی آخری بات لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار" (انسانوں کی بینائیاں جو یہاں ان کو ملی ہوئی ہیں اللہ کو نہیں پا سکتیں اور وہ سب بینائیوں کو پا رہا ہے) بلاشبہ بڑی اعلیٰ اور بڑی لطیف اور بڑی جامع تنزیہ ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اس قدر لطیف اور وراء الوراء ہے کہ ہر وقت قریب تر اور بالکل ساتھ ہونے کے باوجود کوئی نگاہ اس کو نہیں پا سکتی اور وہ سب کی نگاہوں کو پا رہا ہے۔

اسی طرح سورہ شوریٰ میں ایک جگہ گنتی کے دو حرفوں میں حق تعالیٰ کی پوری تنزیہ و تقدیس بیان فرما دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:۔

لیس کمثلہ شئ ج	کوئی شے بھی (جس کو تم جانتے ہو اور جس
(شوریٰ ع ۲)	کا تصور کر سکتے ہو) اس کے مثل نہیں۔

قرآن مجید کے اس دو حرفی بیان پر غور کیجئے واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس کا کوئی پہلو اس سے باہر نہیں رہا اور ان ہی دو حرفوں نے ان سب چیزوں سے حق تعالیٰ کا منزہ اور مبرا ہونا بیان کر دیا جو اس کی شانِ الوہیت و قدوسیت کے خلاف ہیں۔ کیوں کہ اس باب میں جتنی غلطیاں اور گمراہیاں ہوئی ہیں یا ہوتی ہیں ان سب کی جڑ بنیاد یہی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اور اس کے افعال و صفات کو اس عالم کی اپنی دیکھی بھالی اور جانی بوجھی چیزوں پر اور ان کے افعال و صفات پر قیاس کر لیتے ہیں ——— پس قرآن مجید نے " لیس کمثلہ شئ " فرما کر اس غلط بنیاد ہی کو اکھاڑ دیا اور

بتلا دیا کہ اس کی کوئی مثال اور کوئی نمونہ نہیں، وہ موجود ہے لیکن اس کا وجود اس طرح کا نہیں جس طرح کا دوسری موجودات کا ہو، وہ اَلْحَیُّ اور زندہ ہو لیکن دوسرے زندوں کی زندگی اور اس کی زندگی میں کوئی مشارکت اور مشابہت نہیں، وہ علیم ہے سمیع و بصیر ہے لیکن اس کا علم اور اس کا سننا اور دیکھنا ہمارے علم اور ہماری سماعت و بصارت سے وراء الوراء ہے، وہ سب کے قریب، سب کے ساتھ ہے لیکن یہ قریب اور ساتھ ہونا ایسا نہیں جیسا کہ اس دنیا کی کوئی چیز کسی کے قریب اور کسی کے ساتھ ہوتی ہے، اسی طرح رحمت و محبت اور غضب و انتقام اس کی صفتیں ہیں لیکن ان کی نوعیت وہ بالکل نہیں جو ہماری ان صفتوں کی ہے ——— بہر حال قرآن مجید کے اس نہایت مختصر تنزیہی بیان نے اُن سب چیزوں کی نفی کردی جو حق تعالیٰ کی شان قدوسیت کے خلاف تشبیہ و تمثیل کی وجہ سے خدا ناشناس لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں ——— "لیس کمثلہ شئ وھو السمیع البصیر"۔

قرآن مجید کی چند جامع الصفات آیات

اب ہم قرآنی تعلیم و دعوت کے اس باب (بیان صفات) کو چند ایسی آیات سنا کے ختم کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مختلف شئون و صفات کو جامع ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ کی ایجابی صفات کمال کے ساتھ اسکی تنزیہی شان کو بھی جمع کرکے بیان کیا گیا ہو ——— سب سے پہلے سورۂ بقرہ کی وہ مشہور جامع الصفات آیت پڑھیئے جو آیت الکرسی کے نام سے معروف ہے۔

اللہ لا الٰہ الا ھو الحی	اللہ کی شان یہ ہے کہ صرف وہی الٰہ ہے (یعنی
القیوم لا تاخذہ سنۃ	اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق
ولا نوم لہ ما فی السمٰوات	نہیں، وہ "الحی" زندۂ جاوید ہے یعنی حیات
وما فی الارض من ذا الذی	اس کی ذاتی صفت ہے اس کے لیے فناء و زوال
یشفع عندہ الا باذنہ	نہیں) وہ "القیوم" ہے ساری کائنات
یعلم ما بین ایدیھم وما	اسی کے حکم سے قائم ہے (وہ ہر وقت بیدار

خلفهم ولا يحيطون بشيء من علمه الا بما شاء وسع كرسيه السمٰوٰت والارض ولا يؤده حفظهما وهو العلي العظيم

(بقرہ ع ۳۴)

اور خبردار رہنے والا ہے) نہ اُسے اونگھ لگتی ہے اور نہ نیند آتی ہے (ایسے عوارض کا اس کے پاس گزر ہی نہیں) زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے (وہی سب کا مالک و مختار ہے) کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش بھی کر سکے (کسی کی یہ مجال نہیں) جو کچھ بندوں کے سامنے اور حاضر ہے وہ اس کو بھی جانتا ہے اور جو ان کے پیچھے اور ان سے غائب اور اوجھل ہے وہ اس سے بھی واقف ہے، اور مخلوقات اور بندوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کے غیر متناہی اور لامحدود علم میں سے وہ کسی ایک چیز کو بھی پوری طرح نہیں جان سکتے الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے (تو وہ صرف اسی کو اور اس کے بتائے کے بقدر ہی جان سکتے ہیں۔ اس کا تخت حکومت زمین و آسمان کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے اور ان کے تھامنے سے وہ تھکتا نہیں اور وہ اونچی شان والا بڑی عظمت والا ہے۔

اسی طرح سورۂ حدید کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی شئون و صفات کا بڑی جامعیت کے ساتھ اور بڑا روح پرور بیان کیا گیا ہے ارشاد ہے:-

سَبَّحَ لله ما في السمٰوٰت والارض وهو العزيز الحكيم له ملك السمٰوٰت والارض يحيي ويميت وهو على كل شيء قدير هو الاول والآخر

اللہ کی تسبیح و تقدیس کرتی ہیں یعنی اس کی پاکی بیان کرتی ہیں وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور وہ بڑا زبردست اور صاحب حکمت ہے۔ اسی کی حکومت اور فرمانروائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں، وہی (جسے چاہتا ہے)

والظاھر والباطن	جِلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی موت وحیات
وھو بکل شیئٍ علیم ۝	کا سارا نظام اسی کے ہاتھ میں ہے) اور وہ
ھو الذی خلق السمٰوات	ہر چیز پر قادر ہے ـــ وہی اول ہے وہی
والارض فی ستۃ ایام	آخر ہے (یعنی وہ اس وقت بھی موجود
ثم استوٰی علی العرش	تھا جبکہ اس کے سوا کوئی موجود نہ تھا اور سب کے فنا
یعلم ما یلج فی الارض	ہوجانے کے بعد بھی وہ موجود رہنے والا ہے) وہی
وما یخرج منھا وما	ظاہر ہو وہی باطن (یعنی ظاہر ایسا کہ ہر معمولی عقل
ینزل من السماء وما	والا اس کو جانتا ہے اور اس کی خدائی
یعرج فیھا ؕ وھو معکم	کا یقین رکھتا ہے اور مخفی ایسا کہ کوئی آنکھ
اینما کنتم واللہ بما	اس کو دیکھ نہیں سکتی) اور وہ ہر چیز کو پوری
تعملون بصیرٌ ۝	طرح جانتا ہے ـــ وہی ہے کہ اس نے
(سدید ۱۶)	آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں (چھ

دوروں میں) بنایا۔ پھر وہ اپنے تخت حکومت پر متمکن ہوگیا۔ جو کچھ زمین کے اندر جاتا ہے اور جو اس میں سے نکلتا ہو وہ اس سب کو جانتا ہو اور اسی طرح جو کچھ آسمان سے اترتا ہو اور جو کچھ اس کی طرف چڑھتا ہو وہ اس سب کا بھی علم رکھتا ہے ـــ اور تم جہاں بھی ہو وہ (ہر جگہ اور ہر حال میں) تمھارے ساتھ ہے۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو وہ اللہ اس سب کو خوب دیکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں سورۂ حشر کی یہ آخری آیتیں بھی اور پڑھ لیجیے:۔

ھو اللہ الذی لا الٰہ الا	وہ اللہ جس کی شان یہ ہے کہ صرف وہی معبود
ھو ج عالم الغیب والشھادۃ	حق ہو اسکے سوا کوئی ہستی عبادت اور بندگی
ھو الرحمٰن الرحیم ۝ ھو اللہ	کے لائق نہیں، وہ سب چھپی اور کھلی چیزوں
الذی لا الٰہ الا ھو ج الملک	کا جاننے والا ہو وہ بڑا مہربان اور نہایت رحمت

القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون ۔ ھو اللہ الخالق البارئ المصور لہ الاسماء الحسنیٰ ط یسبح لہ ما فی السمٰوٰت والارض وھو العزیز الحکیم ۔

(الحشر ع ۳)

والا ہو۔ وہ اللہ وہی اللہ حق ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، وہی حقیقی بادشاہ ہو، وہ القدوس ہے (عیب و نقص کی ہر نسبت سے پاک ہو) السلام ہے (سلامتی اسکی ایسی صفت ہو کہ اس کے لیے کوئی خطرہ اور اس کو کبھی زوال نہیں) المومن ہے (بندوں کو امن دینے والا ہو) المھیمن (ان کا رکھوالا اور نگہبان) ہو۔ العزیز ہے (زبردست اور غالب ہو) الجبار ہو (سب پر اس کا دباؤ اور تسلط ہو کوئی اسکی مشیت کے خلاف حرکت نہیں کر سکتا) المتکبر ہے (بے انتہا عظمت و کبریائی اس کی صفت ہو) پاک ہو ان کے شریک تبلانے سے ــــــ وہ اللہ ہے پیدا کرنے والا، ٹھیک ٹھیک بنانے والا، صورت گری کرنے والا، اسی کے لیے ہیں سب عمدہ نام (اور اچھے القاب) آسمان و زمین کی سب چیزیں اس کی تسبیح و تقدیس کرتی ہیں (اور اس کی پاکی اور برتری کے گیت گاتی ہیں) اور وہ نہایت زبردست اور صاحب حکمت ہو۔

خدا کی صفات کے متعلق قرآن مجید کے ان مفصل بیانات کے بعد سورۂ اخلاص کا نہایت مختصر ایک بیان اور بھی پڑھ لیجیے جو بڑا سادہ ہونے کے ساتھ بڑی غیر معمولی دلکشی اور دلآویزی اپنے اندر رکھتا ہے۔

قل ھو اللہ احد ۚ اللہ الصمد ۚ لم یلد ولم یولد ۚ ولم یکن لہ کفوا احد ۚ

کہو وہ اللہ ایک ہو یگانہ و یکتا ہے۔ اللہ بے نیاز ہو (اس کو کسی کی احتیاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں) نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہو اور نہ کوئی ہستی اس کی ہمسر اور اس کے برابر کی ہو۔

جو شخص خدا کو مانتا ہے اور اپنے کو اس کا مخلوق و مملوک اور بندہ یقین کرتا ہو اس کے دل میں اس چیز کی طلب اور پیاس کا ہونا بالکل قدرتی بات ہو کہ مجھے اپنے اس خالق اور رب کی معرفت حاصل ہو اور اس کے بارے میں جو کچھ میں جان سکتا ہوں وہ کسی طرح جانوں، اور بلاشبہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق سب سے زیادہ صحیح، مکمل اور واضح اور اطمینان بخش بیان صرف قرآن مجید کا ہو، اس سے ایک طرف تو دلوں میں اللہ کی شایان شان عظمت پیدا ہوتی ہے اور امکان کی حد تک اس کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور دوسری طرف اُنس و محبت کا چشمہ بھی اُبلتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ بندہ اسکی رضا جوئی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتا ہے اور یہی انسان کی کامیابی کی اعلیٰ اور آخری منزل ہو۔

معارف الاحادیث

(مسلسل)

(۱۰) عن عبد اللّٰہ بن عمرو ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اربعٌ اذا کُنَّ فیك فلا علیك ما فاتك الدنیا حفظ امانۃٍ وصدق حدیث وحسن خلیقۃٍ وعفۃٌ فی طعمۃ۔

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہو کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چار باتیں اور چار خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ تم کو نصیب ہو جائیں تو پھر دنیا اور اس کی نعمتوں کے فوت ہو جانے اور ہاتھ نہ آنے میں کوئی مضائقہ اور کوئی گھاٹا نہیں۔ امانت کی حفاظت، باتوں میں سچائی، حسنِ اخلاق، اور کھانے میں احتیاط اور پرہیزگاری۔ (احمد و بیہقی)

(تشریح) نبوت کی زبان اور دین کی اصطلاح میں امانت بہت وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہو اللہ کے اور اسی طرح بندوں کے ہر حق کی ادائیگی اور ہر عہد کی پابندی امانت کے وسیع مفہوم میں داخل ہو۔ پس ظاہر ہو کہ جس شخص میں امانت کی صفت ہو یعنی جس کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ کے اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی پوری دیانت داری کے ساتھ کرتا ہو اور اسی کے ساتھ اس کی زبان صداقت اور سچائی کی پابند ہو اور حسنِ اخلاق کی دولت بھی اس کو حاصل ہو اور کھانے پینے کے معاملہ میں بھی وہ محتاط اور پرہیزگار ہو، یعنی صرف حلال کھاتا ہو اور اتنا ہی کھاتا ہو جتنا اس کو کھانا چاہیے، اور حرام اور مشتبہ سے

پرہیز کرتا ہو، پس جس شخص کو یہ چار خصلتیں نصیب ہوں ظاہر ہو کہ اس کو انسانیت کا کمال نصیب ہو جو اس دُنیا کی سب سے بڑی بلندی ہو اور آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں اس کو وہ بے حساب اور بے شمار نعمتیں ملیں گی جن میں سے ایک ایک کی قیمت اس دُنیا سے اور اس کی ساری دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ ہو گی، پس ایسا شخص اگر دُنیا سے خالی ہاتھ رہے تو اُسے کوئی غم اور کوئی افسوس نہ ہونا چاہیے کیوں کہ جو کچھ اسے ملا ہوا ہو دنیا اور اس کی ساری دولتیں اور بہاریں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

(۱۱) عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد افلح من اَسْلَمَ وَرُزِقَ کفافاً وقنعہ اللہ بما آتاہ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) یقیناً وہ شخص کامیاب اور بامراد ہوا جس نے اللہ کی فرمانبرداری کا طریقہ اختیار کیا اور اس کو قدر کفاف روزی دی گئی (یعنی فقر و فاقہ کی سختیوں سے بھی بچایا گیا اور زیادہ دولت مند بھی نہیں بنایا گیا)، اور اللہ نے اس کو اتنی ہی روزی پر قانع بنا دیا جو اس کو عطا فرمائی۔ (مسلم)

(تشریح) فی الحقیقت جس کو یہ تین باتیں نصیب ہو گئیں یعنی اپنے حقیقی مالک کی اطاعت اور فرمانبرداری اور ضرورت بھر رزق اور اللہ کی عطا پر قناعت اور اطمینان قلبی، وہ بڑا ہی کامیاب رہا اور اس نے سب کچھ پالیا۔ اللّٰھُمَّ اجعلنا منھم۔

(۱۲) عن ابی ذر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال قد افلح من اخلص اللہ قلبہ للایمان وجعل قلبہ سلیما ولسانہ صادقاً ونفسہ مطمئنۃ وخلیقتہٗ مستقیمۃ وجعل اذنہ مستمعۃ وعینہ ناظرۃ فاما الاذن فقمع واما العین فمُقِرَّۃ لما یُوعِی القلب وقد افلح من جعل قلبہ واعیا۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ وہ شخص کامیاب اور بامراد ہوا جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے لیے خالص کر دیا اور اس کے قلب کو صحیح و سالم بنا دیا۔ (یعنی جس کے دل کو ایسا صاف ایمان و یقین نصیب فرمایا جس میں شک یا نفاق کی کوئی آمیزش اور کوئی گنجائش نہیں، اور حسد و کینہ جیسے باطنی امراض سے بھی اس کے دل کو پاک کر کے سلیم بنایا)، اور اس کی

زبان کو سچائی اور اس کے نفس کو اطمینان عطا فرمایا۔ (یعنی اس کے نفس کو ایسا کر دیا کہ اللہ کی یاد سے اور اس کی مرضیات سے اس کو چین و اطمینان ملتا ہو) اور اس کی طبیعت کو سیدھا اور درست کر دیا (کہ وہ برائی کی طرف نہیں چلتی) اور اس کے کان کو سننے والا اور آنکھ کو دیکھنے والا بنا دیا (کہ وہ حق باتوں کو اور اللہ کی نشانیوں کو سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور نصیحت و عبرت حاصل کرتے ہیں) پس کان تو مثل قیف کے ہے (کہ باتیں اسکے راستے سے دل میں اس طرح جاتی ہیں جس طرح بوتل یا شیشی میں کوئی چیز قیف کے ذریعہ جاتی ہے) اور آنکھ پہونچانے والی اور ٹھہرانے والی ہے ان چیزوں کو جو وہ قلب کو سونپتی ہے، اور بامراد اور کامیاب ہوا وہ شخص جس کے دل کو بنا دیا اللہ نے یاد رکھنے والا۔

(**تشریح**) حدیث کے آخر حصہ میں کان اور آنکھ کے متعلق جو بات فرمائی گئی ہے "فاما الاذن فقمع" الخ جس کے ترجمہ پر امتیاز کے لیے خط لگا دیا گیا ہے اس سے وجود انسانی میں کان اور آنکھ کی امتیازی اہمیت ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دل جو انسانی اعضاء میں گویا بادشاہ اور فرمانروا کی حیثیت رکھتا ہے اس میں جو چیزیں پہونچتی ہیں اور اس کو متاثر کرتی ہیں وہ عموماً کان اور آنکھ ہی کے ذریعہ پہونچتی ہیں، اس لیے انسان کی فلاح و سعادت اس پر موقوف ہے کہ اللہ اسکے کان کو شنوا اور اسکی آنکھوں کو بینا بنا دے ــــ اور سب سے آخر میں فرمایا کہ "فلاح یاب اور بامراد ہوا وہ انسان جس کے دل کو اللہ نے یاد رکھنے والا بنا دیا" مطلب یہ ہے کہ فلاح و سعادت تک پہونچانے والی جو باتیں کان یا آنکھ کے ذریعہ دل میں پہونچیں اُن سے بھی منزل سعادت تک جب ہی پہونچا جا سکتا ہے جبکہ دل ان کو محفوظ رکھے اور ان سے برابر کام لیتا رہے اس لیے انسان کی سعادت اور خوش بختی کی آخری اور سب سے اہم شرط یہ ہے کہ قلب اپنا فریضہ اور وظیفہ ٹھیک ٹھیک انجام دیتا رہے۔

قرآن مجید میں بھی جا بجا انسان کی ان تینوں قوتوں (سمع، بصر، قلب) کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا انسان کی ہدایت اور نجات کا دارومدار انہی تینوں کی سلامتی اور درست روی پر ہے۔
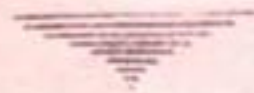
انسانیت اور انبیاء علیہم السلام

[اس سال لکھنؤ میں یکم شعبان سے چہارم شعبان تک چار تبلیغی اجتماعات ہوئے تھے۔ ان میں سے دو اجتماع شہر کی عام جلسہ گاہ امین آباد پارک میں منعقد کیے گئے تھے، تاکہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حضرات کے کان بھی دعوت حق سے آشنا ہو سکیں اور زندگی کے لیے اللہ کے دین اور اس کے پیغمبروں کی ضرورت کو محسوس کر سکیں۔ پارک کے پہلے اجتماع میں مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی نے خطاب فرمایا تھا جسکو لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ کے آٹھ دس ہزار انسانوں نے قابل تعریف سکون و سنجیدگی کے ساتھ سنا۔ مولانا کی یہی تقریر ہدیۂ ناظرین الفرقان کی جا رہی ہے۔] ادارہ
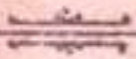
الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ونبینا ومولٰینا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ وازواجہ وذریاتہ وسلم تسلیماً کثیراً۔

دوستو اور بھائیو! لکھنؤ جیسے بڑے اور بھرے شہر اور امین آباد جیسی گلزار اور آباد جگہ میں ایک نامانوس صدا بلند کرنا نقار خانہ میں طوطی کی آواز کے مرادف ہے، اور اس شور و ہنگامہ میں اس کو صبر و سکون کے ساتھ سننا صبر و ضبط کا بڑا امتحان ہے ـــــــ مگر دوستو! یہ کوئی نئی مشکل یا دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ جب اللہ کے برگزیدہ بندے اس دنیا میں آئے اور اللہ کا پیغام لائے اس وقت

بھی دنیا میں سناٹا اور ہو کا عالم نہیں تھا، تاریخ بتلاتی ہو کہ انھوں نے مشغول انسانوں کو مخاطب کیا، اور چوراہوں اور راستوں پر کھڑے ہو کر اس پیغام کو پہونچایا۔

میری پہلی درخواست آپ سے یہ ہو کہ آپ شک و شبہ سے ابتدا نہ فرمائیں، جب تمدن کا توام بگڑ جاتا ہو اور انسانوں کے دل میلے ہو جاتے ہیں تو خالص سے خالص اور سچی بات بھی بدگمانی سے سُنی جاتی ہو۔ ہم اور آپ جو تجربوں کے غلام ہیں اپنے تجربوں کے ماتحت رائے قائم کرتے ہیں، جن لوگوں نے اس جگہ پہلے جلسے دیکھے ہوں گے ممکن ہو کہ وہ کوئی بدگمانی کریں اور یہ سمجھیں کہ اس کے پیچھے بھی کوئی غرض ہو اور کوئی راز ہو، لیکن اگر دنیا میں بدگمانی ہی بدگمانی رہتی تو کچھ کام نہ ہوتا، دنیا کبھی بھی ایسی نہیں رہی کہ اعتماد بالکل اُٹھ گیا ہو، لہٰذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھ پر اعتماد کریں اور اس بات کی توقع رکھیں کہ شاید میں آپ کے کام کی بات کہوں، آپ نے فارسی کا مشہور شعر سُنا ہوگا ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یعنی جب تک کہ آدمی اپنی بات نہ کہہ لے اس کا عیب و ہنر چھپا رہتا ہو، اس لیے آپ فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں اور پہلے میری گذارش سُن لیں۔

دوستو اور بھائیو! آج سے پورے سات سَو برس پہلے ترکی کے حدود میں ایک بڑے مشہور شاعر اور حکیم گذرے ہیں جن کا نام مولانا روم ہو، آپ نے ان کی مثنوی سُنی ہوگی۔ انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہی وہ میں آپ کو سناتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ کل رات کا واقعہ ہو کہ ایک ضعیف العمر آدمی چراغ لیے شہر کے گرد گھوم رہے تھے اور اندھیری رات میں کچھ تلاش کر رہے تھے، میں نے کہا کہ حضرت سلامت آپ کیا تلاش کر رہے ہیں، فرمانے لگے مجھے انسان کی تلاش ہو، میں چوپایوں اور درندوں کے ساتھ رہتے رہتے عاجز آ گیا ہوں، میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہو، اب مجھے ایک ایسے انسان کی تلاش ہو جو خدا کا شیر اور مردِ کامل ہو، میں نے کہا بزرگوار اب آپ کلا کھوئی وقت ہو، انسان کو آپ کہاں تک ڈھونڈھیں گے، اس عنقا کا ملنا آسان نہیں، میں نے بھی بہت ڈھونڈھا ہو لیکن نہیں پایا۔ ان بزرگ نے جواب دیا کہ میری ساری عمر کی عادت ہو کہ جب کسی چیز کو سنتا ہوں کہ وہ نہیں ملتی تو اس کو اور زیادہ تلاش کرتا ہوں، تم نے مجھے اب

اس بات پر آمادہ کر دیا کہ میں اس گمشدہ انسان کو اور زیادہ ڈھونڈھوں اور اس کی تلاش سے کبھی باز نہ آؤں۔

حضرات! یہ ایک شاعر کا مکالمہ ہو، آپ کو شاید تعجب ہو کہ کیا ایسا بھی کوئی وقت تھا کہ انسان بالکل نایاب ہو گیا تھا، مولینا روم نے ہمارے ذہن میں ایک سوال پیدا کر دیا کہ کیا ہر انسان انسان نہیں ہے؟ اور کیا انسانوں کی بڑی بڑی آبادیوں میں بھی انسان نایاب ہو؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ انسان کی ایک ہی ہی قسم ہو، اس سے معلوم ہوا کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو دیکھنے میں انسان ہو لیکن حقیقت میں انسان نہیں ہو، اور دنیا میں ہمیشہ ان ہی لوگوں کی کثرت رہی ہو، دوسرے وہ جو حقیقت میں انسان ہیں اور وہ کبھی ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ ان کو چراغ لے کر ڈھونڈھنے کی ضرورت ہوتی ہو۔ مولانا روم کو سات سو برس ہو چکے، ان کے بعد سے دُنیا میں بڑی بڑی ترقیاں ہوئیں، ہر شہر میں انسانوں کی تعداد بڑھتی رہی ہو اور آج کی انسانی آبادی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہو، اور اس کی ترقیاں بھی بہت وسیع ہیں، اور آج انسان نے بجلی، بھاپ، ہوا اور پانی پر قبضہ جما لیا ہو، ہوائی جہاز، ریڈیو، اور ایٹم بم سے انسانوں کی ترقی اور فتوحات کا اندازہ کیا جا سکتا ہو۔

لیکن دوستو! انسانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے نقشوں اور بڑے بڑے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں کی تصویروں سے کرنا صحیح نہیں ہو، انسانیت کی ترقی ان مادی ترقیات کا نام نہیں ہو، اور محض نسل انسان کی ترقی کو انسانیت کی ترقی نہیں کہا جا سکتا، انسانیت کی ترقی کا اندازہ انسانوں کے اخلاق و کردار سے ہوتا ہو۔ اور اخلاق و کردار کا اندازہ آپس میں ملنے جلنے، ریل کے ڈبوں، پارکوں، ہوٹلوں، دفتروں اور بازاروں میں ہو سکتا ہو، آپ کے ہمسایہ شاعر اکبرؔ نے بالکل صحیح کہا ہو ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو کیا چیز جی رہی ہو کیا چیز مر رہی ہو

انسانیت کا صحیح اندازہ امتحان پڑنے پر اور ایسے مواقع پر ہوتا ہو جب ہر قسم کے ذرائع اور مواقع حاصل ہوں، کہ چوری، گناہ، حق تلفی کی جا سکے، مگر انسان کے اندر کی کیفیات اس کا ہاتھ پکڑ لیں، جہاں انسانیت کا گلا گھونٹا جا رہا ہو، وہاں انسانیت اپنا جوہر دکھلائے، انسانیت کا

اندازہ ہماری موجودہ زندگی کے سانچوں اور مادی ترقی کے پیمانوں سے نہیں ہوسکتا۔

انسانیت درحقیقت ایک بڑا مرتبہ ہو۔ لیکن انسانیت کے خلاف انسان ہمیشہ خود بغاوت کرتا ہو۔ اس کو انسانیت کی سطح پر قائم رہنا ہمیشہ دوبھر اور مشکل معلوم ہوا ہو، وہ کبھی نیچے سے کترا کر نکل گیا، کبھی اس نے اپنے کو انسانیت سے برتر سمجھا، اور کبھی خود کو انسانیت سے بالاتر کہلوانے اور خدا اور دیوتا بننے کی کوشش کی، اور سچی بات یہ ہو کہ لوگوں نے خدا اور دیوتا بننے کی کوشش کم کی، لوگوں نے انھیں خدا اور دیوتا بنانے کی کوشش زیادہ کی۔ ہم اگر فلسفہ اور روحانیت کی تاریخ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ لوگ انسانیت سے بلند تر کسی مرتبہ کی تلاش میں رہے اور انسانوں کو انسانوں کا صحیح مقام سمجھانے کے بجائے اس سے اونچا ہونے کی فکر کرتے رہے، اس کے بالمقابل دوسری کوشش یہ رہی کہ انسان کو انسانیت سے گرا دیا جائے، وہ حیوانی اور نفسانی زندگی کا عادی بنے اور دنیا میں من مانی زندگی کا رواج ہو۔

ان دونوں کوششوں کے نتائج دُنیا میں خراب ہوئے ہیں۔

جب انسان کو انسانیت سے اُٹھا کر خدا یا دیوتا بنایا گیا تو دُنیا میں بد نظمی پھیلی اور بڑا فساد برپا ہوا۔ دنیا میں لوگوں نے جب خدائی کا دعویٰ کیا یا لوگوں نے ان کو یہ درجہ دیا تو دنیا میں بگاڑ ہی بگاڑ بڑھتا گیا اور انسانی زندگی میں نئی نئی گرہیں پڑیں۔ جب ایک معمولی سی گھڑی کسی اناڑی کے ہاتھ پڑ جاتی ہو اور وہ اس کی مشین میں دخل دیتا ہو تو وہ بگڑ جاتی ہو، تو یہ نظام عالم ان مصنوعی خداؤں سے کیسے چل سکتا ہو۔ اس دُنیا کے اتنے مسائل، اتنے مراحل، اور اس میں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ اگر کوئی انسان اس دنیا کو چلانا چاہے تو یقیناً اس کا انجام بگاڑ ہوگا۔ میرا منشا یہ نہیں کہ انسان انسانیت کے دائرے میں ترقی نہ کرے بلکہ یہ کہ انسان خدائی کی کوشش نہ کرے۔ اس نے انسانیت ہی میں کیا کامیابی حاصل کرلی ہو کہ اب وہ خدائی کی ہوس کرے۔

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

مذاہب کی تاریخ بتلاتی ہو کہ جب اس قسم کی کوشش کی گئی تو ایسی پیچیدگیاں رونما ہوئیں

جن کا کوئی علاج نہ تھا، یہ کوشش دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہمیشہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہوتی رہی، ایسے لوگوں نے فطرت سے زور آزمائی کی ہے، اور فطرت سے لڑ کر انسان نے ہمیشہ شکست ہی کھائی ہے، دوسری طرف اکثر ایسے انسان گذرے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو چوپایا جانا، اور ان کو بحیثیت انسان کے اپنی ترقی کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اپنی انسانیت اپنی روحانیت اور خداشناسی کو ترقی دینے کا ان کو کبھی خیال تک نہیں ہوا۔ دنیا میں زیادہ تعداد انھیں انسانوں کی رہی ہے۔ اس زمانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یہ دونوں بگاڑ تھیں، یہ دونوں عیب اور یہ دونوں فساد جمع ہو گئے ہیں۔ اس وقت تقریباً ساری دنیا انھیں دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، چند آدمی ہیں جو خدائی کے دعویدار ہیں اور جن کو دیوتا بننے کا شوق ہے، باقی اکثر وہ انسان ہیں جو چوپایوں اور درندوں کی سی زندگی گذار رہے ہیں اس لیے اس زمانہ کا بگاڑ ہر زمانہ کے بگاڑ سے بڑھ گیا ہے اور زندگی عذاب جان بن گئی ہے۔ اس وقت مردم شماری کے خانوں میں کوئی ایسا خانہ نہیں کہ جو لوگ اپنی انسانیت کی قدر کرتے، اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں ان کا اندراج کیا جائے، مگر آپ خود ہی انصاف کیجیے کہ آپ کے چاروں طرف زندگی کا جو طوفان امڈا ہوا ہے اس میں کتنے انسان ہیں جن کو انسانیت کا احساس ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں صرف ایک معدہ اور پیٹ ہی نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اللہ نے انسان کو روح بھی دی ہے، دل بھی دیا ہے اور دماغ بھی عطا کیا ہے جن کو ہم ہمیشہ نظرانداز کرتے اور ان کے صحیح استعمال سے بچتے ہیں۔ ہم جنسی خواہشات اور مادی ضروریات کے ریلے میں ایسے بہے چلے جا رہے ہیں جیسے ایک گاڑی اپنے اختیار سے باہر لڑھک رہی ہو جس پر کسی کا کوئی قابو نہ ہو، میں اور سمجھا کر کہوں، یوں سمجھیے کہ انسانیت ایک سائکل ہے اور وہ سائکل ایک ڈھلوان پل پر سے پھسل رہی ہے، اس میں نہ کوئی گھنٹی ہے نہ بریک، اور نہ اس کے ہینڈل پر کسی کا ہاتھ، جغرافیہ کی پرانی تعلیم یہ بتاتی تھی کہ زمین چپٹی ہے، جغرافیہ کی نئی تعلیم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمین گول ہے۔ لیکن مجھے جغرافیہ کے استاد اور طالب علم معاف کریں میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ زمین ڈھلوان ہے، اس لیے کہ ساری قومیں اور ان کے تمام افراد اخلاقی بلندی سے حیوانی پستی کی طرف لڑھکتے چلے آ رہے ہیں، اور روز بروز ان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے، ہماری زمین کا یہ کرہ ضرور آفتاب کے

گرد گردش کر رہا ہوگا، مگر اس کرۂ ارض پر بسنے والا انسان مادیت اور معدہ کے گرد چکر لگا رہا ہے، زمین کی گردش کا انسانوں کے اخلاق اور معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن انسانوں کی اس گردش کا تمام دنیا کے اخلاق اور حالات پر اثر پڑ رہا ہے. نظام شمسی میں حقیقی مرکز آفتاب ہو یا زمین، لیکن عملی زندگی میں انسانوں کا حقیقی مرکز معدہ یا پیٹ اور حیوانی عنصر بنا ہوا ہے اور ساری انسانیت اس کے گرد چکر لگا رہی ہے، آج دنیا میں سب سے وسیع رقبہ معدہ کا ہے، یوں کہنے کو تو وہ انسان کے جسم کا بہت مختصر حصہ ہے، لیکن اس کا طول و عرض اور عمق اتنا بڑھ گیا ہے کہ ساری دنیا اس میں سماتی چلی جا رہی ہے، یہ معدہ اتنی بڑی خندق ہے کہ پہاڑوں سے بھی نہیں بھرتا، آج سب سے بڑا مذہب، سب سے بڑا فلسفہ معدہ کی عبادت ہے، تعلیم گاہوں میں اسی کا غلام بنانا سکھایا جا رہا ہے، آج کامیاب انسان بننے کا فن سکھایا جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں دولت مند بننے کا. آج دولت مند بننے کی ریس ہے جس میں حرص اتنی بڑھ گئی ہے کہ انسان کو خود اپنے تن من کا ہوش نہیں رہا۔ مطالعہ، علم اور فنون لطیفہ کا مقصد بھی یہی ہو گیا ہے کہ انسان کہاں سے زیادہ روپیہ حاصل کر سکتا ہے۔ سب سے بڑا علم و ہنر یہ ہے کہ لوگوں کی جیبوں سے کس طرح روپیہ نکال کر اپنی جیب بھری جائے۔ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ تھوڑے سے تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ دولتمند بننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دولتمند بننے کی کوشش تمدن اور سوسائٹی کے لیے اتنی مضر نہیں جتنی کہ جلد دولتمند بننے کی ہوس ہے۔ یہی ہوس رشوت، خیانت، غبن، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، اور حصول دولت کے دوسرے مجرمانہ ذرائع پر آمادہ کرتی ہے، اس لیے کہ ان مجرمانہ طریقوں کے بغیر جلد دولت مند بننا ممکن نہیں، اس ذہنیت کی وجہ سے ساری دُنیا میں ایک مصیبت برپا ہے۔ دفتروں میں طوفان ہے، منڈیوں میں قیامت کا منظر ہے۔ آج انسان جونک بن گئے ہیں۔ اور انسان کا خون چوسنا چاہتے ہیں۔ آج کوئی کام بے غرض اور بے مطلب نہیں رہا۔ آج کوئی شخص بغیر اپنے فائدہ اور مطلب کے کسی کے کام نہیں آتا ہے، آج ہر چیز اپنی مزدوری اور اپنی فیس مانگتی ہے. کبھی کبھی تو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اگر درخت کے سایہ میں دم لیں گے تو شاید درخت بھی اپنی فیس اور اپنی مزدوری مانگنے لگیں گے۔

اقبالؔ نے تو کہا تھا ؎

ہند کے شاعر وصورت گر و افسانہ نویس   آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہو سوار

لیکن میرے خیال میں تو عورت سے زیادہ دولت سوار ہو۔ اور اس میں ان تین طبقوں ہی کی خصوصیت نہیں سب کا حال یہی ہو رہا ہو کہ دولت اور خواہشات نفس کا نشہ سوار ہو، آج دولت کمانا ہی زندگی کا مزا بن گیا ہو آج دنیا میں دو تین مزے سمجھے جاتے ہیں اور ساری دنیا ان کے پیچھے دیوانی ہو۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ رُوح کا مزا کیا ہو، اور دوسروں کے لیے اپنا گھر اُجاڑ کر کیا مزا ملتا ہو۔ کسی کی خدمت کر کے، کسی کے واسطے خود تکلیف اٹھا کر کیا مزہ ملتا ہو۔ اللہ کے پیغمبر انسانوں کو وہ مزے بتلانے آئے تھے جن کو وہ بھلا چکے تھے، یہ کام انھیں کا تھا کہ نکالے جا رہے ہیں، پریشان کیے جا رہے ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں مگر ان کو مزہ آ رہا ہے۔ آج یہ مزہ اُڑ گیا، آج بھی اگر دُنیا یہ جان لے کہ مزا صرف شکست دینے ہی میں نہیں آتا، بلکہ شکست کھانے میں بھی ایک مزا ہو تو دنیا کا نقشہ بدل جائے اور ساری درندگی ختم ہو جائے۔

سیاسی اختلافات اور نظام سلطنت تو فرصت کی باتیں ہیں، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حکومت اندرونی حکومت خواہشات کی ہو، حکومت پر قبضہ خواہ کسی قوم یا پارٹی کا ہو اور خواہ کوئی صدر یا وزیر ہو، مگر در اصل ہر جگہ نفس کا قبضہ اور خواہشات کا تسلط ہو، پہلے برطانیہ کے متعلق کہتے تھے کہ اس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا، لیکن آج جس حکومت و سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا وہ نفس کی خواہش اور من کی چاہت ہو۔

وقت کا فرمان یہ ہو کہ نفس کی خواہش پوری کی جائے، دل کی آگ بجھائی جائے، چاہے انسانوں کے خون کی نہریں بہتی ہوں، خواہ انسانوں کے اوپر ان کی لاشوں کو روند کر گزرنا پڑے، خواہ قومیں اس راستہ میں پامال ہو جائیں۔ خواہ ملک کے ملک ویران اور تباہ ہو جائیں۔

لیکن اس میں ذرا بھی تعجب کی بات نہیں، سیکڑوں برس سے جو تعلیم انسانوں کو دی جا رہی ہے خواہ وہ تعلیم گاہوں کے ذریعہ ہو یا سنیماؤں کے ذریعہ یا ادب و شاعری کے ذریعہ اور جو ہر ملک اور قوم میں رائج ہو اُس کا ماحصل یہی ہو کہ تم مَن کے راجہ ہو اور نفس کے غلام۔

دوستو! اس زمانہ کے سارے انسانوں کی آبادیاں اس لحاظ سے ایک سطح پر ہیں اور اس کے خلاف کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، ملکوں کے خلاف بغاوت کرنے والے بہت ہیں، چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے لیے بھوک ہڑتال کرنے والے بہت ہیں، مقامی مسائل پر جان کی بازی لگا دینے والے بہت ہیں، لیکن انسانیت کے لیے مرنے والے کتنے ہیں۔ کتنے ہیں جن کو حقیقی انسانیت کی فکر ہو۔ آج دنیا میں اگر کسی کو انسانیت کے انحطاط کا احساس بھی ہو تو اس میں یہ جرأت نہیں ہو کہ انسانیت کے لیے آواز اٹھائے۔ سلسلے کرۂ ارض میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو انسانیت کے لیے اپنی قربانی دے۔

دراصل پیغمبروں ہی کی جرأت تھی، خواہ وہ ابراہیمؑ ہوں یا موسیٰؑ، عیسیٰؑ ہوں یا محمدؐ۔ اللہ کا درود اور سلام ان پر کہ انھوں نے ساری دُنیا کو چیلنج کر کے انسانیت کے خلاف جو بغاوت جاری تھی اس سے روکا ان کے سامنے دنیا کی لذتیں اور دولتیں لائی گئیں، مگر انھوں نے سب کو ٹھکرا دیا، اور انسانیت کے درد میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا، اللہ کے برگزیدہ اور منتخب بندوں کی یہ جماعت جس کو پیغمبروں کی جماعت کہا جاتا ہو دنیا کو کچھ دینے کیلئے آئی تھی لینے کیلئے نہیں، انکی کوئی ذاتی غرض نہ تھی، انھوں نے دوسروں کے بننے کی خاطر اپنے کو مٹایا، انھوں نے دوسروں کی آبادی کی خاطر اپنے گھروں کو اُجاڑا، انھوں نے دوسروں کی خوشحالی کے لیے اپنے متعلقین کو فقر و فاقہ میں مبتلا کیا، انھوں نے غیروں کو نفع پہونچایا اور اپنوں کو منافع سے محروم کیا، رسول اللہ نے ساری دنیا کے غریبوں کے لیے زکوٰۃ کا انتظام کیا اور اپنے خاندان کو قیامت تک کے لیے اس سے محروم کر دیا۔ کیا دُنیا کے رہنماؤں میں ایسی بے غرضی اور خلوص کی مثالیں مل سکتی ہیں۔

پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی قوموں میں خلش پیدا کی اور ان کو محسوس کرایا کہ موجودہ زندگی خطرہ کی ہو، جو لوگ اطمینان کے عادی تھے اور میٹھی نیند سو رہے تھے اور میٹھی نیند ہی سونا چاہتے تھے، انھوں نے پیغمبروں کی اس دعوت اور تنبیہ کے خلاف سخت احتجاج کیا اور بڑی شکایت کی کہ انھوں نے ہمارا عیش مکدر کر دیا اور ہماری نیند خراب کی، لیکن جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھتا ہو وہ سونے والوں کی پرواہ نہیں کرتا اور اسکو کسی کی نیند پر ترس نہیں آتا۔ پیغمبر انسان کے حقیقی ہمدرد تھے، وہ دُنیا کو خواب خرگوش سے

بیدار کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ دنیا کے گمراہ رہنماؤں اور نفس کے بندوں نے دنیا کو مارفیا (marphia) کے انجکشن دیے اور اس کو تھپک تھپک کر سُلایا مگر پیغمبروں نے انسانوں کو جھنجھوڑا اور غفلت سے بیدار کیا۔ یہ چھوٹی چھوٹی جنگیں اور لڑائیاں در اصل اسی لیے ہوئیں کہ دنیا سے غفلت دور ہو اور دنیا پر جو تاریکی مسلط ہو وہ ختم ہو، انسان حقیقی انسانیت کو سمجھے۔

ہمارے سامنے سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ واضح اور روشن اور سب سے زیادہ بلند مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہو۔ اگر ہم اس حقیقت کا اظہار نہ کریں تو یہ ایک خیانت ہوگی ہمارا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ان کے اس احسان کو نہ بتلائیں جو انھوں نے انسانیت پر کیا۔

جب دُنیا میں ایک انسان یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اللہ ہی اس دنیا کو اکیلا چلا رہا ہو، اور وہی بندگی اور اطاعت کا مستحق ہو، آپ نے اس حق کا اعلان کیا اور اس آواز کو اتنا بلند کیا کہ آج دنیا کے ہر حصّے سے یہ آواز بلند ہو رہی ہو اور جب کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تو اذان کی آواز کانوں میں آتی ہو۔ جب مساوات اور عورت کے حقوق کا نام لینا جرم تھا آپ نے اس کی آواز بلند کی، اور آج یہ آواز تمام دنیا میں پھیل گئی ہو۔

آپ کی تعلیم اور آپ نے جو کچھ دنیا کو عطا کیا وہ انسانیت کا مشترک سرمایہ ہو جس پر کسی قوم کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ہوا، پانی اور روشنی پر کسی کو اجارہ داری کا حق نہیں اور کوئی اس پر اپنی مہر اور اپنی چھاپ نہیں لگا سکتا، اسی طرح آنحضرتؐ کی تعلیمات ساری دنیا کا حصّہ ہیں اور ہر شخص کا اس میں حصہ ہو جو ان سے فائدہ اٹھانا چاہے، یہ دنیا کی تنگ نظری ہو کہ وہ ان حقوق کو کسی قوم یا ملک کی جاگیر سمجھے۔ دوستو! محمدؐ محسنِ انسانیت تھے اور ساری انسانیت آپ کی ممنون ہو۔ دُنیا میں جو عدل و انصاف اس وقت موجود ہو اور جن حقوق کو اس وقت تسلیم کیا جا رہا ہے وہ سب آپ کا فیض ہے ۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے ۔ یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

دوستو! ہم اس موجودہ نظام زندگی کو چیلنج کرتے ہیں، ہم اسی لیے اس پارک میں جمع ہوئے

ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ تم دنیا کو آج جتنا بلند سمجھتے ہو وہ اتنی ہی پست ہو، ہم صاف کہتے ہیں کہ دنیا تدریجی خودکشی کی طرف جا رہی ہو، ہم اسی لیے آپ کے سامنے آئے کہ اس مرکزی مقام پر کھڑے ہو کر آپ سے کہہ دیں کہ یہ راستہ انسانیت کی تباہی کا راستہ ہو۔ میں اس اسٹیج پر سیدھا مسجد سے اٹھ کر نہیں چلا آیا ہوں، بلکہ کتب خانوں کے راستہ سے، مطالعہ کے راستہ سے اور درس گاہوں کے راستہ سے آیا ہوں، آپ میں سے کچھ لوگ یورپ کی دو ایک زبانیں جانتے ہوں گے۔ میں خود یورپ کو جانتا ہوں، تم انگریزی داں ہو، میں انگریزی داں ہوں، میں سارے یورپ سے خم ٹھونک کر کہتا ہوں کہ تمہارا پورا نظامِ زندگی غلط ہو اور وہ انسانیت کو ہلاکت کی طرف لے جا رہا ہو، میرا دعویٰ ہو اور پورے استدلال اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ دنیا کی نجات پیغمبروں ہی کے راستہ میں ہو اور دنیا کے لیے اس وقت خدا کے یقین، اس کے خوف، دوسری زندگی پر ایمان اور پیغمبروں کی رسالت کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہی ہماری دعوت ہو اور یہی ہماری جد و جہد کا مقصد۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

صفحہ ۵۶ کا بقیہ

مصنف بھی تھے، انکی تصنیفات میں القواعد الکبریٰ اور کتاب مجاز القرآن خاص شہرت رکھتی ہو۔ ابن السبکی لکھتے ہیں:۔

وھذان الکتابان شاھدان بامامته	یہ دونوں کتابیں ان کی امامت اور علوم شریعت
وعظیم منزلته فی علوم الشریعة[1]	میں ان کے علو منزلت پر شاہد ہیں۔

ان دونوں کتابوں کا انھوں نے دو الگ کتابوں میں اختصار کیا ہو، ابن السبکی نے انکی دو اور کتابوں شجرة المعارف اور الدلائل المتعلقة بالملائکة والنبیین علیھم السلام کی بھی خصوصی تعریف کی ہو انکی ایک کتاب مقاصد الصلوٰة خود انکے زمانہ میں بڑی مقبول ہوئی اور لوگوں نے اسکی ہزار ہا نقلیں کیں[2]۔ چھوٹی بڑی تصنیفات کے علاوہ انکے فتاوی کا ضخیم مجموعہ ہو جو فقہ شافعی کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

امام غزالی کے بعد شیخ عزالدین غالباً دوسرے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ احکام شرعیہ کے مقاصد و لطائف پر گفتگو کی اور شریعت کے اسرار و نکات بیان کیے، اس موضوع کے سب سے بڑے مصنف شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں اس موضوع کے پیش رو مصنفین میں تین بزرگوں حجۃ الاسلام غزالی ابو سلیمان خطابی اور شیخ الاسلام عزالدین کا نام لیا ہو[3]۔

شیخ کی وفات | ۱۰ جمادی الاولیٰ سنہ ۶۶۰ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی، یہ الملک الظاہر بیرس کا عہد حکومت تھا، اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا کہتا تھا خدا کی شان ہو شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدر تھی، جنازہ میں امراء دربار، ارکان سلطنت اور افواج شاہی شریک تھیں، سلطان نے کاندھا دیا اور دفن میں شریک ہوا،

شیخ کا جنازہ جب قلعہ کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلقت کا ازدحام دیکھا تو اپنے خواص میں سے کسی سے کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہو اس لیے کہ اگر یہ شخص جو مرجع خلائق ہو اگر اشارہ کر دیتا تو میری سلطنت چلی جاتی، اس کے انتقال کے بعد مجھے اب اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے[4]۔

---

[1] طبقات الشافعیة الکبریٰ ص ۸۴ ۔ [2] ایضاً ص ۹۹ ۔ [3] حجۃ اللہ البالغہ ص ۵ مطبع صدیقی ۔ [4] طبقات الشافعیة الکبریٰ ج ۵ ص ۸۴

"الفرقان" کے پاکستانی خریداروں سے!

پچھلے پرچے سے آپ حضرات کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ حضرات کو رسالہ وی، پی کرنے کا جو انتظام کیا گیا تھا وہ تقریباً معطل ہو گیا ہے، چنانچہ کئی مہینے سے آپ حضرات کو وی، پی نہیں جا سکا ہے اور ادھر حال یہ ہے کہ اسّی فیصدی سے زیادہ خریداروں کے چندے وی، پی ہی کے ذریعہ سے وصول ہوا کرتے ہیں از خود چندہ بھیج دینے والے حضرات بیس فیصدی بھی نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے بہت سے خریداروں کا چندہ کئی مہینے سے ختم ہے اور نئے سال کا چندہ وصول نہیں ہوا ہے ___

چنانچہ گذشتہ رسالے کے صفحہ ۵۶ کے اعلان کے بموجب اس مہینے سے ان تمام حضرات کا رسالہ بند کیا جا رہا ہے جن کا چندہ صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ یا جمادی الاخریٰ پر ختم ہو چکا ہے اور انھوں نے اب تک چندہ ادا نہیں کیا یا ادا کرنے کی اطلاع ہمیں نہیں دی۔ اور آئندہ کے لیے بھی مجبوراً یہی فیصلہ کرنا پڑا ہے کہ جو صاحب چندہ ختم ہونے کی اطلاع کے بعد ایک مہینے کے اندر اندر چندہ نہیں بھیج دیں گے ان کو رسالہ بھیجنا موقوف کر دیا جائے گا، تا آنکہ وہ چندہ ارسال فرمائیں! ___ یہ فیصلہ بہت مجبور ہو کر کیا گیا ہے ورنہ ہم نہیں چاہتے کہ بغیر آپ کی مرضی کے رسالہ بند کر دیں۔ اس لیے اگر آپ بھی رسالہ بند کرنا نہ چاہتے ہوں تو براہ کرم اب پہلی فرصت میں چندہ بھیجکر ہمیں مطلع فرما دیجیے تاکہ رسالہ پھر جاری کر دیا جائے۔

بعض حضرات اپنے احباب کے پتے لکھ کر بھیجدیا کرتے ہیں کہ ان کو وی، پی کر کے خریدار بنا لیا جائے ان سے بھی گذارش ہے کہ وہ اب وی، پی کی فرمائش کے بجائے نئے خریداروں کا چندہ منی آرڈر سے بھیجدیا کریں ___

چندہ بھیجنے کا طریقہ یہ ہے

کہ منیجر صاحب مکتبۂ اصلاح ۲۶ مال روڈ لاہور کے نام پانچ روپے منی آرڈر کر دیجیے۔ منی آرڈر کے کوپن پر "برائے الفرقان" کے الفاظ لکھ دیجیے، نیز اپنا مکمل نام و پتہ بھی، اور ڈاک خانہ سے جو رسید منی آرڈر کرنے پر آپ کو ملے وہ ایک لفافہ میں مع نام و پتہ اور فرمائش کے دفتر الفرقان لکھنؤ کو بھیج دیجیے۔ (منیجر)

"ھادم اللذّات"

دوؔ متقابل موتوں کا عبرت انگیز مُرقع

(از، مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

پہلا مرقع

"ایں مردم باشما تمسخر می کنند" (روضۃ الصفا ج ۴ صہ ۵۲)

یہ بچارہا تھا اپنے بچوں کو تیسری صدی ہجری کا ایک ایرانی نژاد مسلمان جس کا عرفی نام بُوَیہ (بُ وَ یے ہ) اور کنیت ابو شجاع تھی۔ اس کے تین بچے علی الترتیب علیؔ، حسنؔ، احمدؔ کے ناموں سے موسوم تھے، نجومی نے ان ہی تینوں کی ولادت کا زائچہ دیکھا تھا، دیکھ کر ان ہی بچوں کے غریب باپ بویہ کو بشارت دیتا جاتا تھا کہ

"ذکر ایشاں در آفاق بلند گردد"

بچوں نے باپ سے سفارش کی کہ نجومی کو کچھ انعام دیجئے! اور بویہ یہ کہتے ہوئے کہ

"بغیر ایں جامہ کہ پوشیدہ ام قادر نیستم"

بچوں کو یہ بھی سمجھا رہا تھا کہ یہ نجومی تم لوگوں کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ جیسے شروع میں میں نے نقل کیا ہے۔ آخر بمشکل دوؔ درم کہیں سے بند و بست کر کے بچوں کے اصرار پر نجومی کے حوالہ کیے گیے، "دوؔ ہی درم ابھی سر دست لیے لیتا ہوں، لیکن جب وہ باتیں پوری ہونگی، جن کا پتہ تمھارے بچوں کے زائچہ سے چلتا ہے، تو مجھے میرا انعام ملنا چاہیئے"۔ نجومی یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

بات رفت گذشت ہو گئی، اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے کبھی اونچے نیچے ہوتے رہتے ہیں، اور کبھی نیچوں

کو اونچائی بخشی جاتی ہے۔ پہلے بھی یہی ہوتا تھا، درمیان میں بھی یہی ہوتا رہا، آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ اور رہتی دنیا تک

تُؤتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ	ملک (حکومت) جسے تو چاہتا ہو دیتا ہو،
الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ	اور جس سے چاہتا ہو چھین لیتا ہو، جسے چاہتا
وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔	ہو آبرو بخشتا ہو، اور جسے چاہتا ہو رسوا کرتا ہو۔

کی قرآنی آیت کی تفسیر یوں ہی واقعات کے اوراق پر قلم بند ہوتی چلی جائے گی۔ اپنے بدن کی پوشاک کے سوا جس کے پاس کوئی دوسرا لباس نہ تھا یعنی بویہ جو کہتا تھا کہ اس لباس کو اتار کر نجومی کے حوالہ اگر کر دیتا ہوں تو "برہنہ ماتم" یعنی ننگا ہو کر رہ جاؤں گا، اسی چھوٹے بویہ کے تینوں لڑکوں کو بڑائیوں سے سرفراز کیا گیا۔ بغداد کی خلافت عباسیہ بجائے خلافت اور حکومت کے کسی مہنت کی گدی بن گئی یا پوپ کے کلیسا کا رنگ اس پر چڑھ گیا، اس کی ابتدا اسی بویہ کے ان بچوں کے ہاتھوں ہوئی جو بعد کو عماد الدولہ علی، رکن الدولہ حسن معز الدولہ احمد کے نام سے مشہور ہوئے۔ بغداد میں خلیفہ صرف دعا گوئی کے لیے بٹھا دیا گیا۔ اور ممالک عباسیہ کے سارے مشرقی علاقوں پر بویہ کے ان ہی بچوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو گیا۔ تاریخ میں حکمرانوں کے اسی خانوادہ کا دیالمہ اور آل بویہ کے نام سے تذکرہ کیا جاتا ہے۔

بویہ کے منجھلے لڑکے رکن الدولہ حسن کا بیٹا عضد الدولہ دیلمی تھا، ۳۳۸ہجری میں حکومت کی باگ اس کے ہاتھ میں آئی کل ۳۴ سال کی عمر میں وہ ناگزیر وقت بہرحال اس کے سامنے بھی ایسے ہی آ گیا، جیسے اس خاکدان ارضی کے ان باشندوں کے سامنے آ ہی جاتا ہو جو چھوٹے بن کر اپنی مدت پوری کرتے ہیں۔ یا اسی مقررہ مدت کو اس طرح گذارتے ہیں کہ گویا وہ نہیں گذرے گی۔

عضد الدولہ نے فیصلہ کیا تھا کہ

"میری تشفی اس وقت تک نہ ہوگی، جب تک کہ میری حکومت کے خزانہ میں روزانہ ایک ملین (دس لاکھ) درم بغیر کسی انقطاع کے داخل نہ ہوں"

ابن جوزی نے منتظم میں لکھا ہے، کہ جو ارادہ کیا گیا تھا، اس کو بھی پورا کرنے کا موقع دیا گیا،

جس زمانہ شیراز کو دار السلطنت بنا کر عضد الدولہ وہاں مقیم تھا۔ مشہور سیاح المقدسی گھومتے ہوئے شیراز پہونچا تھا۔ اور خاص محل اپنے رہنے کے لیے عضد الدولہ نے جو تعمیر کیا تھا، اس کے دیکھنے کا موقع اس مقدسی کو بھی ملا تھا یہ لکھتے ہوئے کہا

طفت فی هذا الدار کلها	اس محل کی بالائی اور تحتانی ساری
سفلها وعلوها۔	منزلوں میں میں گھوما پھرا ہوں۔

(احسن التقاسیم مقدسی ص۴۵۱)

اسی چشم دید معائنہ کے بعد اپنے ذاتی تاثرات کو درج کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:۔

"اس محل میں عامی آدمی اگر پہونچتا ہے، تو بڑی سخت ایمانی آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور عارف اس کو دیکھ کر ان نعمتوں کو یاد کرتا ہے، جن کا وعدہ جنت میں نیک لوگوں کے لیے کیا گیا ہے۔"

یہ محل کیا تھا؟ تفصیل کے لیے تو مقدسی ہی کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو کچھ اس نے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ سال بھر کے تین سو ساٹھ دنوں کے لیے الگ الگ قصر تعمیر کیے گیے تھے، عضد الدولہ سال کا ہر دن اس طریقہ سے نئے ایوان میں گذارتا تھا، ان ایوانوں، یا قصور اور محلات کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر محل اپنا خاص رنگ رکھتا تھا، مقدسی کا بیان ہے کہ:۔

"کسی محل کا رنگ سنہرا تھا، کسی پر چینی کے برتن کا پلاسٹر کیا گیا تھا، کسی پر سیپی کا رنگ چڑھایا گیا تھا۔ بعضوں پر مختلف رنگ کے پتھروں کا رنگ تھا، در و دیوار پر ان کے اسی طرح مختلف قسم کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، اور ان کی چھتوں کے اطراف و جوانب میں موزوں مقامات پر قبے بنائے گیے تھے۔"

یہ بھی مقدسی ہی کا بیان ہے، کہ:۔

"ان ایوانوں کی بالائی منزلوں میں پانی پہونچانے کے لیے پچھ میل دور سے کاٹ کر ایک خاص نہر لائی گئی تھی، اور تحتانی منزلوں کے مکانات جو عموماً خس پوش

تھے ان پر بالائی منزلوں میں دوڑنے والا پانی بارش کی طرح برستا رہتا تھا، اسی لیے نیچے کے یہ سارے مکان تر اور ٹھنڈے رہتے تھے، اور یہی پانی مکانوں سے گذرتے ہوئے چمنستانوں میں پھیل جاتا تھا۔ ایک میل سے کاٹ کر ایک دوسری نہر بھی لائی گئی تھی، جس سے ان باغوں اور خیابانوں کی آبیاری ہوتی تھی، جن سے یہ سارا علاقہ ڈھنکا ہوا تھا، مقدسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"دنیا میں پیدا ہونے والے پھلوں اور پھولوں میں شاید ہی کوئی ایسا پھل یا پھول رہ گیا ہو جسے ان ایوانوں کے متعلقہ باغوں میں تم نہ پاتے"۔

ان ہی ایوانوں کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا، جس میں مقدسی کا بیان ہے، کہ کوشش کر کے ہر مصنف کی کتاب کی فراہمی کا سامان حکومت کی طرف سے کیا گیا تھا، الماریوں کا باضابطہ نظام قائم تھا، مفصل فہرست بھی کتابوں کی تیار کی گئی تھی۔ اور کتابوں کی حفاظت، نیز نکالنے اور پہونچانے کے لیے ملازمین بھی حکومت کی طرف سے متقرر تھے، عضد الدولہ نے بڑے بڑے دریاؤں پر بند بھی تعمیر کیے تھے، شیراز ہی کے قریب جو بند اس نے تعمیر کیا تھا، روضۃ الصفا میں اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو کہ:۔

بر بند امیر معروف ست واں عمارتیت کہ در عالم مثل آں نشان نمی دہند	"بند امیر" کے نام سے شیراز کا یہ بند موسوم ہو، یہ ایک ایسی عمارت ہو کہ دنیا جہان میں لوگ کہتے ہیں اسکی مثال نہیں مل سکتی۔

آگے اسی کی تعریف کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی درج کیے ہیں کہ:۔

وصف آں عمارت ہمیں بس است کہ آبے بداں عظمت را بند کردہ و بر بالائے آں رہگذر خلائق ساختہ چنانکہ لشکرہا و کاروانہا بر آں می گذرند۔ (صفحہ ۵۵)	اس تعمیر کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ پانی کے اتنے عظیم ذخیرہ کو اس کے ذریعہ روکا گیا ہو اور اس کے اوپر ایک ایسا رہگذر بنایا گیا ہو کہ فوجی لشکر اور تجارتی قافلے اس پر گذرتے رہتے ہیں۔

گویا اس زمانہ میں بڑے بڑے دریاؤں کے باندھنے کا جو طریقہ مروج ہے جن کی خبریں عام طور پر روزناموں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ عضد الدولہ صدیوں پہلے اس سلسلے میں اپنی ایک بہترین یادگار چھوڑ گیا ہے۔ بغداد میں بھی اور شیراز میں بھی بڑے بڑے شفاخانے اس کی طرف سے جاری تھے، جن میں بقول صاحب روضہ

ہر چہ ما یحتاج الیہ بود از طبیب وادویہ واشربہ مہیا گردانید روضہ ج ۴ ص ۵۷	شفاخانوں میں جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی معالج، دوائیں اور شربت ہر رنگ کے مہیا کیے گیے تھے۔

شیرازی شفاخانے کی عمارت کے متعلق روضہ میں یہ الفاظ درج کیے گیے ہیں کہ:-

زبان از تعریف و توصیف او قاصرست	اس کی تعریف اور توصیف سے زبان قاصر ہے۔

اپنی عظمت وجلالت کی دھاک بٹھانے کا عجیب وغریب ذہنی وعلمی سلیقہ عضد الدولہ میں تھا، قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کو مرعوب کرنے کے لیے لکھا ہے کہ لوہے کی کسی صندوق میں قدیم یونانی زبان اور حروف میں پرانے کاغذات پر بطور پیشگوئی کے بہت سی گذری باتوں کو لکھواتے ہوئے اسی سلسلے میں یہ بھی لکھوایا کہ آنے والے دنوں میں ایک بادشاہ عضد الدولہ نامی نمودار ہونے

ف۱ کچھ دن ہوئے کہ یورپ کے مورخین کو اس کا پتہ چلا ہو کہ پرانوں کے نام سے ہندوستان میں جو کتابیں پائی جاتی ہیں ان میں تاریخی واقعات پیشین گوئی کی صورت میں بیان کیے گیے ہیں۔ (تاریخ قدیم ہند وُنسنٹ اسمتھ کا اردو ترجمہ ص ۲۶) اس مسئلہ کی سُراغ رسانی کے بعد پرانوں کی قدر وقیمت اب بڑھ گئی ہو۔ یہاں کے برہمن اپنی کتابوں میں قدامت کا تقدس پیدا کرنے کے لیے یہ کیا کرتے تھے کہ گذرے ہوئے واقعات کو مستقبل کے صیغے میں ادا کرتے تھے اور کتاب کو کچھ دن کے لیے کسی جگہ رکھ دیتے پھر اعلان کرتے کہ ایک قدیم کتاب برآمد ہوئی ہے۔ جس میں وہ سب کچھ پہلے سے لکھا ہوا تھا جو بعد کو پیش آیا۔

والا ہے۔ جو بڑا جبار بادشاہ ہوگا، اور یہ کہ:۔

معمورۂ عالم در تحت تصرف آورد، وہر بادشاہ کہ کمر اطاعت او بر میان بست وتاج وخراج بوے دہد، از صدمات لشکرش ایمن گردد، وہر کہ در مقام تمرد وعصیاں آید بخسراں وخذلاں مبتلا شود۔

روضہ ج ۴ ص ۵۵

زمین کے سارے آباد علاقوں پر اس کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ بادشاہوں اور حکمرانوں میں جو اس شخص کے یعنی عضد الدولہ کے آگے اپنے آپ کو جھکا دینگے۔ اور خراج دینا قبول کریں گے۔ وہ تو اس کی فوج کی پامالیوں سے محفوظ ہو جائیں گے، اور جو عضد الدولہ سے سرکشی کی راہ اختیار کرے گا وہ ٹوٹے اور مصیبتوں کا شکار ہوگا۔

اندرونی طور پر ایسی ترکیبیں کی گئیں کہ قسطنطنیہ ہی کے کسی کھنڈر میں یہ آہنی صندوق دفن بھی کرا دیا گیا، اور عیسائی بادشاہ کے سامنے وہ اس شکل میں پیش ہوا کہ فلاں کھنڈر سے یہ مقفل صندوق برآمد ہوا ہے۔ بادشاہ ہی کے سامنے کھولا گیا جس میں وہی عضد الدولہ کا جعلی لکھایا ہوا کاغذ نکلا، ماہرین سے پرانے حروف پڑھوائے گیے، مضمون سے آگاہ ہونے کے ساتھ ہی قسطنطنیہ کا عیسائی بادشاہ سخت مخمصہ میں مبتلا ہو گیا۔ گھبرا کر شاہانہ تحفے تحائف کے ساتھ عضد الدولہ کے پاس اپنے سفراء اس نے روانہ کیے، ان سفیروں سے ملنے کے لیے عضد الدولہ نے کسی تالاب کے ساحل کو متعین کیا۔ شاہی خیمہ خرگاہ جہاں قائم کر دیے گیے تخت پر عضد الدولہ بیٹھا، شاہ قسطنطنیہ کے سفراء پیش ہوئے۔ اتنے میں تالاب کے مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز آنے لگی۔ عضد الدولہ نے اسی وقت حکم دیا کہ مینڈکوں سے جا کر کہا جائے کہ بادشاہ سلامت اس وقت سفراء سے باتیں کر رہے ہیں چاہیے کہ جب تک بادشاہ کا قیام یہاں رہے اپنے ٹرانے کو بند کریں۔ لکھا ہے کہ شاگرد پیشوں نے یہ پیغام مینڈکوں تک سفیروں کے روبرو جوں ہی کہ پہونچایا، سب خاموش ہو گیے، سفراء یہ دیکھ کر حیران ہو گیے، واپس ہو کر شاہ قسطنطنیہ سے وہ سب کچھ جو انھوں نے دیکھا سنا تھا، بیان کیا، اور یہ بھی کہا کہ:۔

حیوانات در قعر بحر از حکم او تجاوز

دریا کی گہرائیوں میں جو جانور رہتے ہیں

نکنند ذفرمان او مانند سلیمان
است کہ بر بحر و بر روا نست

وہ بھی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتے،
گویا حضرت سلیمان علیہ السلام کے مانند خشکی اور
تری میں اس کا فرمان چلتا ہو۔

حالاں کہ واقعہ صرف یہ تھا کہ:۔

مقدارے دارد کہ چوں او را
درآب ریزند وزغ بانگ نکنند

ایک دوا ہو، جسے پانی میں جب ڈال دیا جاتا
ہو تو مینڈک خاموش ہو جاتے ہیں۔

الغرض اپنے آپ کو اونچا کرنے کی جتنی صورتیں عضد الدولہ کی سمجھ میں آتی تھیں بے محابا بغیر جھجکے ان سے وہ مسلسل کام لیتا رہا، دھمکیوں اور سیاسی ڈپلومیسیوں سے جہاں کام نکلتا، وہاں ان سے کام لیتا، اس سلسلہ میں جیسا کہ ذکر کیا گیا تالاب کے مینڈکوں[1] تک سے کام لینے میں وہ نہیں شرماتا تھا۔ نہ مکشوفات اور پیش گوئیوں کے جعلی نتائج کے بنانے میں کسی قسم کا حجاب اسے دامن گیر ہوتا۔ نام اونچا ہو، بلند ہو، سب نیچے چلے جائیں، سب سے اونچا میرا ہی سر نظر آئے۔ اس راہ میں جہاں تخویف و تہدید کی ضرورت ہوتی وہاں ان ہی تدبیروں سے کام لیتا اور جہاں ضرورت ہوتی کہ لوگوں کو ممنون کرم بنا کر ہر دل عزیزی حاصل کی جائے وہاں وہ سب کچھ کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا تھا جس سے آج تک رائے عامہ کی ہمواری میں کام لیا جاتا ہو۔ اس نے مکہ معظمہ جانے والی سڑکوں کے ان کنوؤں، تالابوں کو صاف کرایا جو دست و برد ایام سے پٹ گئے تھے، نئے پروجکٹ اور سیرابی و زرخیزی کے لیے نئے نئے باندھ باندھ کر بڑے بڑے کام اس نے انجام دیے۔ حالانکہ خود شیعی العقیدہ تھا، لیکن اس کی حکومت سہولت رسانیوں میں مذہب و ملت کے تفرقہ کو حائل ہونے نہیں دیتی تھی۔ شیعی، سنی، معتزلی، الغرض ہر قسم کے مسلمان بھی اس کے خوان کرم کے زلہ باروں میں شریک تھے۔ اور یہودی عیسائی صابی اور جس دین کے لوگ بھی اس رقبہ سلطنت میں آباد تھے سب ہی کی دل دہی اس کی عام پالیسی تھی، ہر مذہب کے اہل کمال کا مرجع اسکا دربار بنا ہوا تھا، اسی لیے دیالمہ کی سب سے زیادہ ضخیم و مفصل و مبسوط تاریخ صابی مذہب کے ایک اہل قلم نے لکھی تھی۔ روضۃ الصفا میں ہے کہ

صابی کتاب تاجی در اخبار آل بویہ بنام
او نوشتہ است　　ص۵۳

تاجی نام کی ایک کتاب آل بویہ کی تاریخ
میں صابی نے لکھی ہے۔

---

[1] روضہ میں وزغ کا لفظ لکھا ہو، میں نے اسکا ترجمہ مینڈک کر دیا۔ دراصل مینڈکوں میں ایک بڑی قسم کا مینڈک زرد اور سبز رنگ کا ہوتا ہو، ہمارے یہاں بہار میں اس کو "ڈھونس" کہتے ہیں، واللہ اعلم مینڈکوں کی اس بڑی قسم کو دوسری جگہ کیا کہتے ہیں، ابتداء برسات میں بڑی ہنگامہ خیز آوازوں کے ساتھ یہ چیختا چلاتا رہتا ہو۔

باایں ہمہ اپنے عزائم اور غیر معمولی پروگراموں کی تکمیل کے لیے حصول زر کی راہوں میں بڑی خردہ گیریوں اور دور بینیوں سے کام لیا کرتا تھا، عام ضرورت کی بہت سی چیزوں کی تجارت کو براہ راست اسکی حکومت اپنے قبضہ میں کیے ہوئے تھی، حد یہ تھی کہ اس زمانہ میں "مصنوعی برف" کا تو رواج نہیں تھا، پہاڑوں کی چوٹیوں سے موسم سرما میں لوگ برف کا ذخیرہ گڑھوں میں جمع کر کے گرمیوں میں بیچا کرتے تھے۔ یہ غریبوں کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا، عضد الدولہ کی نظر ایسی خفیف خفیف چیزوں پر بھی پڑتی تھی، لکھا ہے کہ :-

عمل ثلج را مخصوص بدیوان اعلیٰ ساخت چناں چہ	برف کے کاروبار کو اس نے دیوان اعلیٰ کے ساتھ مختص
گماشتگان او ثلج از کوہ می آوردند و بفقاعیان	کردیا تھا، اس کے گماشتے پہاڑ سے برف منگوا لیتے، اور
طرح می دادند (روضۃ ص۳۰)	شربت فروشوں کے ہاتھ فروخت کرتے۔

ان سارے قصوں میں اپنی دھن کا وہ پکا تھا، جب تک جیتا رہا بس ایک ہی خیال میں مست رہا کہ کسی کا ہاتھ مجھ سے اوپر نہ ہو، جہاں تک ممکن ہو سب کو اپنے نیچے دبا کر رکھا جائے۔ عربی زبان میں بھی شاعری کرتا تھا، اپنے عزم اور ارادے کی پختگی کو ظاہر کرتے ہوئے اس نے چند شعر لکھے تھے جن میں ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے :-

"میں عضدی عزم اور ارادے کی پشت پر سوار ہو جاتا ہوں۔ اور اونچی اونچی ناکوں کو خاک میں رگڑ رگڑ ڈالتا ہوں۔"

گویا اپنے ارادہ کا نام ہی اس نے "عضدی عزم" رکھ چھوڑا تھا جس کا پورا ہونا بہرحال ضروری تھا۔ لیکن پچاس بہاریں زمین کے اس کرے پر گذرنے نہ پائیں۔ پچاس کی عمر تک پہونچنے کے لیے ابھی تین سال باقی تھے کہ مرگی کے حملہ کا شکار ہوا، علاج و معالجہ کی تمام ممکنہ صورتیں اختیار کی گئیں، لیکن طبی امدادوں سے کس کی جان پہلے بچ سکی جو عضد الدولہ کے بچا لینے میں کامیاب ہوتیں، حملوں پر حملے مرگی کے ہوتے رہے، تا آنکہ آخر ایک دن دیکھا گیا کہ عربی زبان کے شاعر قاسم بن عبید اللہ کے مشہور قصیدے کے اشعار اس کی زبان پر جاری ہیں جن کا اردو ترجمہ یہ ہے :-

"اپنے وقت کے بادشاہوں کو پچھاڑ پچھاڑ کر میں نے مار گرایا۔ پورب پچھم جدھر بھی وہ بھاگ نکلے، میں نے ان کو تتر بتر کر کے رکھ دیا لیکن آہ! میرے اقبال کا ستارہ عروج کی جب آخری بلندیوں پر پہونچ گیا، تو اچانک زمانہ کے ناگہانی تیر نے گھائل کر کے مجھے گرا دیا۔ اب میں ہوں اور گور کا گڑھا میرے سامنے ہے۔ آج مجھ سے زیادہ بدبخت اور کون ہوگا جس کی دنیا بھی برباد ہوئی اور اپنی الٰہی کا شکار ہو کر اپنے دین کو بھی وہ کھو بیٹھا۔"

ان ہی اشعار کو پڑھتا، سکرات الموت کے غوطوں میں ڈوب جاتا، سننے والے یہ بھی سن رہے تھے کہ غوطوں کے افاقہ کی گھڑیوں میں اس کی زبان پر قرآنی آیت

ما اغنیٰ عنی مالیہ هلک عنی سلطانیہ — میرا مال مجھے کچھ کام نہ آیا، میرا اقتدار مجھ سے چھن کر برباد ہوگیا

ان ہی فقروں کو دہراتے ہوئے، ۴۷ سال کی عمر کا اندوختہ ذخیرہ دم توڑنے کے ساتھ ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر وہاں چلا گیا جہاں سے اب کبھی واپس نہ ہوگا۔

کوئی نہیں جانتا کہ عضد الدولہ کون تھا۔ کہاں مرا۔ کہاں گڑا۔ اور اب اس پر کیا گذر رہی ہو، مورخین نے اطلاع دی ہو کہ اپنی وصیت کے مطابق نجف اشرف میں دفن کر دیا گیا تھا۔

رہنے کے لیے سال کے ہر دن میں نئے ایوان کی جسے ضرورت تھی، صدیوں سے وہ چند گز زمین کے اندر اپنی ہڈیوں کو لیے پڑا ہے۔ شاید اب تو اس کی ہڈیاں بھی زمین کے کیمیائی عمل کے نذر ہو چکی ہوں گی۔

"دوسرا مرقع"

چند صدیاں پیچھے چلے آیئے، پہلا مرقع چوتھی صدی ہجری کا تھا، شیراز ملک ایران میں جس کا تماشا کیا گیا تھا، یہ دوسرا مرقع جس کی نقاب کشائی کا شرف اب حاصل کیا جا رہا ہے ہمارے ملک ہندستان ہی میں اس وقت پیش آیا تھا، جب ہجری کی آٹھویں صدی گویا ختم ہو رہی تھی، سنی سنائی روایتوں سے یہ مرقع تیار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تصویر کھینچنے والے نے یہ تصویر کھینچی تھی، جو حسن اتفاق سے دستیاب ہو گئی ہے۔

ہندستان کے صوبوں میں ایک صوبہ بہار بھی ہے، لیکن جیسے کابل ملک کے نام کے ساتھ اسی ملک کی ایک آبادی کا بھی نام ہے، اسی طرح بہار کے صوبہ میں بھی ایک آبادی اس وقت تک "بہار" کے نام سے پائی جاتی ہے، جو اسلام، اور قبل اسلام دونوں زمانوں میں اپنی ایک خاص تاریخ رکھتی ہے اب وہ چند ہزار کی ایک معمولی آبادی ہے، فقیر کے کہنی گوشہ گیلانی سے بجانب مغرب پانچ کوس کے فاصلہ پر یہ آبادی واقع ہے۔ انگریزی عہد میں اس علاقہ کا سب ڈویژن اسی قصبہ کو قرار دیا گیا تھا، اس کے نام بہار کے ساتھ شریف کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، ڈاک خانہ کی مہر میں بھی "بہار شریف" ہی کا ٹھپہ انگریزی عہد ہی میں منظور کر لیا گیا تھا،

جس ذات شرافت سمات کے انتساب نے بہار شریف کے اس قصبہ کو شریف بنا دیا۔ یہ ان ہی کا آخری وداعی نظارہ ہے۔ حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری قدس اللہ سرہ کے نام سے آپ مشہور ہیں، ہندستان کے اساطین صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں، مکاتیب کے نام سے دین کے مختلف عنوانوں پر مقالہ نگاری کی ابتدا، جہاں تک میری تحقیق ہے آپ ہی نے کی۔ ان مقالات طیبہ کے مختلف مجموعے مکتوبات یک صدی، دو صدی کے نام سے عام طور پر اہل ذوق و مطالعہ میں متداول ہیں۔ اور بھی بہت کتابوں کے مصنف ہیں۔ فارسی نثر نگاری میں ہندستان کی سرزمین شاید ہی ان کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ ایک سو اکیس سال کی طویل عمر حضرت مخدوم کی سلطان نصیر الدین محمود کے عہد سے فیروز تغلق کے عہد تک گذری۔ اس طویل عرصہ میں مسلسل گیارہ بادشاہوں کے بیسیوں سیاسی جھونکوں سے ملک کو گذرنا پڑا، بڑے بڑے انقلابات ہوئے، حکومت کے خانوادوں پر خانوادے بدلتے چلے گئے۔ لیکن اللہ کا یہ راستباز بندۂ بہار کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا کچھ تو کتابیں لکھتا رہا اور کتابوں سے زیادہ زندہ انسانیت کے غلط سوداات کی کاٹ پیٹ، اصلاح و ترمیم میں یک سوئی کے ساتھ مشغول رہا، تا آنکہ ایک سو اکیس سال کے بعد وہی "ناگزیر وقت" انک میت و انھم میتون کا اس کے سامنے بھی آہی گیا، خدام خاص میں زین بن بدر عربی ایک صاحب تھے، ناگزیر گھڑی جس وقت گذر رہی تھی، وہ بھی موجود تھے۔ ان کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، کان جو کچھ سن رہے تھے، دل ان کا جو کچھ پا رہا تھا۔ سب ہی کو ان ہی زین بن بدر عربی نے قلم بند کر لیا تھا۔ جو الحمدللہ اس وقت تک کہیں نہ کہیں مل ہی جاتا ہے۔ اسی کی تلخیص مخدوم الملک بہار رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری "سیرت الشرف"[1] نامی سے نقل کر رہا ہوں۔

مخدوم الملک بہار رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۶ شوال ۷۸۲ھ میں نماز عشا کے وقت ہوئی — چہار شنبہ کا دن گذر چکا تھا، پنجشنبہ کی رات تھی۔ زین بن بدر عربی نے لکھا ہے کہ چہار شنبہ کی صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد تکیہ لگا کر حجرے میں گدے پر تشریف فرما تھے۔ کچھ لوگ حاضر تھے۔ کہ آپ نے

---

[1] مرحومہ سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے پرائیوٹ سکریٹری مولوی ضمیر الدین بہاری مرحوم نے مدت ہوئی یہ کتاب مرتب کی تھی، فارسی و عربی کے سوا وہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے، حسن عقیدت کے ساتھ ساتھ جدید تنقیدی رجحانات سے اثر پذیر ہونے کی وجہ سے کسی "ہندی صوفی" کی عصری قالب میں شاید یہ پہلی سوانح عمری لکھی گئی تھی، آج سے باون سال پہلے ۱۹۰۱ء میں کتاب طبع ہوئی تھی، افسوس ہو کہ اب نہیں ملتی، کاش! کسی ناشر کو اس کتاب کی اشاعت جدید کی توفیق ہو۔ پڑھنے کی کتاب ہے۔ ۱۲

لاحول ولاقوۃ الا باللہ، کا ورد خود شروع کیا، اور جو موجود تھے ان سے اسی "کنز من کنوز الجنۃ" کو دہرانے کی فرمائش کی، پڑھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "ملعون! اس وقت مجھے پھسلانا چاہتا ہے، مگر میں اور تیری طرف جھانکوں" معاً اسی کے بعد الحمد للہ الحمد للہ، المنۃ للہ المنۃ للہ، کا ورد باآواز بلند شروع کیا۔ خاص حاضر باشوں کے متعلق تشفی و تسلی کے کلمات کے بعد قرآنی آیت

لاتقنطوا من رحمۃ اللہ	نہ مایوس ہونا اللہ کی رحمت سے، بلاشبہ
ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا۔	تمام گناہوں کو وہ بخش دیتا ہے۔

کی تلاوت میں مشغول ہوئے، کبھی کبھی اسی کے ساتھ فارسی کا یہ شعر بھی زبان مبارک پر جاری ہو جاتا

خدایا رحمتت دریاے عام ست
ازآنجا قطرۂ ما را تمام ست

اس سلسلہ میں کبھی کبھی یہ فقرہ بھی نکل جاتا

ماھماں دیوانہ ایم ماھماں	ہم وہی دیوانے ہیں، ہم وہی
دیوانہ ایم	دیوانے ہیں۔

حاضرین سے خطاب کرکے پوچھا گیا۔ تم سے اگر دریافت کیا گیا تو کیا کہوگے؟

جواب خود ہی یہ بتاتے "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللہِ اِنَّ اللہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا"

بس یہی لایا ہوں، یہی اپنے ساتھ بھی لیے جارہا ہوں، اچانک آواز آنے لگی

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی
وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ	الٰہ و معبود نہیں ہو تنہا ہی ہو۔ اس کا
اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ	کوئی ساجھی نہیں اور میں گواہی دیتا
	ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے
	رسول ہیں۔

اسی کو دہراتے ہوئے سنا گیا کہ فرماتے ہیں:۔

رضیت باللہ ربا، وبالاسلام دینا، وبمحمد علیہ السلام نبیاً وبالقرآن اماما وبالکعبۃ قبلۃ

میں خوش ہوں، اللہ کو رب، اسلام کو دین، محمد علیہ السلام کو نبی، قرآن کو پیشوا و امام، کعبہ کو قبلہ بنا کر

اسی کے ساتھ یہ اضافہ بھی سننے والوں کے کانوں تک پہونچا۔

وبالمومنین اخوانا وبالجنۃ ثوابا وبالنار عقابا۔

یعنی خوش ہوں ایمان والوں کو بھائی بنا کر، جنت کو ثواب اور جہنم کو سزا مان کر۔

آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، مولانا آموئی نامی کوئی بزرگ تھے۔ جب وہ سامنے آئے، تو مخدوم الملک بہار نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر سینہ مبارک پر ملتے ہوئے فرمایا تم نے میری بڑی خدمت کی

خاطر جمع رکھو، ہم سب ایک ہی جگہ ہوں گے،

اور فرمایا کہ

کل تم سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا لائے؟

جواب میں پھر وہی سکھایا۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفرالذنوب جمیعا

فرما رہے تھے۔ "مجھ سے بھی پوچھا جائے گا تو یہی کہوں گا"

مولانا آموئی سے کہا کہ دوسرے جو منتظر ہیں ان سے بھی کہہ دو، کہ خاطر جمع رکھیں،

"اگر میری آبرو رہے گی۔ تو کسی کو نہ چھوڑوں گا"

ٹھٹ لگی چلی جاتی تھی، مخدوم الملک بہار کو پھر اپنا پرانا مشغلہ یاد آجاتا ہے۔

"ایمان کا غم کھاؤ، رحمت و مغفرت کے امیدوار رہو"

اور وہی آیت قرآنی لاتقنطوا الآیۃ بار بار زبان پر جاری ہے۔

مجمع کی طرف خطاب کر کے یہ بھی ارشاد ہوا۔

میں جو کہا کرتا تھا، عاقبت عاقبت (انجام انجام) وہ یہی عاقبت (انجام) ہے۔

عزیزوں میں نوعمر کوئی بچہ سامنے بیٹھا تھا حکم ہوا کہ قرآن کچھ یاد ہو تو سناؤ، اس نے محمد رسول اللہ والذین معہ" سورہ فتح کے خاتمہ کی آیتیں تلاوت کرنی شروع کیں۔ سنبھل کر دو زانو ہو کر جیسے قرآن سننے کے وقت ہمیشہ دستور تھا، بیٹھ گیے، تلاوت ختم ہوئی، بچے کو شاباشی دی گئی۔

وقت گذر رہا تھا۔ پانی طلب کیا گیا، انگا اتارا گیا۔ قمیص کے ساتھ وضو، میں مشغول ہوئے، لیکن آج کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ ایک سو اکیس سال تک وضو کی مشق کرنے والے کو دیکھا گیا کہ منہ کا دھونا بھول گیے، یاد دلایا گیا۔ پھر از سر نو وضو کا اعادہ کیا گیا۔[1] بدن پر ارتعاش طاری تھا، پاؤں دھونے میں لوگوں کو محسوس ہوا کہ قابو نہیں چل رہا ہو مدد کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اشارہ سے روک دیے گیے، اور جس طرح ممکن ہوا اپنے اس آخری وضو کو خود ہی پورا فرمایا۔ کنگھی طلب کی گئی، محاسن مبارک کے بال سلجھائے گیے اور دو رکعت نماز ادا کی گئی۔

کچھ زیادہ دفعہ نہیں گذرا تھا کہ بسم اللہ کے ساتھ

لا الہ الا انت سبحانک	کوئی الٰہ نہیں ہے مگر تو ہی، پاک ہے تیری
انی کنت من الظالمین	ذات میں ہی تھا ظلم کرنے والوں (حد سے تجاوز کرنے والوں) میں۔

تسبیح یونسی کا اعادہ بار بار فرمانے لگے۔

اسی کے ساتھ کبھی کبھی بسم اللہ، کلمہ شہادت، حوقلہ (یعنی لاحول ولاقوۃ الا باللہ) کا ورد بھی درمیان میں کرتے، اسی قسم کے کلمات طیبات زبان مبارک پر جاری تھے کہ

---

[1] حالات میں ان کے لکھا ہے کہ ایام جوانی میں جب راجگیر کی پہاڑیوں کے دامن میں آپ مجاہدہ و ریاضتوں میں مشغول تھے۔ غسل کی ضرورت موسم سرما میں پیش آگئی، ٹھنڈے پانی کے تالاب میں غسل کیا۔ لیکن پھر ضرورت پڑی، بار بار غسل کرتے، اور ضرورت ہو جاتی ۔۔۔

اچانک

"محمد رسول اللہ"

کی صدائے پر درد سینۂ بریاں سے اٹھی، اسی نعرے کے ساتھ جس کا چند بار اعادہ کیا گیا، کہ

"محمدؐ، محمدؐ، محمدؐ"

آوازسے فضا گونج اٹھی، کفرستان ہند میں محمد کا ایک غلام اپنے آقا کو پکار رہا تھا، ہائے جس پر جس کے نام پر اپنی ایک سو اکیس سال کی عمر نذر کر دی۔

سکون کی سی کیفیت اس کے بعد پیدا ہوئی، دعاء عیسوی

اللھم ربنا انزل علینا مائدۃ	اے اللہ! اے رب ہمارے! اتار ہم پر ایک
من السماء تکون لنا عیداً لاولنا	خوان بھرا آسمان سے کہ وہ دن عید رہے
وآخرنا وآیۃ منک وارزقنا	ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لیے اور نشانی
وانت خیر الرازقین۔	تیری طرف سے ہو۔ اور روزی دے ہم کو

اور تو ہی بہتر روزی دینے والا

سنی گئی، کہ مانگی جارہی ہو، دعاء عیسوی ختم ہوئی، پھر "اللہ ہی کو رب بنا کر پسند کرلیا، اسلام کو دین، محمد کو نبی، قران کو امام، کعبہ کو قبلہ، ایمان والوں کو بھائی" یعنی رضیت باللہ ربا، کے اقرار کو تازہ فرماتے ہوئے دکھیا گیا کہ دست مبارک آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں، اور عرض کیا جارہا ہو، سینئے یہ مسلمانوں کے مخدوم کی زبان کے آخری کلمات ہیں۔

اللھم اصلح امۃ محمد صلی اللہ	اے اللہ سنوار محمد کی امت کو، اے اللہ رحم کر
علیہ وسلم، اللھم ارحم امۃ	محمد کی امت پر، اے اللہ بخش دے محمد کی امت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم،	کو، اور اے اللہ درگزر فرما محمد کی امت
اللھم اغفر لامۃ محمد، اللھم	سے، اے اللہ فریادرس محمد کی امت کی
تجاوز عن امۃ محمد، اللھم	اے اللہ مدد فرما محمد کی امت کی،

اغث امة محمد. اللهم اعن امة محمد، اللهم فرج عن امة محمد عاجلا.	اے اللہ محمد کی امت کی مصیبت کو ٹال، جلدی ٹال۔

اور آخر میں

اللهم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللهم اخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم	اے اللہ مدد کر اس شخص کی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد کرے اور تباہ کر اس کو جو محمد کے دین کی تباہی کے درپے ہو، اپنی رحمت سے ایسا ہی کر، اے سارے مہربانوں سے سب سے بڑا
برحمتك یا ارحم الراحمین	مہربان“

سارے جہان سے الگ ہو کر ہندوستان کے مختلف گوشوں، اور زاویوں میں جو بیٹھے ہوئے تھے وہ کن کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ کن کا کام کرتے تھے؟

کہنے والے آج اللہ کے ان برگزیدوں، امت محمدؐ کے ان چاہنے والوں کی شان میں جو چاہیں کہیں، جن بدگمانیوں سے اپنے آپ کو گندہ اور ناپاک کریں۔

لیکن ان واقعات کا ان کو اگر صحیح علم ہو، تو یورپ کی سکھائی ہوئی قولی "عشق بازی" میں ان کو وہ روح نہیں ملے گی، جو مرنے والے کے ان زندہ کلمات میں مل رہی ہے۔ آواز کہتے ہیں، اسی آخری دعاء کے بعد پست ہو گئی، کان لگانے والوں نے صرف اتنا اور سنا، کہ لب جو ہل رہے تھے اس سے

لاخوف علیهم ولا هم یحزنون	نہ ڈر ہی ہو ان کو اور نہ کڑھیں گے۔
لا الٰہ الا اللہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	لا الٰہ الا اللہ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارتعاشی تموجات ان کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے، زندگی کی ایک منزل کے اختتام کے بعد شاید دوسری منزل میں قدم رکھتے ہوئے پانے والا جو کچھ پا رہا تھا، کیا اسی کی یہ تعبیر تھی؟ گویا

سمجھنا چاہیے کہ زندگی کی یہ دوسری منزل جو خوف وحزن سے پاک تھی اور وہی اللّٰہ جو خاکی زندگی کے ابتدائی دور میں "اِلٰہ" بناکر ایک سو اکیس سال تک پوجا گیا تھا، وہی جزائی رنگ میں اِلٰہ بن کر سامنے آگیا تھا، اسی لیے زندگی کی اس نئی اور جدید منزل میں قدم رکھنے والے نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ہوئے قدم رکھا، سننے اور سنانے کا سارا قصہ آخری انجام، اور جدید آغاز پر ختم ہوگیا، تغمدہ اللہ بغفرانہ، وصب علیہ شآبیب ضوانہ۔

سلسلۂ تاریخ دعوت و عزیمت

ساتویں صدی کا ایک باعظمت عالم

شیخ الاسلام عزّ الدین بن عبد السلام

سلطان صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں، ان کی علمی و دینی سرپرستی، جابجا دینی مدارس کے قیام، نیز شیعی اثرات کے اضمحلال اور سنی العقیدہ سلاطین کی حکومت کے اثر سے علمی و عملی زندگی میں تازگی پیدا ہوئی، اور علوم شرعیہ کے تعلیم و تعلّم اور ان میں کمال پیدا کرنے کی طرف عالمِ اسلام میں از سرِ نو توجہ ہوئی، اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوتِ و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، اور حکومت اور زمانہ کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا، ان میں سب سے زیادہ باعظمت شخصیت شیخ الاسلام عزالدین بن عبد السلام (م ۶۶۰ھ) کی ہے جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی دبیباکی میں نادرۂ روزگار اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔

عزالدین بن عبد السلام دمشق میں ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے، اساتذۂ دمشق اور مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی، جن میں "فخر الدین بن عساکر" "سیف الدین آمدی" "حافظ ابو محمد القاسم بن عساکر" جیسے اجلۂ علماء و اساتذۂ وقت تھے، بعض روایتوں کے مطابق انھوں نے جوانی میں پڑھنا شروع کیا، لیکن جلد تمام علوم میں تبحر حاصل کر لیا، اور انکے معاصرین نے ان کی علمی جلالتِ شان اور عظمت کا اعتراف کیا۔ علامۂ ابن دقیق العید نے اپنی بعض تصانیف میں ان کو سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ جب ۶۳۹ھ میں مصر تشریف لے گئے، تو حافظ عبد العظیم المنذری صاحب کتاب "الترغیب و الترہیب" نے فتویٰ دینے سے معذوری ظاہر کی، اور کہا کہ جس شہر میں عزالدین بن عبد السلام ہوں وہاں دوسرے کے لئے فتویٰ دینا درست نہیں۔ شیخ جمال الدین بن الحاجب کا قول ہے کہ فقہ میں شیخ عزالدینؒ کا پایہ امام غزالیؒ سے بلند ہے[1]۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ - ج ۵ -

ذہبی اپنی کتاب "العبر" میں لکھتے ہیں :-

انتهت اليه معرفة المذهب مع الزهد والورع و بلغ رتبة الاجتهاد[1]	فقہ کے علم اور زہد و ورع میں ان کو کمال حاصل تھا اور درجۂ اجتہاد کو پہونچے ہوئے تھے،

شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے عرصے تک دمشق میں "زاویۂ غزالیہ" میں درس دیا، "جامع اموی" میں خطابت و امامت کے منصب پر عرصے تک فائز رہے، شیخ شہاب الدین ابوشامہ کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے بہت سی بدعات کا ازالہ ہوا، جو ان کے زمانہ میں رواج پذیر ہوگئی تھیں، صلاۃ الرغائب اور نصف شعبان[2] کی کھل کر مخالفت کی اور ان کو بدعت ثابت کیا جبکہ بعض اکابر علماء ان کے بارے میں ساکت اور متردد تھے۔ "الملک الکامل" نے دمشق کے عہدۂ قضا کے لئے بڑا اصرار کیا شیخ نے بڑی شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کیا، اسی عرصے میں ایک بار وہ الملک الکامل کی طرف سے دربارِ خلافت (بغداد) میں سفیر بن کر گئے۔

سلاطین کو صلاح نیک، اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

شیخ عزالدین کی شخصیت شام میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی، جس کا سلاطینِ وقت تک احترام کرتے تھے، وہ بڑے باوقار، بارعب اور خوددار تھے، اُنھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا درباداری کرنا گوارا نہیں کیا، جب کبھی بادشاہِ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی، تو تشریف لیگئے، اور اُس کو صحیح مشورہ دیا، اور اُسکی اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

سُلطان الملک الاشرف نے مرض الموت میں اپنے سب سے بڑے عہدے دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا، اور کہلایا کہ آپ کا محب موسیٰ بن الملک العادل ابوبکر سلام عرض کرتا ہے، اور عیادت اور دُعا کی درخواست کرتا ہے،

---

[1] حسن المحاضرہ للسیوطی ص ۱۳۱ ج ۱۔

[2] صلاۃ الرغائب ایک نماز تھی جو ستائیسویں رجب کو بارہ رکعتوں[12] خاص ترکیب سے اکیسویں شب کو پڑھی جاتی تھی، اور اسکی بڑی فضیلت بیان کیجاتی تھی، یہ نماز ۴۴۸ھ میں ایجاد ہوئی اور عام بدعات کی طرح تیزی سے پھیل گئی، شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اسکے ظہور کی پوری تاریخ لکھی ہے، ملاحظہ ہو اتحاف السادۃ ج ۳ ص ۴۲۲-۴۲۳
نصف شعبان پندرھویں شب کو سو رکعتیں خاص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، علماء اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں بدعت ہیں، ابن سبکی نے اس کو بدعتِ مذمومہ لکھا ہے، امام نووی نے اس کیلئے موضوع، منکر اور قبیح کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ (اتحاف ص ۴۲۶ ص ۴۲۷ ج ۳)

اور چاہتا ہے کہ آپ اس کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیں، جو کل خدا کے سامنے اسکے کچھ کام آئے، شیخ نے سنکر کہا کہ یہ عیادت افضل عبادت ہے، اسلئے کہ انشاء اللہ اس کا نفع متعدی ہے، چنانچہ تشریف لیگئے، سلطان انکی تشریف آوری سے بیحد مسرور ہوا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اس سے پہلے سلطان کو کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی، اور سلطان عرصہ تک ان سے ناراض رہا تھا[1] سلطان نے اس کی معافی چاہی اور کہا کہ آپ مجھے معاف فرمادیں، میرے لئے دعا بھی فرمائیں اور مجھے کچھ نصیحت بھی فرمائیں، شیخ نے فرمایا کہ جہاں تک معاف کرنے اور بازپرس نہ کرنے کا تعلق ہے میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں، اور اس وقت سوتا ہوں جبکہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق یا مطالبہ یا شکایت باقی نہیں رہتی، اور میرا اجر مخلوق کے بجائے اللہ کے ذمہ ہوتا ہے، فمن عفی و اصلح فاجرہ علی اللہ - باقی رہی دعا، تو میں سلطان کے لئے اکثر دعا کیا کرتا ہوں، اسلئے کہ اسکی صلاح میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و فلاح ہے، اللہ تعالیٰ سلطان کو ان امور کی بصیرت عطا فرمائے جن سے وہ خدا کے سامنے سرخرو ہو، رہی نصیحت تو اب وہ سلطان کی آمادگی اور تقاضے کی وجہ سے فرض واجب ہوگئی ہو، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کی فتوحات اور دشمنوں پر غلبہ کی دھوم ہے اس وقت حالت یہ ہو رہی ہو کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جارہے ہیں، ان کو اس بات سے شہ ملی ہے کہ آپ کو اسوقت اللہ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کرنے کی فرصت نہیں، اس وقت آپ کا رخ الملک الکامل سے جنگ کرنے کی طرف ہے، اور آپ ان کے مقابلے کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، الملک الکامل آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتے دار ہیں، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنا رخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹاکر دشمنانِ اسلام کی طرف پھیرلیں، اور اس اخیر وقت میں اپنا رشتہ نہ توڑیں، آپ اللہ کے دین کی مدد اور اسکی سربلندی

---

[1] چھٹی ساتویں صدی میں اشعریت وحنبلیت کے اختلاف نے (باوجود بنیادی اتحاد کے) تقریباً وہ شکل اختیار کرلی تھی جو چوتھی صدی میں اعتزال وسنیت کے اختلاف کی تھی، اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے، اور حنابلہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے ہر گروہ خوش نیتی کیساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت و شریعت کیساتھ خیرخواہی سمجھتا تھا، لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دیدیا گیا، اور رائی کا پہاڑ بن گیا، تحزب و تعصب نے اس کو بھی کفر و ایمان کا معیار قرار دیدیا، شیخ عزالدین کے زمانہ میں یہ مباحث بڑی شدت اختیار کرچکے تھے، وہ عقیدۃً و علماً اشعری تھے، الملک الاشرف حنابلہ کا معتقد اور حنبلیت کی طرف مائل تھا، ابتدا میں اس کو شیخ سے بدگمانی اور شکایت پیدا ہوئی، لیکن شیخ کی ملاقات اور تفصیلی معلومات کے بعد اسکی بدگمانی دور ہوگئی، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبقات ج۵

کی نیت کریں، اگر اللہ تعالیٰ سلطان کو صحت عطا فرماتا ہے تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی اُمید رکھتے ہیں اور آپ کے نامۂ اعمال میں یہ سعادت لکھی جاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کا کچھ اور فیصلہ ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کیساتھ دنیا سے جاتے ہیں۔

سلطان نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اس بروقت تنبیہ اور مخلصانہ مشورے پر جزائے خیر عطا فرمائے، اُسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رُخ بجائے مصر کے (جو الملک الکامل کی جانب تھا) تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے، اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے مقام قُصیرہ میں پڑاؤ ڈالے، چنانچہ دن کے دن اسکی تعمیل ہوئی، اور لوگوں کو معلوم ہو گیا، کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔

الملک الاشرف نے مزید نصیحت کی فرمائش کی، شیخ نے فرمایا کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے اور نائبینِ سلطنت اور اہل کارانِ حکومت رنگ رلیاں کر رہے ہیں، شراب کے دَور چل رہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے، نئے نئے محاصل اور ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جا رہے ہیں، آپ کے لئے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گندگیوں کو دُور کریں، یہ نئے نئے ٹیکس بند کریں، اور تمام ظالمانہ کارروائیوں کو روک دیں، اور اہل معاملہ کی دادرسی کریں، الملک الاشرف نے اسی وقت ان سب چیزوں کی ممانعت کے احکام جاری کئے، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دینی خدمت اور اس خیرخواہی پر تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے، اور اپنے لُطف و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی معیت نصیب فرمائے، اسی کے ساتھ ایک ہزار دینار مصری نذر کئے، شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی، اور فرمایا کہ میری یہ ملاقات خالصۃً لوجہ اللہ تھی، میں اسمیں دنیا کی کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

بادشاہِ شام کے مقابلے میں جرأت و استقامت

الملک الاشرف کے جانشین صالح اسمٰعیل (ابو الجیش) نے الملک الصالح نجم الدین ایوب بادشاہِ مصر کے مقابلے میں (جس کے شام پر حملے کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی اور حق الخدمت کے طور پر ان کو شہر "صیدا" اور "شقیف" اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بناء پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آ کر ہتھیار خریدتے، شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آ کر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں، تاجرانِ اسلحہ نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے، اسلئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے۔

شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حمیتی اور اسلام کی اس ذلّت وبے بسی کا بڑا اثر تھا، انھوں نے بادشاہ کے لئے خطبہ میں دُعا ترک کردی، اسکے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے فارغ ہوکر بڑے جوش کے ساتھ دُعا کرتے تھے کہ الٰہی! اسلام اور حامیانِ اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور ملحدین و دشمنانِ دین کو ذلّت و نکبت نصیب فرما، اور تمام مسلمان بڑی رقت و اثر کے ساتھ آمین کہتے تھے، حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی، شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصے تک محبوس رہے، کچھ عرصے کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کئے گئے۔

اسی اثناء میں سلطان صالح اسمٰعیل، الملک المنصور والیِ حمص اور سلاطین فرنگ اپنی افواج وعساکر کے ساتھ مصر کے ارادہ سے بیت المقدس آئے۔ صالح اسمٰعیل کے دل میں شیخ عزّالدین کی ناراضگی برابر کھٹکتی رہتی تھی، اور اس کو اس کی فکر تھی، اُسنے اپنے عمائد وخواص میں سے ایک شخص کو اپنا رومال دیا اور کہا کہ یہ رومال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا، اور انتہائی خوشامد و استمالت کے ساتھ اُن سے کہنا کہ سابقہ خدمات و مناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آسکتے ہیں، اگر وہ منظور فرمالیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمے کے پہلو میں دوسرے خیمے میں ان کو محبوس کر دینا، امیر نے شیخ سے بڑی خوشامدانہ باتیں کیں، اور انکی تعظیم وتکریم اور ان کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا کے ذرا بادشاہ سے نیازمندانہ مل لیں، اور اس کی دست بوسی کرلیں تو یہ قصہ رفع دفع ہوجائے گا، اور آپ اضافہ و ترقی کیساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آجائیں گے، شیخ نے اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، انھوں نے فرمایا:۔

والله یا مسکین ما أرضاه ان یقبّل یدی فضلا عن أن اقبّل یده،

یا قوم انتم فی واد وانا فی واد، والحمد لله الذی عافانی مما ابتلاکم به۔

اے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے، چہ جائیکہ میں اُسکی دست بوسی کروں؟۔ لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو، میں کسی اور عالم میں! خدا کا شکر ہے کہ میں اُس سے آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔

یہ جواب سنکر امیر نے کہا، کہ پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کرلوں، شیخ نے کہا کہ شوق سے، جو کچھ تم سے ہوسکے اُس سے دریغ نہ کرو! - امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمے میں رکھا، شیخ اپنے خیمے میں قرآن مجید پڑھتے رہتے تھے، اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر سُنتا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا، کہ تم شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سُنتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! کہا جانتے ہو یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (ھذا اکبر قسوس المسلمین) میں نے اس کو اسلئے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعے سپرد کردینے کے خلاف تھا، اور اس پر معترض تھا، میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا، اور اس کو دمشق سے شہر بدر کردیا، اب میں نے تمھاری خاطر پھر اس کو قید کردیا ہے، عیسائی بادشاہوں نے کہا، کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اسکے پاؤں دھو کر پیتے[1]۔

اسی عرصہ میں مصری افواج آئیں، صالح اسمٰعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں، اور شیخ صحیح سلامت مصر روانہ ہوگئے۔

راستے میں جب "کرک" کی ریاست سے گزرنا ہوا، تو والی کرک نے قیام کی درخواست کی، فرمایا، کہ:- تمھارا یہ مختصر شہر میرے علم کا تحمل نہیں ہوسکتا۔

شیخ عزالدین مصر میں

مصر میں سلطان مصر الملک الصالح نجم الدین ایوب نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو بن العاص کا خطیب مقرر کیا، اور الوجہ القبلی مصر کا عہدۂ قضا اور ویران مساجد کی آبادی کا کام سپرد کیا، سلطان نے جب مدرسۂ صالحیہ کی تعمیر کی، تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عزالدین کے سپرد کی، اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم و اشاعت علم کا فرض انجام دیا، اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔

شیخ کی حق گوئی و بیباکی

اسی دوران میں ایک مرتبہ فخر الدین عثمان نے جو قصر شاہی کا مہتمم، اور عملا سلطنت مصر کا منتظم اعلیٰ تھا، مصر کی ایک مسجد کی چھت پر طبل خانے کی

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ۔ ج ۵ - ص ۱۰۰ - ۱۰۱ - بروایت شیخ شرف الدین عبداللطیف فرزند شیخ عزالدین بن عبدالسلام۔

عمارت بنوائی، اور وہاں طبل و نقارہ بجنے لگا، شیخ عزالدین کو جب اس واقعہ کی تحقیق ہوئی تو انھوں نے (بحیثیت قاضی اور مہتمم مساجد کے) اس عمارت کے انہدام کا حکم دیدیا، اور اس جرم میں فخر الدین کو ساقط الشہادۃ قرار دیا، اور ساتھ ہی ساتھ عہدۂ قضا سے استعفاد دیدیا، اس کارروائی سے سلطان کی نگاہ میں شیخ کی منزلت کم نہیں ہوئی، مگر اسنے عہدۂ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر نہیں کیا، ادھر شیخ کے فیصلوں کا اتنا احترام اور ان کا دینی نفوذ واثر اس قدر تھا کہ اسی زمانے میں الملک الصالح سلطان مصر نے خلیفۂ بغداد کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی جب سفیر کی باریابی ہوئی، اور اسنے سلطانِ مصر کا پیغام پہونچایا تو اُس سے دریافت کیا گیا کہ یہ پیغام تم نے خود سلطانِ مصر کی زبان سے سنا ہے یا کسی کے واسطہ سے؟ اُسنے کہا کہ میں نے یہ پیغام مہتمم قصر شاہی فخر الدین کی زبان سے سنا ہے، خلیفہ نے کہا کہ فخر الدین کی شہادت معتبر نہیں، اس کو شیخ عزالدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے اسلئے ہم اس کی روایت قبول نہیں کر سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفارت پھر مصر واپس آئی، اور براہِ راست سلطان سے پیغام سُنکر بغداد واپس ہوکر خلیفہ کو پیغام پہونچایا۔

ان کی جرأت کا اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعے میں دربار شاہی تھا، بادشاہ اپنے تزک واحتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دورویہ افواجِ شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہو ہو کر آداب تسلیمات بجالاتے تھے، اور زمین بوس ہوتے تھے، اس بھرے دربار میں دفعۃً شیخ نے بادشاہ کو نام لیکر خطاب کیا اور کہا، کہ:- "ایوب خدا کو تم کیا جواب دوگے جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اسلئے دی تھی، کہ شراب آزادی سے پی جائے؟" بادشاہ نے کہا، کہ: "یہ کیا واقعہ ہے؟" شیخ نے بلند آواز سے فرمایا:-

"ہاں! فلاں میخانے میں شراب آزادی سے بک رہی ہے، اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے دادِ عیش دے رہے ہو!" بادشاہ نے کہا، کہ:- جناب والا! اس میں مجھے کچھ دخل نہیں، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہو رہا ہے" شیخ نے فرمایا، کہ:- "پھر تم بھی انھیں لوگوں میں سے ہو جن کا جواب یہ ہوتا ہے، کہ انا وجدنا اٰبائنا علیٰ امۃ (یہ ہمارے باپ دادا کے زمانہ سے ہوتا چلا آیا ہے)" سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔

شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا، کہ حضرت! کیا واقعہ ہے؟- فرمایا، کہ

میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت کے ساتھ اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ منظر دیکھ کر اس پر بھی تکبر کا حملہ ہو، اور وہ اپنے نفس کا شکار ہو جائے، میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہ بات کہی، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خوف نہیں معلوم ہوا، فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال اس وقت ایسا مستحضر اور پیشِ نظر تھا کہ وہ مجھے اسکے مقابلے میں ایک بلّے کی طرح معلوم ہوتا تھا[1]۔

فرنگیوں سے جہاد

وہ زمانہ فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے خالی نہ تھا، ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہونچ گئیں، اور مسلمانوں پر انھوں نے غلبہ حاصل کر لیا، شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو استجابت دُعا کی نعمت عطا فرمائی تھی، ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ ان کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ہوا کا رُخ بدل گیا، فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے، اور اکثر فرنگی غرق ہوئے[2]۔

مصارفِ جہاد کیلئے شیخ کا انتظام

اس زمانہ میں تاتاری عالم اسلام پر جا بجا سے یورش کر رہے تھے، اسی اثناء میں انھوں نے مصر کا رُخ کیا، تاتاریوں کی مسلمانوں پر جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی وہ ضرب المثل ہے مصر میں بھی سراسیمگی پھیل گئی، سلطانِ مصر اور اہلِ مصر کی ہمت مقابلے کی نہیں ہوتی تھی، شیخ الاسلام نے ہمت دلائی، اور فرمایا، کہ:۔ تم اللہ کا نام لیکر نکلو، میں فتح کی ضمانت کرتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے، میں تجار سے قرض لینا چاہتا ہوں۔ شیخ نے فرمایا، کہ:۔ پہلے اپنے محل کے جواہرات اور اپنی بیگمات کے زیورات نکالو، ارکانِ سلطنت اور امراءِ دربار اپنی اپنی بیگمات کے وہ زیورات حاضر کریں جو حرام ہیں، اور اس کے سکے ڈھلوائے جائیں، اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں، اُسکے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں۔ شیخ کا اتنا رعب تھا کہ بادشاہ اور امراءِ سلطنت نے بے چون و چرا جواہرات و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کر دیئے، اور ان سے جنگ کے مصارف پورے کئے گئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

امراءِ سلطنت کا نیلام

شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ان امراءِ سلطنت کو نیلام کیا جو اُن کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے، اور شرعی طریقے پر آزاد

---

[1] الطبقات الشافعیۃ۔

[2] الطبقات الشافعیۃ۔

نہیں کئے گئے تھے، یہ امراء سلطنت نسلاً ترک تھے، اور سلطنتِ مصر پر بڑے حاوی تھے، اُن میں سے ایک نائب السلطنت تھا شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقے پر آزاد نہ ہوں ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عام غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتوے کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کردی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان امراء کے حلقے میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انھوں نے ایک دن جمع ہوکر شیخ کو طلب کیا اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے، اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقے پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا، انھوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، اور سرِ بازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں، بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انھوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، اس گفت و شنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جو شیخ کے خلافِ شان تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملہ سے کیا تعلق، اور وہ امراء کے قصے میں کیوں پڑتے ہیں، شیخ یہ سنکر ناراض ہوئے، اور انھوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کرلیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا، اور گھر والوں کو سوار کیا، اور روانہ ہو گئے، ان کی روانگی کی خبر سنکر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہولیا، علماء، صلحاء، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے، سلطان کو اطلاع ہوئی اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عزالدین چلے گئے تو تمہاری سلطنت جاتی رہے گی، سلطان خود سوار ہوکر ان کے پاس پہونچا، اور اُن کو منا کر شہر واپس لایا، اور طے ہوا کہ امراء سلطنت کا وہ خود نیلام کریں، یہ سُنکر نائب السلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں اُن کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آگیا، اُسنے کہا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا ہم ملک کے حاکم ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اُڑادوں گا، چنانچہ وہ اپنے عملے کے ساتھ سوار ہوکر شیخ کے دروازہ پر پہونچا، ننگی تلوار اُسکے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹکھٹایا، شیخ کے صاحبزادے باہر نکلے، تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ دروازہ پر کھڑا ہے، انھوں نے اندر جاکر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پرواہی سے جواب دیا کہ :- بیٹا! تمھارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کے راستے میں شہید ہو - یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، اُن کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، اور اُسکے جسم پر رعشہ طاری ہوگیا، اُسنے رو کر

شیخ سے دُعا کی درخواست کی، اور کہا کہ: میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا:۔ میں تمھارا نیلام کروں گا، اور تمھیں فروخت کروں گا۔ اُسنے کہا کہ:۔ ہماری قیمت آپ کس مد میں صرف کرینگے؟۔ فرمایا: مسلمانوں کے کاموں میں۔ اُس نے عرض کیا کہ:۔ قیمت وصول کون کرے گا۔ فرمایا: میں خود۔ اُسنے کہا:۔ بہت اچھا۔ چنانچہ شیخ نے ایک ایک کرکے سب امراء کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے (ان کے اعزاز کے طور پر) ان کے دام بہت لگائے، اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کرکے خیر کے کاموں میں صرف کی، اور وہ آزاد ہوکر اپنے اپنے گھر گئے۔[۱] ابن السبکی لکھتے ہیں، کہ:۔ "یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سُننے میں نہیں آیا"۔ ایک عالم کی عظمت اور اُسکے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عزالدین، اور سلاطین مصر

مصر میں شیخ کی زندگی میں بڑے انقلابات آئے، وہ مصر آئے تھے تو ایوبی سلطنت کا زمانہ تھا، اور صلاح الدین کا خاندان حکومت کر رہا تھا، ان کی زندگی ہی میں یہ خاندان ختم ہوا، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے جانشین الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل امراء کا دورِ حکومت آیا، وہ سب شیخ کے قدرداں اور نیازمند رہے، اور ان کی تعظیم و تکریم اور بزرگداشت میں کوئی کمی نہیں آئی، خصوصیت کے ساتھ مصر کا نامور ترک سلطان الملک الظاہر بیبرس، شیخ کا بڑا ادب شناس اور انکی شخصیت سے متاثر تھا، شیخ ہی کے مشورے سے سقوط بغداد اور سلطنت عباسیہ کے اختتام پر سُلطان نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم کے چچا ابوالقاسم احمد کو جن کا لقب المستنصر ہے، ۶۵۹ھ کو مصر میں اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، پہلے شیخ عزالدین نے بیعت کی پھر الملک الظاہر بیبرس نے، پھر قاضی القضاۃ تاج الدین وغیرہ نے۔[۲]

مکارم اخلاق

شیخ اپنے علم و فضل، وقار و ہیبت کے ساتھ بڑے کریم النفس، فیاض اور مخیر تھے، قاضی القضاۃ بدرالدین بن جماعۃ ناقل ہیں کہ دمشق کے زمانۂ قیام میں ایک سال بڑی گرانی کا آیا، باغات کے دام بہت گر گئے، اور بہت سستے بکنے لگے، شیخ کی اہلیہ محترمہ نے ان کو ایک زیور دیا کہ گرمی گذارنے کے لئے ایک باغ خرید لیں، انھوں نے وہ زیور فروخت کرکے ساری قیمت خیرات کردی، اہلیہ نے پوچھا، کہ:۔ آپنے باغ خرید لیا؟ فرمایا، کہ:۔ ہاں! مگر

---

[۱] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۸۴ - ۸۵۔

[۲] حسن المحاضرۃ۔ ج ۲۔ ص ۴۹۔

جنت میں، میں نے دیکھا کہ لوگ بڑی عسرت اور تکلیف میں ہیں، میں نے اس کی قیمت ان پریشان حال لوگوں پر صرف کردی۔

انھوں نے فرمایا: جزاك الله۔

قاضی القضاۃ موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ تنگ حالی کے باوجود بڑے فراخ دست اور مخیر تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا، تو اپنا عمامہ چیر کر اس کا ایک ٹکڑہ دیدیتے۔

شیخ عزالدین صرف سلاطین ہی کے مقابلے میں جری اور حق گو نہ تھے، بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی اسی طرح بیباک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانۂ قیام میں ان سے ایک فتوے میں غلطی ہوگئی تو انھوں نے اعلان کروادیا کہ جس کو ابن عبدالسلام نے فلاں فتویٰ دیا ہو وہ اس پر عمل نہ کرے، اسلئے کہ وہ غلط ہے[1]۔

ابن السبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم ظاہری کے کمالات کے ساتھ دولتِ باطنی سے بھی مالامال تھے، اگرچہ ان کے ایمان و یقین، اعتماد علی اللہ، بےخوفی و شجاعت، ارباب دنیا کی بے وقعتی کے واقعات خود اس پر دلیل ہیں، لیکن ابن السبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے امام طریقت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے استفادہ کیا تھا، اور اُن کی طرف سے ارشاد و تربیت کے لئے مجاز تھے[2]۔ سیوطی نے شیخ ابوالحسن شاذلیؒ سے بھی ملاقات و استفادہ کا ذکر کیا ہے[3]۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں شیخ کا مسلک

شیخ علمی و نظری طور پر بھی اسکے قائل تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، بدعات اور گمراہیوں کی علانیہ مخالفت و انکار علماء کا فریضہ ہے، اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات اور شدائد بھی برداشت کرنے چاہئیں اور ہر طرح کے مصائب کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ الملک الاشرف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

وبعد ذلك فانا نزعم انا من جملة حزب الله وانصار دینه وجنده، وکل جندی لایخاطر

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے ہیں اور اسکے دین کے مددگار اور اُس کا لشکر ہیں، وہ لشکری جو اپنے کو

---

[1] حسن المحاضرہ (ص۱۴۲)۔ [2] طبقات (ج ۵ ص ۸۶)۔ [3] حسن المحاضرہ (ص۱۴۲)۔

بنفسہ فلیس بمجاہد ـــــــ

خطرہ میں ڈالنے کیلئے تیار نہ ہو وہ لشکری نہیں ہے۔

ان کا خیال تھا کہ علم و زبان علماء کا ہتھیار ہیں، اسلئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو حق کی تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں، ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :-

قد أمرنا الله بالجهاد فی نصرة دینه، الا ان سلاح العالم علمه ولسانه کما ان سلاح الملك سیفه وسنانه فکما لا یجوز للملوك اغماد اسلحتهم عن الملحدین والمشرکین لا یجوز للعلماء اغماد السنتهم عن الزائغین والمبتدعین[1]

اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے دین کی مدد کیلئے جہاد و جدوجہد کا حکم دیا ہے، اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ عالم کا ہتھیار اس کا علم اور اسکی زبان ہے جیسے کہ بادشاہ کا ہتھیار اسکی تلوار اور تیر و سناں ہے، تو جس طرح بادشاہوں کیلئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں، اسی طرح علماء کے لئے اہل زیغ و ضلال اور مبتدعین سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں عالم ربانی کو ہر طرح کے خطرات برداشت کرنے چاہئیں گویا ان کو اُن علماء سے اتفاق نہیں ہے جو ہر طرح کے خطرے میں پڑنے کو مطلقاً ناجائز سمجھتے ہیں، اور آیت "ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة" سے غلط اور بے محل استدلال کرتے ہیں۔ اسی خط میں بڑے مؤثر انداز میں فرماتے ہیں :-

والمخاطرة بالنفوس مشروعة فی اعزاز الدین، ولذلك یجوز للبطل من المسلمین ان ینغمر فی صفوف المشرکین، وکذلك المخاطرة بالامر بالمعروف والنهی عن المنکر ونصرة

دین کے اعزاز و غلبہ کے لئے جانوں کو خطرہ میں ڈالنا دین میں مشروع ہے، اسی لئے مسلمان شہ زور کے لئے جائز ہے کہ مشرکین کی صفوں میں گھس جائے اسی طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اپنے کو خطرے میں ڈالنا، اور اصولِ دین کی دلائل و براہین کے ذریعہ

---

[1] طبقات الشافعیة الکبریٰ - (ج ۵ - ص ۹۰) - ۱۲

قواعد الدين بالحجج والبراهين مشروعة، فمن خشي على نفسه سقط عنه الوجوب وبقي الاستحباب، ومن قال بان التعزير بالنفوس لايجوز فقد بعد عن الحق ونأى عن الصواب، وعلى الجملة فمن آثر الله على نفسه آثره الله، ومن طلب رضا الله بما يسخط الناس رضي الله عنه وأرضى عنه الناس، ومن طلب رضا الناس بما يسخط الله سخط الله عليه وأسخط عليه الناس، وفي رضا الله كفاية عن رضا كل أحد

فليتك تحلو والحياة مريرة
وليتك ترضى والانام غضاب

تقویت شروع ہو البتہ جس کو اپنی جان کا خطرہ ہو اس سے وجوب ساقط ہو جائے گا اور استحباب باقی رہے گا، جس شخص کا خیال ہو کہ جان کو خطرہ میں ڈالنا جائز ہی نہیں وہ حق سے بہت دور ہو گیا۔ اور اس کا یہ خیال بالکل صحیح نہیں، خلاصہ یہ کہ جو اللہ کو اپنے نفس پر ترجیح دے گا اللہ اس کو دوسروں پر ترجیح دے گا اور جو لوگوں کو ناراض کر کے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اللہ اس سے خود بھی راضی ہو جائے گا اور لوگوں کو راضی کر دے گا اور جو اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا اللہ اس سے ناراض ہو گا اور لوگوں کو بھی ناراض کر دیگا۔ عرب شاعر نے خوب کہا ہو

کاش کہ آپ کی محبت کی حلاوت مجھے حاصل ہو جاتی پھر چاہے زندگی کتنی ہی تلخ ہو اور کاش کہ آپ مجھ سے راضی ہو جاتے چاہے ساری دنیا ناراض ہو۔

ان کی زندگی بتلاتی ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنے اس عقیدہ اور مسلک پر عمل کیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں، اور اپنے نزدیک کسی غلط اور خلاف شرع چیز کی تردید میں اپنی جان مال آبرو وطن اور عہدہ کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

شیخ کی تصنیفات | شیخ جس طرح کامیاب مدرس، وسیع النظر فقیہ اور متبحر مفتی تھے اسی طرح کہنہ مشق

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

رمضان المبارک

میں

کتب خانۂ الفرقان نے شائقین کتب کے لیے غیر معمولی رعایت کا فیصلہ کیا ہے! اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کی صرف ایک شرط ہے، وہ یہ کہ :

آپ کا آرڈر کم سے کم عـ۱ـہ روپے کی قیمت کا ہو

اگر آپ

اس شرط کو پورا کرتے ہیں تو پھر رمضان کی چاہے جس تاریخ کو بھی آپ کا آرڈر ہمیں ملے، اپنی مطبوعات پر ۴ر فی روپیہ اور باہر کی مطبوعات پر ۲ر فی روپیہ کی رعایت آپ کو دیجائے گی۔

آئندہ اوراق میں کتابوں کی ایک

مختصر فہرست

پیش کی جا رہی ہے

اس میں سے آپ اپنے آرڈر کے لیے کتابیں منتخب فرمالیجیے

اور یاد رکھیے کہ رمضان ختم ہونے پر یہ رعایت

بھی ختم ہو جائے گی۔

منیجر الفرقان لکھنؤ

تصوف کیا ہے؟

اردو میں تصوف سے متعلق کئی اچھی اچھی چیزیں ہمارے اس زمانہ میں شائع ہو چکی ہیں، لیکن ہمارا خیال ہو کہ یہ تازہ طبع کتاب اپنے اختصار کیساتھ انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے بہت ممتاز سمجھی جائیگی اور انشاء اللہ ان تمام حق پسند حضرات کیلئے اطمینان کا باعث ہوگی جو تصوف کے بارے میں بھی انصاف سے غور کرنا چاہتے ہیں اور جن کو انکے نام سے خواہ مخواہ کی ضد اور چڑ نہیں ہو ——— اس میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان، مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے مندرجۂ ذیل آٹھ مقالے ہیں۔ گویا ان تینوں حضرات کی مشترک تالیف ہو۔

(۱) تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ (۲) تصوف اور اسکے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند یقین (۳) تصوف اور اسکے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات (۴) تصوف کے متعلق بعض شبہات کا جواب (۵) یقین اور اس کے ثمرات (۶) تصوف اور شیخین (یعنی تصوف کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ ابن القیم کی تصریحات) (۷) اہل تصوف اور دینی جد و جہد (۸) طالبان سلوک کو ابتدائی مشورے۔

(ڈیڑھ سو صفحات، کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ اعلیٰ۔ قیمت:- ۱۲/

نوٹ:- ان میں سے بعض کتابوں کا تعارف ٹائٹل کے صفحات پر موجود ہے باقی بعض خاص کتابوں کا تعارف اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ

اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

یہ کتاب دراصل مولانا محمد الیاسؒ کی سوانح حیات ہے جس میں ان کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ ان کی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو بلاشبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے۔۔۔ اس دعوت و تحریک کے پس منظر اس کے بنیادی اصول اور اسکی ارتقائی منزلوں کو جس تحقیق و تنقیح کے ساتھ بہترین علمی اور تصنیفی زبان میں اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ انکے محترم مولف کا حصہ ہے۔۔۔ شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کے اصول دعوت کی تشریح کر کے دکھلایا گیا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء سے کس درجہ مطابقت ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت عہ

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

(مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی)

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور ان کی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعہ ملفوظات کا مطالعہ کرلے جو دین کے حقائق و معارف کا عجیب غریب گنجینہ ہے۔۔۔ اس سے مولانا مرحوم کی دینی دعوت کی روح حقیقت اسکے اصول مقاصد اور آداب و لوازم۔ اور اس کی گہرائیاں بھی معلوم ہوں گی اور یہ بھی اندازہ ہو جائیگا کہ تفقہ فی الدین و معرفت و یقین میں مولاناؒ کا مقام کتنا بلند تھا اور اللہ تعالیٰ نے دین کیلئے حقائق و معارف ان کے قلب پر فرما دیئے تھے اور امت مسلمہ کے امراض کی مولانا نے کتنی صحیح تشخیص کی تھی۔ حقیقت شناسوں کی نظر میں اس مجموعہ کا ایک ایک ملفوظ ایسا ہے جس پر ضخیم کتابیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ کاغذ، کتابت طباعت اعلیٰ۔ غیر مجلد قیمت عہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ

(از، مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

شاہ ولی اللہؒ کا دور اسلامی طوفانی دور تھا، مغلیہ سلطنت کا زوال و انحطاط، ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز، سکھ اور مرہٹہ تحریکوں کا زور اور ان کے غارتگرانہ ہنگامے، نادر شاہ کا خونی سیلاب، احمد شاہ ابدالی کی تاریخی جنگ یہ سارے واقعات شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ میں ہوئے اور خود شاہ صاحب ان سے غیر متعلق بھی نہ تھے اسلیے اس مقالہ میں ان تمام واقعات اور انکے اسباب و اثرات کا ذکر بھی اچھی خاصی تفصیل سے آ گیا ہے۔ پھر بتلایا گیا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اس طوفانی دور میں اسلام کی خدمت کیا اور کس طرح کی اور انکے طرز عمل سے موجودہ حالات میں ہمیں کیا روشنی ملتی ہے۔ یہ مقالہ اچھی خاصی کتاب ہے بار یک قلم سے الفرقان سائز کے ۳۰ صفحات پر ختم ہے۔ کاغذ چکنا۔ کتابت طباعت عمدہ

(قیمت عہ)

تصوف و صوفیہ

اور ہندستان میں ان کی برکات"

تصوف و صوفیہ کے موضوع پر ایک عدیم النظیر فاضلانہ اور محققانہ علمی مقالہ ہے، شروع میں تصوف و احسان کی حقیقت اور اسکے آغاز کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ تصوف اسی چیز کا نام ہے جس کو کتاب و سنت میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔۔۔ پھر تاریخ کی مستند شہادتوں کی روشنی میں بتلایا گیا ہے کہ امت کے چاروں مشہور امام (ائمہ اربعہ) دین کے اس شعبہ کے بھی امام تھے، اور اپنے اپنے زمانہ کے ائمہ تصوف سے انھوں نے استفادہ کیا تھا۔۔۔ پھر پوری تفصیل سے بتلایا گیا ہے کہ خصوصیت سے ہندستان میں صوفیہ صافیہ خاص کر اہل چشت نے دین کی بنیاد قائم کرنے اور کلمۃ اللہ کو یہاں بلند کرنے میں کیا حصہ لیا، اور اسلامی ہند کی تعمیر میں ان کی ساعی کو کتنا دخل ہے۔ تاریخ کے ہزاروں صفحات کا عطر اور خلاصہ ہے قیمت عہ

مولانا محمد منظور نعمانی ــــ اور ــــ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کی

تبلیغی تقریریں!

جو ہندوستان و پاکستان کے مختلف شہروں کے اہم تبلیغی اجتماعات میں کی گئی تھیں۔

ان کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہوگا ــــ کہ

(۱) دعوت و تبلیغ کی اس جد وجہد کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے۔

(۲) اس کا مقصد و نصب العین اور اس کے اصول کیا ہیں اور وہ کن امتیازات کی حامل ہے۔

(۳) مسلمانوں سے اس کا کیا مطالبہ ہے، اور ان کے لیے اس کا کیا پیام ہے۔

(۴) دنیا اور آخرت میں اس تحریک سے کن نتائج کی توقع ہے۔

(۵) جو لوگ اس دینی دعوت کو صرف کلمہ و نماز کی تحریک یا جامد خانقاہیت کی دعوت کہتے ہیں وہ اصل حقیقت سے کتنے ناواقف ہیں۔

اس تحریک کے کارکنوں کو ان تقریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا

ــــ کہ ــــ

(۶) مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے سامنے اس دعوت کو کس انداز میں پیش کرنا چاہیئے۔

(۷) شبہات اور غلط فہمیوں کو کس طرح صاف کرنا چاہیئے۔

(۸) اس کام سے تعلق رکھنے والوں کو کن باتوں کی پابندی خاص طور سے کرنی چاہیئے۔

(۹) ان میں بعض تقریریں وہ بھی ہیں جو ایسے مجمعوں میں کی گئیں جن میں غیر مسلم بھی خاصی تعداد میں تھے، ان سے معلوم ہوگا کہ غیر مسلم حضرات کے لیے ہماری دعوت اور ہمارا پیام کیا ہے؟ اور ہم ان سے کیا کہتے ہیں۔

(۱۰) بوقتِ ضرورت ان تقریروں کو اجتماعات میں بھی سنایا جاسکتا ہے۔

ــــ اس میں کل ۱۳ تقریریں ہیں ــــ

پونے تین سو صفحات ــــ مجلد، خوشنما، مع گرد پوش ــــ قیمت۔ دو روپیہ (ع) ۸

کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

Regd. No.—(A 353.)

Printed at—NAMI PRESS, Lko.

Regd. No—(A 353.)

Printed at:—NAMI PRESS, Lko

تصوف کیا ہے؟